اشفاق احمد

زاویہ ۲

زاویہ

(۲)

اشفاق احمد

ترتیب

پنجاب کا دوپٹہ

جب آدمی میری عمر کو پہنچتا ہے تو وہ اپنی وراثت آنے والی نسل کو دے کر جانے کی کوشش کرتا ہے۔ کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں، جو انسان بد قسمتی سے ساتھ ہی سمیٹ کر لے جاتا ہے۔ مجھے اپنی جوانی کے واقعات اور اس سے پہلے کی زندگی کے حالات مختلف ٹکڑیوں میں ملتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اب وہ آپ کے حوالے کر دوں۔ حالانکہ اس میں تاریخی نوعیت کا کوئی بڑا واقعہ آپ کو نہیں ملے گا لیکن معاشرتی زندگی کو بہ نظر غائر دیکھا جائے تو اس میں ہماری سیاسی زندگی کے بہت سے پہلو نمایاں نظر آئیں گے۔

آج سے کوئی بیس بائیس برس پہلے کی بات ہے میں کسی سرکاری کام سے حیدر آباد گیا تھا ۔سندھ میں مجھے تقریباً ایک ہفتے کے لیے رہنا پڑا، اس لیے میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ بھی میرے ساتھ چلے، چنانچہ وہ بھی میرے ساتھ تھی۔ دو دن وہاں گزارنے کے بعد میری طبیعت جیسے بے چین ہو گئی۔ میں اکثر اس حوالے سے آپ کی خدمت میں ”بابوں“ کا ذکر کرتا ہوں۔ میں نے اپنی بیوی

سے کہا کہ بھٹ شاہ (شاہ عبد اللّٰطیف بھٹائی) کا مزار یہاں قریب ہی ہے اور آج جمعرات بھی ہے، اس لیے آج ہم وہاں چلتے ہیں۔ وہ میری بات مان گئی۔ میزبانوں نے بھی ہمیں گاڑی اور ڈرائیور دے دیا، کیونکہ وہ راستوں سے واقف تھا۔ ہم مزار کی طرف روانہ ہو گئے۔ جوں جوں شاہ عبد اللّٰطیف بھٹائی کا مزار قریب آ رہا تھا، مجھ پر ایک عجیب طرح کا خوف طاری ہونے لگا۔ مجھ پر اکثر ایسا ہوتا ہے۔ میں علم سے اتنا متاثر نہیں ہوں، جتنا کریکٹر سے ہوں۔ علم کم تر چیز ہے، کردار بڑی چیز ہے۔ اس لیے صاحبانِ کردار کے قریب جاتے ہوئے مجھے بڑا خوف آتا ہے۔ صاحبانِ علم سے اتنا خوف نہیں آتا، ڈر نہیں لگتا۔

جب ہم وہاں پہنچے تو بہت سے لوگ ایک میلے کی صورت میں ان کے مزار کے باہر موجود تھے۔ گھوم پھر رہے تھے۔ ہم میاں بیوی کافی مشکل سے مزار کے صحن میں داخل ہوئے۔ بہت سے لوگ وہاں بیٹھے ہوئے تھے اور شاہ عبد اللّٰطیف بھٹائی کا کلام سنا رہے تھے۔ اس کلام میں جب شاہ کی شاعری میں موجود ایک خاص ٹکڑا آتا تو سارے سازندے چوکس ہو کر بیٹھ جاتے اور گانے لگتے، کلام میں یہ خاص ٹکڑا اس قدر مشکل اور پیچیدہ ہے کہ وہاں کے رہنے والے بھی کم کم ہی اس کا مطلب سمجھتے ہیں، لیکن اس کی گہرائی زمانے کے ساتھ ساتھ کھلتی چلی جاتی ہے۔ ہم بھی وہاں ایک دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ وہاں کافی

رش تھا۔ کچھ لوگ زمیں پر لیٹے ہوئے تھے۔ عورتیں، مرد سب ہی اور کچھ بیٹھے کلام سن رہے تھے۔ ہم بھی جا کر بیٹھ گئے۔ جب شاہ کی وائی (مخصوص ٹکڑی) شروع ہوتی تو ایک خادم دھات کے بڑے بڑے گلاسوں میں دودھ ڈال کر تقسیم کرتا۔ یہ رسم ہے وہاں کی کہ جب وائی پڑھتے ہیں تو دودھ تقسیم کیا جاتا ہے۔ گلاس بہت بڑے بڑے تھے، لیکن ان میں تولہ ڈیڑھ تولہ دودھ ہوتا۔ جب اتنا بڑا گلاس اور اتنا سا دودھ لا کر ایک خادم نے میری بیوی کو دیا، تو اُس نے دودھ لانے والے کی طرف بڑی حیرت سے دیکھا اور پھر جھانک کر گلاس کے اندر دیکھا۔ میں نے اُس سے کہا کہ دودھ ہے پی لو۔ میں نے اپنے گلاس کو ہلایا۔ میرے گلاس کے اندر دودھ میں ایک تنکا تھا۔ میں اُس تنکے کو نظر انداز کرتا تھا، لیکن وہ پھر گھوم کر سامنے آجاتا تھا۔ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں دودھ کو تنکے سمیت ہی پی جاتا ہوں۔ چنانچہ میں نے دودھ پی لیا اور اپنی بیوی سے کہا کہ آپ بھی پئیں، یہ برکت کی بات ہے۔

خیر! اُس نے زبردستی زور لگا کر پی لیا اور قریب بیٹھے ہوئے ایک شخص سے کہا کہ آپ ہمیں تھوڑی سی جگہ دیں۔ اُس شخص کی بیوی لیٹ کر اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ اُس شخص نے اپنی بیوی کو ٹھوکا دیا اور کہا کہ مہمان ہے، تم اپنے پاؤں پیچھے کرو۔ میری بیوی نے کہا کہ نہیں نہیں، اس کو مت اُٹھائیں۔ لیکن اُس شخص

نے کہا، نہیں نہیں کوئی بات نہیں۔ اُس کی بیوی ذرا سمٹ گئی اور ہم دونوں کو جگہ دے دی۔ انسان کا خاصہ یہ ہے کے جب اُس کو بیٹھنے کی جگہ مل جائے، تو وہ لیٹنے کی بھی چاہتا ہے۔ جب ہم بیٹھ گئے تو پھر دل چاہا کہ ہم آرام بھی کریں اور میں آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا پاؤں پسارنے لگا۔ فرش بڑا ٹھنڈا اور مزیدار تھا۔ ہوا چل رہی تھی۔ میں نیم دراز ہو گیا۔ میری بیوی نے تھوڑی دیر کے بعد کہا کہ میں چکر لگا کر آتی ہوں، کیونکہ یہ جگہ تو ہم نے پوری طرح دیکھی ہی نہیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ وہ چلی گئی۔ دس پندرہ منٹ گزر گئے، وہ واپس نہ آئی تو مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں گُم ہی نہ ہو جائے، کیونکہ پیچیدہ راستے تھے اور نئی جگہ تھی۔

جب وہ لوٹ کر آئی تو بہت پریشان تھی۔ کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔ اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ میں نے کہا، خیر ہے! کہنے لگی آپ اُٹھیں میرے ساتھ چلیں۔ میں آپ کو ایک چیز دکھانا چاہتی ہوں۔ میں اُٹھ کر اُس کے ساتھ چل پڑا۔ وہاں رات کو دربار کا دروازہ بند کر دیتے ہیں اور زائرین باہر بیٹھے رہتے ہیں۔ صبح جب دروازہ کھلتا ہے تو پھر دعائیں وغیرہ مانگنا شروع کر دیتے ہیں۔ جب ہم وہاں گئے تو اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگی، آپ ادھر آئیں۔ شاہ کے دروازے کے عین سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اُس کے سر پر جیسے ہمارا دستر خوان ہوتا ہے، اس سائز کی چادر کا ٹکڑا تھا اور اُس کا اپنا جو دوپٹہ تھا وہ اُس نے شاہ کے دروازے

کے کندھے کے ساتھ گانٹھ دے کر باندھا ہوا تھا اور اپنے دوپٹے کا آخری کونہ ہاتھ میں پکڑے کھڑی تھی اور بالکل خاموش تھی، اُسے آپ بہت ہی خوبصورت لڑکی کہہ سکتے ہیں۔

اُس کی عمر کوئی سولہ، سترہ یا اٹھارہ برس ہو گی۔ وہ کھڑی تھی، لیکن لوگ ایک حلقہ سا بنا کر اُسے تھوڑی سی آسائش عطا کر رہے تھے تا کہ اُس کے گرد جمگھٹا نہ ہو۔ کچھ لوگ، جن میں عورتیں بھی تھیں، ایک حلقہ سا بنائے کھڑے تھے۔ میں نے کہا، یہ کیا ہے؟ میری بیوی کہنے لگی، اس کے پاؤں دیکھیں۔ جب میں نے اُس کے پاؤں دیکھے تو آپ یقین کریں کہ کوئی پانچ سات کلو کے۔ اتنا بڑا ہاتھی کا پاؤں بھی نہیں ہوتا۔ بالکل ایسے تھے جیسے سیمنٹ، پتھر یا اینٹ کے بنے ہوئے ہوں۔ حالانکہ لڑکی بڑی دھان پان کی اور دُبلی پتلی سی تھی۔ ہم حیرانی اور ڈر کے ساتھ اُسے دیکھ رہے تھے، تو وہ منہ ہی منہ میں کچھ بات کر رہی تھی۔ وہاں ایک سندھی بزرگ تھے۔ ہم نے اُن سے پوچھا کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ اُس نے کہا، سائیں! کیا عرض کریں۔ یہ بیچاری بہت دُکھیاری ہے۔ یہ پنجاب کے کسی گاؤں سے آئی ہے اور ہمارے اندازے کے مطابق مُلتان یا بہاولپور سے ہے۔ یہ گیارہ دن سے اسی طرح کھڑی ہے اور اس مزار کا بڑا خدمتگار، وہ سفید داڑھی والا بُزرگ، اس کی منت سماجت کرتا ہے تو ایک کھجور کھانے کے لیے یہ منہ

کھول دیتی ہے، چوبیس گھنٹے میں۔ میری بیوی کہنے لگی کہ اسے ہوا کیا ہے؟ اُنہوں نے کہا کہ اس کے بھائی کو پھانسی کی سزا ہوئی ہے اور یہ بیچارگی کے عالم میں وہاں سے چل کر یہاں پہنچی ہے اور اتنے دن سے کھڑی ہے اور ایک ہی بات کہہ رہی ہے کہ اے شاہ! تُو تو اللہ کے راز جانتا ہے، تُو میری طرف سے اپنے رب کی خدمت میں درخواست کر کہ میرے بھائی کو رہائی ملے اور اس پر مقدّمہ ختم ہو۔" وہ بس یہ بات کہہ رہی ہے۔ شاہ اپنی ایک نظم میں فرماتے ہیں کہ اے لوگو! چودھویں کے چاند کو جو بڑا خوبصورت اور دلکش ہوتا ہے، پہلی کے چاند کو جو نظر بھی نہیں آتا اور لوگ چھتوں پر چڑھ کر اُنگلیوں کا اشارہ کر کے اسے دیکھتے ہیں۔ یہ کیا راز ہے تم میرے قریب آؤ میں تمہیں چاند کا راز سمجھاتا ہوں (یہ شاہ عبداللّطیف بھٹائی کی ایک نظم کا حصّہ ہے)

وہ لڑکی بھی بیچاری کہیں سے چل کر چلتی چلتی پتا نہیں اس نے اپنے گھر والوں کو بتایا بھی ہے کہ نہیں، لیکن وہ وہاں پہنچ گئی ہے اور وہاں کھڑی تھی۔ چونکہ رات کو مزار کا دروازہ بند ہو جاتا ہے، اس لیے کوئی کنکشن نہیں رہتا، اس نے اپنا دوپٹہ اُتار کر وہاں باندھ رکھا ہے۔ وہ بابا بتا رہا تھا کہ اب اس کا چلنا مشکل ہے۔ بڑی مشکل سے قدم اُٹھا کر چلتی ہے اور ہم سب لوگ اس لڑکی کے لیے دعا کرتے ہیں۔ ہم اپنا ذاتی کام بھول جاتے ہیں اور ہم اس کے لیے اور اس کے بھائی کے

لیے اللہ سائیں سے گڑگڑا کر دعا کرتے ہیں کہ اللہ تُو اس پر فضل کر۔ کتنی چھوٹی سی جان ہے اور اس نے اپنے اوپر کیا مصیبت ڈال لی ہے۔ میں کھڑا اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کا دوپٹہ اگر سر سے اُتر جاتا تو وہاں کے لوگ اپنے پاس سے اجرک یا کوئی اور کپڑا اُس کے سر پر ڈال دیتے۔ میں اس کو دیکھتا رہا۔ مجھے باہر دیکھنا، وائی سننا اور دودھ پینا سب کچھ بھول گیا۔ میں چاہتا تھا کہ اس سے بات کروں، لیکن میرا حوصلہ نہیں پڑ رہا تھا، کیونکہ وہ اتنے بُلند کردار اور طاقت کے مقام پر تھی کہ ظاہر ہے ایک چھوٹا، معمولی آدمی اس سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ ہمیں وہاں کھڑے کھڑے کافی دیر ہو گئی۔ ہم نے ساری رات وہاں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے ساری رات اس لڑکی کے لیے دعائیں کیں۔ بس ہم اس کے لیے کچّی پکّی دعائیں کرتے رہے۔

صبح چلتے ہوئے میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ جب تک پنجاب کا دوپٹہ شاہ عبداللّطیف بھٹائی کے کنڈے سے بندھا ہے پنجاب اور سندھ میں کسی قسم کا کریک نہیں آ سکتا۔ یہ تو اپنے مقصد کے لیے آئی ہے نا، لیکن مقصد سے ماورا بھی ایک اور رشتہ ہوتا ہے۔ میری بیوی کہنے لگی، کیوں نہیں، آپ روز ایسی خبریں پڑھتے ہیں کہ یہ سندھ کارڈ ہے، یہ پنجاب کارڈ ہے۔ جب ایک چودھری دیکھتا ہے کہ لوگوں کی توجّہ میرے اوپر ہونے لگی ہے اور لوگ میرے بارے میں

Critical ہونے لگے ہیں، تو وہ پھر کہتا ہے اے لوگو! میری طرف نہ دیکھو۔ تمہارا چور پنجاب ہے۔ دوسرا کہتا ہے، نہیں! میری جانب نہ دیکھو تمہارا چور سندھ ہے، تاکہ اس کے اوپر سے نگاہیں ہٹیں، ورنہ لوگوں کے درمیان وہی اصل رشتہ قائم ہے جو مُلتان یا بہاولپور سے جانے والی لڑکی کا شاہ کے مزار سے ہے، جو اکیلی تن تنہا، سوجے پاؤں بغیر کسی خوراک کے کھڑی ہوئی ہے اس کا اعتقاد اور پورا ایمان ہے کہ اس کا مسئلہ حل ہو گا۔ اپنی ایک نظم میں شاہ فرماتے ہیں کہ اے کمان کسنے والے تُو نے اس میں تیر رکھ لیا ہے اور تُو مجھے مارنے لگا ہے، لیکن میرا سارا وجود ہی تیرا ہے، کہیں تُو اپنے آپ کو نقصان نہ پہنچا لے۔"

چند سردیاں پہلے کی بات ہے کہ ہمارے باغِ جناح میں پُرانے جمخانے کے سامنے اندرونِ شہر کی ایک خاتون بنچ کے اوپر بیٹھی تھی اور اپنے چھوٹے بچے کو اپنے گھٹنے کے اوپر پلا رہی تھی۔ اُس کی تین بچیاں کھیلتے ہوئے باغ میں پھیل گئی تھیں اور ایک دوسری کے ساتھ لڑتی تھیں اور بار بار چیخیں مارتی ہوئی ماں سے ایک دوسری کی شکایت کرتی تھیں۔ ذرا دیر بعد پھر ماں کو تنگ کرنا شروع کر دیتیں اور پھر چلی جاتیں۔ آخر میں پھر لڑتی ہوئی دو بچیاں آئیں اور کہا کہ امّاں اس نے میری فلاں اتنی بڑی چیز لے لی ہے۔ ایک نے مٹھی بند کی ہوئی تھی۔ آخر ماں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کہا کھول دے مٹھی۔ جب اس نے مٹھی کھولی تو اس میں

سوکھاہوا درخت سے گرا بھیڑہ تھا۔ ایک نے کہا، پہلے میں نے دیکھا تھا یہ میرا ہے۔ اُن کی ماں نے دوسری سے کہا، اسے دے دو۔ پھر وہ صُلح صفائی کرتے ہوئے بھاگ کر چلی گئیں۔

جب میں نے ان کے درمیان اتنی زیادہ لڑائی دیکھی تو میں نے اُس خاتون سے کہا کہ آپ تو مشکل میں پڑی ہوئی ہیں۔ یہ بچے آپ کو بہت تنگ کرتے ہیں۔ تو اُس نے کہا کہ بھائی! مجھے یہ بہت تنگ کرتے ہیں، لیکن میں اِن سے تنگ ہوتی نہیں۔ میں نے کہا وہ کیسے؟ کہنے لگیں، یہ جو میرے بچے ہیں، اپنی نانی کے مرنے کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ اگر ان کی نانی زندہ ہوتی تو یہ بچیاں کتنی ہی شیطانیاں کرتیں، ضد کرتیں، لڑائیاں کرتیں، لیکن پھر بھی اپنی نانی کی پیاریاں اور لاڈلیاں ہی رہتیں۔

جب میرے ذہن میں یہ خیال آتا ہے تو یہ کچھ بھی کریں۔ میں اپنی نانی کی حوالے سے ان کو معاف کر دیتی ہوں اور یہ مزے سے کھیلتی رہتیں ہیں، حالانکہ جسمانی اور ذہنی روحانی طور پر مجھے تنگ کرتی ہیں۔ جب اُس نے یہ بات کی تو میں سوچنے لگا کہ کیا ہمارے سیاسی اور سماجی وجود میں کوئی نانی جیسا تصوّر نہیں آ سکتا؟ کیا ہمیں ایسا لیڈر نہیں مل سکتا، یا سکا جس کے سہارے ہم اپنی مشکلات کو اس

کے نام Dedicate کر کے یہ کہیں کہ اگر ایسی مشکلات ہوتیں اور اگر قائد اعظم زندہ ہوتے تو ہم ان کے حوالے کر دیتے کہ جی یہ مشکلات ہیں اور وہ ان کو ویسے ہی سمیٹ لیتے جیسا کہ وہ دوسری مشکلات سمیٹا کرتے تھے، بلکہ اکیلے اُنہوں نے ہی تمام مشکلات کو سمیٹا تھا۔ لیکن شاید یہ ہماری قسمت یا مقدّر میں نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ایک دھان پان سی، دُبلی پتلی لڑکی اتنی ہمّت کر کے اپنے ذاتی مقصد کے لیے اتنا بڑا کنکشن میرے آپ کے اور سندھ کے درمیان پیدا کر سکتی ہے، تو ہم جو زیادہ پڑھے لکھے، دانشمند اور دانشور لوگ ہیں یہ دل اور روح کے اندر مزید گہرائی پیدا کرنے کے لیے کچھ کیوں نہیں کرسکتے؟

کوئی ایسی صبح طلوع ہو یا کوئی ایسی شام آئے، جب ہم دیوار سے ڈھو لگا کر ایک Meditation میں داخل ہوتے ہیں، تو کیا اس مراقبے میں یہ ساری چیزیں نہیں آتیں، یا یہ کہ ہم اس مراقبے کے اندر کبھی داخل ہی نہیں ہو سکے؟ ایک چھوٹی سی لڑکی اس طرح ایک تہیہ کے اندر اور ایک ارادے کے اندر داخل ہو گئی تھی اور ہم جو بڑے ہیں ان سے یہ کام نہیں ہو تا۔ اس کے باوجود میں بہت پُر امید ہوں کہ یقیناً ایسا وقت آ جائے گا جس کا کوئی جواز ہمارے پاس نہیں ہو گا، جس کی کوئی منطق نہیں ہو گی۔ لیکن وہ وقت ضرور آئے گا، کیوں آئے گا، کس

لیے آئے گا، کس وجہ سے اور کیسے آئے گا؟ اس کا بھی کوئی جواب میرے پاس نہیں ہے۔ لیکن اتنی بڑی معاشرتی زندگی میں جان بوجھ کر یا بیوقوفی سے ہم جو نام لے چکے ہیں، انہیں کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی مقام پر پہنچ کر سفل ہونا ضروری ہے۔ یہ میرا ایک ذاتی خیال ہے، جس کے ساتھ میں وابستہ رہتا ہوں۔

مایوسی کی بڑی گھٹائیں ہیں، بڑی بے چینیاں ہیں، بڑی پریشانیاں ہیں۔ اکنامکس کا آپ کے یوٹیلٹی بِلز کا ہی مسئلہ اتنا ہو گیا ہے کہ انسان اس سے باہر ہی نہیں نکلتا۔ آدمی روتا رہتا ہے، لیکن ہمارے اس لاہور میں، ہمارے اس مُلک میں اور ہمارے اس مُلک سے ماورا دوسری اسلامی دنیا میں کچھ نہ کچھ تو لوگ ایسے ضرور ہوں گے جو اکنامکس کی تنگی کے باوصف یہ کہتے ہوں گے جو میں نہیں کہہ سکتا۔ میں کسی نہ کسی طرح سے خوش ہو سکتا ہوں، کیونکہ خوشی کا مال و دولت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے بابے کہا کرتے ہیں کہ اگر مال و دولت کے ساتھ جائیداد کے ساتھ خوشی کا تعلق ہوتا تو آپ اتنی ساری چیزیں چھوڑ کر کبھی سوتے ناں! ان ساری چیزوں کو آپ اپنی نگاہوں کے سامنے چھوڑ کر سو جاتے ہیں اور سونا اتنی بڑی نعمت ہے جو آپ کو راحت عطا کرتی ہے اور اگر آپ کو کوئی جگائے تو آپ کہتے ہیں کہ مجھے تنگ نہ کرو۔ اگر اس سے کہیں کہ تیری وہ کار، جائیداد اور بینک بیلنس پڑا ہے تو اس سونے والے کو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ اس

سے طے یہ پایا کہ یہ دولت یہ مال و متاع یہ سب کچھ آپ کو خوشی عطا نہیں کرتے، خوشی آپ کے اندر کی لہر ہے۔

مچھلی جس کو پکڑ لے وہ اس لہر پر ڈولفن کی طرح سوار ہو کر دُور جا سکتی ہے۔ اگر وہ لہر نہ پکڑی جائے تو پھر ہماری بد قسمتی ہے۔ پھر ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اس لہر کو دیکھنا، جانچنا اور پکڑنا اور اس پر سوار ہونا شہ سواروں کا کام ہے، عام لوگوں کا نہیں۔ بڑی تکلیفیں اور دقتیں ہیں، لیکن ان کے درمیان رہتے ہوئے بھی کئی آدمی گاتے ہوئے گزر جاتے ہیں اور ہم اپنے کانوں سے ان کا گانا سُنتے ہیں اور ہم ان کی تحقیق نہیں کر سکتے کہ ان کے اندر کون سی چُپ لگی ہوئی ہے، کس قسم کی پروگرامنگ ہوئی ہوتی ہے کہ یہ گاتے چلے جا رہے ہیں۔ اللہ آپ کو خوش رکھے اور بہت سی آسانیاں عطا فرمائے اور خداوند تعالیٰ آپ کو آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ!

ملٹی نیشنل خواہشیں

پچھلی گرمیوں کا آخری مہینہ میں نے اپنے بھانجے جاوید کے گھر گزارا۔ اُس کے گھر میں ایک بڑا اچھا سوئمنگ پول ہے، اُس کا ایک چھوٹا بیٹا ہے، اُس کے بیٹے کا ایک چھوٹا کُتّا جیکی" ہے۔ میں کُتّوں بارے میں چونکہ زیادہ نہیں جانتا، اس لیے اتنا سمجھ سکا ہوں کہ وہ چھوٹے قد کا نہایت محبّت کرنے والا اور تیزی سے دُم ہلانے والا کُتّا ہے۔ جیکی کی یہ کیفیت ہے کہ وہ سارا دن کھڑکی کی سل پر اپنے دونوں پنجے رکھ کر کھڑکی سے باہر دیکھتا رہتا ہے اور جب آوارہ لڑکے اسے پتھر مار کر گزرتے ہیں تو وہ بھونکتا ہے۔ جب آئس کریم کی گاڑی آتی ہے تو اُس کا باجا سُنتے ہی وہ اپنی کٹی ہوئی دُم بھی گنڈیری" کی طرح ہلاتا ہے اور ساتھ بھونکنے کے انداز میں "چوس چوس" بھی کرتا ہے (شاید اُسکی آرزو ہو کہ مجھے اس سے کچھ ملے گا)۔ پھر جب غبارے بیچنے والا آتا ہے تو وہ اُس کے لیے بھی ویسا ہی پریشان ہوتا ہے اور وہ منظر نامہ اُس کی نگاہوں کے سامنے سے گزرتا رہتا ہے۔ پھر جس وقت سکول سے اس کا محبوب مالک توفیق آتا ہے تو پھر وہ سل چھوڑ کر بھاگتا ہے اور جا کر اُس کی ٹانگوں سے چمٹتا ہے۔

شام کے وقت جب وہ سوئمنگ پول میں نہاتے ہیں اور جب اُس کُتّے کا مالک، اُس کا ساتھی توفیق چھلانگ لگاتا ہے تو وہ (جیکی) خود تو اندر نہیں جاتا، لیکن جیسے جیسے وہ تالاب میں تیر تا ہوا آگے جاتا ہے۔ جیکی بھی اُس کے ساتھ آگے بھاگتا ہے اور تالاب کے اِرد گرد پھر کی کی طرح چکر لگاتا ہے، غرّاتا ہے، بھونکتا ہے، پھسلتا ہے اور پانی کے سبب دُور تک پھسلتا جاتا ہے۔ میں اس قیام کے سارے عرصہ میں اسے دیکھتا رہا کہ یہ کیا کرتا ہے۔ پھر میں نے بچّوں کو اکٹھا کر کے ایک دن کہا کہ آؤ اس جیکی کو سمجھائیں کہ تم تو اس طرح بھاگ بھاگ کے ہلکان ہو جاؤ گے، زندگی برباد کر لو گے۔ بچّوں نے کہا اچھا دادا۔ اور اُن سب نے جیکی کو بُلا کر بٹھایا اور اُس سے کہا کہ جیکی میاں دادا کی بات سُنو۔ میں نے جیکی سے کہا، دیکھو وہ (توفیق) تو تیر تا ہے، وہ تو انجوائے کرتا ہے، تم خواہ مخواہ بھاگتے ہو، پھسلتے ہو اور اپنا مُنہ تڑواتے ہو، تم اس عادت کو چھوڑ دو لیکن وہ یہ بات سمجھا نہیں۔ اگلے روز پھر اُس نے ایسے ہی کیا، جب اُس کو میں سمجھا چکا اور رات آئی اور میں لیٹا لیکن ساری رات کروٹیں بدلنے کے بعد بھی مجھے نیند نہ آئی تو میں نے اپنا سر دیوار کے ساتھ لگا کر یہ سوچنا شروع کیا کہ میرے بیٹے نے جو سی ایس ایس کا امتحان دیا ہے کیا وہ اس میں سے پاس ہو جائے گا؟ پوتا جو امریکہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے گیا ہے کیا اُس کو ورلڈ بینک میں کوئی نوکری مل جائے گی؟ ہمارے اوپر جو مقدّمہ ہے، کیا اُس کا فیصلہ ہمارے حق میں ہو جائے گا اور وہ انعامی بانڈ جو ہم نے خریدا ہے، وہ نکل آئے گا کہ نہیں؟

میری اتنی ساری بے چینی اور یہ سب کچھ جو مل ملا کے میری Desires ، میری آرزوئیں، میری تمنّائیں اور خواہش گڈ مڈ ہو گئیں تو میں نے کہا کہ میں بھی کسی صورت میں جیکی سے کم نہیں ہوں، جس طرح وہ بے چین ہے، جیسے وہ تڑپتا ہے، جیسے وہ نا سمجھی کے عالم میں چکر لگاتا ہے، تو حالات کے تالاب کے اِرد گرد میں بھی چکر لگاتا ہوں تو کیا میں اس کو کسی طرح روک سکتا ہوں، کیا میں ایسے سیدھا چل سکتا ہوں جیسے سیدھا چلنے کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔ میں جیسے پہلے بھی ذکر کیا کرتا ہوں، میں نے اپنے باباجی سے پوچھا کہ جی یہ کیوں بے چینی ہے، کیوں اتنی پریشانی ہے، کیوں ہم سکونِ قلب کے ساتھ اور اطمینان کے ساتھ بیٹھ نہیں سکتے ہیں تو اُنہوں نے کہا کہ دیکھو تم اپنی پریشانی کی پوٹلیاں اپنے سامنے نہ رکھا کرو، اُنہیں خُدا کے پاس لے جایا کرو، وہ ان کو حل کر دے گا۔ تم انہیں زور لگا کر خود حل کرنے کی کوشش کرتے ہو، لیکن تم انہیں حل نہیں کر سکو گے۔

میں جب چھوٹا تھا تو ہمارے گاؤں میں میری ماں کے پاس ایک بوڑھی عورت آیا کرتی تھی، ہم اسے تائی سوندھاں کہتے تھے۔ اُس کے پاس چھوٹی چھوٹی پوٹلیاں ہوتی تھیں۔ وہ میری ماں کے پاس بیٹھ جاتی اور ایک ایک پوٹلی کھول کے دکھاتی کہ بی بی یہ ہے۔ کسی پوٹلی میں سُوکھے بیر ہوتے، کسی میں سُوکھی لکڑیاں، جیسے ملٹھی ہوتی ہے وہ ہوتیں۔ وہ کہتی کہ اگر ان لکڑیوں کو جلاؤ تو مچھر نہیں رہتا، کسی پوٹلی میں چھوٹے چھوٹے پتھر پوتے تھے، کسی میں بڑ کے درخت سے گری ہوئی "گولیں" ہوتیں تھیں۔ اُس کے پاس ایسی ہی سُوکھی چیزوں کی بے شمار پوٹلیاں ہوتی تھیں، اُن میں کوئی بھی کام کی چیز نہیں ہوتی تھی، میرا یہ

اندازہ ہے اور میری ماں کا بھی یہ اندازہ تھا۔ میری ماں کہتی کہ نہیں سوندھاں مت کھول ان کو ٹھیک ہے اور میری ماں اُسے کچھ آٹھ آنے، چار آنے دے دیتی تھی۔ اُس زمانے میں آٹھ چار آنے بہت ہوتے تھے اور وہ دعائیں دیتی ہوئی چلی جاتی تھی۔ اُس کی کسی کے حضور پوٹلیاں کھُل کر یا نہ کھُل کر بھی اُس کو بہت فائدہ عطا کرتی تھیں۔ اور میرا بابا مجھ سے یہ کہتا تھا کہ تُو اپنی پوٹلیاں اللہ کے پاس لے جا، ساری مشکلات کسی وقت بیٹھ کر دیوار سے ڈھو لگا کر کہو کہ اے اللہ یہ بڑی مشکلات ہیں یہ مجھ سے حل نہیں ہوتیں۔ یہ میں تیرے حضور لے آیا ہوں۔

میں چونکہ بہت ہی پڑھا لکھا آدمی تھا اور ولایت سے آیا تھا، میں کہتا، کہاں ہوتا ہے خُدا؟

اُس نے کہا، خُدا ہوتا نہیں ہے، نہ ہو سکتا ہے، نہ جانا جاتا ہے، نہ جانا جا سکتا ہے اور خُدا کے بارے میں تمہارا ہر خیال وہ حقیقت نہیں بن سکتا لیکن پھر بھی اُس کو جانا جانا چاہیے۔ میں کہتا تھا کیوں جانا جانا چاہیے اور آپ اس کا کیوں بار بار ذکر کرتے ہیں، آپ ہر بار اس کا ذکر کرتے ہیں اور ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ نہ جانا جاتا ہے اور نہ جانا جا سکتا ہے، کہنے لگے کہ پرندہ کیوں گاتا ہے اور کیوں چہچہاتا ہے، اس لیے نہیں کہ پرندے کے پاس کوئی خبر ہوتی ہے، کوئی اعلان ہوتا ہے، یا پرندے نے کوئی ضمیمہ چھاپا ہوا ہوتا ہے کہ آگئی آج کی تازہ خبر" پرندہ کبھی ضمیمے کی آواز نہیں لگاتا، پرندہ اس لیے گاتا ہے کہ اُس کے پاس ایک گیت ہوتا ہے اور ہم خُدا کا ذکر اس لیے کرتے ہیں کہ پرندے کی طرح ہمارے پاس بھی اُس کے نام کا گیت ہے۔ جب تک آپ اس میں اتنے گہرے، اتنے Deep اور اتنے عمیق

نہیں جائیں گے اُس وقت تک تمہارا یہ مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ لیکن میں اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود اور بہت زور لگانے کے باوصف جیکی" کی طرح بے چین ہی رہا اور اپنے حالات کے تالاب کے اِرد گرد ویسے ہی بھاگتا رہا، چکر کاٹتا رہا جیسے کہ جیکی میرے پوتے کے اِرد گرد بھاگتا ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک چھوٹی مچھلی نے بڑی مچھلی سے پوچھا کہ "آپا یہ سمندر کہاں ہوتا ہے؟" اُس نے کہا جہاں تم کھڑی ہوئی ہو یہ سمندر رہے۔ اُس نے کہا، آپ نے بھی وہی جاہلوں والی بات کی یہ تو پانی ہے، میں تو سمندر کی تلاش میں ہوں اور میں سمجھتی تھی کہ آپ بڑی عمر کی ہیں، آپ نے بڑا وقت گزارا ہے، آپ مجھے سمندر کا بتائیں گی۔ وہ اُس کو آوازیں دیتی رہی کہ چھوٹی مچھلی ٹھہرو ٹھہرو میری بات سُن کے جاؤ اور سمجھو کہ میں کیا کہنا چاہتی ہوں لیکن اُس نے پلٹ کر نہیں دیکھا اور چلی گئی۔ بڑی مچھلی نے کہا کہ کوشش کرنے کی، جدوجہد کرنے کی، بھاگنے دوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، دیکھنے کی اور Straight آنکھوں کے ساتھ دیکھنے کی ضرورت ہے۔ مسئلے کے اندر اُترنے کی ضرورت ہے۔ جب تک تم مسئلے کے اندر اُتر کر نہیں دیکھو گے، تم اسی طرح بے چین و بے قرار رہو گے اور تمہیں سمندر نہیں ملے گا۔

میرے بابا نے کہا یہ بڑی غور طلب بات ہے۔ جو شخص بھی گول چکروں میں گھومتا ہے اور اپنے ایک ہی خیال کے اندر رِس گھولتا ہے اور جو گول گول چکر لگاتا رہتا ہے، وہ کُفر کرتا ہے، شرک کرتا ہے کیونکہ وہ اھدنا الصراط المستقیم (دکھا ہم کو سیدھا راستہ) پر عمل نہیں

کرتا۔ یہ سیدھا راستہ آپ کو ہر طرح کے مسئلے سے نکالتا ہے لیکن میں کہتا ہوں سر اس دُبدھا (مسئلے) سے نکلنے کی آرزو بھی ہے اور اس بے چینی اور پیچیدگی سے نکلنے کو جی بھی نہیں چاہتا، ہم کیا کریں۔ ہم کچھ اس طرح سے اس کے اندر گھرے ہوئے ہوتے ہیں، ہم یہ آرزو کرتے ہیں اور ہماری تمنّا یہ ہے کہ ہم سب حالات کو سمجھتے جانتے، پہچانتے ہوئے کسی نہ کسی طرح سے کوئی ایسا راستہ کوئی ایسا دروازہ ڈھونڈ نکالیں، جس سے ٹھنڈی ہوا آتی ہو۔ یا ہم باہر نکلیں یا ہوا کو اندر آنے دیں، لیکن یہ ہمارے مقدّر میں آتا نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہمارے اور Desire کے درمیان ایک عجیب طرح کا رشتہ ہے جیسے بابا بدھا یہ کہتا ہے کہ جب تک خواہش اندر سے نہیں نکلے گی (چاہے اچھی کیوں نہ ہو) اُس وقت تک دل بے چین رہے گا۔ جب انسان اس خواہش کو ڈھیلا چھوڑ دے گا اور کہے گا کہ جو بھی راستہ ہے، جو بھی طے کیا گیا ہے میں اُس کی طرف چلتا چلا جاؤں گا، چاہے ایسی خواہش ہی کیوں نہ ہو کہ میں ایک اچھا رائٹر یا پینٹر بن جاؤں یا میں ایک اچھا اچھا بن جاؤں۔ جب انسان خواہش کی شدّت کو ڈھیلا چھوڑ کر بغیر کوئی اعلان کیے بغیر خط کشیدہ کیے یا لائن کھینچے چلتا جائے تو پھر آسانی ملے گی۔

ایک گاؤں کا بندہ تھا، اسے نمبر دار کہہ لیں یا ذیلدار اس کو خواب آیا کہ کل ایک شخص گاؤں کے باہر آئے گا، وہ جنگل میں ہو گا اور اُس کے پاس دنیا کا سب سے قیمتی ہیرا ہو گا اور اگر کسی میں ہمّت ہے اور اُس سے وہ ہیرا لے سکے تو حاصل کر لے۔ چنانچہ وہ شخص جنگل میں گیا اور حیرانی کی بات یہ ہے کہ ایک درخت کے نیچے واقعی ایک بُدھو سا آدمی بیٹھا ہوتا

ہے، اُس نے جا کر اُس شخص سے کہا کہ تیرے پاس ہیرا ہے، اُس نے جواب دیا، نہیں میرے پاس تو کوئی ہیرا نہیں۔ اُس نے کہا کہ مجھے خواب آیا ہے کہ تیرے پاس ایک ہیرا ہے۔ اُس نے پھر نفی میں جواب دیا کہ نہیں اور کہا کہ میرے پاس میرا ایک تھیلا ہے "گتھلہ" اس کے اندر میری ٹوپی، چادر، بانسری اور کچھ کھانے کے لیے سُوکھی روٹیاں ہیں، گاؤں کے شخص نے کہا، نہیں تم نے ضرور ہیرا چھپایا ہوا ہے، اس پر اُس پردیسی نے کہا کہ نہیں میں کوئی چیز چھپاتا نہیں ہوں اور ہیرے کی تلاش میں آنے والے کی بے چینی کو دیکھا (جیسا مجھ میں اور جیکی میں بے چینی ہے) اور تھیلے میں ہاتھ ڈال کر کہا کہ جب میں کل اس طرف آ رہا تھا تو راستے میں مجھے یہ پتھر کا ایک خوبصورت، چمکدار ٹکڑا ملا ہے۔ یہ میں نے تھیلے میں رکھ لیا تھا۔ اُس شخص نے بے قراری سے کہا، بیوقوف آدمی یہی تو ہیرا ہے تو اُس نے کہا، اس کا میں نے کیا کرنا ہے تُو لے جا۔ وہ اُس پتھر کو لے گیا۔ وہ گاؤں کا شخص ہیرا پا کر ساری رات سو نہ سکا، کبھی اسے دیکھتا، کبھی دیوار سے ڈھو لگا کر پھر آنکھیں بند کر لیتا اور پھر اسے نکال کر دیکھنے لگتا۔ ساری رات اسی بے چینی میں گُزر گئی۔

صبح ہوئی تو لوٹ کر اُس شخص کے پاس گیا، وہ ویسے ہی آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اُس نے دیکھ کر کہا، اب میرے پاس کیا مانگنے آیا ہے۔ اُس نے کہا، میں تیرے پاس وہ اطمینان مانگنے آیا ہوں جو اتنا بڑا، قیمتی ہیرا دے کر تجھے نصیب ہے اور تُو آرام سے بیٹھا ہوا ہے، تیرے اندر بے چینی کیوں پیدا نہیں ہوئی۔ اُس نے جواب دیا کہ مجھے تو معلوم ہی نہیں کہ بے چینی کس طرح پیدا ہوتی ہے اور کیسے کی جاتی ہے! اُس گاؤں کے شخص نے کہا تو آ جا

اور ہمارے گاؤں میں رہ کے دیکھ۔ میں تجھے اس بات کی ٹریننگ دوں گا اور بتاؤں گا کہ بے چینی کس چیز کا نام ہے۔ لیکن وہ انکار کر گیا اور کہا کہ میر اراستہ کچھ اور طرح کا ہے۔ تُو یہ ہیرا رکھ اپنے پاس۔ اُس نے پھر کہا کہ گو میں نے تم سے یہ ہیرا لے لیا ہے، لیکن میری بے چینی کم ہونے کی بجائے بڑھ گئی ہے۔ میں اس پریشانی میں مُبتلا ہو گیا ہوں کہ ایسا کس طرح اور کیسے ہو سکتا ہے جیسے تُو نے کر دیا ہے۔ اب میں وہاں سے آ تو گیا ہوں اور میں اپنے گھر میں ہوں لیکن میرے اندر کا جیکی وہ اس طرح سے آدھا پانی میں بھیگا ہوا۔ لعاب گراتا ہوا، اس بے چینی کے ساتھ گھوم رہا ہے اور اُس کو وہ سکون نصیب نہیں ہوا، جو ہونا چاہیے تھا اور میں اپنی تمام تر کوشش کے باوصف اس خواہش سے اس آرزو سے اس تمنّا سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکا، باہر نہیں نکل سکا جو اس عمر میں جو کہ ایک بڑی عمر ہے، نکل جانا چاہیے تھا۔ میں سڑک پر باہر نکل کر دیکھتا ہوں تو پریشانی کے عالم میں بہت سارے جیکی میرے شہر کی سڑکوں پر بے چینی کے عالم میں بھاگ رہے ہوتے ہیں۔ وہ بھی میرے جیسے ہی ہیں۔ ان کے اندر بھی یہ بیماری چلی جارہی ہے اور بڑھتی چلی جارہی ہے۔ میں لوٹ کر آ گیا ہوں اور اس وقت اپنے وجود کی کھڑکی میں آرزو کے پنجے رکھ کر باہر دیکھ رہا ہوں اور ہر آنے جانے والی چیز کو دیکھ رہا ہوں اور حاصل کرنے والی چیز کے لیے بڑی شدّت کے ساتھ دُم ہلا رہا ہوں۔ میری کوئی مدد نہیں کرتا، کوئی آگے نہیں بڑھتا حالانکہ میری خواہش یہ ہے کہ ایسے لوگ مجھے بھی ملیں جن کے تھیلے میں وہ من موہنا ہیرا ہو جو لوگوں کو دیکھ چکنے کے بعد کچھ عطا کر دیتا ہے۔ اب جبکہ میں بڑا بے چین ہوں اور اس عمر میں یہ

بے چینی زیادہ بڑھ گئی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس میں ایک بڑا حصّہ ملٹی نیشنل کا بھی ہے۔ پہلے یہ چیزیں نہیں تھیں۔

ایک صبح جب میں جاگا اور میں باہر نکلا تو میرے شہر کے در و دیوار بدل گئے۔ اُن کے اوپر اتنے بڑے بڑے ہورڈنگ، سائن بورڈز اور تصویریں لگ گئی ہیں جو میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھیں جو پُکار پُکار کر مجھے کہہ رہی تھیں کہ مجھے خریدو، مجھے لو، مجھے استعمال کرو، میں ان کو نہیں جانتا تھا۔ آپ یقین کریں کہ آج سے ستر برس پہلے بھی میں زندہ تھا۔ میں خُدا کی قسم کھا کہ کہہ سکتا ہوں کہ میں آج سے پہلے زندہ تھا اور بڑی کامیابی کے ساتھ زندہ تھا اور صحت مندی کے ساتھ زندہ تھا اور اب اس بڑھاپے میں میری انکم کا ستر فیصد حصّہ ان آئیٹمز پر خرچ ہو رہا ہے جو آج سے 70 برس پہلے ہوتی ہی نہیں تھیں۔1960ء میں یہ آئیٹمز ہوتی ہی نہیں تھیں۔ یہ ایک بڑی ٹریجڈی ہے۔ آپ یقین کریں کہ 1960ء میں فوٹو اسٹیٹ مشین کا کوئی تصوّر نہیں تھا کہ یہ کیا ہوتی ہے۔ اب مجھے اتنا فوٹو اسٹیٹ کروانا پڑتا ہے کہ میں پیسے بچا بچا کر رکھتا ہوں۔ میرا پوتا کہتا ہے کہ دادا اس کی میں فوٹو اسٹیٹ کروالاتا ہوں۔ فلاں چیز کی بھی ہو جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔ جب میں کسی دفتر میں جاتا ہوں اور میں وہاں جا کر عرضی دیتا ہوں کہ جناب مجھے اپنی Date of Birth چاہیے تو سب سے پہلے وہ کہتے ہیں کہ جی اس کی دو فوٹو اسٹیٹ کروالائیں۔ بھئی کیوں کروالاؤں؟ کہتے ہیں اس کا مجھے نہیں پتہ، بس فوٹو اسٹیٹ ہونا چاہیے۔ آپ یقین کریں کہ جب میں بی اے میں پڑھتا تھا، بہت دیر کی بات ہے تو وہاں ہمارا ایک سِکھ دوست ہرونت سنگھ تھا، اُس نے مجھے

کہا ہتھیلی آگے بڑھا، میں نے ہتھیلی آگے بڑھائی۔ اُس نے ایک گندی لیس دار چیز میری ہتھیلی پر لگا دی۔ میں نے کہا "ظالما! یہ تو نے کیا کیا، سکھا"۔ اُس نے کہا، اس پر پانی گرا اور سر پر مَل اور پھر دیکھ۔ میں نے اس پر پانی گرا کر سر پر ملا تو پھچا پھچ جھاگ ہو گئی، کہنے لگا اس کو شیمپو کہتے ہیں۔ ہم تو اُس وقت لال صابن سے نہاتے تھے۔ اُس نے کہا یہ میرے چاچے نے لندن سے بھیجی ہے۔

ہمارے مُلک میں شام کے وقت جب میں اپنے ٹی وی پر Advertisement دیکھتا ہوں تو مجھے یہ پتہ چلتا ہے کہ میرے مُلک کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کون سا شیمپو استعمال کیا جائے۔ ایک لڑکی کہتی ہے، خبر دار جوئیں پڑ جائیں گی، وہ شیمپو نہیں لگانا۔ دوسری کہتی ہے، نہیں میں تو "ٹِکا فوری" لگاتی ہوں۔ وہ کہتی ہے، مت لگا، ٹِکا فوری خراب ہوتا ہے۔ چوچا چوچی کا اچھا ہے۔ میرے سارے بچّے کہتے ہیں، ہمیں فلاں شیمپو چاہیے۔ میرا ایک پوتا مجھ سے کہتا ہے کہ دادا تم خُدا کے فضل سے بڑے صحت مند آدمی ہو، اللہ کے واسطے یہ پانی مت پیو جو تم 78 برس سے پیتے آ رہے ہو۔ تم منرل واٹر پیو، یہ بالکل Pure Water ہوتا ہے۔ اُس کے کہنے کا مطلب شاید یہ ہوتا ہے کہ اس کے پینے والا زندہ رہتا ہے۔ دوسرے سب فوت ہوئے پڑے ہیں!! اس سب کے ساتھ ساتھ مجھے رونا بھی آ رہا ہے کہ میں اپنے یوٹیلٹی بِلز پر دباؤ ڈالتا ہوں اور ان پر کُڑھتا ہوں۔ میرا اس میں کوئی قصور نہیں۔ یوٹیلٹی بل بھیجنے والوں کا بھی کوئی قصور نہیں۔ قصور میری خواہشات کا ہے، میری Desires کا دائرہ اتنی دُور تک پھیل گیا ہے اور وہ میرے اختیار میں بالکل نہیں رہا۔ میں

کتنی بھی کوشش کیوں نہ کرلوں، میں اس دائرے کے اندر نہیں آسکتا۔ بار بار مجھے یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ بھی تمہارے استعمال کی چیز ہے۔ وہ بھی تمہارے استعمال کی چیز ہے اور جب تک تم اسے استعمال میں نہیں لاؤ گے، اُس وقت تک کچھ نہیں ہو سکتا۔

1948ء میں ہم نے ایک فریج خریدا، کیونکہ میری بیوی کہتی تھی کہ فریج ضرور لینا یہ دُنیا کی سب سے قیمتی اور اعلیٰ درجے کی چیز ہے۔ ہمارے خاندان میں کسی کے پاس فریج نہیں تھا۔ وہ ہمارے گھر سالم تانگے کرواکر فریج دیکھنے آتے تھے کہ سبحان اللہ کیا کمال کی چیز ہے۔ میری بیوی انہیں دکھاتی تھی کہ دیکھو ڈھکنا کھلا ہے اور اس میں ساری چیزیں پڑی ہیں اور ان پر روشنی پڑ رہی ہے۔ ساری چیخیں مارتی تھیں کہ آپا جی بتّی جلتی رہے گی۔ تو وہ کہتی ہے "جب دروازہ بند ہو گا تو بتّی خود بخود بجھ جائے گی۔ اس میں یہ کمال ہے۔" تو وہ ساری بیچاریاں دست بستہ ہو کر ڈر کے پیچھے ہو کر کھڑی ہو جاتیں۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ یہ فریج تو آگیا ہے اس کے ساتھ کی ساری نیگیٹو چیزیں بھی آئیں گی۔ اُس نے کہا، نہیں یہ بڑی مُفید چیز ہے۔

اگلے روز عید تھی۔ جب میں نمازِ عید پڑھ کے صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم کے گھر کے آگے سے گُزرا تو گھروں میں صفائی کرنے والی دو بیبیاں جا رہی تھیں، میں اُن کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ ایک نے دوسری سے پوچھا کہ اس بی بی نے تجھے کتنا گوشت دیا ہے۔ تو اُس نے کہا، دفع دُور! اُس نے ٹھنڈی الماری خرید لی ہے، سارا بکرا کاٹ کے اندر رکھ دیا ہے، کچھ بھی نہیں دیا۔ اب آپ لوگ میرا بندوبست کرو کہ میں اپنے آپ کو کیسے بچاؤں۔ میں جتنی دیر

بھی اور زندہ رہنا چاہتا ہوں، خوش دلی اور خوش بختی کے ساتھ زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ مجھ پر ایسا دباؤ نہ ڈالو، میں محسوس کرتا ہوں کہ جیکی میرے مُقابلے میں اب زیادہ پُر سکون ہو گیا ہے، یہ بات شاید اب سمجھ میں آ گئی ہو جبکہ میں اِرد گرد بھاگا پھرتا ہوں اور بے چین ہوں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ ۔

وقت ایک تحفہ

میں وقت کے بارے میں بہت گنجلک رہتا ہوں۔ میں کیا اور میری حیثیت کیا۔ میں کس باغ کی مولی ہوں۔ وقت کے بارے میں بڑے بڑے سائنسدان، بڑے فلسفی، بڑے نکتہ دان، وہ سارے ہی اس کی پیچیدگی کا شکار ہیں کہ وقت اصل میں ہے کیا؟ اور یہ ہماری زندگیوں پر کس طرح سے اثر انداز ہوتا ہے؟ حضرت علامہ اقبال رحؒ اور ان کے بہت ہی محبوب فرانسیسی فلسفی برگساں بھی وقت کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ مولانا روم اپنی چھوٹی چھوٹی کہانیوں میں وقت کا ہی ذکر کرتے ہیں۔ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ آئن سٹائن نے بھی اپنی Theory of Reality میں سارا زور وقت پر دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ "شئے" کوئی چیز نہیں ہے "وقت" شئے کی ماہئیت کو تبدیل کرتا ہے۔ اس نے ہم لوگوں کی آسانی کے لئے ایک مثال دی ہے کہ اگر آپ ایک بہت گرم توے پر غلطی سے بیٹھ جاتے ہیں اور وہ بھی ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے تک اور آپ

پریشانی کی حالت میں یا تکلیف میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، تو آپ کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ پوری صدی آپ کے ساتھ چمٹ گئی ہے۔

اگر آپ اپنے محبوب کے انتظار میں بیٹھے ہیں اور اس نے کہا ہے کہ میں دس بج کر پندرہ منٹ تک پہنچ جاؤں گا، یا پہنچ جاؤں گی، فلاں جگہ تو اس میں اگر ایک منٹ کی بھی دیر ہو جاتی ہے، تو آپ کو یوں لگتا ہے کہ ڈیڑھ ہزار برس گزر گیا ہے اور وہ ایک منٹ آپ کی زندگی سے جاتا ہی نہیں۔ یہ سارا وقت کا ہی شاخسانہ ہے کہ آنے جانے، ملنے ملانے اور گرم ٹھنڈے کا کوئی معاملہ نہیں ہے۔ ساری بات وقت کی ہے، پھر جو آئن سٹائن سے اختلاف رکھتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ Subatomic Particle Level پر جب ہم اس کو دیکھتے ہیں تو کبھی وہ ہم کو Wave نظر آتا ہے، تو کبھی وہ ہمیں Particle دکھائی دیتا ہے اور اگر اس میں سے وقت کو نکال دیا جائے، تو پھر شاید اصل بات پتا چل سکے کہ Subatomic Particle Level اوپر یہ کیا چیز ہے۔ بہر کیف یہ ایسی پیچیدگیاں ہیں، جن کے بارے میں بات ہوتی رہتی ہے۔ میرے جو سمجھدار نوجوان اس نسل کے ہیں، یہ بھی وقت کے بارے میں بہت لمبی اور سوچ بچار کی کریں گے۔

وقت کا ایک پیچیدہ ساخاکہ ہر انسان کے ساتھ گھومتا رہتا ہے۔ چاہے وہ اس پر غور کرے یا نہ کرے۔ میں جب اپنی ملازمت سے ریٹائر ہو رہا تھا، تو ریٹائرمنٹ کا بڑا خوف ہوتا ہے کہ اب کیا ہو گا؟ یعنی آدمی نے ایک نوکری کی ہوتی ہے اور اس میں پھنسا چلتا رہتا ہے، لیکن آخر میں کچھ لوگ تو Re ـemployment کی تیار کر لیتے ہیں۔ ایک پھانسی سے نکلوں گا، دوسری پھانسی انشاءاللہ تیار ہو گی۔ اس میں اپنا سر دے دوں گا اور پھر آخرت کا سفر کر جاؤں گا۔

جب میں ریٹائر ہونے کے قریب تھا، تو مجھ پر بھی یہ خوف سوار ہوا۔ میں نے قدرت اللہ شہاب سے، جو بڑے ہی نیک اور عبادت گزار تھے، ان سے پوچھا کہ "سر! میں ریٹائر ہونے والا ہوں، تو میں کیا کروں؟" انہوں نے کہا کہ ریٹائر ہونے کا جو خوف ہوتا ہے، اس کا سب سے بڑا دباؤ آپ پر یہ پڑتا ہے کہ پھر لوگ آپ پر توجہ نہیں دیتے یعنی اپنا وقت آپ کو نہیں دیتے۔ آپ ان کے وقت کی آغوش سے نکل جاتے ہیں، پھر آپ کلب کی ممبر شپ اختیار کرتے ہیں۔ گالف کھیلنے لگتے ہیں، زور لگاتے ہیں کہ نئے دوست بنیں۔ اس کا آسان نسخہ یہ ہے کہ ہم متوسط درجے کے لوگوں کا کہ آپ مسجد میں جا کر نماز پڑھنے لگ جائیں۔

میں نے کہا کہ اس کا کیا تعلق ؟یعنی ریٹائرمنٹ کا اور مسجد کا آپس میں کیا تعلق ؟ میں نے کہا کہ خیر نماز پڑھ لوں گا۔ کہنے لگے، نہیں مسجد میں جا کر، جب میں ریٹائر ہوا تو میں نے سوچا کہ انہوں نے کہا ہے اور یہ بات مانی جانی چاہئے کہ مسجد میں جا کر نماز پڑھوں۔ اب میں مسجد میں جا کر نماز پڑھنے لگا، لیکن عصر اور مغرب کی۔ اس طرح کوئی دو مہینے گزر گئے۔ مجھے تو اس میں کوئی عجیب بات نظر نہیں آئی۔ لیکن چونکہ انہوں نے کہا تھا اس لئے میں ان کی بات مانتا تھا۔ ایک دن میری بیوی یہ بیان کرتی ہے کہ کچھ عجیب و غریب جسم کے چار پانچ آدمی، جن کی شکلیں میں نے پہلے نہیں دیکھی تھیں، ہاتھ میں چھڑیاں لے کر اور دوسرے ہاتھ میں تسبیحات لٹکا کر میرے گھر کے دروازے پر آئے اور انہوں نے گھنٹی بجائی اور جب میں باہر نکلی تو کہنے لگے: "اشفاق صاحب خیریت سے ہیں!" میں (بانو قدسیہ) نے کہا، ہاں ٹھیک ہیں۔ وہ کہنے لگے، ان سے ملاقات نہیں ہو سکتی کیا؟ میں نے کہا کہ وہ پچھلے چھ دن سے اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔ کہنے لگے "الحمد للہ، الحمد للہ! ہمارے تسلی ہو گئی، اچھا بہن السّلام علیکم!" میری بیوی پوچھنے لگی وہ کون لوگ تھے ؟ میں نے کہا کہ، وہ میرے دوست تھے، جو مسجد جانے کی وجہ سے میرے حلقہ احباب میں شامل ہوئے ہیں۔ میرے پاس تو اتنے پیسے نہیں تھے کہ میں کلب میں ممبر ہو کر نئی دوستیاں استوار کر سکوں۔

وہ مجھے وقت عطا کرتے ہیں اور اس وقت کی تلاش میں کہ میں اس میں شامل نہیں ہوں، پوچھنے آئے تھے کہ میں کہاں ہوں؟ انسان دوسرے انسان کو جو سب سے بڑا تحفہ عطا کر سکتا ہے، وہ وقت ہے۔ اس سے قیمتی تحفہ انسان انسان کو نہیں دے سکتا۔ آپ کسی کو کتنا بھی قیمتی تحفہ دے دیں، اس کا تعلق گھوم پھر کر وقت کے ساتھ چلا جائے گا۔ مثلاً آپ مجھے یا میں آپ کو نہایت خوبصورت قیمتی پانچ ہزار روپے کا "اوڈی کلون" دوں یا آپ مجھے قالین کا ایک خوبصورت ٹکڑا دیں، یا میرے آرٹسٹ بچے مجھے ایک بہت قیمتی پینٹنگ بطور تحفہ دیں، یا سونے کا کنگن ایک خاتون کو دیا جائے یا ہیرے کا ایک طوطا یا کوئی اور قیمتی چیز، تو آپ دیکھیں گے کہ یہ سارے تحفے جو بظاہر اور حقیقت میں قیمتی ہیں، ان کے پیچھے وقت ہی کارفرما ہے۔

پہلے میں نے وقت لیا، پھر میں نے کمائی کی۔ میں نے دس دیہاڑیاں لگائیں، جو مجھے ایک ہزار فی دیہاڑی ملتے تھے، پھر دس ہزار کا میں نے قالین خریدا اور تحفے کے طور پر آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ ٹائم پہلے لینا پڑتا ہے، پھر اس کو بیچنا پڑتا ہے، پھر اس کو تحفے کی شکل میں Convert کرنا پڑتا ہے، پھر وہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ انسان کے پاس تحفہ دینے اور لینے کے لئے سب سے قیمتی چیز بس وقت ہی ہے۔ اکثر یہ ہو جاتا ہے جیسے آج مجھ سے ہو گا اور میں مجبور ہوں

ایسا کرنے پر کہ میں اپنا وقت اس شخص کو دینے کی بجائے جو میری آس میں ہسپتال کے ایک وارڈ میں موجود ہے، میں اسے پھولوں کا ایک گلدستہ بھیجوں گا، لیکن وہ شخص اس گلدستے کی آس میں نہیں ہو گا، بلکہ وہ میرے وجود، میرے لمس اور میرے ٹچ کے لئے بے چین ہو گا کہ میں اس کے پاس آؤں اور اس کے ساتھ کچھ باتیں کروں۔ ڈاکٹر اس کی بہت نگہداشت کر رہے ہیں۔ نرسیں اس پر پوری توجہ دے رہی ہیں اور اس کے گھر کے لوگ بھی ظاہر ہے اس کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کر رہے ہیں، کیونکہ وہ بیمار ہے۔ لیکن ایک خاص کرسی پر اسے میرا انتظار ہے، لیکن میں اس کے پاس اپنے وقت کا تحفہ لے کر نہیں جا سکتا۔

خواتین و حضرات! وقت ایک ایسی انوسٹمنٹ ہے، ایک ایسی سرمایہ کاری ہے جو باہمی اشتراک رکھتی ہے۔ ہمارے بابے کہتے ہیں کہ جب میں آپ کو اپنا وقت دیتا ہوں تو سننے والا اور آپ سے ملاقات کرنے والا اور آپ کے قریب رہنے والا آپ کو اپنا وقت دیتا ہے اور باہمی التفات اور محبت کا یہ رشتہ اس طرح سے چلتا رہتا ہے۔ میرے بھتیجے فاروق کی بیوی کشور جب ساہیوال سے اپنے میکے اسلام آباد گئی، تو کشور نے جاتے ہوئے (اس کا خاوند فاروق انکم ٹیکس آفیسر ہے اور اس نے سی ایس ایس کیا ہوا ہے، کشور بھی بڑی پڑھی لکھی ذہین لڑکی ہے) ایک کاغذ

پر لکھا، یہ تمہارے لئے ایک Instruction Paper ہے کہ دھوبی کو تین سو روپے دے دینا، دودھ والا ہر روز ایک کلو دودھ لاتا ہے، اس کو کم کر کے پونا سیر کر دینا اور بلی کے لئے جو قیمہ ہے، یہ میں نے ڈیپ فریزر میں رکھ کر اس کی "پڑیاں" بنادی ہیں اور ان کے اوپر Dates بھی لکھی ہیں، روز ایک پڑیا نکال کر اس کے صبح کے وقت دینی ہے (اس کی سیامی بلی ہے، وہ قیمہ ہی کھاتی ہے)۔ اس نے اور دو تین Instructions لکھی تھیں کہ مالی جب آئے تو اسے کہنا ہے کہ فلاں پودے کاٹ دے، فلاں کو "وینگا" (ٹیڑھا) کر دے اور فلاں کی جان مار دے، جو جو بھی اس نے لکھنا تھا، ایک کاغذ پر لکھ دیا۔

اس نے اپنے خاوند سے کہا کہ ساری چیزیں ایمانداری کے ساتھ ٹک کرتے رہنا کہ یہ کام ہو گیا ہے۔ جب وہ ایک مہینے کے بعد لوٹ کر آئی اور اس نے وہ کاغذ دیکھا، تو اس کے Dutiful خاوند نے ساری چیزوں کو ٹِک کیا ہوا تھا۔ اس نے آخر میں کاغذ پر یہ بھی لکھا تھا کہ "مجھ سے محبت کرنا نہیں بھولنا" جب اس نے ساری چیزیں ٹِک کی ہوئی دیکھیں اور آخری ٹِک نہیں ہوئی تو اس نے رونا، پیٹنا شروع کر دیا کہ مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے باقی کام تو نہایت ذمہ داری سے کئے ہیں، یہ ٹِک کیوں نہیں کی؟ تب اس (فاروق) نے کہا کہ پیاری بیوی جان یہ تو میں ٹِک کر نہیں سکتا، کیونکہ یہ تو Continuous Process ہے۔ محبت کا عمل تو جاری

رہتا ہے۔ یہ کہیں رُکتا نہیں ہے۔ محبت گوالے کا دودھ نہیں ہے، یا اخبار کا بل نہیں ہے، اس کو میں کیسے ٹِک کر سکتا تھا؟ یہ تو چلتی رہے گی۔ یہ کاغذ ایسا ہی رہے گا۔ تم سو بار مجھے لکھ کر دے جاؤ، ہزار بار میں ہر آئیٹم کو ٹِک کروں گا، لیکن یہ معاملہ تو ایسے ہی چلتا رہے گا۔ تو یہ ایک انوسٹمنٹ ہے، وقت کی۔ پلیز! خدا کے واسطے اس بات کو یاد رکھیئے۔ بظاہر یہ بڑی سیدھی سی اور خشک سے نظر آتی ہے، لیکن آپ کو اپنا وقت دینا ہو گا، چاہے تھوڑا ہی، بے حد تھوڑا ہو اور چاہے زندگی بڑی مصروف ہو گئی ہو۔

واقعی زندگی مصروف ہو گئی ہے، واقعی اس کے تقاضے بڑے ہو گئے ہیں، لیکن جب انسان انسان کے ساتھ رشتے میں داخل ہوتا ہے، تو سب سے بڑا تحفہ اس کا وقت ہی ہوتا ہے۔ وقت کے بارے میں ایک بات اور یاد رکھئے کہ جب آپ اپنا وقت کسی کو دیتے ہیں تو اس وقت ایک عجیب اعلان کرتے ہیں اور بہت اونچی آواز میں اعلان کرتے ہیں، جو پوری کائنات میں سنا جاتا ہے۔ آپ اس وقت یہ کہتے ہیں کہ "اس وقت میں اپنا وقت اس اپنے دوست کو دے رہی ہوں، یا دے رہا ہوں۔ اے پیاری دنیا! اے کائنات!! اس بات کو غور سے سنو کہ اب میں تم ساری کائنات پر توجہ نہیں دے سکتا، یا دے سکتی، کیونکہ اس وقت میری ساری توجہ یہاں مرکوز ہے۔" آپ اعلان کریں یا نہ کریں، کہیں یا نہ کہیں جس وقت

آپ ہم آہنگ ہوتے ہیں اور ایمانداری کے ساتھ وقت کسی کو دے رہے ہوتے ہیں، تو پھر یہ اعلان بار بار آپ کے وجود سے، آپ کی زبان سے، آپ کے مسام سے آپ کی حرکت سے نکلتا چلا جائے گا۔ توجہ ہی سب سے بڑا راز ہے۔

ایک دن ہمارا ڈرائیور نہیں تھا۔ میری بہو درس میں جاتی ہے، تو میں نے اس سے کہا کہ تم کیوں پریشان ہوتی ہو؟ میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔ دن کے وقت میں گاڑی چلا لیتا ہوں۔ میں نے کہا۔ اس پر اس نے کہا، ٹھیک ہے۔ ماموں آپ مجھے چھوڑ آئیں بڑی مہربانی۔ جب میں اسے اس جگہ لے گیا، جس مقام پر بیٹھ کر خواتین درس دیتی ہیں، تو ظاہر ہے میں تو آگے نہیں جا سکتا تھا، میں نے اسے اتارا۔ اسی اثنا میں میں نے درس دینے والی خاتون کا عجیب اعلان سنا۔ جو میں سمجھتا ہوں کہ مردوں کی قسمت میں تو نہیں۔ میں نے مردوں کے بڑے بڑے جلسے دیکھے ہیں۔ ان میں، میں نے اتنی خوبصورت بات نہیں سنی۔ وہ بی بی اندر کہہ رہی تھیں کہ "اے پیاری بچیو اور بہنو! اگر تم اپنی بیٹی سے بات کر رہی ہو، یا اپنے خاوند سے مخاطب ہو، یا اپنی ماں کی بات سن رہی ہو اور ٹیلیفون کی گھنٹی بجے تو ٹیلیفون پر توجہ مت دو، کیونکہ وہ زیادہ اہم ہے، جس کو آپ اپنا وقت دے رہی ہو۔ چاہے کتنی ہی دیر وہ گھنٹی کیوں نہ بجتی رہے، کوئی آئے گا سن لے گا۔" یہ

بات میرے لئے نئی تھی اور میں نے اپنے حلقۂ احباب میں لوگوں یا دوستوں سے کبھی ایسی بات نہیں سنی تھی۔

میں اس خاتون کی وہ بات سن کر بہت خوش ہوا اور اب تک خوش ہوں اور اگر یہ بات ان بیبیوں نے سمجھی ہے تو یہ بے حد قیمتی بات ہے اور غالباً انہوں نے اس سے قیمتی بات اس روز کے درس میں اور نہیں دی ہو گی۔ اب آپ بڑے ہو گئے ہیں، آپ کو وقت کی پیچیدگی کے بارے میں سوچنا پڑے گا۔ ایک آپ کو چھپے چھپائے مسائل ملتے ہیں اور ایک وہ ہیں، جن کو آپ جیسے بچے اپنے کالج کے برآمدوں میں ستونوں کے ساتھ ٹیک لگا کر سوچتے ہیں۔ آپ ان مسائل کو سوچیں، جو آپ کی زندگیوں کے ساتھ ٹچ کرتے ہیں۔ گزرتے، لمس کرتے اور جیسے پنجابی میں کہتے ہیں "کھیہ" کے جاتے ہیں، پھر آپ کی سوچ شروع ہو گی، ورنہ پٹے ہوئے سوال جو چلے آرہے ہیں، انگریز کے وقتوں سے انہی کو آپ اگر Repeat کرتے رہیں گے، تو پھر آپ آنے والے زمانے کو وہ کچھ عطا نہیں کر سکیں گے، جو آپ کو عطا کرنا ہے۔ اس وقت کا تعلق حال سے ہے۔ جب آپ کسی کو وقت دیتے ہیں، یا کوئی آپ کو وقت دیتا ہے، اپنا لمحہ عطا کرتا ہے تو آپ حال میں ہوتے ہیں، اس کا تعلق ماضی یا مستقبل سے نہیں ہوتا۔ لیکن کبھی کبھی (یہ بات میں تفریح کے طور پر کرتا ہوں، تاکہ اپنے استاد کو بہت داد دے سکوں

اور ان کا مان بڑھانے کے لئے میں ان کے سامنے عاجزی سے کھڑے ہونے کے لئے کہتا ہوں) جس زمانے میں ہمارے استاد پطرس بخاری ہمیں گورنمنٹ کالج چھوڑ کر ''یو این او'' میں چلے گئے تھے اور وہ نیویارک میں رہتے تھے، جس علاقے یا فلیٹ میں وہ رہتے تھے، وہاں پر استادِ مکرم بتاتے ہیں کہ رات کے دو بجے مجھے فون آیا اور بڑے غصے کی آواز میں ایک خاتون بول رہی تھیں۔ وہ کہ رہی تھیں کہ آپ کا کتا مسلسل آدھ گھنٹے سے بھونک رہا ہے، اس نے ہماری زندگی عذاب میں ڈال دی ہے۔ میرے بچے اور میرا شوہر بے چین ہو کر چارپائی پر بیٹھ گئے ہیں اور اس کی آواز بند نہیں ہوتی۔ اس پر بخاری صاحب نے کہا کہ میں بہت شرمندہ ہوں اور آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ میرا کتا اس طرح سے Behave کر رہا ہے۔ لیکن میں کیا کروں، میں مجبور ہوں۔ اس پر اس خاتون نے غصے میں آ کر اپنا فون بند کر دیا۔ اگلے ہی روز بخاری صاحب نے رات ہی کے دو بجے ٹیلیفون کر کے اس خاتون کو جگایا اور کہا کہ محترمہ! میرے پاس کوئی کتا نہیں ہے، مجھے کتوں سے شدید نفرت ہے۔ کل رات جو کتا بھونکا تھا، وہ میرا نہیں تھا۔ اب دیکھئے کہ انہوں نے کس خوبصورتی سے حال کو مستقبل سے جوڑا، یا میں یہ کہوں گا کہ ماضی کو مستقبل کے ساتھ جوڑا۔ یہ بخاری صاحب کا ہی خاصہ تھا۔

میں اب آپ سے بڑی عجیب و غریب بات عرض کرنے لگا ہوں۔ مجھے اپنا وہ زمانہ یاد آگیا، جلدی میں وہ بات بھی بتا دوں۔ جب میں اٹلی میں رہتا تھا۔ روم میں ایک فوارہ ہے، جس میں لوگ پیسے پھینکتے ہیں۔ میں وہاں راستے میں کھڑا ہو گیا۔ وہاں بہت سارے امریکن ٹورسٹ آئے تھے۔ ایک بڈھا امریکی بھی اس میں پیسے پھینک رہا تھا۔ اس کی بیوی ہنس کر اس سے کہنے لگی کہ "جارج! میرا نہیں خیال تھا کہ تم اس طرح کے دقیانوسی اور اتنے پرانی باتوں کو ماننے والے ہو گے۔ اور کیا تم تسلیم کرتے ہو کہ اس طرح سے باتیں پوری ہوتی ہیں؟" اس نے کہا کہ دیکھئے یہ جو میری بات یامنت تھی، یہ تو کب کی پوری ہو چکی ہے۔ اب تو میں اس کی قسطیں ادا کر رہا ہوں۔" یہ ساری محبت اور Attachment کی باتیں ہیں، جن کا ہمارے ہاں رواج کم ہی ہے۔

جس طرح سے میں وقت کی بات آپ کی خدمت میں عرض کر رہا تھا اور اسے تحفے کے طور پر ادا کرنے کے لئے آپ کو رائے دے رہا تھا، اسی طرح وقت ہی سب سے بڑا دشمن بھی ہے، کیونکہ جب آپ کسی کو قتل کر دیتے ہیں تو اس سے کچھ نہیں لیتے، سوائے اس کے وقت کے۔ اس نے ابھی سوات دیکھنا تھا، ابھی ڈھاکہ جانا تھا۔ لیکن آپ نے اس سے اس کا وقت چھین لیا۔ جب آپ کسی انسان پر بہت ظلم کرتے ہیں، بڑی شدت کا تو آپ اس سے اس کا وقت چھین

لیتے ہیں۔ ابھی اس نے نیویارک دیکھنا تھا، ابھی اس نے کئی پینٹنگز بنانی تھیں، ابھی اس نے گانے گانے تھے، ابھی اس نے ناچنا تھا اور وہ سب آپ نے چھین لیا۔

وقت کا بھید پکڑا نہیں جا سکتا۔ اس کی پیچیدگی کو آسانی نے سلجھایا نہیں جا سکتا، لیکن یہ بات یاد رکھئے یہ آپ کے، میرے اور ہم سب کے اختیار میں ہے کہ ہم وقت دیتے ہیں تو ہمارا مدِّ مقابل زندہ ہے۔ اگر اس سے وقت لے لیتے ہیں، تو روح اور قالب ہونے کے باوصف وہ مر جاتا ہے۔ میں تو کسی کو بھی وقت نہیں دے سکا اور نہ ہی آج شام ایسا کر سکوں گا۔ اپنے دوست کو پھولوں کا گلدستہ ہی بھیج دوں گا، جو میری بدقسمتی اور کوتاہی ہے۔ آپ دوسروں کو وقت دینے کی کوشش ضرور کیجئے گا۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ نگہبان!!

چھوٹا کام

رزق کا بندوبست کسی نہ کسی طرح اللہ تعالیٰ کرتا ہے، لیکن میری پسند کے رزق کا بندوبست نہیں کرتا۔ میں چاہتا ہوں کہ میری پسند کے رزق کا انتظام ہونا چاہیے۔ ہم اللہ کے لاڈلے تو ہیں۔ لیکن اتنے بھی نہیں جتنے خود کو سمجھتے ہیں۔

ہمارے بابا جی کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی آدمی آپ سے سردیوں میں رضائی مانگے تو اُس کے لیے رضائی کا بندوبست ضرور کریں، کیونکہ اُسے ضرورت ہو گی۔ لیکن اگر وہ یہ شرط عائد کرے کہ مجھے فلاں قسم کی رضائی دو تو پھر اُس کو باہر نکال دو، کیونکہ اس طرح اس کی ضرورت مختلف طرح کی ہو جائے گی۔

وقت کا دباؤ بڑا شدید ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ برداشت کے ساتھ حالات ضرور بدل جائیں گے، بس ذرا سا اندر ہی اندر مُسکرانے کی ضرورت ہے۔ یہ ایک راز ہے جو سکولوں، یونیورسٹیوں اور دیگر اداروں میں نہیں سکھایا جاتا۔ ایسی باتیں تو بس بابوں کے ڈیروں سے ملتی ہیں۔ مجھ سے اکثر لوگ پوچھتے ہیں کہ

اشفاق صاحب کوئی بابا بتائیں۔ میں نے ایک صاحب سے کہا کہ آپ کیا کریں گے ؟ کہنے لگے، اُن سے کوئی کام لیں گے۔ نمبر پوچھیں گے انعامی بانڈز کا۔ میں نے کہا انعامی بانڈز کا نمبر میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔ بتاؤ کس کا چاہیے ؟ کہنے لگے، چالیس ہزار کے بانڈ کا۔ میں نے کہا کہ 931416, کیونکہ تم کبھی کہیں سے اسے خرید نہیں سکو گے۔ کہاں سے اسے تلاش کرو گے ؟ آپ کو انعامی بانڈ کا نمبر آپ کی مرضی کا تو نہیں ملے گا ناں!

آپ بابوں کو بھی بس ایسے ہی سمجھتے ہیں، جیسے میری بہو کو آج کل ایک خانساماں کی ضرورت ہے۔ وہ اپنی ہر ایک سہیلی سے پوچھتی ہے کہ اچھا سا خانساماں کا تمہیں پتا ہو تو مجھے بتاؤ۔ اسی طرح میرے سارے چاہنے والے مجھ سے کسی اچھے سے بابے کی بابت پوچھتے ہیں کہ جیسے وہ کوئی خانساماں ہو۔ ان بابوں کے پاس کچھ اور طرح کی دولت اور سامان ہو تا ہے، جو میں نے متجسس ہو کر دیکھا، حالانکہ میں تو ولایت میں تھا اور پروفیسری کرتا تھا۔ میں نے یہاں آ کر دیکھا کہ یہ بھی تو ایک علم ہے۔ یا اللہ! یہ کیسا علم ہے، اسے کس طرح سے آگے چلایا جاتا ہے کہ یہ مشکل بہت ہے۔ مثال کے طور پر ان کا (بابوں) حکم ہو تا ہے کہ چھوٹے چھوٹے کام کرو، بڑے بڑے کام نہ کرو۔ چھوٹے کاموں کو مت بھولیں، ان کو ساتھ

لے کر چلیں۔ چھوٹے کاموں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے، لیکن ہم ان باتوں کو مانتے ہی نہیں کہ بھئی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ چھوٹا کام بھی اہمیت کا حامل ہو۔

جب ہم بابا جی کے پاس ڈیرے پر گئے تو اُنہوں نے ہمیں مٹر چھیلنے پر لگا دیا۔ میں نے تھری پیس سوٹ پہن کر ٹائی لگا رکھی تھی، لیکن مٹر چھیل رہا تھا، حالانکہ میں نے ساری زندگی کبھی مٹر نہیں چھیلے تھے۔ پھر اُنہوں نے لہسن کو چھیلنے پر لگا دیا اور ہاتھوں سے بُو آنا شروع ہو گئی۔ پھر حکم ہوا کہ میتھی کے پتّے اور ڈنٹھل الگ الگ کرو۔ اس مشقّت سے اب تو خواتین بھی گھبراتی ہیں۔ ہماری ایک بیٹی ہے زونیرا، اُس کو کوئی چھوٹا سا کام کہہ دیں کہ بھئی یہ خط پہنچا دینا تو کہتی ہے، بابا یہ معمولی سا کام ہے۔ مجھے کوئی بڑا سا کام دیں۔ اتنا بڑا کہ میں آپ کو وہ کر کے دکھاؤں (کوئی شٹل میں جانے جیسا کام شاید) میں نے کہا یہ خط تو پہنچا دیتی! کہنے لگی، یہ تو بابا بس پڑا ہی رہ گیا میرے پاس۔ چھوٹے چھوٹے کاموں سے بابوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس سے ہماری زندگی میں ڈسپلن آئے۔

ہمارے دین میں سب سے اہم چیز ڈسپلن ہے۔ میں تین چار برس پہلے کینیڈا گیا تھا، وہاں ایک یورپی انڈریو نامی ریڈیو اناؤنسر ہے۔ اب وہ مُسلمان ہو گیا ہے۔ اُس کی آواز بڑی خوبصورت آواز ہے۔ میں اس وجہ سے کہ وہ اچھا اناؤنسر ہے اور

اب مُسلمان ہو گیا ہے، اُس سے ملنے گیا۔ وہ اپنے مُسلمان ہونے کی وجوہات کے بارے میں بتاتا رہا۔ اُس نے مُسلمان ہونے کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے کہا کہ وہ سورۃ روم پڑھ کر مُسلمان ہوا ہے۔ میں پھر کبھی آپ کو بتاؤں گا کہ اُس کو سورۃ روم میں کیا نظر آیا۔ میں نے کہا کہ اب ہمارے حالات تو بڑے کمزور ہیں۔ اُس نے کہا نہیں۔ اسلام کا نام تو جلی حروف میں سامنے دیوار پر بڑا بڑا کر کے لکھا ہوا ہے۔ میں نے کہا، نہیں! ہم تو ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ خاص طور پر جس طرح سے ہم کو گھیر اجا رہا ہے، اُس نے کہا ٹھیک ہے گھیر اجا رہا ہے، لیکن اس صورتِ حال میں سے نکلنے کا بھی ایک انداز ہے۔ ہم نکلیں گے۔ میں نے کہا ہم کیسے نکلیں گے؟ اُس نے کہا کہ جب کوئی پانچ چھ سات سو امریکی مُسلمان ہو جائیں گے اور اسی طرح سے چھ سات سو کینیڈین مُسلمان ہو جائیں اور ساڑھے آٹھ نو سو سکینڈے نیوین مُسلمان ہو جائیں گے تو پھر ہمارا قافلہ چل پڑے گا، کیونکہ We are Disciplined۔ اسلام ڈسپلن سکھاتا ہے، نعرہ بازی کو نہیں مانتا۔ میں بڑا مایوس، شرمندہ اور تھک سا گیا۔ اُس کی یہ بات سُن کر اور سوچا کہ دیکھو! ہر حال میں ان کی "چڑھ" مچ جاتی ہے۔ یہ جو گورے ہیں یہ یہاں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔

اسلام، جو ہم کو بہت پیارا ہے۔ ہم نعرے مار مار کر، گانے گا گا کر یہاں تک پہنچے ہیں اور یہ ہمیں مل نہیں رہا۔ میں نے اُس سے کہا کہ اس میں ہمارا کوئی حصّہ نہیں ہو گا؟ تو اُس نے کہا کہ نہیں! آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ آپ کا اس میں کوئی حصّہ نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ یار! ہمارا بھی جی چاہے گا کہ ہمارا بھی اس میں کوئی حصّہ ضرور ہو۔ کہنے لگا، ایسا کریں گے کہ جب ہمارا قافلہ چلے گا تو تم بھی بسترے اُٹھا کر پیچھے پیچھے چلتے آنا اور کہنا Sir we are also Muslim ۔ لیکن آپ میں وہ ڈسپلن والی بات ہے نہیں۔ اور دنیا جب آگے بڑھی ہے تو وہ نظم سے اور ڈسپلن سے ہی آگے بڑھی ہے۔ جب اس نے یہ بتایا کہ دیکھئے ہمارے دین میں اوقات مقرّر ہیں۔ وقت سے پہلے اور بعد میں نماز نہیں ہو سکتی۔ اس کی رکعات مقرّر ہیں۔ آپ مغرب کی تین ہی پڑھیں گے۔ آپ چاہیں کہ میں مغرب کی چار رکعتیں پڑھ لوں کہ اس میں اللہ کا بھی فائدہ، اور میرا بھی فائدہ، لیکن اس سے بات نہیں بنے گی۔ آپ کو فریم ورک کے اندر ہی رہنا پڑے گا۔ پھر آپ حج کرتے ہیں۔ اس میں کچھ عبادت نہیں کرنی، طے شدہ بات ہے کہ آج آپ عرفات میں ہیں، کل مزدلفہ میں ہیں۔ پرسوں منٰی میں ہیں اور بس حج ختم اور کچھ نہیں کرنا، جگہ بدلنی ہے کہ فلاں وقت سے پہلے وہاں پہنچ جانا ہے اور جو یہ کر گیا، اُس کا حج ہو گیا، کچھ لمبا چوڑا کام نہیں۔

دین میں ہر معاملے میں ڈسپلن سکھایا گیا ہے۔ ہمارے بابے کہتے ہیں کہ ڈسپلن چھوٹے کاموں سے شروع ہوتا ہے۔ جب آپ معمولی کاموں کو اہمیت نہیں دیتے اور ایک لمبا منصوبہ بنا کر بیٹھ جاتے ہیں، اپنا ذاتی اور انفرادی تو پھر آپ سے اگلا کام چلتا نہیں۔ کافی عرصہ پہلے میں چین گیا تھا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب چین نیا نیا آزاد ہوا تھا۔ ہم سے وہ ایک سال بعد آزاد ہوا۔ ان سے ہماری محبتیں بڑھ رہی تھیں اور ہم ان سے ملنے چلے گئے۔ افریقہ اور پاکستان کے کچھ رائٹر چینی حکّام سے ملے۔

ایک گاؤں میں بہت دُور پہاڑوں کی اوٹ میں کچھ عورتیں بھٹی میں دانے بھون رہی تھیں۔ دھواں نکل رہا تھا۔ میرے ساتھ شوکت صدیقی تھے۔ کہنے لگے، یہ عورتیں ہماری طرح سے ہی دانے بھون رہی ہیں۔ جب ہم ان کے پاس پہنچے تو دو عورتیں دھڑا دھڑ پھوس، لکڑی جو کچھ ملتا تھا، بھٹی میں جھونک رہی تھیں اپنے رومال باندھے کڑاہے میں کوئی لیکوڈ (مائع) سا تیار کر رہی تھیں۔ ہم نے اُن سے پوچھا کہ یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟ تو اُنہوں نے کہا کہ ہم سٹیل بنا رہی ہیں۔ میں نے کہا کہ سٹیل کی تو بہت بڑی فیکٹری ہوتی ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ ہم غریب لوگ ہیں اور چین ابھی آزاد ہوا ہے۔ ہمارے پاس کوئی سٹیل مل نہیں ہے۔ ہم نے اپنے طریقے کا سٹیل بنانے کا ایک طریقہ اختیار کیا ہے کہ کس طرح سے

سیندور ڈال کر لوہے کو گرم کرنا ہے۔ یہ عورتیں صبح اپنے کام پر لگ جاتیں اور شام تک محنت اور جان ماری کے ساتھ سٹیل کا ایک ڈلا یعنی پانچ چھ سات آٹھ سیر سٹیل تیار کر لیتیں۔ ٹرک والا آتا اور ان سے آ کر لے جاتا۔

اُنہوں نے بتایا کہ ہمیں جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے ہم اس سٹیل کی بدلے لے لیتے ہیں۔ میں اب بھی کبھی جب اس بات کو سوچتا ہوں کہ سبحان اللہ، ان کی کیا ہمت تھی۔ اُن کو کس نے ایسے بتا دیا کہ یہ کام ہم کریں گی تو مُلک کی کمی پوری ہو گی۔ چھوٹا کام بہت بڑا ہوتا ہے۔ اس کو چھوڑا نہیں جا سکتا، جو کوئی اسے انفرادی یا اجتماعی طور پر چھوڑ دیتا ہے، مشکل میں پڑ جاتا ہے۔

اٹلی میں ایک مسٹر کلاؤ ایک بڑا سخت قسم کا یہودی تھا۔ اس کی کوئی تیرا چودہ منزلہ عمارت تھی۔ صبح جب میں یونیورسٹی جاتا تو وہ وائپر لے کر رات کی بارش کا پانی نکال رہا ہوتا اور فرش پر ٹاکی لگا رہا ہوتا تھا یا سڑک کے کنارے جو پٹڑی ہوتی ہے اُسے صاف کر رہا ہوتا۔ میں اُس سے پوچھتا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں، اتنے بڑے آدمی ہو کر۔ اُس نے کہا یہ میرا کام ہے، کام بڑا یا چھوٹا نہیں ہوتا، جب میں نے یہ ڈیوٹی لے لی ہے اور میں اس ڈسپلن میں داخل ہو گیا ہوں تو میں یہ کام کروں گا۔ میں نے کہا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اُس نے کہا کہ یہ انبیا

کی صفت ہے، جو انبیا کے دائرے میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ وہ چھوٹے کام ضرور کرے۔ ہم کو یہ نوکری ملی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے بکریاں چرائی تھیں اور ہم یہودیوں میں یہ بکریاں چرانا اور اس سے متعلقہ نچلے لیول کا کام موجود ہے تو ہم خود کو حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا پیروکار سمجھیں گے۔ اُس نے کہا کہ آپ کے نبی اپنا جوتا خود گانٹھتے تھے۔ قمیض کو پیوند یا ٹانکا خود لگاتے تھے۔ کپڑے دھو لیتے تھے۔ راستے سے جھاڑ جھنکار صاف کر دیتے تھے، تم کرتے ہو؟ میں کہنے لگا مجھے تو ٹانکا لگانا نہیں آتا، مجھے سکھایا نہیں گیا۔ وہ آدمی بڑی تول کے بات کرتا تھا۔ مجھے کہتا تھا دیکھو اشفاق تم اُستاد تو بن گئے ہو، لیکن بہت سی چیزیں تمہیں نہیں آتیں۔ جب کام کرو چھوٹا کام شروع کرو۔ اب تم لیکچرار ہو کل پروفیسر بن جاؤ گے۔ تم جب بھی کلاس میں جانا یا جب بھی لوگوں کو خطاب کرنے لگنا اور کبھی بہت بڑا مجمع تمہارے سامنے ہو تو کبھی اپنے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کو مخاطب نہ کرنا۔ ہمیشہ اپنی آواز کو دور پیچھے کی طرف پھینکنا۔ وہ لوگ جو بڑے شرمیلے ہوتے تھے، شرمندہ سے جھکے جھکے سے ہوتے ہیں، وہ ہمیشہ پچھلی قطاروں میں بیٹھتے ہیں۔ آپ کا وصف یہ ہونا چاہیے کہ آپ اپنی بات اُن کے لیے کہیں۔ جب بات چھوٹوں تک پہنچے گی تو بڑوں تک خود بخود پہنچ جائے گی۔ میں اُس کی باتوں کو کبھی بھلا نہیں سکتا۔ جب میں اپنے بابا جی کے پاس آیا تو میں نے

کلاؤ کی یہ بات اُنہیں بتائی، اُنہوں نے کہا کہ دیکھو کچھ ہماری ڈیوٹیاں ہوتی ہیں، مثلاً یہ کہ مجھے سکھایا گیا کہ سوئی میں دھاگہ ڈالنا سیکھو۔ سبزیاں چھیلنے کی تو میری پریکٹس ہو چکی تھی۔ اب باباجی نے فرمایا کہ سوئی میں دھاگہ ڈالنا سیکھو۔ اب یہ بڑا مشکل کام ہے۔ میں کبھی ایک آنکھ بند کرتا اور کبھی دوسری آنکھ کانی کرتا، لیکن اس میں دھاگہ نہیں ڈالتا تھا۔

خیر ! میں نے ان سے کہا کہ اچھا جی دھاگہ ڈال لیا، اس کا فائدہ؟ کہنے لگے اس کا فائدہ ہے کہ اب تم کسی کا پھٹا ہوا کپڑا، کسی کی پھٹی ہوئی پگڑی سی سکتے ہو۔ جب تک تمہیں لباس سینے کا فن نہیں آئے گا، تم انسانوں کو کیسے سیو گے۔ تم تو ایسے ہی رہو گے، جیسے لوگ تقریریں کرتے ہیں۔ بندہ تو بندے کے ساتھ جڑے گا ہی نہیں۔ یہ سوئی دھاگے کا فن آنا چاہیے۔ ہماری مائیں، بہنیں، بیٹیاں جو لوگوں کو جوڑے رکھتی تھیں، وہ یہ چھوٹے چھوٹے کاموں سے کرتی تھیں۔

آپ ایک لمحے کے لئے یہ بات سوچیں کہ اس ملک کی آبادی ۱۴ کروڑ ہے اور ان ۱۴ کروڑ بندوں کو کس طرح سے کھانا مل رہا ہے، کیا کوئی فیکٹری انہیں کھانا فراہم کرتی ہے یا کوئی ٹرک آتا ہے؟ آپ اپنے گھر تشریف لے جائیں اور ٹھنڈا "بسا" بینگن گرم کر کے اماں سے کہیں کہ دال ڈال دیں، مکس کر دیں گھی ڈال

دیں، اس طرح ہمیں کھانا مل رہا ہے اور ان چھوٹے کاموں سے کتنی بڑی آبادی پل رہی ہے۔ آپ اس بارے میں ضرور سوچیے گا کہ اگر کام فیکٹریوں اور بڑی بڑی چیزوں سے ہی ہوتے تو پھر تو سب بھوکے رہ جاتے۔ یہ تو خواتین کا ہی خاصہ ہے کہ وہ سب کو کھانا بنا کر دیتی ہیں۔

آپ ان چند بڑے اشتہاروں کی طرف نہ دیکھیں، جن میں لڑکیاں برگر کھا رہی ہوتی ہیں۔ ان کے ہونٹ آدھے لپ اسٹک سے لال ہوتے ہیں، آدھی کیچپ سے لال۔ بڑا خوبصورت اشتہار ہوتا ہے، جیسے شیرنی ہرن کا "پٹھا" کھا رہی ہو۔ گھر کے لوگوں کو بسم اللہ پڑھ کر کھانا دینے کا سارا درجہ خواتین کو ہی حاصل ہے۔ جب گھر میں یہ خواتین کھانا پکانے کے لئے نہ ہوں تو مرد تو بھوکے رہ جائیں۔ ان مردوں کو تو نہ کھانا پکانا آتا ہے نہ گھر چلانا۔

یہ ضرور یاد رکھئے کہ انبیا کی غلامی میں یا ان کی نوکری میں شامل ہونے کے لئے چھوٹے کام کو ضرور اختیار کریں۔ اگر آپ ان کی نوکری چاہتے ہیں تو! کیونکہ انہوں نے بکریاں چرائی ہیں، میں بھی چراؤں گا۔ ہم نے اس کو دو بکریاں لے دیں، لیکن وہ پانچویں دن روتا ہوا آ گیا اور کہنے لگا یہ تو بڑا مشکل کام ہے میں ایک

کو کھیت سے نکالتا ہوں تو دوسری بھاگ کر ادھر چلی جاتی ہے۔ پھر اس نے دونوں کے گلے میں رسی ڈال دی۔

میں نے باباجی سے پوچھا کہ انبیا کو بکریاں چرانے کا کیوں حکم دیا جاتا تھا، تو باباجی نے فرمایا کہ چونکہ آگے چل کر زندگی میں ان کو نہ ماننے والے لوگوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا، ان کفار سے واسطہ پڑنا تھا، اس لئے ان بکریوں کے ذریعے سکھایا جاتا تھا، کیونکہ دنیا میں جانوروں میں نہ ماننے والا جانور بکری ہی ہے۔ اپنی مرضی کرتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ اب ہمارا کرکٹ کا موسم ہے، جو کہ ہمیشہ ہی رہتا ہے، اس پر بھی غور کریں میں تو اتنا اچھا Watcher نہیں ہوں، لیکن محسوس کرتا ہوں کہ ہر بیٹسمین اپنے مضبوط ہاتھوں اور مضبوط کندھوں اور پُر استقلال جمائے ہوئے قدموں، اپنے سارے وجود اور اپنے سارے Self کی طاقت کے ساتھ ہٹ نہیں لگاتا، بلکہ اُس کے سر کی ایک چھوٹی سی جُنبش ہوتی ہے، جو نظر بھی نہیں آتی۔ اُس جُنبش کے نہ آنے تک نہ چوکا لگتا ہے نہ چھکّا۔ لگتا ہے جب وہ بیلنس میں آتی ہے، تب شارٹ لگتی ہے۔ سرکس کی خاتون جب تار پر چلتی ہے وہ بیلنس سے یہ سب کچھ کرتی ہے۔ میں ابھی جس راستے سے آیا ہوں، مجھے آدھ گھنٹہ کھڑا رہنا پڑا، کیونکہ ہماری بتّی تو سبز تھی، لیکن دوسری

طرف سے آنے والے ہمیں گزرنے نہیں دیتے تھے اور راستہ نہ دے کر کہہ رہے تھے کہ کرلو جو کرنا ہے، ہم تو اس ڈسپلن کو نہیں مانتے۔

یہ سوچ خطرناک ہے، بظاہر کچھ باتیں چھوٹی ہوتی ہیں، لیکن وہ نہایت اہم اور بڑی ہوتی ہیں۔ میں نے تھوڑے دن ہوئے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا (جیسا کہ میری عادت ہے ہر ایک سے پوچھتا رہتا ہوں، کیونکہ ہر ایک کا اپنا اپنا علم ہوتا ہے) کہ آپ کو سب سے زیادہ کرایہ کہاں سے ملتا ہے۔ اُس نے کہا سر مجھے یہ تو یاد نہیں کہ کسی نے خوش ہو کر زیادہ کرایہ دیا ہو، البتہ یہ مجھے یاد ہے کہ میری زندگی میں کم سے کم کرایہ مجھے کب ملا اور کتنا ملا۔ میں نے کہا کتنا، کہنے لگا آٹھ آنے۔ میں نے کہا وہ کیسے؟ کہنے لگا جی بارش ہو رہی تھی یا ہو چکی تھی، میں لاہور میں نسبت روڈ پر کھڑا تھا، بارش سے جگہ جگہ پانی کے چھوٹے چھوٹے جوہڑ سے بنے ہوئے تھے تو ایک بڑی پیاری سی خاتون وہ اس پٹڑی سے دوسری پٹڑی پر جانا چاہتی تھی لیکن پانی کے باعث جا نہیں سکتی تھی۔ میری گاڑی درمیان میں کھڑی تھی، اُس خاتون نے گاڑی کا ایک دروازہ کھولا اور دوسرے سے نکل کر اپنی مطلوبہ پٹڑی پر چلی گئی اور مجھے اٹھنی دے دی۔

ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں، مُسکرانا سیکھنا چاہیے اور اپنی زندگی کو "چیڑا"(سخت) نہ بنالیں کہ ہر وقت دانت ہی بھینچتے رہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ڈسپلن کے راز کو پالیں گے اور خود کو ڈھیلا چھوڑ دیں گے اور Relax رکھیں گے۔ اللہ آپ سب کو اور آپ کے عزیز و اقارب کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ !!

خُوشی کا راز

ماں خدا کی نعمت ہے اور اس کا پیار کا انداز سب سے الگ اور نرالا ہوتا ہے۔ بچپن میں ایک بار باد و باراں کا سخت طوفان تھا اور جب اس میں بجلی شدت کے ساتھ کڑکی تو میں خوفزدہ ہو گیا۔ ڈر کے مارے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میری ماں نے میرے اوپر کمبل ڈالا اور مجھے گود میں بٹھالیا، تو محسوس ہوا گویا میں امان میں آ گیا ہوں۔

میں نے کہا، اماں! اتنی بارش کیوں ہو رہی ہے؟ اس نے کہا، بیٹا! پودے پیاسے ہیں۔ اللہ نے انہیں پانی پلانا ہے اور اسی بندوبست کے تحت بارش ہو رہی ہے۔ میں نے کہا، ٹھیک ہے! پانی تو پلانا ہے، لیکن یہ بجلی کیوں بار بار چمکتی ہے؟ یہ اتنا کیوں کڑکتی ہے؟ وہ کہنے لگیں، روشنی کر کے پودوں کو پانی پلایا جائے گا۔ اندھیرے میں تو کسی کے منہ میں، تو کسی کے ناک میں پانی چلا جائے گا۔ اس لئے بجلی کی کڑک چمک ضروری ہے۔

میں ماں کے سینے کے ساتھ لگ کر سو گیا۔ پھر مجھے پتا نہیں چلا کہ بجلی کس قدر چمکتی رہی، یا نہیں۔ یہ ایک بالکل چھوٹا سا واقعہ ہے اور اس کے اندر پوری دنیا پوشیدہ ہے۔ یہ ماں کا فعل تھا جو ایک چھوٹے سے بچے کے لئے، جو خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اسے خوف سے بچانے کے لئے، پودوں کو پانی پلانے کے مثال دیتی ہے۔ یہ اس کی ایک اپروچ تھی۔ گو وہ کوئی پڑھی لکھی عورت نہیں تھیں۔ دولت مند، بہت عالم فاضل کچھ بھی ایسا نہیں تھا، لیکن وہ ایک ماں تھی۔ میں جب نو سال کا ہوا تو میرے دل میں ایک عجیب خیال پیدا ہوا کہ سرکس میں بھرتی ہو جاؤں اور کھیل پیش کروں، کیونکہ ہمارے قصبے میں ایک بہت بڑا میلہ لگتا تھا۔ تیرہ، چودہ، پندرہ جنوری کو اور اس میں بڑے بڑے سرکس والے آتے تھے۔ مجھے وہ سرکس دیکھنے کا موقع ملا، جس سے میں بہت متاثر ہوا۔ جب میں نے اپنے گھر میں اپنی یہ خواہش ظاہر کی کہ میں سرکس میں اپنے کمالات دکھاؤں گا، تو میری نانی ''پھا'' کر کے ہنسی اور کہنے لگیں، ذرا شکل تو دیکھو! یہ سرکس میں کام کرے گا۔ میری ماں نے بھی کہا، دفع کر تو بڑا ہو کر ڈپٹی کمشنر بنے گا۔ تو نے سرکس میں بھرتی ہو کر کیا کرنا ہے۔ اس پر میرا دل بڑا بجھ سا گیا۔ وہی ماں جس نے مجھے اتنی محبت سے اس باد و باراں کے طوفان میں امان اور آسائش عطا کی تھی۔ وہ میری خواہش کی مخالفت کر رہی تھی۔

میرے والد سن رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں، کیوں نہیں؟ اگر اس کی صلاحیت ہے تو اسے بالکل سرکس میں ہونا چاہیے۔ تب میں بہت خوش ہوا۔ اب ایک میری ماں کی مہربانی تھی۔ ایک والد کی اپنی طرف کی مہربانی۔ انہوں نے صرف مجھے اجازت ہی نہیں دی، بلکہ ایک ڈرم جو ہوتا ہے تار کول والا، اس کو لال، نیلا اور پیلا پینٹ کر کے بھی لے آئے اور کہنے لگے، اس پر چڑھ کر آپ ڈرم کو آگے پیچھے رول کیا کریں۔ اس پر آپ کھیل کریں گے تو سرکس کے جانباز کھلاڑی بن سکیں گے۔ میں نے کہا منظور ہے۔

چنانچہ میں اس ڈرم پر پریکٹس کرتا رہا۔ میں نے اس پر اس قدر اور اچھی پریکٹس کی کہ میں اس ڈرم کو اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق کہیں بھی لے جا سکتا تھا۔ گول چکر کاٹ سکتا تھا۔ بغیر پیچھے دیکھے ہوئے، آگے پیچھے آ جا سکتا تھا۔ پھر میں نے اس ڈرم پر چڑھ کر ہاتھ میں تین گیندیں اچھالنے کی پریکٹس کی۔ وہاں میرا ایک دوست تھا۔ ترکھانوں کا لڑکا محمد رمضان۔ اس کو بھی میں نے پریکٹس میں شامل کر لیا۔ وہ اچھے چھریرے بدن کا تھا۔ وہ مجھ سے بھی بہتر کام کرنے لگا۔ بجائے گیندوں کے وہ تین چھریاں لے کر ہوا میں اچھال سکتا تھا۔ ہم دونوں ڈرم پر چڑھ کر اپنا یہ سرکس لگاتے۔ ایک ہماری بکری تھی، اس کو بھی میں نے ٹرینڈ کیا۔ وہ بکری بھی ڈرم پر آسانی سے چڑھ جاتی۔

ہماری ایک "بُشی" نامی کتا تھا، وہ لمبے بالوں والا روسی نسل کا تھا۔ اس کو ہم نے کافی سکھایا، لیکن وہ نہ سیکھ سکا۔ وہ یہ کام ٹھیک سے نہیں کر سکتا تھا۔ حالانکہ کتا کافی ذہین ہوتا ہے۔ وہ بھونکتا ہوا ہمارے ڈرم کے ساتھ ساتھ بھاگتا تھا، مگر اوپر چڑھنے سے ڈرتا تھا۔ ہم نے اعلان کر دیا کہ یہ کتا ہماری سرکس ہی کا ایک حصہ ہے، لیکن یہ جوکر کتا ہے اور یہ کوئی کھیل نہیں کر سکتا، صرف جوکر کا کردار ادا کر سکتا ہے۔

خیر! ہم یہ کھیل دکھاتے رہے۔ ہم اپنا شو کرتے تو میرے ابا جی ہمیشہ ایک روپیہ والا ٹکٹ لے کر کرسی ڈال کر ہماری سرکس دیکھنے بیٹھ جاتے تھے۔ ہمارا ایک ہی تماشائی ہوتا تھا اور کوئی بھی دیکھنے نہیں آتا تھا۔ صرف ابا جی ہی آتے تھے۔ ہم انہیں کہتے کہ آج جمعرات ہے۔ آپ سرکس دیکھنے آیئے گا۔ وہ کہتے، میں آؤں گا۔ وہ ہم سے ایک روپے کا ٹکٹ بھی لیتے تھے، جو ان کی شفقت کا ایک انداز تھا۔

زندگی میں کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے اور آپ اس بات کو مائینڈ نہ کیجئے گا۔ اگر آپ کو روحانیت کی طرف جانے کا بہت شوق ہے تو اس بات کو برا نہ سمجھئے گا کہ بعض اوقات ماں باپ کے اثرات اس طرح سے اولاد میں منتقل

نہیں ہوتے، جس طرح سے انسان آرزو کرتا ہے۔ اس پر کسی کا زور بھی نہیں ہوتا۔ ٹھیک چوالیس برس بعد جب میرا پوتا جو بڑا اچھا، بڑا ذہین لڑکا اور خیر و شر کو اچھی طرح سے سمجھتا ہے، وہ جاگنگ کر کے گھر میں واپس آتا ہے، تو اس کے جوگرز، جو کیچڑ میں لتھڑے ہوئے ہوتے ہیں، وہ ان کے ساتھ اندر گھس آتا ہے اور وہ ویسے ہی خراب جوگروں کے ساتھ چائے بھی پیتا ہے اور سارا قالین کیچڑ سے بھر دیتا ہے۔ میں اب آپ کے سامنے اس بات کا اعتراف کرنے لگا ہوں کہ میں اسے برداشت نہیں کرتا کہ وہ خراب، کیچڑ سے بھرے جوگرز کے ساتھ قالین پر چڑھے۔ میرا باپ جس نے مجھے ڈرم لا کر دیا تھا، میں اسی کا بیٹا ہوں اور اب میں پوتے کی اس حرکت کو برداشت نہیں کرتا۔ دیکھئے یہاں کیا تضاد پیدا ہوا ہے۔ میں نے اپنے پوتے کو شدت کے ساتھ ڈانٹا اور جھڑکا کہ تم پڑھے لکھے لڑکے ہو، تمہیں شرم آنی چاہئے کہ یہ قالین ہے، بر آمدہ ہے اور تم اسے کیچڑ سے بھر دیتے ہوں۔

اس نے کہا، دادا آئی ایم ویری سوری!! میں جلدی میں ہوتا ہوں، جوگر اتارنے مشکل ہوتے ہیں۔ امی مجھے بلا رہی ہوتی ہیں کہ have a cup of tea، تو میں جلدی میں ایسے ہی اندر آجاتا ہوں۔ میں نے کہا کہ تمہیں اس بات کا احساس ہونا چاہیے۔ اپنے اندر تبدیلی پیدا کرو، چنانچہ میں اس پر کمنٹس کرتا رہا۔ ٹھیک

ہے مجھے ایک لحاظ سے حق تو تھا، لیکن جب یہ واقعہ گزر گیا تو میں نے ایک چھوٹے سے عام سے رسالے میں اقوالِ زرّیں وغیرہ میں ایک قول پڑھا کہ ”جو شخص ہمیشہ نکتہ چینی کے موڈ میں رہتا ہے اور دوسروں کے نقص نکالتا رہتا ہے، وہ اپنے آپ میں تبدیلی کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔“ انسان کو خود یہ سوچنا چاہیے کہ جی مجھ میں فلاں تبدیلی آنی چاہیے۔ جی میں سگرٹ پیتا ہوں، اسے چھوڑنا چاہتا ہوں، یا میں صبح نہیں اٹھ سکتا۔ میں اپنے آپ کو اس حوالے سے تبدیل کر لوں۔ ایک نکتہ چیں میں کبھی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس کی ذات کی جو بیٹری ہے، وہ کمزور ہونے لگتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ جب بیٹری کے سیل کمزور ہو جائیں، تو ایک بیٹری کا بلب ذرا سا جلتا ہے، پھر بجھ جاتا ہے۔ اسی طرح کی کیفیت ایک نکتہ چینی کی ہوتی ہے۔

میں نے وہ قول پڑھنے کے بعد محسوس کیا کہ میری نکتہ چینی اس لڑکے پر ویسی نہیں ہے، جیسا کہ میرے باپ کی ہو سکتی تھی۔ میرے باپ نے سرکس سیکھنے کی بات پر مجھے نہیں کہا کہ عقل کی بات کر، تو کیا کہ رہا ہے؟ اس نے مجھے یہ کہنے کی بجائے ڈرم لا کر دیا اور میری ماں نے مجھے باد و باراں کے طوفان میں یہ نہیں کہا کہ چپ کر، ڈرنے کی کیا بات ہے؟ اور میں اس میں کمنٹری کر کے نقص نکال رہا ہوں۔ ابھی میں اس کا کوئی ازالہ نہیں کر سکا تھا کہ اگلے دن میں نے دیکھا میرے

پوتے کی ماں (میری بہو) بازار سے تار سے بنا ہوا میٹ ہے آئی اور اس کے ساتھ ناریل کے بالوں والا ڈور میٹ بھی لائی، تا کہ اس کے ساتھ پیر گھس کے جائے اور اندر کیچڑ نہ جانے پائے۔ سو، یہ فرق تھا مجھ میں اور اس ماں میں۔ میں نکتہ چینی کرتا رہا اور اس نے حل تلاش کر لیا۔

جب آپ زندگی میں داخل ہوتے ہیں اور باطن کے سفر کی آرزو کرتے ہیں، تو جب تک آپ چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال نہیں کریں گے اور بڑے میدان تک پہنچنے کے لئے پگڈنڈی نہ تیار کریں گے، وہاں نہیں جا سکیں گے۔ آپ ہمیشہ کسی "بابے" کی بابت پوچھتے رہتے ہیں۔ ہمارے بابا جی سے فیصل آباد سے آنے والے صاحب نے بھی یہی پوچھا اور کہنے لگے کہ سائیں صاحب! آپ کو تو ماشاء اللہ خداوند تعالیٰ نے بڑا درجہ دیا ہے۔ آپ ہم کو کسی "قطب" کے بارے میں بتلا دیں۔ بابا جی نے ان کی یہ بات نظر انداز کر دی۔ وہ صاحب پھر کسی قطب وقت کے بارے دریافت کرنے لگے۔ جب انہوں نے تیسری بار یہی پوچھا تو بابا جی نے اس سے کہا کہ کیا تم نے اسے قتل کرنا ہے؟

آدمی کا شاید اس سے یہی مطلب یا مقصد ہوتا ہے کہ کوئی بابا ملے اور میں اس کی غلطیاں نکالوں۔ اگر روح کی دنیا کو ٹٹولنے کا کوئی ایسا ارادہ ہو یا اس دنیا میں کوئی

اونچی پکار کرنے کی خواہش ہو کہ "میں آگیا" تو اس کے لئے ایک راستہ متعین ہونا چاہئے، تیاری ہونی چاہئے۔ تبھی انسان وہاں تک جا سکتا ہے۔ ہم ڈائریکٹ کبھی وہاں نہیں جا سکتے۔ آپ کو اس دنیا کے اندر کوئی پیراشوٹ لے کر نہیں جائے گا۔ جب یہ چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں رونما ہوں گی، تو جا کر کہیں بات بنے گی۔

میرے بھائی نے ایک بار مجھ سے کہا کہ اگر آپ نے کچھ لکھنے لکھانے کا کام کرنا ہے تو میرے پاس آکر مہینے دو گزار لیں (ان کا رینالہ خورد میں ایک مرغی فارم ہے)۔ میں وہاں گیا، بچے بھی ساتھ تھے۔ وہاں جا کر تو میری جان بڑی اذیت میں پھنس گئی۔ وہ اچھی سر سبز جگہ تھی۔ نہر کا کنارہ تھا، لیکن وہ جگہ میرے لئے زیادہ Comfortable ثابت نہیں ہو رہی تھی۔ آسائشیں میسر نہیں تھیں۔ ایک تو وہاں مکھیاں بہت تھیں، دوسرے مرغی خانے کے قریب ہی ایک اصطبل تھا، وہاں سے گھوڑوں کی بو آتی تھی۔ تیسرا وہاں پر مشکل یہ تھی کہ وہاں ایک چھوٹا فریج تھا، اس میں ضرورت کی تمام چیزیں نہیں رکھی جا سکتی تھیں اور بار بار بازار جانا پڑتا تھا۔ یہ مجھے سخت ناگوار گزرتا تھا۔

اب دیکھئے خدا کی کیسے مہربانی ہوتی ہے۔ وہی مہربانی جس کا میں آپ سے اکثر ذکر کرتا ہوں۔ میں اصطبل میں یہ دیکھنے کے لئے گیا کہ اس کی بو کو روکنے کے لئے کسی دروازے کا بندوبست کیا جا سکے۔ وہاں جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ میرے تینوں بچے گھوڑوں کو دیکھنے کے لئے اصطبل کے دروازوں کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں۔ وہ صبح جاگتے تھے تو سب سے پہلے آکر گھوڑوں کو دیکھتے۔ انہیں گھوڑوں کے ساتھ اتنا عشق ہو گیا تھا۔ ان میں ایک گھوڑا ایسا تھا جو بڑا اچھا تھا۔ وہ انہیں ہمیشہ ہنہنا کر ہنساتا تھا اور اگر وہ "ٹینے مینے" بچے وقت پر نہیں پہنچتے تھے، تو شاید انہیں بلاتا تھا، اس گھوڑے کی ہنہناہٹ سے یہ اندازہ ہوتا تھا۔ اب میں نے کہا کہ نہیں، یہ خوشبو یا بدبُو، یہ اصطبل اور گھوڑے اور ان بچوں کی دوستی مجھے وارے میں ہے اور اب مجھے یہ گھوڑے پیارے ہیں۔ بس ایسے ٹھیک ہے۔

ہم شہر کے صفائی پسند لوگ جو مکھی کو گوارا نہیں کرتے۔ ایک بار میرے دفتر میں میرے بابا جی (سائیں جی) تشریف لائے، تو اس وقت میرے ہاتھ میں مکھیاں مارنے والا فلیپ تھا۔ مجھے اس وقت مکھی بہت تنگ کر رہی تھی۔ میں مکھی مارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس لئے مجھے بابا جی کے آنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ اچانک ان کی آواز سنائی دی۔ وہ کہنے لگے، یہ اللہ نے آپ کے ذوقِ کشتن کے لئے پیدا کی ہے۔ میں نے کہا، جی یہ مکھی گند پھیلاتی ہے، اس لئے مار رہا تھا۔ کہنے

لگے، یہ انسان کی سب سے بڑی محسن ہے اور تم اسے مار رہے ہو۔ میں نے کہا، جی یہ مکھی کیسے محسن ہے؟ کہنے لگے، یہ بغیر کوئی کرایہ لئے، بغیر کوئی ٹیکس لئے انسان کو یہ بتانے آتی ہے کہ یہاں گند ہے۔ اس کو صاف کر لو تو میں چلی جاؤں گی اور آپ اسے مار رہے ہیں۔ آپ پہلے جگہ کی صفائی کر کے دیکھیں، یہ خود بخود چلی جائے گی۔ سو، وہاں باباجی کی کہی ہوئی وہ بات میرے ذہن میں لوٹ کر آئی اور میں نے سوچا کہ مجھے اس کمرے میں کوئی فریش چیزیں پھول یا سپرے وغیرہ رکھنی چاہیں اور یہاں کی صفائی پر دھیان دینا چاہیئے۔ وہ فرش جیسا بھی تھا، اس کو گیلا کر کے میں نے جھاڑو لے کر خود خوب اچھی طرح سے صاف کیا۔ آپ یقین کریں پھر مجھے مکھیوں نے تنگ نہیں کیا۔

جب میں سودا لینے کے لئے (جس سے میں بہت گھبراتا ہوں) ایک میل کے فاصلے پر گیا، تو میں نے وہاں اپنے بچپن کے کئی سال گزارنے کے بعد لبساطیوں کی دکانیں دیکھیں، جو ہمارے بڑے شہروں میں نہیں ہوتیں۔ وہاں پر میں نے بڑی دیر بعد دھونکنی کے ساتھ برتن قلعی کرنے والا بندہ دیکھا، پھر عجیب بات، جس سے آپ سارے لوگ محروم ہیں اور آپ نہیں جانتے کہ وہاں ایک کسان کا لڑکا دیکھا، جو گندم کے باریک "ناڑ" جو تقریباً چھ انچ لمبا تھا، اسے کاٹ کر اس کے ساتھ "الغوزہ" بجاتا تھا۔ وہ اتنا خوبصورت الغوزہ بجاتا تھا کہ اگر آپ اسے

سننے لگیں، تو آپ بڑے بڑے اُستادوں کو بھول جائیں۔ پھر میں آرزو کرنے لگا کہ مجھے ہر شام بازار جانے کا موقع ملے۔ یہ چیزیں چھوٹی ہیں اور یہ بظاہر معمولی لگتی ہیں، لیکن ان کی اہمیت اپنی جگہ بہت زیادہ ہے۔

اگر آپ معمولی باتوں کی طرف دھیان دیں گے، اگر آپ اپنی "کنکری" کو بہت دور تک جھیل میں پھینکیں گے تو بہت بڑا دائرہ پیدا ہو گا، لیکن آپ کی یہ آرزو ہے کہ آپ کو بنا بنایا دائرہ کہیں سے مل جائے اور وہ آپ کی زندگی میں داخل ہو جائے، ایسا ہوتا نہیں ہے۔ قدرت کا ایک قانون ہے کہ جب تک آپ چھوٹی چیزوں پر، معمولی سی باتوں پر، جو آپ کی توجہ میں کبھی نہیں آئیں، اپنے بچے پر اور اپنی بھتیجی پر، آپ جب تک اس کی چھوٹی سی بات کو دیکھ کر خوش نہیں ہوں گے، تو آپ کو دنیا کی کوئی چیز یا دولت خوشی عطا نہیں کر سکے گی، کیونکہ روپیہ آپ کو خوشی عطا نہیں کر سکتا۔ روپے پیسے سے آپ کوئی کیمرہ خرید لیں، خواتین کپڑے خرید لیں اور وہ یہ چیزیں خریدتی چلی جاتی ہیں کہ یہ ہمیں خوشی عطا کریں گی۔ لیکن جب وہ چیز گھر میں آجاتی ہے تو اس کی قدر و قیمت گھٹنا شروع ہو جاتی ہے۔

خوشی تو ایسی چڑیا ہے جو آپ کی کوشش کے بغیر آپ کے دامن پر اتر آتی ہے۔ اس کے لئے آپ نے کوشش بھی نہیں کی ہوتی، تیار بھی نہیں ہوئے ہوتے، لیکن وہ آجاتی ہے۔ گویا اس رُخ پر جانے کے لئے جس کی آپ آرزو رکھتے ہیں، جو کہ بہت اچھی آرزو ہے، کیونکہ روحانیت کے بغیر انسان مکمل نہیں ہوتا، مگر جب تک اسے تلاش نہیں کرے گا، جب تک وہ راستہ یا پگڈنڈی اختیار نہیں کرے گا، اس وقت تک اسے اپنے مکمل ہونے کا حق نہیں پہنچتا۔ انسان یہ کوشش کرتا ضرور ہے، لیکن اس کی Methodology مختلف ہوتی ہے۔ وہ چھوٹی چیزوں سے بڑی کی طرف نہیں جاتا۔ آپ جب ایک بار یہ فن سیکھ جائیں گے، پھر آپ کو کسی بابے کا ایڈریس لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ پھر وہ چھوٹی چیز آپ کے اندر بڑا بابا بن کر سامنے آجائے گی اور آپ سے ہاتھ ملا کر آپ کی گائیڈ بن جائے گی اور آپ کو اس منزل پر یقیناً لے جائے گی، جہاں جانے کے آپ آرزومند ہیں۔

سو، ایک بار کبھی چھوٹی چیز سے آپ تجربہ کر کے دیکھ لیں۔ کبھی کسی نالائق پڑوسی سے خوش ہونے کی کوشش کر کے ہی یا کسی بے وقوف آدمی سے خوش ہو کر یا کبھی اخبار میں خوفناک خبر پڑھ کر دعا مانگیں کہ یا اللہ! تو ایسی خبریں کم کر دے، تو آپ کا راستہ، آپ کا پھاٹک کھلنا شروع ہو گا اور مجھے آپ کے چہروں سے

یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ یہ کوشش ضرور کریں گے۔ اللہ آپ کو بہت خوش رکھے۔ بہت آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین!!

ماضی کا البم

انسانی زندگی میں بعض اوقات ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ آدمی کو کسی چیز سے ایسی چڑ ہو جاتی کہ اس کا کوئی خاص جواز نہیں ہوتا مگر یہ ہوتی ہے۔ اور میں اُن خاص لوگوں میں سے تھا جس کو اس بات سے چڑ تھی کہ دروازہ بند کر دو۔ بہت دیر کی بات ہے کئی سال پہلے کی، جب ہم سکول میں پڑھتے تھے، تو ایک انگریز ہیڈ ماسٹر سکول میں آیا۔ وہ ٹیچرز اور طلباء کی خاص تربیت کے لیے متعین کیا گیا تھا۔ جب بھی اُس کے کمرے میں جاؤ وہ ایک بات ہمیشہ کہتا تھا۔

"Shut the Door Behind You."

پھر پلٹنا پڑتا تھا اور دروازہ بند کرنا پڑتا تھا۔

ہم دیسی آدمی تو ایسے ہیں کہ اگر دروازہ کھلا چھوڑ دیا تو بس کھلا چھوڑ دیا، بند کر دیا تو بند کر دیا، قمیص اُتار کے چارپائی پر پھینک دی، غسل خانہ بھی ایسے ہی کپڑوں

سے بھرا پڑا ہے، کوئی قاعدہ طریقہ یا رواج ہمارے ہاں نہیں ہوتا کہ ہر کام میں اہتمام کرتے پھریں۔

یہ کہنا کہ دروازہ بند کر دیں، ہمیں کچھ اچھا نہیں لگتا تھا اور ہم نے اپنے طور پر کافی ٹریننگ کی اور اُنہوں نے بھی اس بارے میں کافی سکھایا لیکن دماغ میں یہ بات نہیں آئی کہ بھئی دروازہ کیوں بند کیا جائے؟ رہنے دو کھلا کیا کہتا ہے، آپ نے بھی اپنے بچّوں، پوتوں، بھتیجوں کو دیکھا ہو گا وہ ایسا کرنے سے گھبراتے ہیں۔ بہت سال پہلے جب میں باہر چلا گیا تھا اور مجھے روم میں رہتے ہوئے کافی عرصہ گُزر گیا وہاں میری لینڈ لیڈی ایک درزن تھی جو سلائی کا کام کرتی تھی۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ درزی کا کام بہت معمولی سا ہے لیکن وہاں جا کر پتہ چلا کہ یہ عزّت والا کام ہے۔ اُس درزن کی وہاں ایک بوتیک تھی اور وہ بہت باعزّت لوگ تھے۔

میں اُن کے گھر میں رہتا تھا۔ اُن کی زبان میں درزن کو سارتہ کہتے ہیں میں جب اُس کے کمرے میں داخل ہوتا اُس نے ہمیشہ اپنی زبان میں کہا "دروازہ بند کرنا ہے" وہ چڑ جو بچپن سے میرے ساتھ چلی تھی وہ ایم اے پاس کرنے کے بعد، یونیورسٹی کا پروفیسر لگنے کے بعد بھی میرے ساتھ ہی رہی۔ یہ بات بار بار سُننی پڑتی تھی تو بڑی تکلیف ہوتی، اور پھر لوٹ کے دروازہ بند کرنا، ہمیں تو عادت ہی

نہیں تھی۔ کبھی ہم آرام سے دھیمے انداز میں گروباپائی سے کمرے میں داخل ہی نہیں ہوئے، کبھی ہم نے کمرے میں داخل ہوتے وقت دستک نہیں دی، جیسا کہ قران پاک میں بڑی سختی سے حکم ہے کہ جب کسی کے ہاں جاؤ تو پہلے اُس سے اجازت لو، اور اگر وہ اجازت دے تو اندر آؤ، ورنہ واپس چلے جاؤ۔ پتہ نہیں یہ حکم اٹھارویں پارے میں ہے کہ انتیسویں میں کہ اگر اتّفاق سے تم نے اجازت نہ لی ہو اور پھر کسی ملنے والے کے گھر چلے جاؤ اور وہ کہہ دے کہ میں آپ سے نہیں مل سکتا تو ماتھے پر بل ڈالے بغیر واپس آجاؤ۔

کیا پیارا حکم ہے لیکن ہم میں سے کوئی بھی اس کو تسلیم نہیں کرتا۔ ہم کہتے ہیں کہ اندر گھُسا ہوا ہے اور کہہ رہا ہے کہ میں نہیں مل سکتا، ذرا باہر نکلے تو اس کو دیکھیں گے وغیرہ وغیرہ، ہماری انا اس طرح کی ہے اور یہ کہنا کہ "دروازہ بند کر دیں" بھی عجیب سی بات لگتی ہے۔ ایک روز میں نے بار بار یہ سُننے کے بعد روم میں زچ ہو کر اپنی اُس لینڈ لیڈی سے پوچھا کہ آپ اس بات پر اتنا زور کیوں دیتی ہیں۔ میں ایک بات تو سمجھتا ہوں کہ یہاں (روم میں) سردی بہت ہے، برف باری بھی ہوتی ہے کبھی کبھی اور "تیز وینتو" (رومی زبان کا لفظ مطلب ٹھنڈی ہوائیں چلنا) بھی ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ کھُلے ہوئے دروازے سے میں بالکل شمشیر زنی کرتی ہوئی کمروں میں داخل ہوتی ہیں۔ یہاں تک تو آپ کی دروازہ بند کرنے

والی فرمائش بجا ہے لیکن آپ اس بات پر بہت زیادہ زور دیتی ہیں۔ چلو اگر کبھی دروازہ کھلا رہ گیا اور اُس میں سے اندر ذرا سی ہوا آگئی یا برف کی بوچھاڑ ہو گئی تو اس میں ایسی کون سی بڑی بات ہے۔

اس نے کہا کہ تم ایک سٹول لو اور یہاں میرے سامنے بیٹھ جاؤ (وہ مشین پر کپڑے سی رہی تھی) میں بیٹھ گیا وہ بولی دروازہ اس لیے بند نہیں کرایا جاتا اور ہم بچپن سے بچّوں کو ایسا کرنے کی ترغیب اس لیے نہیں دیتے کہ ٹھنڈی ہوا نہ آ جائے یا دروازہ کھلا رہ گیا تو کوئی جانور اندر آجائے گا بلکہ اس کا فلسفہ بہت مختلف ہے اور یہ کہ اپنا دروازہ، اپنا وجود ماضی کے اوپر بند کر دو، آپ ماضی میں سے نکل آئے ہیں اور اس جگہ پر اب حال میں داخل ہو گئے ہیں۔ ماضی سے ہر قسم کا تعلق کاٹ دو اور بھول جاؤ کہ تم نے کیسا ماضی گُزارا ہے اور اب تم ایک نئے مُستقبل میں داخل ہو گئے ہو۔ ایک نیا دروازہ تمہارے آگے کھُلنے والا ہے، اگر وہی کھلا رہے گا تو تم پلٹ کر پیچھے کی طرف ہی دیکھتے رہو گے۔ اُس نے کہا کہ ہمارا سارے مغرب کا فلسفہ یہ ہے اور دروازہ بند کر دو کا مطلب لکڑی، لوہے یا پلاسٹک کا دروازہ نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب تمہارے وجود کے اوپر ہر وقت کھلا رہنے والا دروازہ ہے۔ اُس وقت میں ان کی یہ بات نہیں سمجھ سکا جب تک میں لوٹ کے یہاں (پاکستان) نہیں آگیا اور میں اپنے جن بابوں کا ذکر کیا کرتا ہوں

ان سے نہیں ملنے لگا۔ میرے بابا نے مومن کی مجھے یہ تعریف بتائی کہ مومن وہ ہے جو ماضی کی یاد میں مبتلا نہ ہو اور مستقبل سے خوفزدہ نہ ہو۔ (کہ یا اللہ پتہ نہیں آگے چل کے کیا ہونا ہے) وہ حال میں زندہ ہو۔

آپ نے ایک اصلاح اکثر سُنی ہو گی کہ فلاں بُزرگ بڑے صاحبِ حال تھے۔ مطلب یہ کہ اُن کا تعلق حال سے تھا وہ ماضی کی یاد اور مستقبل کی فکر کے خوف میں مبتلا نہیں تھے۔ مجھے اُس لینڈ لیڈی نے بتایا کہ دروازہ بند کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اب تم ایک نئے عہد، ایک نئے دور ایک نئے Era اور ایک اور وقت اور زمانے میں داخل ہو چکے ہیں اور ماضی پیچھے رہ گیا ہے۔ اب آپ کو اس زمانے سے فائدہ اُٹھانا ہے اور اس زمانے کے ساتھ نبرد آزمائی کرنی ہے جب میں نے یہ مطلب سُنا تو ہم چکا چوند گیا کہ میں کیا ہم سارے ہی دروازہ بند کرنے کا مطلب یہی لیتے ہیں جو عام طور پر ہو یا عام اصطلاح میں لیا جاتا ہے۔ بچّوں کو یہ بات شروع سے سکھانی چاہیے کہ جب تم آگے بڑھتے ہو، جب تم زندگی میں داخل ہوتے ہو، کسی نئے کمرے میں جاتے ہو تو تمہارے آگے اور دروازے ہیں جو کھُلنے چاہئیں۔ یہ نہیں کہ تم پیچھے کی طرف دھیان کر کے بیٹھے رہو۔

جب اُس نے یہ بات کہی اور میں نے سُنی تو پھر میں اس پر غور کرتا رہا اور میرے ذہن میں اپنی زندگی کے واقعات، ارد گرد کے لوگوں کی زندگی کے واقعات بطور خاص اُجاگر ہونے لگے اور میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ ہم لوگوں میں سے بہت سے لوگ آپ نے ایسے دیکھے ہوں گے جو ہر وقت ماضی کی فائل بلکہ ماضی کے البم بغل میں دبائے پھرتے ہیں۔ اکثر کے پاس تصویریں ہوتی ہیں۔ کہ بھائی جان میرے ساتھ یہ ہو گیا، میں چھوٹا ہوتا تھا تو میرے ابّا جی مجھے مارتے تھے سوتیلی ماں تھی، فلاں فلاں، وہ نکلتے ہی نہیں اس یادِ ماضی سے۔ میں نے اس طرح ماضی پر رونے دھونے والے ایک دوست سے پوچھا آپ اب کیا ہیں؟ کہنے لگے جی میں ڈپٹی کمشنر ہوں لیکن رونا یہ ہے کہ جی میرے ساتھ یہ زمانہ بڑا ظلم کرتا رہا ہے۔ وہ ہر وقت یہی کہانی سُناتے۔ ہمارے مشرق میں ایشیا، فارس تقریباً سارے مُلکوں میں یہ رواج بہت عام ہے اور ہم جب ذکر کریں گے اس "دردناکی" کا ذکر کرتے رہیں گے۔ ہماری ایک آپا سُکیاں ہیں۔ جو کہتی ہیں کہ میری زندگی بہت بربادی میں گزری بھائی جان، میں نے بڑی مشکل سے وقت کاٹا ہے۔ اب ایک بیٹا تو ورلڈ بینک میں ملازم ہے ایک یہاں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہے۔ ایک بیٹا سرجن ہے (انکے خاوند کی بھی اچھی تنخواہ تھی، اچھی رشوت بھی لیتے رہے، اُنھوں نے بھی کافی کامیاب زندگی بسر کی)

میں نے ایک بار اُن سے پوچھا تو کہنے لگے بس گُزارا ہو ہی جاتا ہے، وقت کے تقاضے ایسے ہوتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آدھی رشوت تو آپ سرکاری افسر ہونے کے ناتے دے کر سرکاری سہولتوں کی مد میں وصول کرتے ہیں مثلاً آپ کی اٹھارہ ہزار روپے تنخواہ ہو گی تو ایک کار ایک دوسری کار، پانچ نوکر، گھر، یہ اللہ کے فضل سے بہت بڑی بات ہے کی اس کے علاوہ بھی چاہیے۔ وہ بولے ہاں اس کے علاوہ بھی ضرورت پڑتی ہے لیکن ہم نے بڑا دُکھی وقت گُزارا ہے، مشکل میں گُزارا، ہمارا ماضی بہت دردناک تھا۔ وہ ماضی کا دروازہ بند ہی نہیں کرتے۔ ہر وقت یہ دروازہ نہ صرف کھلا رکھتے ہیں بلکہ اپنے ماضی کو ساتھ اُٹھائے پھرتے ہیں۔ میں نے بہت سے ایسے لوگ دیکھے، آج کے بعد آپ بھی غور فرمائیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ ان کے پاس اپنے ماضی کی رنگین البمیں ہوتی ہیں۔ ان میں فوٹو لگے ہوئے ہوتے ہیں اور دُکھ درد کی کہانیاں بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ اگر وہ دُکھ درد کی کہانیاں بند کر دیں، کسی نہ کسی طور پر تگڑے ہو جائیں اور یہ تہیہ کر لیں کہ اللہ نے اگر ایک دروازہ بند کیا تو وہ اور کھولے گا، تو یقیناً اور دروازے کھلتے جائیں گے۔

اگر آپ پلٹ کر پیچھے دیکھتے جائیں گے اور اُسی دروازے میں سے جھانک کے وہی گندی مندی، گری پڑی چیزوں کو اکٹھا کرتے رہیں گے تو آگے نہیں جا

سکتے۔ اس طرح سے مجھے پتہ چلا کہ Shut behind the door کا مطلب یہ نہیں ہے جو میں سمجھتا رہا ہوں۔ وہ تو اچھا ہو گیا کہ میں اتفاق سے وہاں چلا گیا ورنہ ہمارے جو انگریز اُستاد آئے تھے اُنھوں نے اس تفصیل سے نہیں بتایا تھا۔ آپ کو ہم کو، سب کو یہ کوشش ضرور کرنی چاہیے کہ ماضی کا پیچھا چھوڑ دیں۔

ہمارے بابے، جن کا میں اکثر ذکر کرتا ہوں، بار بار کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا، اُن کے ڈیروں پر آپ جا کر دیکھیں، وہ ماضی کی بات نہیں کریں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ بسم اللہ آپ یہاں آ گئے ہیں، یہ نئی زندگی شروع ہو گئی ہے، آپ بالکل روشن ہو جائے، چمک جایئے۔ جب ہمارے جیسے نالائق بُری ہیئت رکھنے والے آدمی اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، تو وہ نعرہ مار کے کہتے ہیں واہ واہ! رونق ہو گئی، برکت ہو گئی، ہمارے ڈیرے کی کہ آپ جیسے لوگ آ گئے۔ اب آپ دیکھیے ہمارے اوپر مشکل وقت ہے، لیکن سارے ہی اپنے اپنے انداز میں مستقبل سے خوفزدہ رہتے ہیں کہ پتا نہیں جی کیا ہو گا اور کیسا ہو گا؟ میں یہ کہتا ہوں کہ ہمیں سوچنا چاہیے۔ ہم کوئی ایسے گرے پڑے ہیں، ہم کوئی ایسے مرے ہوئے ہیں، ہمارا پچھلا دروازہ تو بند ہے، اب تو ہم آگے کی طرف چلیں گے اور ہم کبھی مایوس نہیں ہوں گے، اس لیے کہ اللہ نے بھی حکم دے دیا ہے کہ مایوس نہیں ہونا، اس لیے حالات مشکل ہوں گے، تکلیفیں آئیں گی، بہت چیخیں نکلیں

گی۔ لیکن ہم مایوس نہیں ہوں گے، کیونکہ ہمارے اللہ کا حکم ہے اور ہمارے نبی کے ذریعے یہ فرمان دیا گیا ہے کہ لا تقنطو من رحمتہ اللہ (یعنی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں)۔

بعض اوقات یہ پتا نہیں چلتا کہ اللہ کی رحمت کے کیا کیا رُوپ ہوتے ہیں۔ آدمی یہ سمجھتا ہے میرے ساتھ یہ زیادتی ہو رہی ہے، میں Demote ہو گیا ہوں، لیکن اس Demote ہونے میں کیا راز ہے؟ یہ ہم نہیں سمجھ سکتے۔ اس راز کو پکڑنے کے لیے ایک ڈائریکٹ کنکشن اللہ کے ساتھ ہونا چاہیے اور اُس سے پوچھنا چاہیے کہ جناب! اللہ تعالیٰ میرے ساتھ یہ جو مشکل ہے، میرے ساتھ یہ تنزّلی کیوں ہے؟ لیکن ہمیں اتنا وقت نہیں ملتا اور ہم پریشانی میں اتنا گُم ہو جاتے ہیں کہ ہمیں وقت ہی نہیں ملتا، ہمارے ساتھ یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ ہمیں بازاروں میں جانے کا وقت مل جاتا ہے، تفریح کے لیے مل جاتا ہے، دوستوں سے ملنے، بات کرنے کا وقت مل جاتا ہے۔ لیکن اپنے ساتھ بیٹھنے کا، اپنے اندر جھانکنے کا کوئی وقت میسر نہیں آتا۔

آپ ہی نہیں، میں بھی ایسے لوگوں میں شامل ہوں۔ اگر میں اپنی ذات سے پوچھوں کہ اشفاق احمد صاحب! آپ کو اپنے ساتھ بیٹھنے کا کتنا وقت ملتا ہے؟ کبھی آپ نے اپنا احتساب کیا ہے؟

تو جواب ظاہر ہے کہ کیا ملے گا۔ دوسروں کا احتساب تو ہم بہت کر لیتے ہیں۔ اخباروں میں، کالموں میں، اداریوں میں لیکن میری بھی تو ایک شخصیت ہے، میں بھی تو چاہوں گا کہ میں اپنے آپ سے پوچھوں کہ ایسا کیوں ہے، اگر ایسا ممکن ہو گیا، تو پھر خفیہ طور پر، اس کا کوئی اعلان نہیں کرنا ہے، یہ بھی اللہ کی بڑی مہربانی ہے کہ اُس نے ایک راستہ رکھا ہوا ہے، توبہ کا! کئی آدمی تو کہتے ہیں کہ نفل پڑھیں، درود وظیفہ کریں، لیکن یہ اُس وقت تک نہیں چلے گا، جب تک آپ نے اُس کیے ہوئے برے کام سے توبہ نہیں کر لی، توبہ ضروری ہے۔ جیسا آپ کاغذ لے کے نہیں جاتے کہ "ٹھپّہ" لگوانے کے لیے۔ کوئی "ٹھپّہ" لگا کر دستخط کر دے گا اور پھر آپ کا کام ہو جاتا ہے، اس طرح توبہ وہ "ٹھپّہ" ہے جو لگ جاتا ہے اور بڑی آسانی سے لگ جاتا ہے، اگر آپ تنہائی میں دروازہ بند کر کے بیٹھیں اور اللہ سے کہیں کہ! اللہ میاں پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا، مجھ سے یہ غلطی، گناہ ہو گیا اور میں اس پر شرمندہ ہوں۔(میں یہ Reason نہیں دیتا کہ Human Being کمزور ہوتا ہے، یہ انسانی کمزوری ہے یہ بڑی فضول بات ہے ایسی کرنی

ہی نہیں چاہیے) بس یہ کہے کہ مجھ سے کوتاہی ہوئی ہے اور میں اے خداوند تعالیٰ آپ سے معافی چاہتا ہوں اور میں کسی کو یہ بتا نہیں سکتا، اس لیے کہ میں کمزور انسان ہوں۔ بس آپ سے معافی مانگتا ہوں۔

اس طرح سے پھر زندگی کا نیا، کامیاب اور شاندار راستہ چل نکلتا ہے۔ لیکن اگر آپ اپنے ماضی کو ہی اُٹھائے پھریں گے، اُس کی فائلیں ہی بغل میں لیے پھریں گے اور یہی رونا روتے رہیں گے کہ میرے ابّا نے دوسری شادی کر لی تھی، یا میرے ساتھ سختی کرتے رہے، یا اُنہوں نے بڑے بھائی کو زیادہ دے دیا، مجھے کچھ کم دے دیا، چھوٹے نے زیادہ لے لیا، شادی میں کوئی گڑبڑ ہوئی تھی۔ اس طرح تو یہ سلسلہ کبھی ختم ہی نہیں ہو گا، پھر تو آپ وہیں کھڑے رہ جائیں گے، دہلیز کے اوپر اور نہ دروازہ کھولنے دیں گے، نہ بند کرنے دیں گے، بس پھنسے ہوئے رہیں گے۔ لیکن آپ کو چاہیے کہ آپ Shut Behind The Door کر کے زندگی کو آگے لے کر چلیں۔ آپ زندگی میں یہ تجربہ کر کے دیکھیں۔ ایک مرتبہ تو ضرور کریں۔ آپ میری یہ بات سننے کے بعد جو میری نہیں میری لینڈ لیڈی، اُس اطالوی درزن کی بات ہے، اس پہ عمل کر کے دیکھیں۔

اس کے بعد میں نے رونا چھوڑ دیا اور ہر ایک کے پاس جا کر رحم کی اور ہمدردی کی بھیک مانگنا چھوڑ دی۔ آدمی اپنے دُکھ کی البم دکھا کر بھیک ہی مانگتا ہے نا! جسے سُن کر کہا جاتا ہے کہ بھئی! غلام محمّد، یا نور محمّد یا سلیم احمد تیرے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی۔ اس طرح دو لفظ آپ کیا حاصل کر لیں گے اور سمجھیں گے کہ میں نے بہت کچھ سر کر لیا، لیکن وہ قلعہ بدستور قائم رہے گا، جسے فتح کرنا ہے۔ اگر آپ تہیہ کر لیں گے کہ یہ ساری مشکلات، یہ سارے بل، یہ سارے یوٹیلٹی کے خوفناک بل تو آتے ہی رہیں گے، یہ تکلیف ساتھ ہی رہے گی، بچّے بھی بیمار ہوں گے، بیوی بھی بیمار ہو گی، خاوند کو بھی تکلیف ہو گی، جسمانی عارضے بھی آئیں گے، روحانی بھی، نفسیاتی بھی۔ لیکن ان سب کے ہوتے ہوئے ہم تھوڑا سا وقت نکال کر اور مغرب کا وقت اس کے لیے بڑا بہتر ہوتا ہے، کیونکہ یوں تو سارے ہی وقت اللہ کے ہیں، اس وقت الگ بیٹھ کر ضرور اپنی ذات کے ساتھ کچھ گفتگو کریں اور جب اپنے آپ سے وہ گفتگو کر چکیں، تو پھر خفیہ طور پر وہی گفتگو اپنے اللہ سے کریں، چاہے کسی بھی زبان میں، کیونکہ اللہ ساری زبانیں سمجھتا ہے، انگریزی میں بات کریں، اردو، پنجابی، پشتو اور سندھی جس زبان میں چاہے اس زبان میں آپ کا یقیناً اُس سے رابطہ قائم ہو گا اور اس سے آدمی تقویت پکڑتا ہے، بجائے اس کے آپ مجھ سے آ کر کسی بابے کا پوچھیں، ایسا نہیں ہے۔ آپ

خود بابے ہیں۔ آپ نے اپنی طاقت کو پہچانا ہی نہیں ہے۔ جس طرح ہمارے جوگی کیا کرتے ہیں کہ ہاتھی کی طاقت سارے جانوروں سے زیادہ ہے۔ لیکن چونکہ اس کی آنکھیں چھوٹی ہوتی ہیں، اس لیے وہ اپنی طاقت، وجود کو، پہچانتا ہی نہیں۔ ہاتھی جانتا ہی نہیں کہ میں کتنا بڑا ہوں۔ اس طرح سے ہم سب کی آنکھیں بھی اپنے اعتبار سے چھوٹی ہیں اور ہم نے اپنی طاقت کو، اپنی صلاحیت کو جانا ہی نہیں۔

اللہ میاں نے تو انسان کو بہت اعلیٰ و ارفع بنا کر سجود و ملائک بنا کر بھیجا ہے۔ یہ باتیں یاد رکھنے کی ہیں کہ اب تک جتنی بھی مخلوق نے انسان کو سجدہ کیا تھا، وہ انسان کے ساتھ ویسے ہی نباہ کر رہی ہے۔ یعنی شجر، حجر، نباتات، جمادات اور فرشتے وہ بدستور انسان کا احترام کر رہے ہیں۔ انسان سے کسی کا احترام کم ہی ہوتا ہے۔ اب جب ہم یہاں بیٹھے ہیں، تو اس وقت کروڑوں ٹن برف کے ٹوپر پڑی آوازیں دے کر پکار پکار کر سورج کی منّتیں کر رہی ہے کہ ذرا ادھر کرنیں زیادہ ڈالنا، سندھ میں پانی نہیں ہے۔ جہلم، چناب خشک ہیں اور مجھے وہاں پانی پہنچانا ہے اور نوعِ انسان کو پانی کی ضرورت ہے۔ برف اپنا آپ پگھلاتی ہے اور آپ کو پانی دے کر جاتی ہے۔ صبح کے وقت اگر غور سے سوئی گیس کی آواز سُنیں اور اگر آپ اس درجے یا جگہ پر پہنچ جائیں کہ اس کی آواز سن سکیں، تو وہ چیخ چیخ کر اپنے

سے سے نیچے والے کو کہہ رہی ہوتی ہے نی کُڑیو! چھیتی کرو۔ باہر نکلو، جلدی کرو تم تو ابھی ہار سنگھار کر رہی ہو۔ بچوں نے سکول جانا ہے۔ ماؤں کو انہیں ناشتہ دینا ہے۔ لوگوں کو دفتر جانا ہے۔ چلو اپنا آپ قربان کرو۔ وہ اپنا آپ قربان کر کے جل بھن کر آپ کا ناشتہ، روٹیاں تیار کرواتی ہے۔

یہ سب پھل، سبزیاں اپنے وعدے پر قائم ہیں۔ یہ آم دیکھ لیں، آج تک کسی انور راٹھور یا کسی ثمر بہشت درخت نے اپنا پھل خود کھا کر یا چوس کر نہیں دیکھا۔ بس وہ تو انسانوں سے کیے وعدے کی فکر میں رہتا ہے کہ میرا پھل توڑ کر بلوچستان ضرور بھیجو، وہاں لوگوں کو آم کم ملتا ہے۔ اس کا اپنے اللہ کے ساتھ رابطہ ہے اور وہ خوش ہے۔ آج تک کسی درخت نے افسوس کا اظہار نہیں کیا۔ شکوہ نہیں کیا کہ ہماری بھی کوئی زندگی ہے، جی جب سے کھڑے ہیں، وہیں کھڑے ہیں۔ نہ کبھی اوکاڑہ گئے نہ کبھی آگے گئے، ملتان سے نکلے ہی نہیں۔ میرا پوتا کہتا ہے دادا! ہو سکتا ہے کہ درخت ہماری طرح ہی روتا ہو، کیونکہ اس کی باتیں اخبار نہیں چھاپتا۔ میں نے کہا وہ پریشان نہیں ہوتا، نہ روتا ہے، وہ خوش ہے اور ہوا میں جھومتا ہے۔ کہنے لگا، آپ کو کیسے پتا ہے کہ وہ خوش ہے؟ میں نے کہا کہ وہ خوش ایسے ہے کہ ہم کو باقاعدگی سے پھل دیتا ہے۔ جو ناراض ہو گا، تو وہ پھل نہیں دے گا۔

میں اگر اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھوں، میں جو اشفاق احمد ہوں، میں پھل نہیں دیتا۔ میرے سارے دوست میرے قریب سے گُزر جاتے ہیں۔ میں نہ تو انور راٹھور بن سکا، نہ ثمر بہشت بن سکا نہ میں سوئی گیس بن سکا۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ !!

ویل وشنگ

میں اکثر عرض کرتا ہوں کہ جب وقت ملے اور گھر میں کوئی دیوار ہو تو اُس کے ساتھ ٹیک لگا کر زمین پر بیٹھ کر اپنا تجزیہ ضرور کیا جانا چاہیے۔ یہ ہے تو ذرا سا مشکل کام اور اس پر انسان اس قدر شدّت سے عمل پیرا نہیں ہو سکتا، جو درکار ہے، کیونکہ ایسا کرنے سے بہت سی اپنی باتیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ آپ نے سُنا ہو گا کہ یہ جو رفوگر ہیں، کشمیر میں برف باری کے دنوں میں اپنا سوئی دھاگہ لے کر چلے جاتے ہیں اور وہاں کپڑے کے اندر ہو جانے والے بڑے بڑے شگافوں کی رفوگری کا کام کرتے ہیں، جن میں خاص طور پر گرم کپڑوں کے شگاف اور ''لگار'' اور چٹاخ جو ہوتے ہیں اُن کی رفوگری کرتے ہیں، وہ کہاں سے دھاگہ لیتے ہیں اور کس طرح سے اس کو اس دھاگے کے ساتھ مہارت سے ملاتے ہیں کہ ہم ''ٹریس'' نہیں کر سکتے کہ یہاں پر اتنا بڑا (Gap) سُوراخ ہو گیا تھا، کیونکہ وہ بالکل ایسا کر دیتے ہیں، جیسے کپڑا کارخانے سے بن کر آتا ہے۔

یہ رفو گروں کا کمال ہے۔ وہ غریب لوگ اپنی چادر لے کر اور اپنی کانگڑی (مٹّی کی بھٹّی) سُلگا کر اُس میں کوئلے ڈال کر، دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھے ہوتے ہیں اور بہت بھلے لوگ ہیں یہ کشمیری لوگ بڑی ہی بھلی کمیونٹی ہیں، کیونکہ وہ اپنا تجزیہ کرتے ہیں اور اُن کو پتہ چلتا رہتا ہے اپنے اس Self کا جو لے کر انسان پیدا ہوا تھا، محفوظ رکھا ہوا ہے یا نہیں۔ گو ہم نے تو اپنی Self کے اوپر بہت بڑے بڑے سائن بورڈ لگا لیے ہیں، اپنے نام تبدیل کر لیے ہیں، اپنی ذات کے اوپر ہم نے پینٹ کر لیا ہے۔ ہم جب کسی سے ملتے ہیں، مثلاً میں آپ سے اس اشفاق کی طرح نہیں ملتا، جو میں پیدا ہوا تھا، میں تو ایک رائٹر، ایک دانشور، ایک سیاستدان، ایک مکّار، ایک ٹیچر بن کر ملتا ہوں۔ اس طرح آپ جب مجھ سے ملتے ہیں تو آپ اپنے اپنے سائن بورڈ مجھے دکھاتے ہیں۔ اصل Self کہاں ہے، وہ نہیں ملتی۔ اصل Self جو اللہ نے دے کر پیدا کیا ہے، وہ تب ہی ملتا ہے، جب آدمی اپنے نفس کو پہچانتا ہے، لیکن اُس وقت جب وہ اکیلا بیٹھ کر غور کرتا ہے، کوئی اُس کو بتا نہیں سکتا اپنے نفس سے تعارف اُس وقت ممکن ہے جب آپ اُس کے تعارف کی پوزیشن میں ہوں اور اکیلے ہوں۔ جس طرح خُداوند تعالیٰ فرماتا ہے جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا، اُس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

جس انسان نے خود کو پہچان لیا کہ میں کون ہوں؟ وہ کامیاب ہو گیا اور وہ لوگ خوش قسمت ہیں جو باوجود اس کے کہ علم زیادہ نہیں رکھتے، اُن کی تعلیم بھی کچھ زیادہ نہیں، لیکن علم اُن پر وارد ہوتا رہتا ہے، جو ایک خاموش آدمی کو اپنی ذات کے ساتھ دیر تک بیٹھنے میں عطا ہوتا ہے۔

میں پہلے تو نہیں اب کبھی کبھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ اور عمر کے اس حصّے میں میری طبیعت پر ایک عجیب طرح کا بوجھ ہے، جو کسی طرح سے جاتا نہیں۔ میں آپ سے بہت سی باتیں کرتا ہوں۔ اب میں چاہوں گا کہ میں اپنی شکل آپ کے سامنے بیان کروں اور آپ بھی میری مدد کریں، کیونکہ یہ آپ کا بھی فرض بنتا ہے کہ آپ مجھ جیسے پریشان اور درد مند آدمی کا سہارا بن جائیں۔ ہمارے بابے جن کا میں اکثر ذکر کرتا ہوں، کہتے ہیں کہ اگر آپ کسی محفل میں کسی یونیورسٹی، سیمینار، اسمبلی میں، کسی اجتماع میں یا کسی بھی انسانی گروہ میں بیٹھے کوئی موضوع شدّت سے ڈسکس کر رہے ہوں اور اُس پر اپنے جواز اور دلائل پیش کر رہے ہوں اور اگر آپ کے ذہن میں کوئی ایسی دلیل آجائے جو بہت طاقتور ہو اور اُس سے اندیشہ ہو کہ اگر میں یہ دلیل دوں گا تو یہ بندہ شرمندہ ہو جائے گا کیونکہ اُس آدمی کے پاس اس دلیل کی کاٹ نہیں ہو گی۔ شطرنج کی ایسی چال میرے پاس آ

گئی ہے کہ یہ اس کا جواب نہیں دے سکے گا۔ اس موقع پر "بابے" کہتے ہیں کہ، اپنی دلیل روک لو، بندہ بچالو، اسے ذبح نہ ہونے دو، کیونکہ وہ زیادہ قیمتی ہے۔

ہم نے تو ساری زندگی کبھی ایسا کیا ہی نہیں۔ ہم تو کہتے ہیں کہ میں کھڑکا پادیاں گا۔ ہماری بیبیاں جس طرح کہتی ہیں کہ میں تے آپاں جی فیر سدھی ہو گئی، اوہنوں ایسا جواب دتا کہ اوہ تھر تھر کنبن لگ پئی، میں اوہنوں اک اک سُنائی، اوہدی ماسی دیاں کرتوتاں اوہدی پھوپھی دیاں وغیرہ وغیرہ۔

(باجی میں نے تو اُس کو کھری کھری سنا دیں، جس سے وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ اُس کو اُس کی خالہ، پھوپھی سب کی باتیں ایک ایک کر کے سُنائیں۔)

خیر انسان کمزور ہے، ہم بھی ایسے ہی کرتے ہیں۔ بڑی دیر کی بات ہے، 1946ء کی جب پاکستان نہیں بنا تھا۔ میں اُس وقت بی اے کر چکا تھا اور تازہ تازہ ہی کیا تھا۔ ہمارے قصبے کے ساتھ ایک گاؤں تھا۔ اس میں ایک ڈسٹرکٹ بورڈ مڈل سکول تھا، وہاں کا ہیڈ ماسٹر چھٹی پر گیا۔ اُس کی جگہ تین ماہ کے لیے مجھے ہیڈ ماسٹر بنا دیا گیا۔ اب میں ایک پدّا سا (چھوٹے قد کا) نوجوان بڑے فخر کے ساتھ ایک سکول ہینڈل کر رہا ہوں۔ گو مجھے زیادہ تجربہ نہیں ہے، لیکن میں زور لگا کے یہ بتانا چاہتا ہوں دوسرے ماسٹروں کو کہ بی اے کیا ہوتا ہے، کیونکہ وہ بیچارے نارمل

سکول پڑھے ہوئے تھے۔ جیسا کہ ہر نئے آدمی کی عادت ہوتی ہے یا جو بھی کسی جگہ نیا آتا ہے، وہ ہمیشہ سسٹم ٹھیک کرنے پر لگ جاتا ہے۔ یہ بندے کے اندر ایک عجیب بلا ہے۔ میں نے بھی سوچا کہ میں سکول کا سسٹم ٹھیک کروں گا، حالانکہ مجھے چاہیے تو یہ تھا کہ میں پڑھاتا اور بہتر طور پر پڑھاتا اور جیسا نظام چل رہا تھا، اُسے چلنے دیتا، لیکن میں نے کہا نہیں، اس کا سسٹم بدلنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے کہا یہ گملا ادھر نہیں اُدھر ہونا چاہیے۔ وہ جو سن فلاور (سورج مکھی) ہوتا ہے، وہ مجھے بہت بُرا لگتا ہے۔ اُس پیلے پھول کو میں نے وہاں سے نکال دینے کا حکم دیا۔ اب اگلا پھٹا (ڈیسک) پیچھے کر کے پچھلا آگے کر کے سسٹم تبدیل ہو رہا ہے۔ گملوں کو گیرو لگا دو، سُرخ رنگ کا، سفیدی کر دو، تمام ماسٹر صاحبان پگڑی باندھ کر آئیں۔ اس طرح سکول میں سسٹم کی تبدیلی جاری تھی۔ ماسٹر بیچارے بھی عذاب میں مُبتلا ہو گئے۔ سکول میں چھٹی کے وقت پہاڑے کہلوائے جاتے تھے۔ چھ کا پہاڑہ ماسٹر صاحب کہلوا رہے تھے۔

چھ ایکم چھ، چھ دونی بارہ

چھ تیا اٹھارا، چھ چوکے چووی

میں نے سکول میں ایک شرط عائد کر دی کہ بچوں میں شرمندگی اور خفّت دور کرنے کے لیے ان کو سٹیج پر آنا چاہیے اور بلیک بورڈ (تختہ سیاہ) کے سامنے کھڑے ہو کر یہ پہاڑہ لکھنا چاہیے۔ چوتھی جماعت کا ایک لڑکا تھا، اب مجھے اُس کا نام یاد نہیں صادق تھا یا صدیق۔ اُس نے تختہ سیاہ پر لکھنے سے انکار کر دیا کہ میں نہیں لکھوں گا۔ اُستاد نے کہا کہ یہ ہیڈ ماسٹر صاحب کا حکم ہے، تمہیں وہاں جا کر لکھنا پڑے گا، لیکن اُس نے صاف انکار کر دیا۔ وہ شرماتا ہو گا بیچارہ گاؤں کا لڑکا۔ اُسے میرے سامنے پیش کیا گیا۔ بتایا گیا کہ یہ لڑکا پہاڑہ تو ٹھیک جانتا ہے، لیکن بورڈ پر لکھتا نہیں۔ میں نے پوچھا، تم کیوں نہیں لکھتے، اُس نے کہا میں نہیں لکھوں گا۔ میں نے اُس کا کان پکڑ کر مروڑا اور کہا کیا تجھے معلوم ہے کہ میں تجھے سخت سزا دوں گا، کیونکہ تم میرے اصول کے مطابق کام نہیں کر رہے۔ اُس نے کہا جی میں یہ نہیں کر سکتا، مجھ سے لکھا نہیں جاتا شرمیلا تھا شاید۔ میں نے ماسٹر صاحب سے کہا کہ آپ ایسا کریں کہ اسے ساری کلاسوں میں پھرائیں اور سب کو بتائیں کہ یہ نافرمان بچّہ ہے اور اس نے ہیڈ ماسٹر صاحب کی بات نہیں مانی۔ ماسٹر صاحب اُسے میرے حکم کے مطابق لے گئے اور اُسے گھماتے رہے۔ دیگر اُستادوں نے بھی بادل نخواستہ اپنی طبیعت پر بوجھ سمجھ کر میرے اس حکم کو قبول کیا، تاہم اُنہوں نے میری یہ بات پسند نہیں کی، جسے میں اپنی انتظامی

صلاحیت خیال کرتا تھا۔ اس کے بعد وہ لڑکا چلا گیا۔ اس کے بعد کبھی سکول نہیں آیا۔ آپس کے والدین نے بھی کہا کہ جی وہ سکول نہیں جاتا۔ گھر پر ہی رہتا ہے۔ میں نے اپنے ایک فیصلے اور حکم سے اُسے اتنا بڑا زخم دے دیا تھا کہ وہ اُس کی تاب نہ لا سکا۔ گو میں نے بد نیتی سے ایسا نہیں کیا تھا، لیکن اب میں بیٹھ کر سوچتا ہوں، تو دیکھتا ہوں کہ میں نے اتنے اچھے صحت مند پیارے بچّے کے ساتھ کیا حماقت کی ہے۔ اُس وقت میرے ذہن میں Scar یعنی زخم کا لفظ نہیں آیا۔ تب میں سمجھتا تھا کہ پڑھانے کے لیے ایسا ہی سخت رویہ ہونا چاہیے۔

وہ زمانہ گُزر گیا، پاکستان بن گیا۔ ہم ادھر آ گئے۔ وہ لوگ پتا نہیں کدھر ہوں گے۔ ایسے ہی مجھے پتا چلا کہ وہ گھرانہ ساہیوال چلا گیا تھا۔ باپ کو اُسے پڑھانے کا بہت شوق تھا، خواہش تھی۔ اُس نے بچّے کو پھر سکول داخل کرایا، لیکن وہ سکول سے بھاگ جاتا تھا۔ ڈرتا تھا اور کانپتا تھا۔ وقت گُزرتا گیا۔ بہت سال بعد مجھے پھر معلوم ہوا کہ اُس لڑکے نے بُری بھلی تعلیم حاصل کر لی ہے اور لاہور سے انجنیئرنگ یونیورسٹی سے بی ایس سی بھی کر لی ہے۔ ایک اندازہ تھا لوگ مجھے آ کر یہ بتاتے تھے کہ شاید وہی لڑکا ہے کوئی یقینی بات نہیں تھی۔ پچھلی سے پچھلی عید پر جب ہم نماز پڑھ چکے، تب ہم عید کے بعد ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں۔ معانقہ کرتے ہیں "جپھی" ڈالتے ہیں۔ اس میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ آپ

اُس بندے کو جانتے ہیں یا نہیں۔ آپ کی صف میں جو بھی ہو اُس سے معانقہ کیا جاتا ہے۔ کوئی واقف کار ہو یا نہ ہو۔ میرے ساتھ لوگ ملتے رہے اور ہم بڑی محبّت سے ایک دوسرے سے جپھی ڈالتے رہے۔ وہاں ایک نوجوان کھڑا تھا، وہ بھی کسی سے مل رہا تھا۔ میں نے کہا یہ میری طرف تو متوجہ نہیں ہوتا، میں ہی اس کی طرف متوجہ ہوں۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا اور جب میں نے آگے بڑھ کر اُسے جپھی ڈالنے کی کوشش کی تو اُس نے دونوں ہاتھوں سے مجھے پرے دھکیل دیا۔ اب میرا یقین ہے کہ یہ وہی لڑکا تھا۔ میں تو اُس وقت بڑا تھا۔ وہ چھوٹا تھا تب اور وہ مجھے پہچانتا تھا۔ میں اُسے نہیں پہچان سکتا تھا۔ اب میں اُس کو تلاش کر رہا ہوں اور بہت تکلیف میں ہوں اور اس بات کا آرزومند ہوں کہ کسی طرح سے مجھے اُس سے معافی مل جائے۔

بظاہر تو یہ اتنی بڑی کوتاہی نہیں تھی، لیکن جو واقعہ گزرا اور جس طرح سے اُس کے دل کے اوپر لگا اور وہ زخم کتنے ہی سال گُزرنے کے بعد بھی اُس کے دل پر چلا آرہا ہے اور اب وہ واقعہ ایک نئے رُوپ میں مجھے پریشان کرتا ہے، دُکھ دیتا ہے۔ میں آپ سب سے درخواست کروں گا کہ بظاہر یہ بات معمولی لگتی ہے، بظاہر ہم یہ بات کہہ دیتے ہیں کہ میں نے اس کو ایسا پوائنٹ مارا کہ اس کی پھٹکری کھل کر دی، لیکن ایک بندہ زندہ رہتے ہوئے بھی اپنے اندر کی لاش ساتھ

اُٹھائے پھرتا ہے اور آپ اُس کے قاتل ہیں۔ اُس کا دین، اُس کی دیت، اُس کا قصاص کس طرح سے ادا کیا جائے، یہ سمجھ سے باہر ہے۔ وہ کشمیری جن کو بھارتی گورنمنٹ اپنا اٹوٹ انگ کہتی ہے کہ یہ ہمارے بدن کا ایک حصّہ ہیں، مگر ان بھارتیوں نے گزشتہ 56 برسوں میں کتنے زخم کشمیریوں کو دیے ہیں۔ جسمانی بھی، روحانی بھی، نفسیاتی بھی اور ہر طرح کے زخم اور وہ ساری کی ساری قوم بھارت کے سامنے ایسی ہی ہو گئی ہے جیسے وہ زخم کہ اے اللہ! میں ان کے لیے اور کچھ نہیں کر سکتا، صرف Well Wish کر سکتا ہوں۔ اے اللہ! تُو مدد فرما۔ لیکن آپ کو اس کے لیے وقت نکالنا پڑے گا۔ یہ نہیں کہ آپ چلتے ہوئے رسماً پڑھ لیں اس طرح سے Well Wish اثر نہیں کرے گی۔ جو ہاتھوں کی زنجیر بنتی ہے وہ تصویر کھینچنے کے لیے ہوتی ہے۔ یہ تصویر جو الگ بیٹھ کر آپ کھینچیں گے یہ اللہ کے دربار میں کھینچے گی اور اللہ اس کی طرف متوجہ ہو گا۔ میرے لیے بھی یہ دعا ضرور کیجیے گا کہ وہ نوجوان، اب ماشاء اللہ اُس کے بچّے ہوں گے، مل جائے اور اتنا ناراض نہ رہے، جتنا ناراض ہونے کا اُسے حق پہنچتا ہے۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ!!

دروازہ کھلا رکھنا

آج سے چند ہفتے پہلے یا چند ماہ پہلے میں نے ذکر کیا تھا کہ جب بھی آپ دروازہ کھول کے اندر کمرے میں داخل ہوں تو اسے ضرور بند کر دیا کریں اور میں نے یہ بات بیشتر مرتبہ ولایت میں قیام کے دوران سُنی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ Shut Behind The Door میں سوچتا تھا کہ وہ یہ کیوں کہتے ہیں کہ اندر داخل ہوں تو دروازہ پیچھے سے بند کر دو، شاید وہاں برف باری کے باعث ٹھنڈی ہوا بہت ہوتی ہے اس وجہ سے وہ یہ جملہ کہتے ہیں۔ لیکن میرے پوچھنے پر میری لینڈ لیڈی نے بتایا کہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ اندر داخل ہو گئے ہیں اور اب ماضی سے آپ کا کوئی تعلق نہیں رہا، آپ صاحبِ حال ہیں، اس لیے ماضی کو بند کر دو اور مستقبل کا دروازہ آگے جانے کے لیے کھول دو۔

ہمارے بابے کہتے ہیں صاحبِ ایمان اور صاحبِ حال وہ ہوتا ہے، جو ماضی کی یاد میں مبتلا نہ ہو اور مستقبل سے خوفزدہ نہ ہو۔ اب میں اس کے ذرا سا اُلٹ آپ سے بات کرنا چاہ رہا تھا کیوں کہ پیچھے کی یادیں اور ماضی کی باتیں لوٹ لوٹ کے

میرے پاس آتی رہتی ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اس میں سے کچھ حصّہ بٹائیں۔

ابنِ انشاء نے کہا تھا کہ "دروازہ کھلا رکھنا"۔ آپ دوسروں کے لیے ضرور دروازہ کھول کے رکھیں، اسے بند نہ رہنے دیں۔ آپ نے اکثر و بیشتر دیکھا ہو گا کہ ہمارے ہاں بینکوں کے دروازے شیشے والے ہوتے ہیں وہاں دروازوں پر موٹا اور بڑا Thick قسم کا شیشہ لگا ہوا ہوتا ہے۔ اگر اسے کھول دیا جائے تو بلا شبہ اندر آنے والے کے لیے بڑی آسانی ہو گی اور اگر آپ کسی کے لیے دروازہ کھولتے ہیں اور کسی دوسرے کو اس سے آسانی پیدا ہوتی ہے، تو اس کا آپ کو بڑا انعام ملے گا، جس کا آپ کو اندازہ نہیں ہے۔ کسی کے لیے دروازہ کھولنا بڑے اجر کا کام ہے۔ ہمارے گھروں میں بیبیوں کا زیادہ اس کا علم نہیں ہے، وہ بیٹھی ہی کہہ دیتی ہے "اچھا ماسی سلام، فیر ملاں گے" اور اپنی جگہ پر بیٹھی کہہ دیتی ہیں، یہ نہیں کہ اُٹھ کے دروازہ کھول کے کہا بسم اللہ اور جانے کے لیے خود دروازہ کھولیں اور خدا حافظ کہیں۔ اس میں بہت ساری برکات ہیں اور بہت سارے فوائد سے آپ مستفید ہو سکتے ہیں اور ایسا نہ کر کے آپ ان سے محروم رہ جاتے ہیں۔

میں جب اٹلی میں رہتا تھا، تو جب ہمیں مہینے کی پہلی تاریخ کو تنخواہ ملتی تھی، تو میں ایک بہت اچھے ریستوران میں، جہاں اُمرا آتے تھے، خاص طور پہ اداکار اور اداکارائیں بھی آتی تھیں، چلا جایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ جب میں بیٹھا کافی پی رہا تھا تو ایک شخص بڑے وجود اور بڑے بڑے ہاتھوں والا آکر میرے پاس بیٹھ گیا۔ اُس نے کہا کہ میں نے گزشتہ ماہ آپ کو کسی آدمی سے باتیں کرتے سُنا تھا، تو آپ بڑی رواں اٹالین زبان بول رہے تھے۔ لیکن آپ conditional Verb اور Subjective Verb میں تھوڑی سی غلطی کر جاتے ہیں جیسے I wish I cold have been doing do۔ اس طرح تو مشکل اور پیچیدہ ہو جاتا ہے ناں؟ میں نے کہا، جی! آپ کی بڑی مہربانی۔ میں نے اُس سے کہا کہ میں بھی آپ کو جانتا ہوں (اب اُن کا جو حوالہ تھا، وہ تو میں نے اُن سے نہیں کہا) آپ اس دنیا کے بہت بڑے امیر آدمی ہیں یہ مجھے معلوم ہے (اُس کا پہلا حوالہ یہ تھا کہ وہ ایک بہت بڑے مافیا کا چیف تھا) اُس شخص نے مجھ سے کہا کہ میں آپ کو ایک بڑی عجیب و غریب بات بتاتا ہوں، جو میری امارت کا باعث بنی اور میں اس قدر امیر ہو گیا۔ وہ یہ کہ مجھے ہارس ریسنگ کا شوق تھا اور میں گھوڑوں پر جُوا لگاتا تھا۔ میری مالی حالت کبھی اونچی ہو جاتی تھی اور کبھی نیچی، جیسے ریس کھیلنے والے لوگوں کی ہوتی ہے۔

ایک بار میں نے اپنا سارا مال و متاع ایک ریس پر لگا دیا اور کہا کہ اب اس کے بعد میں ریس نہیں کھیلوں گا۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ میں وہ ریس ہار گیا، میری جیبیں بالکل خالی تھیں اور میں بالکل مفلس ہو گیا تھا۔ جب میں وہاں سے پیدل گھر لوٹ رہا تھا، تو مجھے شدّت سے واش روم جانے کی ضرورت محسوس ہوئی، لیکن وہاں جانے کے لیے میرے پاس مقامی کرنسی کا سکہ نہیں تھا، جو واش روم کا دروازہ کھولنے کے لیے اُس کے لاک میں ڈالا جاتا ہے، وگرنہ دروازہ کھلتا نہیں ہے۔ میں بہت پریشان تھا اور مجھے جسمانی ضرورت کے تحت تکلیف بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں وہاں قریبی پارک میں گیا۔ وہاں بنچ پر ایک شخص بیٹھا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں نے بڑی لجاجت سے اُس سے کہا کہ کیا آپ مجھے ایک سکہ عنایت فرمائیں گے؟ اُس شخص نے میری شکل و صورت کو دیکھا اور کہا کیوں نہیں اور سکہ دے دیا۔ لیکن اس سے قبل میری جسمانی صحت پر غور ضرور کیا۔ اُسے کیا خبر تھی میں بالکل پھانگ (مفلس) ہو چکا ہوں۔ جب میں وہ سکہ لے کر چلا اور واش روم کے دروازے تک پہنچا، جہاں لاک میں سکہ ڈالنا تھا، تو اچانک وہ دروازہ کھل گیا جبکہ وہ سکہ ابھی میرے ہاتھ میں تھا۔ جو اندر آدمی پہلے موجود تھا وہ باہر نکلا اور اُس نے مُسکرا کر بڑی محبّت، شرافت اور نہایت استقبالیہ انداز میں دروازہ پکڑے رکھا اور مجھ سے کہا، یہ ایک روپے کا سکہ کیوں ضائع کرتے ہو؟

میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور میں اندر چلا گیا۔ اب جب میں باہر نکلا تو میرے پاس وہ ایک روپے کی قدر کا سکہ بچ گیا تھا۔ تو میں قریب کسینو میں چلا گیا، وہاں پر ایک جوا ہو رہا تھا کہ ایک روپیہ لگاؤ ہزار روپے پاؤ۔ میں نے وہ روپے کا سکہ اُس جوئے میں لگا دیا اور سکہ بکس میں ڈال دیا۔ وہ سکہ کھڑکھڑایا اور ہزار کا نوٹ کڑک کر کے باہر آ گیا۔ (جواری آدمی کی بھی ایک اپنی زندگی ہوتی ہے)۔ میں نے آگے لکھا دیکھا کہ ایک ہزار ڈالو تو ایک لاکھ پاؤ۔ میں نے ہزار کا نوٹ وہاں لگا دیا۔ رولر گھوما، دونوں گیندیں اُس کے اوپر چلیں اور ٹک کر کے ایک نمبر پر آ کر وہ گریں اور میں ایک لاکھ جیت گیا (آپ غور کریں کہ وہ ابھی وہیں کھڑا ہے، جہاں سے اُس نے ایک سکہ مانگا تھا) اب میں ایک لاکھ روپیہ لے کر ایک امیر آدمی کی حیثیت سے چل پڑا اور گھر آ گیا۔

اگلے دن میں نے اخبار میں پڑھا کہ یہاں پر اگر کوئی Sick Industry میں انویسٹ کرنا چاہے، تو حکومت انہیں مالی مدد بھی دے گی اور ہر طرح کی انہیں رعایت دے گی۔ میں نے ایک دو کارخانوں کا انتخاب کیا، حکومت نے ایک لاکھ روپیہ فیس داخل کرنے کا کہا اور کہا کہ ہم آپ کو ایک کارخانہ دے دیں گے (شاید وہ جُرابیں بنانے یا انڈر گارمنٹس کا کارخانہ تھا) وہ کارخانہ چلا تو اس سے دوسرا، تیسرا اور میں لکھ پتی سے کروڑ پتی اور ارب پتی ہو گیا۔ (آپ اب غور

کریں کہ یہ سب کچھ ایک دروازہ کھلا رکھنے کی وجہ سے ممکن ہوا) اُس نے کہا کہ میری اتنی عمر گزر چکی ہے اور میں تلاش کرتا پھر رہا ہوں اُس آدمی کو، جس نے مجھ پر یہ احسان کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اُس آدمی کو، جس نے آپ کو ایک روپیہ دیا تھا؟ اُس نے کہا، نہیں! اُس آدمی کو، جس نے دروازہ کھلا رکھا تھا۔ میں نے کہا کہ آپ اُس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اُس سے ملنا چاہتے ہیں؟ تو اُس نے جواب دیا، نہیں! یہ دیکھنے کے لیے اُس سے ملنا چاہتا ہوں کہ وہ شخص کن کیفیات سے گزر رہا ہے اور کس اونچے مقام پر ہے اور مجھے یقین ہے کہ دروازہ کھولنے والے کا مقام روحانی، اخلاقی اور انسانی طور پر ضرور بُلند ہو گا اور وہ ہر حال میں مجھ سے بہتر اور بُلند تر ہو گا لیکن وہ آدمی مجھے مل نہیں رہا ہے۔

میں اُس کی یہ بات سُن کر بڑا حیران ہوا، اور اب مجھے انشاء جی کی دروازہ کھلا رکھنا کی بات پڑھ کر وہ شخص یاد آیا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ بڑھاپے میں گزشتہ چالیس، پینسٹھ، باسٹھ برس کی باتیں اپنی پوری جزویات اور تفصیلات کے ساتھ یاد آ جاتی ہیں اور کل کیا ہوا تھا، یہ یاد نہیں آتا۔ بڑھاپے میں بڑی کمال کمال کی چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ آدمی چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ میں بڑا pleasant آدمی ہوں۔ بڑا شریف آدمی ہوں۔ میں تو چڑچڑا نہیں ہوں۔ پرسوں ہی مجھے گیس کا چولہا جلانے کے لیے ماچس چاہیے تھی، میں اتنا چیخا، اوہ!

آخر کدھر گئی ماچس! میرا پوتا اور پوتی کہنے لگے کہ الحمدللہ دادا بوڑھا ہو گیا ہے۔ میں نے کہا کیوں؟ تو کہنے لگے، آپ چڑنے لگے ہیں اور ایسی تو آپ کی Language کبھی نہ تھی۔ میں نے کہا، بھئی آخر بڑھاپے میں تو داخل ہونا ہی ہے، کیا کیا جائے؟ لیکن پھر بھی تم سے بہت طاقتور ہوں۔ کہنے لگے، آپ کیسے طاقتور ہیں؟ میں نے کہا، جب تمہاری کوئی چیز زمین پر گرتی ہے تو تم اُسے اُٹھا لیتے ہو، لیکن اللہ نے مجھے یہ قوّت دی ہے، ایک بوڑھے آدمی میں کہ جب اُس کی ایک چیز گرتی ہے تو وہ نہیں اُٹھاتا اور جب دوسری گرتی ہے، تو میں کہتا ہوں اکٹھی دو اُٹھا لیں گے، اسی لیے ہمیشہ انتظار کرتا ہے کہ دو ہو جائیں تو اچھا ہے۔

خواتین و حضرات! دروازہ کھلا رکھنے کے حوالے سے مجھے یہ بھی یاد آیا ہے اور اپنے آپ کو جب میں دیکھتا ہوں کہ ایک زمانہ تھا (جس طرح سے ماشاءاللہ آپ لوگ جوان ہیں) 1947ء میں جب ہم نعرے مار رہے تھے، تو ہمارا ایک ہی نعرہ ہوتا تھا، لے کے رہیں گے آزادی، لے کے رہیں گے پاکستان، ہم اُس وقت نعرے لگاتے ہوئے گلیوں، بازاروں میں گھوما کرتے تھے اور اپنے مخالفین اور دُشمنوں کے درمیان بالکل اس طرح چلتے تھے جیسے شیر اپنی کچھار میں چلتا ہے اور اب جب کچھ وقت گزرا ہے اور ہم ہی پر یہ وقت آیا ہے اور ہم جو کہتے تھے کہ

"لے کے رہیں گے پاکستان، لے کے رہیں گے آزادی" اب ہر بات پر کہتے ہیں کہ "لے کے رہیں گے سیکورٹی" ہم کہتے ہیں کہ ہمیں سیکورٹی نہیں ہے۔

کسی آدمی کی تبدیلی لاہور سے مُلتان کر دی جائے تو وہ کہتا ہے کہ جی بس سیکورٹی نہیں ہے (ایسے ہی کہتے ہیں ناں) تو سیکورٹی کے لیے اتنے بے چین ہو گئے ہیں ہم، اتنے ڈر گئے ہیں اور آخر کیوں ڈر گئے؟ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟ ہم تو وہی ہیں۔ تب مجھے احساس ہو کہ ہم نے اپنی بات پر اتنے دروازے بند کر لیے ہیں اور ہم دروازے بند کر کے اندر رہنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ذہنی طور پر، روحانی طور پر اور جسمانی طور پر۔ ہم نے ہر لحاظ سے خود کو ایسا بند کر دیا ہے کہ اب وہ آواز سُنائی نہیں دیتی کہ لے کے رہیں گے پاکستان) جب چاروں طرف سے دروازے بند ہوں گے تو یہی کیفیت ہو گی۔ پھر آپ اس حصار سے یا کمرے سے باہر نہیں نکل سکیں گے۔ اور نہ کسی کو دعوت دے سکیں گے، نہ تازہ ہواؤں کو اپنی طرف بُلا سکیں گے۔ ایسی چیزوں پر جب نظر پڑتی ہے اور میری عمر کا آدمی سوچتا ہے، تو پھر حیران ہوتا ہے کہ یہ وقت جو آتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے آتے ہیں، یا پھر قومیں ایسے فیصلے کر لیتی ہیں، یا مختلف گروہ انسانی اس طرح سے سوچنے لگتے ہیں۔ اس کا کوئی حتمی یا یقینی فیصلہ کیا نہیں جا سکتا۔

میں ایک دن ناشتے کی میز پر اخبار پڑھ رہا تھا اور میری بہو کچھ کام کاج کر رہی تھی باورچی خانے میں۔ وہ کہنے لگی، ابو! میں آپ کو کافی کی ایک پیالی بنا دوں؟ میں نے کہا، بنا تو دو، لیکن چوری بنانا، اپنی ساس کو نہ پتہ لگنے دینا، وہ آکر لڑے گی کہ ابھی تو تم نے ناشتہ کیا ہے اور ابھی کافی پی رہے ہو۔ اُس نے کافی بنا کر مجھے دے دی۔ ہمارے باورچی خانے کا ایک ایسا دروازہ ہے، جس کو کھولنے کی کبھی ضرورت نہیں پڑتی، میری بہو کو وہ دروازہ کھولنے کی ضرورت پڑی اور وہ کھولنے لگی اور جب وہ میرے لیے کافی بنا رہی تھی تو کہنے لگی، ابو آپ یہ مانیں گے کہ عورت بے بدل ہوتی ہے، اس کا کوئی بدل نہیں ہوتا، میں نے کہا، ہاں بھئی! میں تو مانتا ہوں، وہ دروازہ کھولنے لگی اور کوشش کرنے لگی، کیونکہ وہ کم کھلنے کے باعث کچھ پھنسا ہوا تھا اور بڑا سخت تھا، وہ کافی دیر زور لگاتی رہی، لیکن وہ نہ کھلا تو مجھے کہنے لگی، ابو اس دروازے کو ذرا دیکھئے گا، کھل ہی نہیں رہا۔ میں گیا اور جا کر ایک بھرپور جھٹکا دیا تو وہ کھل گیا، جب وہ کھل گیا تو پھر میں نے بھی کہا کہ دیکھا (انسان خاص طور پر مرد بڑا کمینہ ہوتا ہے، اپنے انداز میں) تم تو کہتی تھیں کہ میں بے بدل ہوں اور عورت کا کوئی بدل نہیں ہوتا۔ کہنے لگی، ہاں ابو! یہی تو میں اب بھی کہتی ہوں کہ عورت بے بدل ہوتی ہے۔ دیکھیں میں نے ایک منٹ میں دروازہ کھلوا لیا (قہقہہ) میں نے کہا، ہاں یہ بڑی پیاری بات ہے۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ دوسروں کے لیے دروازہ کھولنا، ایک جادو، چالاکی، ایک تعویذ اور ایک وظیفے کی بات ہے، اگر آپ میں، مجھ میں یہ خصوصیت پیدا ہو جائے تو یہ عجیب سی بات لگے گی کہ ہم دروازہ کھولنے لگیں،لوگوں کے لیے تو یہ ایک رہبری عطا کرنے کا کام ہو گا۔ آپ لوگوں کو رہبری عطا کریں گے اپنے اس عمل سے، جس نے دروازہ کھول کے اندر جانا ہے، آخر اُسے جانا تو ہے ہی، لیکن آپ اپنے عمل سے اُس شخص کے رہنما بن جاتے ہیں اور جب آدمی رہنمائی کرتا ہے، تو اس کا انعام اُسے ضرور ملتا ہے۔ ہمارے ہاں تو یہ رواج ذرا کم ہے۔ ہم تو دروازہ وغیرہ اس اہتمام سے نہیں کھولتے کہ ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے کسی کا دروازہ کھولنے کی، جب وہ چلا جائے گا، دفع ہو جائے گا تو کھول کر اندر چلے جائیں گے۔ اگر ہم میں دروازہ کھولنے کی عادت پیدا ہو جائے۔ اگر ہم اپنے دفتر، بینک یا درس گاہ میں دروازہ خود کھولیں، چاہے ایک اُستاد ہی اپنے شاگردوں کے لیے کلاس روم کا دروازہ کیوں نہ کھولے، یہ کام برکت اور آگے بڑھنے کا ایک بڑا اچھا تعویذ ثابت ہو گا۔

یہ بات واقعی توجہ طلب ہے۔ اس سے فائدہ اُٹھایا جانا چاہیے اور ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا تعلق ذاتی فائدے سے بھی ضرور ہوتا ہے۔ اس میں چاہے روحانی فائدہ ہو یا جسمانی یا پھر اخلاقی ہو، ہوتا ضرور ہے اور انسان سارے کا سارا محض چیزوں

اور اشیاء سے ہی نہیں پہچانا جاتا۔ ہمارے ایک اُستاد تھے، میرے کولیگ، بڑے بزرگ قسم کے، وہ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ Rich آدمی وہ ہوتا ہے، جس کی ساری کی ساری Richness اس کی امارت، اس کی دولت، سب کی سب ضائع ہو جائے اور وہ اگلے دن کیسا ہو؟ اگر وہ اگلے دن گر گیا تو اس کا سہارا اور امارت جو تھی وہ جھوٹی تھی۔ میں آپ سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں بھی اس پروگرام کے بعد دروازے کھولنے والوں میں ہوں گا، چاہے میں ڈگمگاتا ہوا ہی اسے کھولوں۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ !!

ایم اے پاس بلّی

آج صبح کی نماز بھی ویسے ہی گزر گئی اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میرے ساتھ اکثر و بیشتر ایسے ہو جاتا ہے کہ آنکھ تو کھل جاتی ہے لیکن اُٹھنے میں تاخیر ہو جاتی ہے اور پھر وہ وقت بڑا ابو جہل بن کر وجود پر گزرتا ہے۔ میں لیٹا ہوا تھا۔ میں نے کہا اور کوئی کام نہیں چلو کل کا اخبار ہی دیکھ لیں۔ میں نے ہیڈ لیمپ آن کیا، بتّی جلائی اور اخبار دیکھنے لگ پڑا اور آپ جانتے ہیں اخبار میں کتنی خوفناک خبریں ہوتی ہیں، وہ برداشت نہیں ہوتیں۔ مثلاً یہ کہ سرحد کے پار سے تیس گاڑیاں مزید چوری ہو گئی ہیں۔ دو بیٹوں نے کاغذات پر انگوٹھے لگوا کر باپ کو قتل کر کے اُس کی لاش گندے نالے میں پھینک دی۔ تاوان کے لیے بچّہ اغوا کرنے والے نے بچّے کو کسی ایسی جگہ پر رکھا کہ وہ والدین کی یاد میں تین دن تک روتا ہوا انتقال کر گیا وغیرہ۔

ایسی خبریں پڑھتے ہوئے دل پر بوجھ پڑتا ہے۔ ظاہر ہے سب کے دل پر پڑتا ہو گا۔ میں یہ سب کچھ پڑھ کر بہت زیادہ پریشان ہو گیا اور میں سوچنے لگا کہ ٹھیک

ہے خودکشی حرام ہے، لیکن ایسے موقعے پر اس کی اجازت ہونی چاہیے یا مجھ سے پہلے جو لوگ اس دنیا سے چلے گئے ہیں، وہ کتنے اچھے تھے۔ خوش قسمت تھے کہ اُنہوں نے یہ ساری چیزیں نہیں دیکھی تھیں۔ میں یہ دردناک باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک دو اڑھائی کلو کا ایک گولہ میرے پیٹ پر آن گرا اور میں ہڑبڑا گیا۔ اخبار میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے غور سے دیکھا تو میری پیاری بلّی کنبر وہ فرش سے اُچھلی اور اُچھل کر میرے پیٹ پر آن گری تھی اور جب میں نے گھبراہٹ میں اُس کی طرف دیکھا، تو وہ چلتی چلتی سینے پر پہنچ گئی۔ اُس نے پیار سے میرے منہ کے قریب اپنا منہ لا کر میاؤں کی، چیخ ماری اور کہا کہ بیوقوف آدمی! لیٹے ہوئے ہو، تو میرے دودھ کا ٹائم ہے اور تم مجھے اس وقت دودھ دیا کرتے ہو۔

میں تھوڑی دیر کے لیے اُسے پیار کرتا رہا اور وہ ویسے ہی میرے سینے کے اوپر آنکھیں بند کر کے مراقبے میں چلی گئی۔ جب کنبر مراقبے میں گئی تو میں سوچنے لگا کہ جس طرح اس کنبر کو اعتماد ہے مجھ پر، میرے وجود پر اور میری ذات پر، کیا مجھ کو میرے اللہ پر نہیں ہو سکتا؟ یعنی یہ مجھ سے کتنی "Superior" ہے، برتر ہے اور کتنی ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس کو پتہ ہے کہ مجھے گھر بھی ملے گا، حفاظت بھی ملے گی، Care بھی ملے گی، Protection بھی ملے گی اور میں آرام سے

زندگی بسر کروں گی، لیکن میرے اندر یہ چیز اس طرح سے موجزن نہیں ہے، جیسے میری بلّی کے اندر موجود ہے۔ میرا یقین کیوں ڈگمگاتا ہے۔

خیر! میں اُٹھا اور باورچی خانے میں گیا۔ وہاں میری بیٹی نے اُس کو ایک تھالی میں دودھ دیا۔ اور وہ تھالی سے دودھ لپرنے لگی۔ میں دیر تک سوچتا رہا۔ بہت سارے خوف ابھی تک میرے ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔ خوف انسان کو آخری دم تک نہیں چھوڑتا اور یہ بڑی ظالم چیز ہے۔ میں نے اس کا اپنے طور پر ایک طریق نکالا ہوا ہے۔ میں سوچتا رہتا ہوں اور جو میرے دل کا خوف ہوتا ہے، اسے میں ایک بڑے اچھے، خوبصورت کاغذ پر لکھتا ہوں۔ ایک نئے مارکر کے ساتھ کہ اے اللہ! میرے دل کے اندر جو خوف ہے کہ مجھ سے اُس مقام تک نہیں پہنچا جائے گا، جس مقام تک پہنچنے کے لیے تو نے ہمیں رائے دی ہے، پھر میں یہ لائن بڑی دفعہ لکھتا ہوں۔ کوئی ذاتی خوف، بچّے کے پاس نہ ہونے کا خوف یا بچّی کی شادی نہ ہونے کا، میں اسے پہلے ایک کلر میں لکھتا ہوں، پھر کئی اور کلرز میں لکھتا ہوں اور جب میں اسے بار بار پڑھتا ہوں اور بالکل اس کا وظیفہ کرتا ہوں تو عجیب بات ہے کہ آہستہ آہستہ میرے ذہن سے وہ خوف کم ہونے لگتا ہے اور جب وہ کم ہونے لگتا ہے، تو پھر میں اُس کاغذ کو پھاڑ کر ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیتا ہوں، ہر روز

میرے خوف اور میرے ڈر، جو ہیں وہ نئی نئی Shape اختیار کر کے آگے ہی آگے چلتے رہتے ہیں۔

میری ایک تمنّا، آرزو اور بہت بڑی Desire یہ ہے کہ میں اللہ پر پورے کا پورا اعتماد کروں، ویسا نہیں جیسا ہم عام طور پر کیا کرتے ہیں اچھا جی! اللہ جو بھی کرائے ٹھیک ہے۔ اللہ نے جیسا چاہا جی انشاء اللہ ویسے ہی ہو گا۔ اللہ کو جو منظور ہوا وہی ہو گا۔" یہ تو اللہ کے ساتھ تعلق کی بات نہیں ہے۔ اللہ کے ساتھ تعلق تو ایسے ہونا چاہیے کہ آدمی اپنے کمرے کے اندر پلنگ کے بازو پر بیٹھا ہوا اُس کے ساتھ باتیں کر رہا ہو اور اپنی مشکلات بیان کر رہا ہو، اپنی زبان میں، اپنے انداز میں کہ اے خدا! مجھے یہ مشکلات درپیش ہے۔ اللہ کے ساتھ تعلق تو اُس وقت ہوتا ہے جب آپ ایک بہت بڑے کھُلے میدان میں، جہاں بچّے کرکٹ کھیل رہے ہوں، اُس کے کارنر یا کونے میں بنچ پر بیٹھے ہوئے اُن کو دیکھ رہے ہیں اور اللہ کے ساتھ آپ کا تعلق چل رہا ہے، اتنا ہی وسیع جتنا بڑا میدان آپ کے سامنے ہے اور اتنی ہی قربت کے ساتھ جتنا بچّوں کا واسطہ اپنے کھیل سے ہے۔ اللہ کے ساتھ تعلق تو ایسے ہوتا ہے۔

جب آپ حضرات یا خواتین بازار جاتے ہیں سودا لینے اور اُس کے بعد آپ بس کے انتظار میں بس سٹینڈ پر بیٹھ جاتے ہیں، تو اُس وقت آپ اللہ سے کہیں کہ اے اللہ! شازیہ نے بی اے کر لیا ہے، اب اُس کے رشتے کی تلاش ہے، اب یہ بوجھ تیرا ہی ہے، تو جانے۔ یہ تعلق جو ہے یہ مختلف مدارج میں ہوتا ہوا چلتے رہنا چاہیے۔ یہ جو ہم خدا سے تعلق کے محاورے بول جاتے ہیں کہ اچھا جی جو اللہ چاہے کرے گا۔ اللہ کی مرضی!! کبھی کبھی وقت نکال کر اللہ کے ساتھ کوئی نہ کوئی تعلق ضرور پیدا کرنا چاہیے، جیسے پالتو بلّی کو گھر کے افراد ساتھ ہوتا ہے کہ میری ساری ذمّے داریاں انہوں نے اُٹھائی ہوئی ہیں اور میں مزے سے زندگی بسر کر رہی ہوں۔ کبھی نہ کبھی تو ہمارا بھی دل چاہتا ہے مزے سے زندگی بسر کرنے کا، ہم بھی تو اس بات کے آرزومند ہوں گے کہ ہم بھی مزے سے زندگی بسر کریں اور اپنے اللہ کے اوپر سارا بوجھ ڈال دیں۔

ہم نے تو بہت سارا بوجھ خود اپنے کندھے پر اُٹھا رکھا ہے۔ ہم اتنے سیانے ہو جاتے ہیں جیسے میں کئی دفعہ اپنے دل میں کہتا ہوں کہ نہیں یہ تو میرے کرنے کا کام ہے، اسے میں اللہ کے حوالے نہیں کر سکتا، کیونکہ میں ہی اس کی باریکیوں کو سمجھتا ہوں اور میں نے ہی ابھی Statistics کا مضمون پاس کیا ہے اور یہ نیا علم ہے۔ اسے میں ہی جانتا ہوں۔ لیکن یہ قسمت والوں کا خاصہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا

سارا بوجھ اُس (اللہ) کے حوالے کر دیتے ہیں اور اُس کے ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ ایک دفعہ ہمارے ہاں ایک نمائش ہوئی تھی، بڑی دیر کی بات ہے، میرا بچّہ اُس وقت بہت چھوٹا تھا۔ اُس نمائش میں بہت ساری چیزیں تھیں۔ خاص طور پر کھلونوں کے سٹال تھے اور چائنہ جو نیا نیا ابھر رہا تھا، اُس کے بنے ہوئے بڑے کھلونے اُدھر موجود تھے۔ میرے سارے بچّے اسی کھلونوں کے سٹال پر ہی جا کر جمع ہو گئے۔ ظاہر ہے میں اور اُن کی ماں بھی وہاں اُن کے ساتھ تھے۔ وہاں پر چائنہ کا بنایا ہوا ایک پھول، بہت اچھا اور خوبصورت پھول، جو کپڑے اور مصالحے کا بنا ہوا تھا اور سٹال والے کا دعویٰ تھا کہ یہ پھول رات کے وقت روشنی دیتا ہے، یعنی اندھیرے میں رکھو تو روشن ہو جاتا ہے۔ میرے چھوٹے بیٹے نے کہا کہ ابو یہ پھول لے لیتے ہیں۔ وہ اُس پھول کے بارے میں بڑا متجسس تھا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے، لے لیتے ہیں۔ وہ اتنا قیمتی بھی نہیں تھا۔ ہم نے پھول لے لیا۔ اب وہ (میرا بیٹا) بیچارہ سارا دن اسی آرزو اور انتظار میں رہا کہ کب رات آتی ہے اور کب میں اس کو روشن دیکھوں گا۔

رات کو وہ اپنے کمرے میں وہ پھول لے گیا اور بیچارہ آدھی رات تک بیٹھا رہا، لیکن اُس میں سے کوئی روشنی نہیں آئی تھی۔ صبح جب میں اُٹھا تو وہ میرے بستر کے پاس کھڑا پھُس پھُس رو رہا تھا اور پھول اُس کے ہاتھ میں تھا اور کہہ رہا تھا کہ

ابو اس میں کوئی روشنی نہیں تھی، یہ تو ویسا ہی کالے کا کالا ہے۔ یہ تو ہمارے ساتھ دھوکہ ہو گیا۔ میں نے کہا، نہیں! تم ابھی تھوڑا انتظار کرو اور صبر کی کیفیت پیدا کرو۔ اگر اُس سٹال والے نے دعویٰ کیا ہے تو اس میں سے کچھ ہو گا۔ میں نے اُس سے وہ پھول لے لیا اور اُسے اپنے کوٹھے (گھر کی چھت) پر لے جا کر (وہاں کڑی دھوپ تھی) دھوپ میں رکھ دیا۔ مجھے پتہ تھا کہ اس میں جو چمکنے والا مصالحہ انہوں نے لگایا تھا، وہ جب تک سورج کی کرنیں جذب نہیں کرے گا، اُس وقت تک اُس میں روشنی نہیں آئے گی۔ بالکل ویسے ہی جیسے گھڑیاں ہوتی تھیں کہ وہ دن کو روشنی میں رہتی تھیں، تو رات کو پھر جگمگاتی تھیں۔ جب شام پڑی تو میں نے اپنے بیٹے سے کہا کہ اب تم اس پھول کو لے جاؤ۔ جب رات گہری اندھیری ہو گئی تو جیسا میں نے اُسے بتایا تھا کہ اس کے اوپر کالا کپڑا رکھنا اور فلاں فلاں وقت میں اسے دیکھنا (میں نے اُسے اس انداز میں سمجھایا جیسے جادوگر کرتے ہیں)۔ اُس نے ایسے ہی کیا اور خوشی کا نعرہ اور چیخ ماری۔ اُس کا سارا کمرہ جگمگ روشن جو ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنی ماں کو اور چھوٹے بھائیوں کو بلایا اور وہ جگمگاتا ہوا پھول دکھانے لگا۔ ہمارے گھر میں ایک جشن کا سا سماں ہو گیا۔

جب اُس کی ماں اور اُس کے بھائی اُس کے کمرے میں بیٹھے ہوئے اُس کے ساتھ باتیں کر رہے تھے، تو میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا سوچ رہا تھا کہ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ

ہم بھی وہ روشنی، جو اللہ خداوند تعالیٰ ہمیں عطا کرتا ہے اور جسے وہ بطور خاص نور کہتا ہے اللہ نُورُ السّمٰوٰتِ وَالاَرض کہتا ہے کیا ہم اس کو اپنی ذات میں نہیں سمو سکتے؟ کیا ایسے نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی بلّی کی طرح اپنی ساری چیزیں اُس کی روشنی میں رکھ دوں، جیسے میں نے وہ پھول چھت پر رکھا تھا تاکہ وہ روشنی جذب کر کے چمک سکے۔ میری شادی، میری مُلازمت، میری زندگی، میری صحت، میرے بچّے، میرے عزیز و اقارب، میرے رشتہ دار حتیٰ کہ میں اپنا مُلک بھی، جسے بڑی محبّت، محنت کے ساتھ اور بڑی قربانیاں دے کر ہم نے آزادی دلوائی ہے، اس کو اُٹھا کر اس روشنی کے اندر رکھ دوں اور پھر یہ سارا دن رات اسی طرح جگمگاتے رہیں، جیسے میرے بچّے کا وہ پھول رات کے اندھیرے میں جگمگا رہا تھا۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ ہم کو ظلمات سے اتنا پیار ہو گیا ہے، کس وجہ سے ہوا ہے۔ میں یہ الزام آپ پر بھی نہیں لیتا، آپ کو خیر کیسے دے سکتا ہوں کہ اندھیرے سے اتنا پیار کیوں ہے؟

ہم اندھیرے کی طرف کیوں مائل ہیں اور جب اللہ بار بار کہتا ہے، واضح کرتا ہے کہ میں تم کو ظلمات سے نور کی طرف لانا چاہتا ہوں، تم ظلمات سے نور کی جانب آؤ اور جن کے اذہان اور روئیں بند ہیں، وہ روشنی کی طرف نہیں آتے اور ایسے ہو نہیں پاتا، جیسے رب تعالیٰ چاہتا ہے اور آرزو یہ رہتی ہے کہ انسان اپنے کام،

اپنی ہمّت اور اپنی محنت سے کرے۔ انسان اپنے کام اپنی ہمّت اور اپنی محنت سے صرف اسی حد تک کرے، جس کا وہ مکلّف ہے، یعنی جس کی وہ تکلیف اُٹھا سکتا ہے۔ لیکن اللہ کو بھی کچھ نہ کچھ ذمہ داری عطا کرنی چاہیے۔ اگر آپ تفریحاً (میری ایسی ہی باتیں ہیں، جو ایک ڈرائنگ ماسٹر سمجھتے ہیں، وہ کرتا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی تعلق پیدا کرنا چاہیے) کچھ وقت نکال کر، آپ اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیں اور میرے کہنے پر ہی تھوڑے وقت کے کے لیے کہ آپ کسی بھی زبان میں، اپنے اللہ کے ساتھ کچھ گفتگو شروع کر دیں (جس طرح آج کل آپ اپنے سیلولر فون پر کرتے ہیں) تو چند دنوں کے بعد آپ کو ایک Message آنے لگ جاتا ہے، جو واضح تو نہیں ہوتا۔ ایسے تو نہیں ہوتا جیسے آپ ٹیلیفون پر سُنتے ہیں، لیکن آپ کا دل، آپ کی ذات اور آپ کا ضمیر اس کے ساتھی وابستہ ہو جاتا ہے، پھر آہستہ آہستہ زیادہ وقت صرف کرنے سے کہ میں کچھ وقت نکال کر، اپنا ہل چھوڑ کے واہی (کھیتی) چھوڑ کر یا قلم چھوڑ کر لکھتے ہوئے یا دفتر میں اپنے اوقات کے دوران میں اگر آپ کا کمرہ الگ ہے، تو اپنی ٹیبل چھوڑ کر، سامنے والے صوفے جو مہمانوں کے لیے رکھا ہوتا ہے، وہاں جا کر بیٹھیں اور اپنے جوتے اُتار دیں، پاؤں آرام سے قالین پر رکھیں۔ پھر آپ کہیں کہ میں خاص نیّت کے ساتھ آپ سے (خُدا سے) وابستہ ہونے کے لیے یہاں آ کر بیٹھا ہوں۔

مجھے یہ پتہ نہیں ہے کہ وابستگی کس طرح سے ہوتی ہے، مجھے یہ بھی پتہ نہیں ہے کہ آپ کو کس طرح سے پُکارا جاتا ہے۔ میں صرف یہ بوجھ آپ پر ڈالنے کے لیے یہاں آیا ہوں کہ جس طرح جانور کو اپنے مالک پر اعتماد ہوتا ہے۔ اسی طرح میں عین اُس جانور کی حیثیت سے اپنا بوجھ آپ پر ڈالنے آیا ہوں۔

مجھے سارے طریقے نہیں آتے ہیں، جو طریقے بزرگوں کو معلوم ہیں۔ اس طرح آپ کے اندر اور اس ماحول کے اندر سے اور اُس مقام کے اندر سے اور جو کام کرنے والی جگہ چھوڑ کر آپ اور جگہ پر آکر بیٹھے ہیں، اُس جگہ کے حوالے سے اور اُس جگہ کی تقدیس سے یقیناً آپ Inline ہوں گے۔ جس طرح آپ نے شاید کبھی انجن گاڑی کے ساتھ جوڑتے ہوئے دیکھا ہو گا کہ کس طرح جب انجن کو گاڑی کے پاس لایا جاتا ہے، تو وہ "کرک" کر کے گاڑی کے ساتھ جُڑ جاتا ہے اور گاڑی کو بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ ساتھ جُڑ گیا ہے۔ یہ مشاہدہ آپ ضرور کریں کہ کس طرح سے آدمی اللہ کے ساتھ جُڑ جاتا ہے اور پھر وہ اپنا سارا بوجھ اللہ پر ڈال کر اور ساری ذمّے داری اُس کے حوالے کر کے چلتا رہتا ہے۔

ایک روز میں جمعہ پڑھنے جا رہا تھا۔ راستے میں ایک چھوٹا سا کُتّا تھا، وہ پلا ریہڑے کی زد میں آ گیا اور اُسے بہت زیادہ چوٹ آ گئی۔ وہ جب گھبرا کر گھوما تو دوسری

طرف سے آنے والی جیپ اس کو لگی، وہ بالکل مرنے کے قریب پہنچ گیا۔ سکول کے دو بچّے یونیفارم میں آ رہے تھے۔ وہ اُس کے پاس بیٹھ گئے۔ میں بھی اُن کے قریب کھڑا ہو گیا۔ حالانکہ جمعے کا وقت ہو گیا تھا۔ اُن بچوں نے اُس زخمی پلے کو اُٹھا کر گھاس پر رکھا اور اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک بچّے نے جب اُس کو تھپتھپایا تو اُس پلے نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ وہاں ایک فقیر تھا۔ اُس نے کہا کہ واہ، واہ واہ! وہ سارے منظر کو دیکھ کر بڑا خوش ہوا، جبکہ ہم کچھ آبدیدہ اور نم دیدہ تھے۔ اُس فقیر نے کہا کہ یہ اب اس سرحد کو چھوڑ کر دوسری سرحد کی طرف چلا گیا۔ وہ کہنے لگا کہ یہ موت نہیں تھی کہ اس کتّے نے آنکھیں بند کر لیں اور یہ مر گیا۔ اس کی موت اُس وقت واقع ہوئی تھی جب یہ زخمی ہوا تھا اور لوگ اس کے قریب آ کر سڑک کراس کر رہے تھے اور کوئی رُکا نہیں تھا۔ پھر اُس نے سندھی کا ایک دوہڑا پڑھا۔ اس کا مجھے بھی نہیں پتہ کہ کیا مطلب تھا اور وہ آگے چلا گیا۔ وہ کوئی پیسے مانگنے والا نہیں تھا۔ پتہ نہیں کون تھا اور وہاں کیوں آیا تھا؟

وہ سپردگی جو اُس سکول کے بچّے نے بڑی دل کی گہرائی سے اُس پلے کو عطا کی، ویسی ہی سپردگی ہم جیسے پلوں کو خدا کی طرف سے بڑی محبّت اور بڑی شفقت سے اور بڑے رحم اور بڑے کرم کے ساتھ عطا ہوتی ہے۔ لیکن یہ ہے کہ اسے

Receive کیسے کیا جائے؟ کچھ جاندار تو اتنی ہمّت والے ہوتے ہیں وہ رحمت اور اس شفقت کو اور اس Touch کو حاصل کرنے کے لیے جان تک دے دیتے ہیں۔ آپ نے بزرگانِ دین کے ایسے بیشمار قصّے پڑھے ہوں گے۔

میں یہ عرض کر تھا کہ میرا چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے، لیکن ان تجربات میں سے گزرتے ہوئے میں نے یہ ضرور محسوس کیا ہے کہ اللہ کی طرف رجوع کیا جائے اور اپنا سارا سامان، جتنا بھی ہے، اُس کی روشنی میں رکھ دیا جائے اور جب اُس کی پوری کی پوری روشنی سے وہ پورے کا پورا لتھڑ جائے، تو پھر کوئی خطرہ کوئی خوف باقی نہیں رہتا۔

کتابی علم جو میرے پاس بھی ہے، وہ تو مل جائے گا، لیکن وہ روح جو سفر کرتی ہے، وہ داخل نہیں ہو گی۔ میری بلّی کنبر نے آج صبح سے مجھے بہت متاثر کیا ہے اور میں بار بار قدم قدم پر یہ سوچتا ہوں کہ کیا میں اس جیسا نہیں بن سکتا؟ اب مجھے اپنی بلّی پر غصّہ بھی آتا ہے اور پیار بھی آتا ہے اور میں اس سے چڑ گیا ہوں کہ یہ تو اتنے بڑے گریڈ حاصل کر گئی اور فرسٹ ڈویژن میں ایم اے کر گئی ہے اور میں جو اس کا مالک ہوں، میں بالکل پیچھے ہوں۔ یہ ساری بات غور کرنے کی ہے۔ آپ میری نسبت باطن کے سفر کے معمول میں بہتر ہیں اور جو جذبہ اور جو محبّت

اور لگن آپ کی روحوں کو عطا ہوتی ہے، وہ مجھے عطا نہیں ہوئی۔ لیکن میں آپ
کے ساتھ ساتھ بھاگنے والوں میں شریک رہنا چاہتا ہوں کہ کچھ کرنیں جب بٹ
جائیں، آپ کے سامان سے تو وہ مجھے مل جائیں۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے
اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ !!

تنقید اور تائی کا فلسفہ

(نوٹ۔ یہ پروگرام اشفاق احمد کے انتقال سے چند روز قبل نشر ہوا)

ان دنوں میرا پوتا، جو اب بڑا ہو گیا ہے، عجیب عجیب طرح کے سوال کرنے لگا ہے۔ ظاہر ہے کہ بچّوں کو بڑا حق پہنچتا ہے سوال کرنے کا۔ اُس کی ماں نے کہا کہ تمہاری اردو بہت کمزور ہے، تم اپنے دادا سے اردو پڑھا کرو۔ وہ انگریزی سکول کے بچّے ہیں، اس لیے زیادہ اردو نہیں جانتے۔ خیر! وہ مجھ سے پڑھنے لگا۔ اردو سیکھنے کے دوران وہ مجھ سے کچھ اور طرح کے سوالات بھی کرتا ہے۔ پرسوں مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ دادا! یہ آمد و رفت جو ہے، اس میں عام طور پر کتنا فاصلہ ہوتا ہے؟ (اُس نے یہ لفظ نیا نیا پڑھا تھا) اب اُس نے ایسی کمال کی بات کی تھی کہ میں اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا۔ پھر اُس نے مجھ سے کہا کہ دادا! کیا نفسیات کی کوئی ایسی کتاب ہے، جس میں آدمی کو پرکھنے کے اچھے سے اور آسان سے طریقے ہوں؟ تو میں نے کہا کہ بھئی! تمھیں آدمی کو پرکھنے کی کیا ضرورت پیش آ رہی ہے؟ اُس نے کہا کہ پتہ تو چلے کہ آخر مدِّ مقابل کیسا ہے؟ کس طرز کا ہے؟

جس سے میں دوستی کرنے جارہاہوں، یا جس سے میری مُلاقات ہورہی ہے۔ میں اُس کو کس کسوٹی پر لٹمس پیپر کے ساتھ چیک کروں۔ میں نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ اُس کو چیک کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن اگر تم ایسا چاہتے ہی ہو تو ظاہر ہے علمِ نفسیات میں بہت ساری ایسی کتابیں ہیں کہ

HOW TO UNDERSTAND PEOPLE? HOW TO CHECK HUMAN BEINGS؟

ایسی بیشمار کتابیں ہیں، لیکن وہ ساری کی ساری اتنی ٹھیک نہیں جتنی ہمارے ہاں عام طور پر سمجھی جاتی ہیں۔ ہماری اُستاد تو ہماری تائی تھی۔ میں نے پہلے بھی اس کے بارے میں آپ لوگوں کو بتایا ہے، لیکن آپ میں سے شاید بہت سے لوگ نئے ہیں اور اُن کو "تائی" کے بارے میں پتہ نہ ہو، جسے سارا گاؤں ہی تائی کہتا تھا۔ بڑے کیا، چھوٹے کیا، سبھی۔ وہ ہمارے گاؤں میں ایک بزرگ تیلی جو میری پیدائش سے پہلے فوت ہو گئے تھے، اُن کی بیوہ تھیں۔ ہماری تائی تیلن تھی، تیل نکالتی تھی اور کچی گھانی کا خالص سرسوں کا تیل بیچتی تھی۔ سارے گاؤں والے اُس سے تیل لیتے تھے۔ خود ہی بیل چلاتی تھی، بڑی لٹھ جو بہت مشکل ہوتی ہے، بیلوں سے وہ اکیلے نکال لیتی تھی۔

میں جب اُس سے ملا تو اُس کی عمر 80 برس کی تھی۔ میں اُس وقت آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا، لیکن مجھے اُس تائی کی شخصیت نے متاثر بہت کیا۔ وہ اتنی خوش مزاج، اتنی خوشی عطا کرنے والی اور خوش بختی کا سامان مہیا کرنے والی تھی کہ جس کا کوئی حساب نہیں۔ شام کے وقت گاؤں کے لوگ، بزرگ، ہندو، سکھ سب اُس کے پاس جمع ہو جاتے تھے کہ ہمیں کوئی دانش کی بات اُس کے ہاں سے ملے گی۔ ایک طرح سے یوں سمجھئے کہ اُس کا گھر "کافی ہاؤس" تھا جس میں زمیندار لوگ اکٹھے ہو جاتے تھے۔ ایک بار میں نے تائی سے پوچھا کہ یہ تیری زندگی جو گزری ہے، اس کا میں تو شاہد نہیں ہوں، وہ کس قسم کی تھی؟ اُس نے بتایا کہ میں چھبیس برس کی عمر میں بیوہ ہو گئی اور پھر اُس کے بعد میری عمر دیکھ لو، تمہارے سامنے ہے۔ اسّی برس ہے۔ میں ایسے ہی رہی، لیکن میں کڑوی بہت تھی اور تلخ طبیعت کی ہو گئی۔ جب میں بیوہ ہو گئی۔ میں خُدا پر بھی تنقید کرتی تھی، حالات پر بھی، وقت پر بھی، لوگوں پر بھی اور میری کڑواہٹ میں مزید اضافہ ہوتا رہتا تھا۔

میری شخصیت کو وہ سکون نہیں ملتا تھا، جس کی میں آرزو مند تھی، لیکن میں ہر بندے کو اچھی طرح سے "کھڑکا" دیتی تھی اور وہ شرمندہ ہو کر اور گھبرا کر میرے ہاں سے رُخصت ہوتا تھا۔ تو میں نے ایک اور یہ فیصلہ کیا کہ (اس عورت

میں اللہ نے فیصلے کی بڑی صلاحیت رکھی ہوئی ہے) اگر مجھے آدمیوں کو، لوگوں کو سمجھنا ہی ہے، اگر مجھے ان کی روحوں کے اندر گہرا اُترنا ہے، تو میرا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ مجھے ان پر Criticism کرنا، تنقید کرنا، نکتہ چینی کرنا چھوڑنا ہو گا۔ جب آپ کسی شخص پر نکتہ چینی کرنا چھوڑ دیتے ہیں، اُس پر تنقید کرنا چھوڑ دیتے ہیں، اُس میں نقص نکالنا چھوڑ دیتے ہیں تو وہ آدمی سارے کا سارا آپ کی سمجھ میں آنے لگتا ہے اور ایکسرے کی طرح اُس کا اندر اور باہر کا وجود آپ کی نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔

اب یہ اُس کا بھی فلسفہ تھا اور کچھ بڑوں سے بھی اُس نے حاصل کیا تھا، وہ بھی تھا۔ جب بھی مجھے کوئی ایسا مشکل مسئلہ ہوتا، تو میں ضرور اُس سے ڈسکس کرتا کہ اس کو کیسے کرنا ہے، اکیلا میں ہی نہیں، سارے ہی اُس سے ڈسکس کرتے تھے، کیونکہ اُس کا فلسفہ یہ تھا کہ کسی کی خرابیاں تلاش کرنے کے بجائے اُس کی خوبیوں پر نظر رکھنی چاہیے اور ظاہر ہے کہ آدمی کسی کی خوبیوں پر نظر نہیں رکھ سکتا، کیونکہ اُس کو بڑی تکلیف ہوتی ہے، لیکن ڈھونڈنی چاہئیں۔ وہ تائی واحد ایسی فرد تھی جو کہ بُرے سے بُرے وجود میں سے بھی خوبی تلاش کر لیتی تھی۔ میرا بھائی جو مجھ سے دو جماعتیں آگے تھا، وہ بھی تائی کے اس رویّے سے بڑا تنگ تھا۔ وہ ذہین آدمی تھا۔ ایک دن اُس نے ایک ترکیب سوچی۔ اُس نے کہا کہ یار! میں

ابھی تائی کو پھانستا ہوں، کیونکہ وہ بالکل ان پڑھ ہونے کے باوصف ہم سے بہت آگے چلی جارہی ہے۔ میں نے آج ایک معمہ بنایا ہے، اسے لے کر تائی کے پاس چلتے ہیں۔ لیکن تم بہت سنجیدہ اور معصوم سے "میسنے" بن کر کھڑے ہو جانا۔ یہ تائی ہر چیز کی تعریف کرتی ہے، کبھی آج تک اس کو کسی میں نقص نظر نہیں آیا، پھر زندگی کا مزہ کیا ہے کہ آدمی نقص کے بغیر ہی زندگی بسر کرتا چلا جائے اور ارد گرد پڑوس میں عورتیں آباد ہوں اور آدمی اُن میں نقص ہی نہ نکالے۔ بیبیاں تو فوراً کھڑکی کھول کر دیکھتی ہیں کہ اُس کے گھر میں کون آیا ہے؟ کون گیا؟ فٹافٹ نقص نکالنے اور خرابی کی وضاحت پیش کرنے کے لیے اُن کو موقعہ چاہیے ہوتا ہے۔

خیر! ہم گئے۔ میرے بھائی نے بہت ادب کے ساتھ اُس سے کہا (اور وہ خوش تھا کہ اب تائی پھنس جائے گی) تائی! یہ شیطان کیسا ہے؟ تائی کہنے لگی پُت! ابلیس؟ وہ کہنے لگا، ہاں۔ تائی کہنے لگی، ہائے ہائے صدقے جاواں وہ بڑا ہی محنتی ہے، جس کم دا تہیہ کر لے اُس کو چھوڑتا ہی نہیں، پورا کر کے دم لیتا ہے۔ کیا کہنے اُس کے، وہ ہماری طرح سے نہیں ہے کہ کسی کام میں آدھا دل اِدھر اور آدھا دل اُدھر، اُس نے جس کام کی ٹھان لی، پورا کر کے ہی چھوڑتا ہے۔ میں نے بھائی سے کہا کہ

آ جاؤ یہاں ہماری دال نہیں گلے گی، یہ اور طرح کی یونیورسٹی ہے اور اس یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے جو لوگ ہیں، ہم اُن کے ساتھ نہیں کھڑے ہو سکتے۔

میں اپنے پوتے سے یہ کہہ رہا تھا (ظاہر ہے عرصہ بیت گیا، اب تائی اس جہاں میں موجود نہیں ہے، لیکن میں اُس سے اپنے حوالے سے اور حیثیت سے بات کر رہا تھا) کہ آدمی کو اپنے آپ کو جاننے کے لیے دوسرے آدمی کے آئینے میں اپنی شکل دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جب تک آپ دوسرے کو آئینہ نہیں بنائیں گے، آپ کو اپنی ذات کی شکل نظر نہیں آئے گی۔ اگر آپ اس کے اوپر کالک ملتے رہیں گے، تو پھر بڑی مشکل ہو جائے گی۔

اتّفاق سے اب ہمارے ہاں Criticism کچھ زیادہ ہی ہونے لگا ہے اور کچھ ہمیں پڑھایا بھی جاتا ہے۔ کچھ ہماری تعلیم بھی ایسی ہے۔ کچھ ہم ایسے West oriented Educated لوگ ہو گئے ہیں کہ ہم کہتے ہیں کہ ہر بات کا احتساب کرو، اس پر تنقید کرو اور ہر چیز کو تسلیم کرتے ہوئے اور ایسے ہی آگے چلتے ہوئے زندگی بسر نہ کرو۔

جب میں لکھنے لکھانے لگا اور میں چھوٹا سا ادیب بن رہا تھا، یہ پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے، اُس وقت لاہور میں ایک ”کافی ہاؤس“ ہوتا تھا، وہاں بڑے

سینئر ادیب رات گئے تک نشست کرتے تھے، تو ہم بھی اُن کے پاس بیٹھ کر اُن سے باتیں سیکھتے تھے۔ اُن سے بات کرنے کا شعور حاصل کرتے تھے اور اپنے مسائل بھی اُن سے بیان کرتے تھے۔ اُس زمانے میں راجندر سنگھ بیدی یہاں ڈاکخانے میں کام کرتے تھے۔ پریم چند بھی "کافی ہاؤس" میں آجاتے تھے اور اس طرح بہت بڑے لوگ وہاں آجاتے تھے۔ میں رات دیر سے گھر آتا تھا، میری ماں ہمیشہ میرے آنے پر ہی اُٹھ کر چولہا جلا کر روٹی پکاتی تھی (اُس زمانے میں گیس ویس تو ہوتی نہیں تھی) اور میں ماں سے ہمیشہ کہتا تھا کہ آپ روٹی رکھ کر سو جایا کریں، تو وہ کہتیں تو رات کو دیر سے آتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تجھے تازہ پکا کر روٹی دوں۔ جیسا کہ ماؤں کی عادت ہوتی ہے۔ میں اُن سے اس بات پر بہت تنگ تھا اور میں نے اُن سے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر آپ اسی طرح رات دیر سے اُٹھ کر روٹی پکاتی رہیں، تو پھر میں کھانا ہی نہیں کھاؤں گا۔ ایک دن یونہی رات دیر سے میرے آنے کے بعد پھُلکا (تازہ روٹی) پکاتے ہوئے اُنہوں نے مجھ سے پوچھا کہاں جاتا ہے میں نے کہا، اماں! میں ادیب بن رہا ہوں۔ کہنے لگیں، وہ کیا ہوتا ہے؟ میں نے کہا، اماں! لکھنے والا، لکھاری۔ وہ پھر گویا ہوئیں، تو پھر کیا کرے گا؟ میں نے کہا، میں کتابیں لکھا کروں گا۔ وہ کہنے لگیں، اینیاں اگے پیاں جیہڑیاں کتاباں اونہاں دا کی بنے گا؟ میں نے کہا، نہیں! نہیں، وہ تو جھوٹ ہیں،

کچھ نہیں۔ میں اور طرح کا رائٹر بنوں گا اور میں سچ اور حق کے لیے لڑوں گا اور میں ایک سچی بات کرنے والا بنوں گا۔

میری ماں کچھ ڈر گئی۔ بیچاری اَن پڑھ عورت تھی گاؤں کی۔ میں نے کہا، میں سچ بولا کروں گا اور جس سے ملوں گا، سچ کا پرچار کروں گا اور پہلے والے لکھاری بڑے جھوٹے رائٹر ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اُس وقت ماں کے ہاتھ میں پکڑے چمٹے میں روٹی اور پتیلی (دیگچی) تھی۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگی، اگر تو نے یہی بننا ہے، جو تو کہتا ہے اور تو نے سچ ہی بولنا ہے، تو اپنے بارے میں سچ بولنا۔ لوگوں کے بارے میں سچ بولنانہ شروع کر دینا۔ یہ میں آپ کو بالکل اَن پڑھ عورت کی بات بتا رہا ہوں۔ سچ وہ ہوتا ہے جو اپنے بارے میں بولا جائے، جو دوسروں کے بارے میں بولتے ہیں، وہ سچ نہیں ہوتا۔ ہماری یہ عادت بن چکی ہے اور ہمیں ایسے ہی بتایا، سکھایا گیا ہے کہ ہم سچ کا پرچار کریں۔

جب ہم باباجی کے پاس گئے اور کبھی کبھی اُن کے سامنے میرے منہ سے یہ بات نکل جاتی تھی کہ میں سچی اور حق کی بات کروں گا، تو وہ کہا کرتے تھے، سچ بولا نہیں جاتا، سچ پہنا جاتا ہے، سچ اوڑھا جاتا ہے، سچ واپرتا (اوڑھنے) کی چیز ہے، بولنے کی چیز نہیں ہے۔ اگر اسی طرح اور یوں ہی سچ بولو گے تو جھوٹ ہو جائے

گا۔ جب تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی، لیکن اب جوں جوں وقت گزرتا ہے اور یہ حسرت اور آرزو ہی رہی ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ مرنے سے پہلے میں کم از کم ایک دن سیج اوڑھ کر باہر نکلوں اور ساری دنیا کا درشن کر کے پھر واپس لوٹوں، اوڑھا ہو سیج معلوم نہیں کتنا خوبصورت ہوتا ہو گا، بولا ہوا تو آپ کے سامنے ہی ہے۔ وہ اچھا نہیں ہوتا۔ جب آدمی کسی کو Criticise کرتا ہے اور کسی کے اوپر تنقید کرتا ہے، تو حکم تو یہ ہے کہ پہلے آپ دیکھ لیں اور اُس کی عینی شہادت لیں کہ آیا اس میں ایسی کوئی خرابی ہے بھی کہ نہیں۔ اگر وہ نظر بھی آ جائے اور خرابی ہو بھی، تو پھر بھی اُس کا اعلان نہ کریں۔ آپ کو کیا ضرورت ہے کسی کی خرابی کا اعلان کرنے کی، اللہ ستار العیوب ہے۔ اگر اللہ خُداوند تعالیٰ ہماری چیزوں کو اُجاگر کرنے لگے تو، توبہ توبہ ہم تو ایک سیکنڈ بھی زندہ نہ رہیں، لیکن وہ ہمارے بھید لکو کر رکھتا ہے۔ تو ہمیں اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ ہم لوگوں کی خرابیوں کا ڈھنڈورا پیٹتے پھریں۔ اگر آپ کو کسی میں خرابی نظر آئے تو یہ دیکھیں کہ اگر میں اس کی جگہ پر ہوتا، میں انہی Circumstances میں ہوتا اور میں ایسے حالات میں سے گزرا ہوا ہوتا، بچپن میں یتیم ہو گیا ہوتا، یا کسی کے گھر پلا ہوتا، تو میری شخصیت کیسی ہوتی؟ یہ ایک بات بھی غور طلب ہے۔

ممکن ہے آپ کی آنکھ میں ٹیڑھ ہو اور اُس بندے میں ٹیڑھ نہ ہو۔ ایک واقعہ اس حوالے سے مجھے نہیں بھولتا، جب ہم سمن آباد میں رہتے تھے۔ یہ لاہور میں ایک جگہ ہے۔ وہ اُن دنوں نیا نیا آباد ہو رہا تھا۔ اچھا پوش علاقہ تھا۔ وہاں ایک بی بی بہت خوبصورت، ماڈرن قسم کی بیوہ عورت نو عمر وہاں آ کر رہنے لگی۔ اُس کے دو بچے بھی تھے۔ ہم، جو سمن آباد کے نیک آدمی تھے، ہم نے دیکھا کہ ایک عجیب و غریب کردار آ کر ہمارے درمیان آباد ہو گیا ہے اور اُس کا اندازِ زیست ہم سے ملتا جُلتا نہیں ہے۔ ایک تو وہ انتہائی اعلیٰ درجے کے خوبصورت کپڑے پہنتی تھی، پھر اُس کی یہ خرابی تھی کہ وہ بڑی خوبصورت تھی۔ تیسری اُس میں خرابی یہ تھی کہ اُس کے گھر کے آگے سے گزرو تو خوشبو کی لپٹیں آتی تھیں۔ اُس کے جو دو بچّے تھے، وہ گھر سے باہر بھاگے پھرتے تھے اور کھانا گھر پر نہیں کھاتے تھے۔ لوگوں کے گھروں میں چلے جاتے تھے اور جن گھروں میں جاتے، وہیں سے کھا پی لیتے تھے، یعنی گھر کی زندگی سے اُن بچوں کی زندگی کچھ کٹ آف تھی۔

اُس خاتون کو کچھ عجیب و غریب قسم کے مرد بھی ملنے آتے تھے۔ گھر کی گاڑی کا نمبر تو روز دیکھ کر آپ جان جاتے ہیں، لیکن اُس کے گھر آئے روز مختلف نمبروں والی گاڑیاں آتی تھیں۔ ظاہر ہے اس صورتِ حال میں ہم جیسے بھلے

آدمی اس سے کوئی اچھا نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے۔ اُس کے بارے میں ہمارا ایسا ہی رویہ تھا، جیسا آپ کو جب میں یہ کہانی سُنا رہا ہوں، تو آپ کے دل میں لا محالہ اس جیسے ہی خیالات آتے ہوں گے۔ ہمارے گھروں میں آپس میں چہ میگوئیاں ہوتی تھیں کہ یہ کون آکر ہمارے علاقے میں آکر آباد ہو گئی ہے۔ میں کھڑکی سے اسے جب بھی دیکھتا، وہ جاسوسی ناول پڑھتی رہتی تھی۔ کوئی کام نہیں کرتی تھی۔ اُسے کسی چولہے چوکے کا کوئی خیال نہ تھا۔ بچّوں کو بھی کئی بار باہر نکل جانے کو کہتی تھی۔

ایک روز وہ سبزی کی دُکان پر گر گئی، لوگوں نے اُس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے وینٹے مارے تو اُسے ہوش آیا اور وہ گھر گئی۔ تین دن کے بعد وہ فوت ہو گئی، حالانکہ اچھی صحت مند دکھائی پڑتی تھی۔ جو بندے اُس کے ہاں آتے تھے، اُنہوں نے ہی اُس کا کفن دفن کا سامان کیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ اُن کے ہاں آنے والا ایک بندہ اُن کا فیملی ڈاکٹر تھا۔ اُس عورت کو ایک ایسی بیماری تھی جس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ اُس کو کینسر کی ایسی خوفناک صورت لاحق تھی Skin وغیرہ کی کہ اُس کے بدن سے بدبُو بھی آتی رہتی تھی۔ جس پر زخم ایسے تھے اور اُسے خوشبو کے لیے سپرے کرنا پڑتا تھا، تاکہ کسی قریب کھڑے کو تکلیف نہ ہو۔ اُس کا لباس اس لیے ہلکا ہوتا تھا اور غالباً ایسا تھا جو بدن کو نہ چُبھے۔ دوسرا اُس کے گھر

آنے والا اُس کا وکیل تھا، جو اُس کے حقوق کی نگہبانی کرتا تھا۔ تیسرا اُس کے خاوند کا چھوٹا بھائی تھا، جو اپنی بھابی کو ملنے آتا تھا۔ ہم نے ایسے ہی اُس کے بارے طرح طرح کے اندازے لگا لیے اور نتائج اخذ کر لیے اور اُس نیک پاکدامن عورت کو جب دورہ پڑتا تھا، تو بچّوں کو دھکے مار باہر نکال دیتی تھی اور تڑپنے کے لیے وہ اپنے دروازے بند کر لیتی تھی۔

میرا یہ سب کچھ عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم تنقید اور نقص نکالنے کا کام اللہ پر چھوڑیں وہ جانے اور اُس کا کام جانے۔ ہم اللہ کا بوجھ اپنے کندھوں پر نہ اُٹھائیں، کیونکہ اُس کا بوجھ اُٹھانے سے آدمی سارے کا سارا "چِببہ" ہو جاتا ہے، کمزور ہو جاتا ہے، مر جاتا ہے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں عطا کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ !!

سلطان سنگھاڑے والا

انسانی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے، جب اُس کی آرزو یہ ہوتی ہے کہ وہ اب بڑے پُر سکون انداز میں زندگی بسر کرے اور وہ ایسے جھمیلوں میں نہ رہے، جس طرح کے جھمیلوں میں اُس نے اپنی گزشتہ زندگی بسر کی ہوئی ہوتی ہے اور یہ آرزو بڑی شدت سے ہوتی ہے۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ جو لوگ اللہ کے ساتھ دوستی لگا لیتے ہیں، وہ بڑے مزے میں رہتے ہیں اور وہ بڑے چالاک لوگ ہوتے ہیں۔ ہم کو اُنہوں نے بتایا ہوتا ہے کہ ہم ادھر اپنے دوستوں کے ساتھ دوستی رکھیں اور وہ خود بیچ میں سے نکل کر اللہ کو دوست بنا لیتے ہیں۔ اُن کے اوپر کوئی تکلیف، کوئی بوجھ اور کوئی پہاڑ نہیں گرتا۔ سارے حالات ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے میرے اور آپ کے ہیں، لیکن ان لوگوں کو ایک ایسا سہارا ہوتا ہے، ایک ایسی مدد حاصل ہوتی ہے کہ اُنہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچتی۔

میں نے یہ بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ہمارے گھر میں دھوپ سینکتے ہوئے میں ایک چڑیا کو دیکھا کرتا ہوں، جو بڑی دیر سے ہمارے گھر میں رہتی ہے اور غالباً یہ

اُس چڑیا کی یا تو بیٹی ہے، یا نواسی ہے جو بہت ہی دیر سے ہمارے مکان کی چھت کے ایک کونے میں رہتی ہے۔ ہمارا مکان ویسے تو بڑا اچھا ہے، اس کی ''آروی'' کی چھتیں ہیں، لیکن کوئی نہ کوئی کھدرا ایسا رہ ہی جاتا ہے، جو ایسے مکینوں کو بھی جگہ فراہم کر دیتا ہے۔ یہ چڑیا بڑے شوق، بڑے سبھاؤ اور بڑے ہی مانوس انداز میں گھومتی پھرتی رہتی ہے۔ ہمارے کمرے کے اندر بھی اور فرش پر بھی چلی آتی ہے۔ کل ایک فاختہ آئی جو ٹیلیفون کی تار پر بیٹھی تھی اور یہ چڑیا اُڑ کر اُس کے پاس گئی، اُس وقت میں دھوپ سینک (تاپ) رہا تھا۔ اُس چڑیا نے فاختہ سے پوچھا کہ ''آپا یہ جو لوگ ہوتے ہیں انسان، جن کے ساتھ میں رہتی ہوں، یہ اتنے بے چین کیوں ہوتے ہیں؟ یہ بھاگے کیوں پھرتے ہیں؟ دروازے کیوں بند کرتے اور کھولتے ہیں؟ اس کی وجہ کیا ہے؟'' فاختہ نے کہا کہ ''میرا خیال کہ جس طرح ہم جانوروں کا ایک اللہ ہوتا ہے، ان کا کوئی اللہ نہیں ہے اور ہمیں یہ چاہیے کہ ہم مل کر کوئی دعا کریں کہ ان کو بھی ایک اللہ مل جائے۔ اس طرح انہیں آسانی ہو جائے گی، کیونکہ اگر ان کو اللہ نہ مل سکا، تو مشکل میں زندگی بسر کریں گے۔''

اب معلوم نہیں میری چڑیا نے اُس کی بات مانی یا نہیں، لیکن وہ بڑی دیر تک گفت و شنید کرتی رہیں اور میں بیٹھا اپنے تصور کے زور پر یہ دیکھتا رہا کہ ان کے

درمیان گفتگو کا شاید کچھ ایسا ہی سلسلہ جاری ہے۔ تو ہم کس وجہ سے، ہمارا اتنا بڑا قصور بھی نہیں ہے، ہم کمزور لوگ ہیں جو ہماری دوستی اللہ کے ساتھ ہو نہیں سکتی۔ جب میں کوئی ایسی بات محسوس کرتا ہوں یا سُنتا ہوں تو پھر چاہنے "بابوں" کے پاس بھاگتا ہوں_ میں نے اپنے بابا جی سے کہا کہ جی ! میں اللہ کا دوست بننا چاہتا ہوں۔ اس کا کوئی ذریعہ چاہتا ہوں۔ اُس تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ یعنی میں اللہ والے لوگوں کی بات نہیں کرتا۔ ایک ایسی دوستی چاہتا ہوں، جیسے میری آپ کی اپنے اپنے دوستوں کے ساتھ ہے، تو اُنہوں نے کہا "اپنی شکل دیکھ اور اپنی حیثیت پہچان، تو کس طرح سے اُس کے پاس جا سکتا ہے، اُس کے دربار تک رسائی حاصل کر سکتا ہے اور اُس کے گھر میں داخل ہو سکتا ہے، یہ ناممکن ہے۔ میں نے کہا، جی ! میں پھر کیا کروں؟ کوئی ایسا طریقہ تو ہونا چاہیے کہ میں اُس کے پاس جا سکوں؟ بابا جی نے کہا، اس کا آسان طریقہ یہی ہے کہ خود نہیں جاتے اللہ کو آواز دیتے ہیں کہ "اے اللہ ! تو آجا میرے گھر میں" کیونکہ اللہ تو کہیں بھی جا سکتا ہے، بندے کا جانا مشکل ہے۔ بابا جی نے کہا کہ جب تم اُس کو بُلاؤ گے تو وہ ضرور آئے گا۔ اتنے سال زندگی گزر جانے کے بعد میں نے سوچا کہ واقعی میں نے کبھی اُسے بلایا ہی نہیں، کبھی اس بات کہ زحمت ہی نہیں کی۔ میری زندگی ایسے ہی رہی ہے، جیسے بڑی دیر کے بعد کالج کے زمانے کا ایک کلاس فیلو مل

جائے بازار میں تو پھر ہم کہتے ہیں کہ بڑا اچھا ہوا آپ مل گئے۔ کبھی آنا۔ اب وہ کہاں آئے، کیسے آئے اس بے چارے کو تو پتا ہی نہیں۔

ہمارے ایک دوست تھے۔ وہ تب ملتے تھے، جب ہم راولپنڈی جاتے تو کہتے کہ جی آنا، کوئی ملنے کا پروگرام بنانا، یہ بہت اچھی بات ہے، لیکن ایڈریس نہیں بتاتے تھے۔ جیسے ہم اللہ کو اپنا ایڈریس نہیں بتاتے کسی بھی صورت میں میں کہ کہیں سچ مچ ہی نہ پہنچ جائے۔ ایک دھڑکا لگا رہتا ہے۔ وہ مجھے کہا کرتے تھے کہ بس مہینے کے آخری ویک کی کسی ڈیٹ کو ملاقات کا پروگرام بنا لیں گے۔ Sunset کے قریب، نہ ڈیٹ بتاتے تھے نہ ٹائم تھے، Determine نہیں کرتے تھے، تو ایسا ہی اللہ کے ساتھ ہمارا تعلق ہے۔ ہم یہ نہیں چاہتے، بلکہ کسی حد تک ڈر جاتے ہیں کہ خدانخواستہ اگر ہم نے اللہ سے دوستی لگا لی اور وہ آ گیا تو ہمیں بڑے کام کرنے پڑیں گے۔ دوپٹہ چننا ہوتا ہے، بوٹ پالش کرنا ہوتے ہیں، مہندی پر جانا ہوتا ہے۔ اُس وقت اللہ میاں آ گئے اور اُنہوں نے کہا کہ "کیا ہو رہا ہے؟" تو مشکل ہو گی۔ ہم نے آخر زندگی کے کام بھی نمٹانے ہیں۔ باقی جو بات میں سوچتا ہوں اور میں نے اپنے بابا کو یہ جواب دیا کہ میں سمجھتا ہوں کہ اللہ کی عبادت کرنا بہت اچھی بات ہے اور یہ بھی اچھی بات۔ اُنہوں نے کہا کہ عبادت کرنا ایک اور چیز ہے، تم نے تو مجھ سے کہا کہ میں خداوند کریم کو بلاواسطہ

طور پور ملنا چاہتا ہوں۔ عبادت کرنا تو ایک گرائمر ہے جو آپ کر رہے ہیں اور اگر آپ عبادت کرتے بھی ہیں، تو پھر آپ اپنی عبادت کو Celebrate کریں، جشن منائیں، جیسے مہندی پر لڑکیاں تھال لے کر ناچتی ہیں نا، موم بتیاں جلا کر اس طرح سے، ورنہ تو آپ کی عبادت کسی کام کی نہیں ہو گی۔

جب تک عبادت میں Celebration نہیں ہو گی، جشن کا سماں نہیں ہو گا، جیسے وہ بابا کہتا ہے "تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا" چاہے سچ مچ نہ ناچیں لیکن اندر سے اس کا وجود اور روح "تھیا تھیا" کر رہی ہے، لیکن جب تک Celebration نہیں کرے گا، بات نہیں بنے گی۔ اس طرح سے نہیں کہ نماز کو لپیٹ کر "چار سنتاں، فیر چار فرض فیر دو سنتاں فیر دو نفل، تِن وِتر" سلام پھیرا، چلو جی رات گزری فکر اُترا۔ نہیں جی! یہ تو عبادت نہیں۔ ہم تو ایسی ہی عبادت کرتے رہے ہیں، اس لیے تال میل نہیں ہوتا۔ جشن ضرور منانا چاہیے عبادت کا، دل لگی، محبّت اور عقیدت کے ساتھ عبادت۔ ہمارے یہاں جہاں میں رہتا ہوں، وہاں دو بڑی ہاکی اور کرکٹ گراؤنڈز ہیں، وہاں سنڈے کے سنڈے بہت سویرے، جب ہم سیر سے لوٹ رہے ہوتے ہیں، منہ اندھیرے گڈی اُڑانے والے آتے ہیں۔ وہ اس کا بڑا اہتمام کیے ہوئے ہوتے ہیں، ان کے بڑے بڑے تھیلے ہوتے ہیں اور بہت کاریں ہوتی ہیں، جن میں وہ اپنے بڑے تھیلے رکھ

کر پتنگ اُڑانے کے لیے کھلے میدان میں آتے ہیں۔ اب وہ خالی پتنگ نہیں اُڑاتے، بلکہ اہتمام کے ساتھ اس کا جشن بھی مناتے ہیں۔ جب تک اس کے ساتھ جشن نہ ہو، وہ پتنگ نہیں اُڑتی اور نہ ہی پتنگ اُڑانے والا سماں بندھتا ہے، کھانے پینے کی بے شمار چیزیں باجا بجانے کے ''بھومپو'' اور بہت کچھ لے کر آتے ہیں، وہاں جشن زیادہ ہوتا ہے، کائٹ فلائنگ کم ہوتا ہے۔ جس طرح ہمارے ہاں عبادت زیادہ ہوتی ہے،Celebration، اللہ کو ماننا کم ہوتا ہے۔

میں نے سوچا یہ گڈی اُڑانے والے بہت اچھے رہتے ہیں، ہمارے پاس بابا جی کے ہاں ایک گڈی اُڑانے والا آیا کرتا تھا موچی دروازے کے اندر علاقے سے، بڑی خوبصورت دھوتی (تہ بند) باندھتا تھا، جیسے انجمن فلموں میں باندھا کرتی تھی، لمبے لڑ چھوڑ کر باندھا کرتی تھی، وہ جب آتا تو ہمارے بابا جی اُسے کہتے، گڈی اُڑاؤ)اس طرح بابا جی ہمیں Celebrate کرنے کا حوصلہ دیتے تھے، جو بات اب سمجھ میں آئی ہے (وہ اتنی اونچی پتنگ اُڑاتا تھا کہ نظروں سے اوجھل ہو جاتی تھی میرے جیسا آدمی تو اس لمبی ڈور کو سنبھال بھی نہیں سکتا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ بھا صدیق! تم یہ گڈی کیوں اُڑاتے ہو؟ کہنے لگا، جی! یہ گڈی اُڑانا بھی اللہ کے پاس پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ کہنے لگا، نظر نہیں آتی، لیکن اس کی کھینچ بتاتی رہتی

ہے کہ میں ہوں، اللہ نظر نہیں آتا لیکن آپ کے دلوں کی دھڑکن یہ بتاتی ہے کہ "میں ہوں"۔ یہ نہیں کہ وہ آپ کے رُوبرو آکر موجود ہو۔

جب میں ریڈیو میں کام کرتا تھا تو ہمیں ایک Assignment ملی تھی۔ وہ یہ کہ پتا کریں چھوٹے دکانداروں سے کہ وہ کس طرح کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ چھوٹے دکانداروں سے مراد چھابڑی فروش۔ یہ کچھ دیر کی بات ہے، میں نے بہت سے چھابڑی فروشوں کا انٹرویو کیا۔ اُن سے حال معلوم کیے۔ پیسے کا ہی سارا اونچ نیچ ہے اور ہم جب بھی تحقیق کرتے ہیں یا تحلیل کرتے ہیں یا Analysis کرتے ہیں تو Economics کی Base پر ہی کرتے ہیں کہ کتنے امیر ہیں، کتنے غریب ہیں، کیا تناسب ہے کہ وہ کس Ratio کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں؟ اُن کے کیا مسائل ہیں؟ دِلّی (دہلی) دروازے کے باہر اگر آپ لوگوں میں سے کسی نے دہلی دروازہ دیکھا ہو، اُس کے باہر ایک آدمی کھڑا تھا نوجوان، وہ کوئی تیس بتیس برس کا ہو گا۔ وہ سنگھاڑے بیچ رہا تھا۔ میں اُس کے پاس گیا۔ میں نے پوچھا، آپ کا نام کیا ہے؟ کہنے لگا، میرا نام سلطان ہے! میں نے کہا کب تک تم یہ سنگھاڑے بیچتے ہو؟ کہنے لگا، شام تک کھڑا رہتا ہوں۔ میں نے پوچھا اس سے تمہیں کتنے روپے مل جاتے ہیں؟ اُس نے بتایا، ستر بہتّر روپے ہو جاتے ہیں۔ میں نے اُس سے پوچھا، انہیں کالے کیسے کرتے ہیں؟ (میری بیوی پوچھتی رہتی تھی

مجھ سے، کیونکہ وہ دیگچے میں ڈال کر ابالتی ہے تو وہ ویسے کے ویسے ہی رہتے ہیں)
اُس نے کہا کہ جی پنساریوں کی دکان سے ایک چیز ملتی ہے، چمچہ بھر اس میں ڈال دیں تو کالے ہو جائیں گے اُبل کر اور آپ جا کر کسی پنساری سے پوچھ لیں کہ سنگھاڑے کالے کرنے والی چیز دے دیں، وہ دیدے گا۔ جب اُس نے یہ بات کی تو میں نے کہا، یہ اندر کے بھید بتانے والا آدمی ہے اور کوئی چیز پوشیدہ نہیں رکھتا۔ کھلی نیّت کا آدمی ہے۔ یقیناً یہ ہم سے بہتر انسان ہو گا۔

میں نے کہا، جب آپ ستر بہتّر روپے روز بنا لیتے ہیں تو پھر ان روپوں کا کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگا، میں جا کر "رضیہ" کو دے دیتا ہوں۔ میں نے کہا، رضیہ کون ہے؟ کہنے لگا، میری بیوی ہے۔ میں نے کہا کہ شرم کرو اتنی محنت سے پیسے کماتے ہو اور سارے کے سارے اُسے دے دیتے ہو۔ کہنے لگا، جی اسی کے لیے کماتے ہیں۔)اللہ کہتا ہے نا قرآن پاک میں کہ اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَی النِّسَآءِ یہ جو مرد ہیں، یہ عورت کے Provider ہیں(۔ میں نے اُس سے کہا، اچھا تو بیچ میں سے کچھ نہیں رکھتے؟ کہنے لگا، نہیں جی! مجھے کبھی ضرورت نہیں پڑی۔ میں نے کہا، اس وقت رضیہ کہاں ہے؟) وہ inside خوبصورت آدمی تھا اس لیے مجھے اُس میں دلچسپی پیدا ہوئی (کہنے لگا، رضیہ کہیں بازار وغیرہ گئی ہو گی۔ اس کی دو سہیلیاں ہیں اور وہ تینوں صبح سویرے نکل جاتی ہیں بازار۔ اُس نے بتایا کہ وہ کبھی کبھی

گلوکوز لگواتی ہیں، اُن کو شوق ہے (اس طرح مجھے تو بعد میں پتا چلا کہ اندرونِ شہر کی عورتیں گلوکوز لگوانا پسند کرتی ہیں، گلوکوز لگوانا انہیں اچھی سی چیز لگتی ہے کہ اس کے لگوانے سے جسم کو تقویت ملے گی)۔ میں نے کہا، اچھا تم خوش ہو اُس کے ساتھ؟ کہنے لگا، ہاں جی! ہم اپنے اللہ کے ساتھ بڑے راضی ہیں۔ میری تو اللہ کے ساتھ ہی آشنائی ہے۔ میں تو کسی اور آدمی کو جانتا نہیں۔ اس پر میں چونکا اور ٹھٹھکا۔ اُس کی باتوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ایک بڑا آدمی ہے لاہور کا۔ میں نے اگر کوئی حاکم دیکھا ہے تو وہ "سلطان سنگھاڑا فروش" ہے۔ اُس کو کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ کوئی واردات، واقعہ اُس کے اوپر اثر انداز نہیں ہوتا تھا۔

میں اُس سے جب بھی ملتا رہا کوئی شکایت اُس کی زبان پر نہیں ہوتی تھی۔ اب تو تین سال سے جانے وہ کہاں غائب ہے۔ مجھے نظر نہیں آیا، لیکن میں اُس کے حضور میں حاضری دیتا ہی رہا۔ اُس کا درجہ چونکہ اس اعتبار سے بلند تھا کہ اُس کی دوستی ایک بزرگ ترین ہستی سے تھی۔ میں ذرا اپنی گفتار اور باتوں میں تھوڑا سا باادب ہو گیا۔ میں نے اُس سے کہا، یار سلطان! کیا تم اللہ کے ساتھ گفتگو بھی کرتے ہو؟ کہنے لگا، ہم تو شام کو جاتے، صبح کو آتے ہوئے، منڈی سے سودا خریدتے ہوئے اُس کے ساتھ ہی رہتے ہیں اور اُسی کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔ میں نے کہا، کون سی زبان میں؟ وہ کہنے لگا، "اوہ پنجابی وی جاندا اے، اردو جاندا

اے، سندھی جو وی بولی بولیں او سب جاندا اے!" میں نے کہا تو نے مجھے بتایا تھا ایک دن کہ گیارہ برس ہو گئے تمہاری شادی کو اور تمہارا کوئی بچّہ نہیں ہے؟ کہنے لگا، بچّہ کوئی نہیں میں اور رضیہ اکیلے ہیں۔ میں نے کہا، اللہ سے کہو کہ اللہ تجھے ایک بچّہ دے۔ کہنے لگا، نہیں جی! یہ تو ایک بڑی شرم کی بات ہے۔ بزرگوں سے ایسی بات کیا کرنی، بُرا سا لگتا ہے۔ وہ خداوند تعالیٰ کو ایک بزرگ ترین چیز سمجھ کر کہہ رہا تھا کہ جی! بڑوں کے ساتھ ایسی بات نہیں کرنی۔ میں یہ کہتا فضول سا لگوں گا کہ اللہ مجھے بچّہ دے۔

میں نے کہا کہ کیا ایسے ہو سکتا ہے کہ ہماری بھی اُس کے ساتھ دوستی ہو جائے؟ کہنے لگا، اگر آپ چاہیں تو ہو سکتا ہے۔ اگر آپ نہ چاہیں تو نہیں ہو سکتا۔ میں نے جیسا کہ میں پہلے عرض کر رہا تھا، اپنے سارے برسوں کا میں نے جائزہ لیا، سارے دنوں کا، میں نے کبھی یہ نہیں چاہا۔ میرا یہی خیال تھا کہ میں عبادت کروں گا اور عبادت ہی اس کا راز ہے اور عبادت کو ہی لپیٹ کر رکھ دوں گا اپنے مصلّے کے اوپر اور دن رات اسی طرح عبادت کرتا رہوں گا۔ لیکن وہ جو میرا منتہائے مقصود ہے، وہ جو میرا محبوب ہے، اُس کی طرف جانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ میں یہی سمجھتا رہا اور آج تک یہی سمجھتا رہا ہوں کہ عبادت ہی یہ سارا راز اور سارا بھید ہے، حالانکہ عبادت سے ماورا (میں یہ جو بات عرض کر رہا ہوں،

آپ کو سمجھانے کے لیے کر رہا ہوں) عبادت سے پرے ہٹ کر ایک آرزو کی بھی تلاش ہے کہ میں اپنے اللہ کے ساتھ جس کی کوئی ایک ہستی ہے نہ نظر میں آنے والی، اس کے ساتھی کوئی رابطہ قائم کروں، جیسا سلطان نے کیا تھا۔ جیسے اُس کے علاوہ چار پانچ بندے اور بھی ہیں میری نظر میں۔ میں نے اس بات سے اندازہ لگایا کہ اتنا خوش آدمی میں نے زندگی میں کوئی نہیں دیکھا۔ جتنے بھی اللہ کے ساتھ تعلق رکھنے والے لوگ تھے، وہ انتہائی خوش تھے۔

1965ء کی جنگ میں اس (سلطان) کے پاس گیا، لوگ گھبرائے بھی ہوئے تھے، جذباتی بھی تھے۔ وہ ٹھیک تھا، ویسے ہی، بالکل اسی انداز میں جیسے پہلے ملا کرتا تھا۔ میں نے اُس سے کہا تم مجھے کوئی ایسی بات بتاؤ جس سے میرے دل میں چلو کم از کم یہ خواہش ہی پیدا ہو جائے، خدا سے دوستی کی اور میں کم از کم اس پلیٹ فارم سے اُتر کر دو نمبر کے پلیٹ فارم پر آ جاؤں۔ پھر میں وہاں سے سیڑھیاں چڑھ کر کہیں اور چلا جاؤں۔ میری نگاہ اوپر ہو جائے، تو کہنے لگا (حالانکہ اَن پڑھ آدمی تھا، اب لوگ مجھ سے بابوں کا ایڈریس پوچھتے ہیں، میں انہیں کیسے بتاؤں کہ ایک سلطان سنگھاڑے والا دِلّی دروازے کے باہر جہاں تانگے کھڑے ہوتے ہیں، ان کے پیچھے کھڑا ہے، جو بہت عظیم "بابا" ہے اور نظر آنے والوں کو شاید نظر آتا ہو گا، مجھے پورے کا پورا تو نظر نہیں آتا) بھا جی! بات

یہ ہے کہ جب ہم منہ اوپر اُٹھاتے ہیں تو ہم کو آسمان اور ستارے نظر آتے ہیں۔ اللہ کے جلوے دکھائی دیتے ہیں۔ کہنے لگا، آپ کبھی مری گئے ہیں؟ میں نے کہا، ہاں میں کئی بار مری گیا ہوں۔ کہنے لگا، جب آدمی مری جاتا ہے نا پہاڑی پر تو پھر حال کا نظارہ لینے کے لیے وہ نیچے بھی دیکھتا ہے اور اوپر بھی۔ پھر اُس کا سفر Complete ہوتا ہے۔ خالی ایک طرف منہ کرنے سے نہیں ہوتا۔ جب آپ نیچے کو اور اوپر کو ملاتے ہیں، تو پھر ساری وسعت اس میں آتی ہے۔

اُس نے کہا کہ یہ ایک راز ہے جب آدمی یہ سمجھنے لگ جائے کہ میں وسعت کے اندر داخل ہو رہا ہوں (وہ پنجابی میں بات کرتا تھا، اُس کے الفاظ تو اور طرح کے ہوتے تھے) پھر اُس کو قربت کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن حوصلہ کر کے وہی کہنا پڑتا ہے، جیسا کہ باباجی کہتے تھے کہ "اے اللہ! تو میرے پاس آ جا مجھ میں تو اتنی ہمّت نہیں کہ میں آ سکوں" اور وہ یقیناً آتا ہے۔ بقول سلطان سنگھاڑے والے کے کہ اس کے لیے کہیں جانا نہیں پڑتا، اس لیے کہ وہ تو پہلے سے ہی آپ کے پاس موجود ہے اور آپ کی شہ رگ کے پاس کرسی ڈال کر بیٹھا ہوا ہے۔ آپ اُسے دعوت ہی نہیں دیتے۔ میں نے اُس سے کہا کہ اس کا مجھے کوئی راز بتا، مجھے کچھ ایسی بات بتا کہ جس سے میرے دل کے اندر کچھ محسوس ہو۔ کہنے لگا، جی! آپ کے دل کے اندر کیا میں تو سارے پاکستان کے، لاہور کے لوگوں سے کہنا

چاہتا ہوں کہ جب وہ باہر نکلا کریں پورا لباس پہن کر نکلا کریں۔ میں نے کہا، سارے ہی پورا لباس پہنتے ہیں۔ کہنے لگا، یہ دیکھ تانگے میں چار بندے بیٹھے ہوئے ہیں۔ پورا لباس نہیں پہنا ہوا۔ میں نے کہا، یہ بابو گزرا ہے تھری پیس سوٹ پہنا ہوا ہے اس نے ٹائی بھی لگائی ہوئی ہے۔ کہنے لگا، نہیں جی آدمی جب کم از کم باہر نکلے تو جس طرح لڑکیاں میک اپ کرتی ہیں، خاص طور پر باہر نکلنے کے لیے، تو اس طرح آدمی کو بھی اپنے لباس کے اوپر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔

میں یہی سمجھتا رہا کہ وہ کوئی اخلاقی بات کرنا چاہتا ہے لباس کے بارے میں، جیسے ہم آپ لوگ کرتے ہیں۔ کہنے لگا، لوگ سارے کپڑے پہن تو لیتے ہیں، لیکن اپنے چہرے پر مسکراہٹ نہیں رکھتے اور ایسے ہی آ جاتے ہیں لڑائی کرتے ہوئے اور لڑائی کرتے ہوئے ہی چلے جاتے ہیں۔ تو جب تک آپ چہرے پر مسکراہٹ نہیں سجائیں گے، لباس مکمل نہیں ہو گا۔ یہ جو تانگے پر بیٹھے ہوئے ہیں چار آدمی، کہنے لگا یہ تو برہنہ جا رہے ہیں۔ مسکراہٹ اللہ کی شکر گزاری ہے اور جب آدمی اللہ کی شکر گزاری سے نکل جاتا ہے، تو پھر وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ میں کہا، یار! ہم تو بہت عبادت گزار لوگ ہیں۔ باقاعدگی سے نماز پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں۔ اس پر وہ کہنے لگا، جی! میں لال قدسی میں رہتا ہوں، وہاں بابا وریام ہیں۔ وہ رات کو بات (لمبی کہانی) سنایا کرتے ہیں۔

انہوں نے ہمیں ایک کہانی سنائی کہ پیرانِ پیر کے شہر بغداد میں ایک بندہ تھا جو کسی پر عاشق تھا۔ اُس کے لیے تڑپتا تھا، روتا تھا، چیخیں مارتا تھا اور زمین پر سر پٹختا تھا۔ لیکن اُس کا محبوب اُسے نہیں ملتا تھا۔ اُس شخص نے ایک بار خدا سے دعا کی کہ اے اللہ! ایک بار مجھے میرے محبوب کے درشن تو کرادے۔ اللہ تعالیٰ و اُس پر رحم آگیا اور اُس کا محبوب ایک مقررہ مقام پر، جہاں بھی کہا گیا تھا، پہنچ گیا۔ دونوں جب ملے تو عاشق چٹھیوں کا ایک بڑا بنڈل لے آیا۔ یہ وہ خط تھے، جو وہ اپنے محبوب کے ہجر میں لکھتا رہا تھا۔ اُس نے وہ کھول کر اپنے محبوب کو سنانے شروع کر دیئے۔ پہلا خط سنایا اور اپنے ہجر کے دکھڑے بیان کیے۔ اس طرح دوسرا خط پھر تیسرا خط اور جب وہ گیارہویں خط پر پہنچا تو اُس کے محبوب نے اُسے ایک تھپڑ رسید کیا اور کہا "گدھے کے بچّے! میں تیرے سامنے موجود ہوں، اپنے پورے وجود کے ساتھ اور تو مجھے چٹھیاں سنا رہا ہے۔ یہ کیا بات ہوئی" سلطان کہنے لگا، بھا جی! عبادت ایسی ہوتی ہے۔ آدمی چٹھیاں سناتا رہتا ہے، محبوب اُس کے گھر میں ہوتا ہے، اُس سے بات نہیں کرتا۔ جب تک اُس سے بات نہیں کرے گا، چٹھیاں سنانے سے کوئی فائدہ نہیں۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ایسے لوگ بڑے مزے میں رہتے ہیں۔ میں بڑا سخت حاسد ہوں ان کا، میں چاہتا ہوں کہ کچھ کیے بغیر، کوشش، Struggle کیے بغیر

مجھے بھی ایسا مقام مل جائے، مثلاً جی چاہتا ہے کہ میرا ابھی پرائز بانڈ نکل آئے ساڑھے تین کروڑ والا۔ لیکن اس سے پہلے میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ چاہے وہ پرائز بانڈ نکلے نہ نکلے (ایمانداری کی بات کرتا ہوں) مجھے وہ عیاشی میسر آ جائے، جو میں نے پانچ آدمیوں کے چہرے پر اُن کی روحوں پر دیکھی تھی، کیونکہ اُن کی دوستی ایک بہت اونچے مقام پر تھی۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ !!

مَیں کون ہوں؟

بہت دیر کا وعدہ تھا جو جلد پورا ہونا چاہیے تھا، لیکن تاخیر اس لیے ہو گئی کہ شاید مجھ پر بھی کچھ اثر میرے پڑوسی ملک کا ہے کہ اس نے کشمیریوں کے ساتھ بڑی دیر سے وعدہ کر رکھا تھا کہ ہم وہاں رائے شماری کرائیں گے۔ لیکن آج تک وہ اسے پورا نہ کر سکے۔ حالانکہ وہ وعدہ یو این او کے فورم میں کیا گیا تھا، لیکن میری نیّت ان کی طرح خراب نہیں تھی۔ میں اس دیر کے وعدے کے بارے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ انسانی وجود، اس کی پرکھ، جانچ اور اس کی آنکھ دیگر تمام جانداروں سے مختلف بھی ہے اور مشکل بھی۔ جتنے دوسرے جاندار ہیں انکو بڑی آسانی کے ساتھ جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے لیکن انسان واحد مخلوق ہے جس کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہ تو باہر کا کوئی شخص کر سکتا ہے اور نہ خود اس کی اپنی ذات کر سکتی ہے۔ انسانی جسم کو ماپنے، تولنے کے لیے جیسے فوجیوں کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ آپ کا قد ماپیں گے، وزن کریں گے، جسم کی سختی کو ملاحظہ کریں گے، بینائی دیکھیں گے یعنی باہر کا جو سارا انسان ہے، اس کو جانچیں اور پرکھیں گے اور پھر انہوں نے جو بھی اصول اور ضابطے قائم کیے ہیں، اس کے مطابق چلتے رہیں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اندر کی مشینری کو جانچنے کے لیے بھی انہوں نے پیمانے بنائے ہیں۔ اگر آپ خدانخواستہ کسی عارضے میں مبتلا ہیں تو اس کو کیسے جانچیں گے؟

ڈاکٹر اپنا اسٹیتھو سکوپ سینے پر رکھ کر دل کی دھڑکنیں اور گڑگڑاہٹیں سنتا ہے، تھرمامیٹر استعمال کرتا ہے، ایکسرے، الٹرا ساؤنڈ اور سی ٹی سکین، یہ سب چیزیں انسان کے اندر کی بیماریوں کا پتا دیتی ہیں۔ پھر اس کے بعد تیسری چیز انسان کی دماغی اور نفسیاتی صورتحال کا جائزہ لینا ہوتا ہے۔ نفسیات دان اس کو جانچتے ہیں۔ انہوں نے کچھ تصویری خاکے اور معمے بنائے ہوتے ہیں۔ ایک مشین بنا رکھی ہے، جو آدمی کے سچ یا جھوٹ بولنے کی کیفیت بتاتی ہے۔ کچھ ایسی مشینیں بھی ہیں، جو شعاعیں ڈال کر پتلی کے سکڑنے اور پھیلنے سے اندازہ لگاتی ہیں کہ اس شخص کا اندازِ تکلم اور اندازِ زیست کیسا ہے؟

نفسیات کے ایک معروف ٹیسٹ میں ایک بڑے سے سفید کاغذ پر سیاہی گرا دی جاتی ہے اور اس کاغذ کی تہہ لگا دیتے ہیں۔ جب اس کو کھولا جاتا ہے تو اس پر کوئی تصویر سی چڑیا، طوطا یا تتلی بنی ہوئی ہوتی ہے اور پوچھا جاتا ہے کہ آپ کو یہ کیا چیز نظر آتی ہے؟ اور پھر دیکھنے والا اس کو جیسا محسوس کرتا ہے، بتلاتا ہے، کوئی اسے خوبصورت چڑیا سے تعبیر کرکے کہتا ہے اسے ایک چڑیا نظر آرہی ہے، جو گاتی ہوئی اڑی جارہی ہے۔

ایک اور مزاج کا بندہ آتا ہے اور کہتا ہے کہ اس میں ایک بڑھیا ہے، جو ڈنڈا پکڑے بیٹھی ہے اور اس کی شکل میرے جیسی ہے۔ اس طرح سے دیکھنے والے کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ جانوروں کو بھی اسی معیار پر پرکھا جاسکتا ہے۔ قصائی جس طرح بکرے کو دیکھ کر بیمار یا تندرست کا پتا چلالیتا ہے۔ بھینس کو دیکھ کر بھی اندازہ لگایا جاتا ہے کہ یہ اچھی بھینس ہے یا نہیں۔ گھوڑوں کو بھی چیک کرلیا جاتا ہے۔ جانوروں کا چیک کرنا اس لیے بھی

آسان ہے کہ اگر ہم جانور کے ساتھ کسی خاص قسم کا برتاؤ کریں گے، تو وہ بھی جواب میں ویساہی برتاؤ کرے گا۔ لیکن انسان کے بارے میں یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ ممکن ہے کہ آپ ایک آدمی کو زور کا تھپڑ ماریں اور وہ پستول نکال کر آپ کو گولی مار دے۔ ممکن ہے کسی کو ایک تھپڑ ماریں اور وہ جھک کر آپ کو سلام کرے یا ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جائے۔ اس لیے انسان کے حوالے سے کچھ طے نہیں کیا جاسکتا۔ اس کو جانچنا ہمارے صوفیائے کرام اور "بابے" جن کا میں اکثر ذکر کرتا ہوں، ان کے لیے ہمیشہ ایک مسئلہ رہا ہے کہ انسان اندر سے کیا ہے؟ اور جب تک وہ اپنے آپ کو نہ جان سکے، اس وقت تک وہ دوسروں کے بارے میں کیا فیصلہ کر سکتا ہے۔

آپ کے جتنے بھی ایم این اے اور ایم پی اے ہیں، یہ ہمارے بارے میں بیٹھ کر فیصلے کرتے ہیں، لیکن وہ خود یہ نہیں جانتے کہ وہ کون ہیں؟ یہ ایسے تیراک ہیں جو ہم کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ان کو خود تیرنا نہیں آتا۔ سیکھا ہی نہیں انہوں نے۔ جو گہری نظر رکھنے والے لوگ ہیں وہ جاننا چاہتے ہیں۔ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ کبھی اگر آپ نے غور کیا ہو یا نہ کیا ہو، لیکن آپ کے شعور سے یہ آواز آتی ہی رہتی ہے کہ "میں کون ہوں" اور" میں کہاں ہوں " اور اس سارے معاملے اور کائنات میں کہاں فٹ ہوں، اس کے لیے ہمارے بابوں نے غور کرنے اور سوچنے کے بعد اور بڑے لمبے وقت اور وقفے سے گزرنے کے بعد اپنی طرز کا طریق سوچا ہے، جس کے کئی رخ ہیں۔ آسان لفظوں میں وہ اس نئے طریق کو "فکر" یا "مراقبے" کا نام دیتے ہیں۔

اب یہ مراقبہ کیوں کیا جاتا ہے، اس کی کیا ضرورت ہے، کس لیے وہ بیٹھ کر مراقبہ کرتے ہیں اور اس سے ان کی آخر حاصل کیا ہوتا ہے؟ مراقبے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوتی ہے کہ کوئی ایسی مشین یا آلہ ایجاد نہیں ہوا، کو کسی بندے کو لگا کر یہ بتایا جا سکے کہ ? What am I? who am I کہ میں کیا ہوں؟ اس کے لیے انسان کو خود ہی مشین بنتا پڑتا ہے، خود ہی سبجیکٹ بننا پڑتا ہے اور خود ہی جانچنے والا۔ اس میں آپ ہی ڈاکٹر ہے، آپ ہی مریض۔ یعنی میں اپنا سراغ رساں خود ہوں اور اس سراغ رسانی کے طریقے مجھے خود ہی سوچنے پڑتے ہیں کہ مجھے اپنے بارے میں کیسے پتا کرنا ہے۔ بہت اچھے لوگ ہوتے ہیں، بڑے ہی پیارے، لیکن ان سے کچھ ایسی باتیں سرزد ہوتی رہی ہیں کہ وہ حیران ہوتے ہیں کہ میں عبادت گزار بھی ہوں، میں بھلا، اچھا آدمی بھی ہوں، لیکن مجھے یہ معلوم نہیں کہ میں ہوں کون؟ اور پتا اسے یوں نہیں چل پاتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے انسان کے اندر اپنی پھونک ماری ہوئی ہے اور وہ چلی آرہی ہے۔ اس کو آپ Erase نہیں کر سکتے۔ اس کو آپ پردہ کھول کر دیکھ نہیں سکتے، آپ ایک لفظ یاد رکھیئے گا Self یعنی "ذات" کا۔ اقبال جسے خودی کہتا ہے۔ خودی کیا ہے؟ اس لفظ خودی کے لیے کئی الفاظ ہیں، لیکن "ذات" زیادہ آسان اور معنی خیز ہے۔

حضرت علامہ اقبال نے اس لفظ کو بہت استعمال کیا اور اس پر انہوں نے بہت غور بھی کیا۔ اب اس ذات کو جاننے کے لیے جس ذات کے ساتھ بہت سارے خیالات چمٹ جاتے ہیں، جیسے گُڑ کی ڈلی کے اوپر مکھیاں آ چمٹتی ہیں یا پرانے زخموں پر بھنبھناتی ہوئی مکھیاں آ کر

چمٹ جاتی ہیں۔ خیال آپ کو کنٹرول کرتا ہے اور وہ ذات وہ خوبصورت پارس جو آپ کے میرے اندر ہم سب کے اندر موجود ہے، وہ کستوری جو ہے وہ چھپی رہتی ہے۔ اس کو تلاش کرنے کے لیے اس اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے لوگ meditate (مراقبہ) کرتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی خوش قسمت کے پاس ایسا گُر آ جاتا ہے کہ وہ چند سیکنڈ کے لیے اس خیال کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کو دور کر دیتا ہے اور اس کو وہ نظر آتا ہے۔ لیکن خیال اتنا ظالم ہے کہ وہ اس خوبصورت قابل رشک زرّیں چیز کو ہماری نگاہوں کے سامنے آنے نہیں دیتا۔

جب آپ دو، تین چار مہینے کے تھے تو اس وقت آپ اپنی ذات کو بہت اچھی طرح سے جانتے تھے۔ جو معصومیت دے کر اللہ نے آپ کو پیدا کیا تھا، اس کا اور آپ کی ذات کا رشتہ ایک ہی تھا۔ آپ وہ تھے، وہ آپ تھا۔ ایک چیز تھا دو پونے دو سال یا کوئی سی بھی مدت مقرر کر لیں۔ جب خیال آ کر آپ کو پکڑنے لگا تو وہ پھر یہ ہوا کہ آپ گھر میں بیٹھے تھے۔ ماں کی گود میں۔ کسی کی بہن آئی انہوں نے آ کر کہا کہ اوہ ہو، نسرین یہ جو تمہارا بیٹا ہے یہ تو بالکل بھائی جان جیسا ہے۔ اس بیٹا صاحب نے جب یہ بات سن لی تو اس نے سوچا میں تو ابا جی ہوں۔ ایک خیال آ گیا نا ذہن میں، حالانکہ وہ ہے نہیں ابا جی۔ پھر ایک دوسری پھوپھی آ گئیں۔ انہوں نے آ کر کہا کہ اس کی تو آنکھیں بڑی خوبصورت ہیں، تو اس بچے نے سوچا میں تو خوبصورت آنکھوں والا ہیرو ہوں۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ انسان نے اپنی ذات کے آگے سائن بورڈ لٹکانے شروع کر دیے ہیرو، رائٹر، لیڈر، پرائم

منسٹر، خوبصورت اور طاقتور، وغیرہ۔ اس طرح کے کتنے سارے سائن بورڈز لٹکا کر ہم آپ سارے جتنے بھی ہیں، نے اپنے اپنے سائن بورڈ لگا رکھے ہیں اور جب ملنے کے لیے آتے ہیں، تو ہم اپنا ایک سائن بورڈ آگے کر دیتے ہیں۔ کہ میں تو یہ ہوں اور اصل بندہ اندر سے نہیں نکلتا اور اصل کی تلاش میں ہم مارے مارے پھر رہے ہیں۔

خدا تعالیٰ نے اپنی روح ہمارے اندر پھونک رکھی ہے۔ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ اس سے فائدہ اٹھائیں اس کی خوشبو ایک بار لیں، اس کے لیے لوگ تڑپتے ہیں اور لوگ جان مارتے ہیں۔ وہ ذات جو اللہ کی خوشبو سے معطّر ہے اس کے اوپر وہ خیال جس کا میں ذکر کر رہا ہوں اس کا بڑا بوجھ پڑا ہوا ہے۔ وہ خیال کسی بھی صورت میں چھوڑتا نہیں ہے۔ اس خیال کو اس کستوری سے ہٹانے کے لیے مراقبے کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ اس لیے کہ آدمی ذرا ٹھیک ہو۔ اس کو پتا چلے کہ وہ کیا ہے۔، اس سے پھر اسے نماز میں بھی مزا آتا ہے۔ عبادت، گفتگو، ملنے ملانے میں، ایک دوسرے کو سلام کرنے میں بھی مزا آتا ہے۔ ایک خاص تعلق پیدا ہوتا ہے، اس کے لیے جس کا بتانے کا میں نے وعدہ کیا تھا۔

آسان ترین نسخہ یہ ہے کہ دو اوقات صبح اور شام صبح فجر پڑھنے کے بعد اور شام کو مغرب کے بعد (یہ اوقات ہی اس کے لیے زیادہ اچھے ہیں) آپ بیس منٹ نکال کر گھر کا ایک ایسا کونہ تلاش کریں، جہاں دیوار ہو، جو عمودی ہو، وہاں آپ چار زانو ہو کر "چوکڑی" مار کر بیٹھ جائیں۔ اپنی پشت کو بالکل دیوار کے ساتھ لگا لیں، کوئی جھکاؤ "کُب" نہ پیدا ہو۔ یہ بہت ضروری ہے، کیونکہ جو کرنٹ چلنا ہے، نیچے سے اوپر تک وہ سیدھے راستے سے چلے۔

اب ماڈرن زندگی ہے، بہت سے لوگ چوکڑی مار کر نہیں بیٹھتے۔ انہیں اجازت ہے کہ وہ کرسی پر بیٹھ جائیں، لیکن اس صورت میں پاؤں زمیں کے ساتھ لگے رہنے چاہیں۔ اور آپ کو Earth ہو کر رہنا چاہیے۔ جب تک آپ ارتھ نہیں ہوں گے، اس وقت تک آپ کو مشکل ہو گی۔ پاؤں کے نیچے دری قالین بھی ہو تو کوئی بات نہیں، لیکن زمین ہو تو بہت ہی اچھا ہے۔ چونکہ فقیر لوگ جنگلوں میں ایسا کرتے تھے، وہ ڈائریکٹ ہی زمین کے ساتھ وابستہ ہو جاتے تھے۔ ہماری زندگی ذرا اور طرح کی ہے۔ جب آپ وہاں بیٹھ جائیں گے تو پھر آپ کو ایک سہارے کی ضرورت ہے۔ جس کو آپ پکڑ کر اس سیڑھی پر چڑھ سکیں، جو لگالی ہے۔ صرف یہ جھانکنے کے لیے کہ "ذات" کیا چیز ہے؟ اس کے لیے ہر کسی کے پاس ایک "ڈیوائس" ایک آلہ ہے، جو سانس ہے، جو ساتھ ہے، بیٹھنے کے بعد آپ اپنے سانس کے اوپر ساری توجہ مرکوز کر دیں اور یہ دیکھیں کہ ہر چیز سے دور ہٹ کر جس طرح ایک بلی اپنا شکار پکڑنے کے لیے دیوار پر بیٹھی ہوتی ہے۔ اپنے شکار یعنی سانس کی طرف دیکھیں کہ یہ جارہاہے اور آرہاہے۔

اس کام میں کوتاہی یا غلطی یہ ہوتی ہے کہ آدمی سانس کو ضرورت سے زیادہ توجہ کے ساتھ لینے لگ جاتاہے، یہ نہیں کرنا۔ آپ نے اس کو چھوڑ دیناہے، بالکل ڈھیلا صرف یہ محسوس کرناہے کہ یہ کس طرح سے آتاہے اور جاتاہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ پہلے دن تقریباً ایک سیکنڈ یا ڈیڑھ سیکنڈ تک سانس کے ساتھ چل سکیں گے۔ اس کے بعد خیال آپ کو بھگا لے جائے گا۔ وہ کہے گا کہ یہ بندہ تو اللہ کے ساتھ واصل ہونے لگاہے۔ میں نے تو بڑی

محنت سے اس کو خیالوں کی دنیا میں رکھا ہے (وہ خیال چلتا رہتا ہے، موت تک۔ لوگ اکثر شکایت کرتے ہیں کہ جی نماز پڑھنے لگتے ہیں تو بڑے خیال آتے ہیں)۔ وہ خیال آپ کو کہیں کا کہیں کافی دور تک لے جائے گا۔ جب آپ کو یہ خیال آئے کہ میں تو پھر خیال کے نرغے، گھیرے یا چنگل میں آگیا، چاہے اسے بیس منٹ بھی گزر چکے ہوں، آپ پھر لوٹیں اور پھر اپنے سانس کے اوپر توجہ مرکوز کر دیں اور جتنی دیر ہو سکے، سانس کو دیکھیں محسوس کریں۔

لیکن زیادہ کوشش نہیں کرنی اس میں جنگ و جدل اور جدوجہد نہیں ہے کہ آپ نے کوئی کُشتی لڑنی ہے۔ یہ ڈھیلے پن کا ایک کھیل ہے اور اسی معصومیت کو واپس لے کر آنا ہے جب آپ ایک سال کے تھے اور جو آپ کے اندر تھی یا چلنے لگے تھے، تو تھی۔ اس میں بچہ معصومیت کو لینے کے لیے زور تو نہیں لگاتا ہے ناں، جب یہ پروسس آپ کرنے لگیں گے تو آپ کا عمل ایسا ہونا چاہیے، یا ہو جیسا کہ ٹینس کے کھلاڑی کا ہوتا ہے۔ ٹینس کھیلنے والا یا کھیلنے والی کی زندگی ٹینس کے ساتھ وابستہ ہے (یہ بات میں نے مشاہدے سے محسوس کی ہے)۔ آپ یہ کبھی گمان نہیں کر سکتے کہ ٹینس کا کھلاڑی آپ کو ہر حال میں ٹینس کورٹ میں اپنی گیم Improve کرتا ہی ملے گا۔ اگر غور سے دیکھیں تو ٹینس کا کھلاڑی ہم سے آپ سے بہت مختلف ہوتا ہے، کیونکہ وہ ہمیشہ ٹینس ہی کھاتا ہے، ٹینس ہی پہنتا ہے، یہی پیتا ہے، ٹینس ہی پہنتا ہے اور ٹینس ہی چلتا ہے۔ یہ اس قدر اس پر حاوی اور طاری ہو جاتی ہے، اس معاملے میں بھی آپ چاہے مراقبے کے اندر ہوں یا باہر نکل آئے ہوں، آپ نے دفتر

جانا، منڈی جانا ہے، کام پر جانا ہے، دکان پر جانا ہے، لیکن ٹینس کے کھلاڑی کی طرح آپ کے اندر یہ ایک طلب ہونی چاہیے، دل لگی ہونی چاہیے کہ میں نے ذات کے ساتھ ضرور واصل ہونا ہے۔

یہ سراغ رسانی کا ایک کھیل ہے۔ مثلاً میں اب آپ کے سامنے ہوں، فوت ہو جاؤں گا، بکری کی طرح۔ بکری آئی اس نے بچے دیئے، دودھ پیا، ذبح کیا۔ زندگی میں کوئی کام ہی نہیں تو یہ جاندار جو دوسرے جاندار ہیں، ان میں جان ضرور ہے، سب میں لیکن روح نہیں ہے۔ دیکھیئے اتنا سا فرق ہوتا ہے کئی لوگ کہہ دیتے ہیں ہمارے غیر مسلم دوست کہ جانوروں پر ظلم کرتے ہیں آپ ان کو کھا جاتے ہیں۔ کھاتے ہم اس لیے ہیں کہ ظلم تو جب ہوتا کہ اس کے اندر روح ہوتی اور اس میں ایک Sensibility ہوتی، وہ تو ہے ہی نہیں۔ جب وہیل مچھلی اپنا منہ کھولتی ہے تو تقریباً ساڑھے تین ہزار مچھلیاں ایک لقمے کے اندر اس کے منہ میں چلی جاتی ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا فلموں میں چھلانگ مار کر خود ہی جا رہی ہوتی ہے، تو یہ اس کی کیفیت ہے۔ اب آپ جاندار تو ہیں، لیکن آپ کے ساتھ روح ہے۔ اس روح کی تلاش کے لیے، اس کی الٹرا ساؤنڈ بننے کے لیے آپ کو خود مشکل میں جانا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر چارہ نہیں۔

یہ ایک بڑا پُر لطف تجربہ یوں ہے۔ اچھا اس سے آپ کو کچھ ملے گا نہیں کہ جب آپ مراقبہ کریں گے، تو آپ کو انعامی بانڈ کا نمبر مل جائے گا، نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ لیکن آپ آسودہ ہونے لگیں گے۔ اتنے ہی آسودہ جتنے آپ بچپن میں تھے۔ یہ بہت بڑی نعمت

ہے۔ یہاں آپ اپنے بچوں کو، پوتوں کو، بھتیجوں کو دیکھیں گے۔ آج کے بعد دیکھیں گے کہ یہ کتنی آسودگی کے ساتھ بھاگا پھرتا ہے۔ اس کو کچھ پتہ نہیں اور اللہ بھی یہ فرماتا ہے۔ ہمارے بابے کہتے ہیں ان کا ایک اندازہ ہے کہ جب آپ جنت میں داخل ہوں گے یا جنت میں جانے لگیں گے تو اللہ گیٹ کے باہر کھڑا ہو گا اور جیسے گیٹ کیپر گیٹ پاس نہیں مانگا کرتا، آپ باہر جا کر کھڑے ہیں تو اللہ کہے گا کہ وہ معصومیت جو دے کر میں نے تمہیں پیدا کیا تھا، وہ واپس کر دو اور اندر چلو اور ہم سارے کہیں گے کہ سر! ہم نے تو بی اے بڑی مشکل سے کیا ہے اور بڑی چالاکی سے ایم اے کیا تھا۔ ہم تو معصومیت بیچتے رہے ہیں۔ وہ تو اب ہمارے پاس نہیں۔ اس معصومیت کی تلاش میں، اس روح کی تلاش کی ضرورت ہے۔ اس میں اگر کوئی اور کوتاہیاں وغیرہ ہو گئی ہیں، اس میں تو آئیں گی ضرور، کیونکہ سب سے تنگ کرنے والی چیز وہ خیال ہے، وہ مائنڈ ہے۔ بابے کہتے ہیں کہ جو وجود ہے ذات کا اور جو ذات ہے اللہ کی، وہ قلب ہے۔ یعنی ہمارا یہ ہارٹ جس کا بائی پاس ہوتا ہے۔ یہ نہیں قلب، اس کے قریب ہی اس کے ڈاؤن پر ایک ڈیڑھ انچ کے فاصلے پر قلب کا ایک مقام ہے، چونکہ یہ بھی نظر نہیں آتا ہم کو، روح کا معاملہ اور اللہ نے فرما بھی دیا ہے کہ ہم نے تم کو علم دیا ہے "الا قلیلاً" تھوڑا ہے نہیں جان سکو گے روح کے بارے میں؛ تو وہ اندازہ یہ لگاتے ہیں، مائنڈ جو ہے وہ اس کے اوپر حملے کرتا رہتا ہے اور وہ دیکھتا رہتا ہے کہ میں نے کس طرح سے آدمی کو پکڑ کے پھر پنجرے میں قید کرنا ہے۔ یہ وعدہ تھا بڑی دیر کا وہ آخر کار پورا ہوا۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

Psycho Analysis

کبھی کبھی زندگی میں یوں بھی ہوتا ہے کہ بہت زیادہ خوشیوں اور بڑی راحتوں کے ساتھ ان کے پیچھے چھپی ہوئی مشکلات بھی آجاتی ہیں اور پھر ان مشکلات سے جان چھڑانی یوں مشکل ہوتی ہے۔ کہ انسان گھبرایا ہوا سا لگتا ہے۔ پچھلے دنوں ہمارے ہاں بہت بارشیں ہوئیں۔ بارشیں جہاں خوشیوں کا پیغام لے کر آئیں، وہاں کچھ مشکلات میں بھی اضافہ ہوا۔ ہمارے گھر میں ایک راستہ، جو چھوٹے دروازے سے ڈرائنگ روم میں کھلتا ہے اور پھر اس سے ہم اپنے گھر کے صحن میں داخل ہوتے ہیں، بارشوں کی وجہ سے وہ چھوٹا دروازہ کھول دیا گیا، تاکہ آنے جانے میں آسانی رہے۔ آسانی تو ہوئی، لیکن اس میں پیچیدگی پیدا ہوگئی۔ وہ یہ کہ باہر سے جو جوتے آتے تھے، وہ کیچڑ سے لتھڑے ہوئے ہوتے تھے اور باوجود کوشش کے اور انہیں صاف کرنے کے، کیچڑ تو اندر آہی جاتا تھا اور اس سے سارا قالین خراب ہو جاتا تھا۔

میں چونکہ اب تیزی سے بوڑھا ہو رہا ہوں اور بوڑھے آدمی میں کنٹرول کی صلاحیت کم ہوتی جاتی ہے۔ تو میں چیختا چلاتا تھا اور ہر اندر آنے والے سے کہتا کہ جوتا اتار کر آؤ اور اسے پہننے کے بجائے ہاتھ میں پکڑ کر آؤ۔ اس سے میرے پوتے اور پوتیاں بہت حیران ہوتے تھے کہ اس جوتے کا فائدہ کیا، جو گھر کے دروازے پر پہنچ کر اتارا جائے اور ہاتھ میں پکڑ کر گھر میں داخل ہوا جائے۔ وہ بے چارے کوئی جواز تو پیش نہیں کرتے تھے، لیکن جوتے اتارتے بھی نہیں تھے۔ جس سے میری طبیعت میں تلخی اور سختی بڑھتی گئی اور میں سوچتا تھا کہ یہ مسئلہ صرف اس طرح سے ہی حل ہو سکتا ہے، جس طرح میں سوچتا ہوں۔

میری بہو نے کوئی اعتراض تو مجھ پر نہیں کیا اور نہ ہی اس نے مجھے کوئی جواب دیا۔ وہ شام کو بازار گئی اور اس نے دو میٹ خریدے۔ ایک تاروں کا بنا ہوا اور دوسرا موٹا بالوں والا۔ اب جب تاروں کے میٹ سے پاؤں رگڑے جاتے تو وہ "رندے" کی طرح صاف کر دیتا اور پھر موٹے بالوں کا موٹا دبیز میٹ مزید صفائی کر دیتا تھا، یہ بعد میں رکھا گیا تھا۔ جب میں نے یہ عمل دیکھا اور اس پر غور کرتا رہا، تو مجھے کافی شرمندگی ہوئی کہ میں جو اپنی دانش کے زور پر اپنے علم اور عمر کے تجربے پر بات کہہ رہا تھا، وہ اتنی ٹھیک نہیں تھی اور اس لڑکی (بہو) نے اپنا

آپ اپلائی کر کے اس مسئلے کا حل نکال دیا اور ہمارے درمیان کوئی جھگڑا بھی نہیں ہوا۔

مجھے خیال آیا کہ انسان اپنے آپ میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے دوسروں پر تنقید زیادہ کرتا ہے اور خود میں تبدیلی نہیں کرتا۔ اس مسئلے سے آپ خود بھی گزرتے ہوں گے۔ ہم نے یہ وطیرہ بنا لیا ہے کہ چونکہ مجھے ماسی اس طرح سے کہتی ہے اور فلاں اس طرح سے کہتا ہے اس لیے یہ کام نہیں ہو سکتا۔ ماما جی میں خرابی ہے یا چچا ٹھیک نہیں یا پھر محلے والے یا حکومت خراب ہے۔ ٹرانسپیرنسی نہیں ہے اور سسٹم ہی ٹھیک نہیں، اس لیے محلّہ گندہ ہے۔ اگر کہیں پانی کھڑا ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ گورنمنٹ اس پر توجہ نہیں دیتی اور اپنی خرابی سے ہٹ کر ہمارے پاس بہت سارے جواز اور بہانے موجود ہوتے ہیں اور یہ ہماری زندگی میں پھیلتے رہتے ہیں۔

کچھ خوش قسمت ملک ہیں، جہاں لوگ اپنے مسائل اپنے طور پر یا خود ہی حل کر لیتے ہیں۔ جو ان کے کرنے کے ہوتے ہیں۔ میری ایک نواسی ہے، اس نے ڈرائیونگ لائسنس کے لیے اپلائی کیا۔ وہ ایک سکول سے دو تین ماہ ڈرائیونگ کی تعلیم بھی لیتی رہی۔ لائسنس کے لیے ٹریفک پولیس والوں نے اس کا ٹیسٹ لیا،

لیکن وہ بے چاری فیل ہو گئی۔ وہ بڑی پریشان ہوئی اور مجھ سے آ کر لڑائی کی کہ نانا یہ کیسی گورنمنٹ ہے، لائسنس نہیں دیتی۔ وہ خود میں خرابی تسلیم نہیں کرتی تھی، بلکہ اسے سسٹم کی خرابی قرار دیتی تھی ایک ماہ بعد اس نے دوبارہ لائسنس کے لیے اپلائی کیا اب مجھے جتنی آیات آتی تھیں، میں نے پڑھ کر اللہ سے دعا کی کہ اس کو پاس کر دے، وگرنہ میری شامت آجائے گی۔ لیکن وہ ٹیسٹ میں پاس نہ ہوئی اور ٹریفک والوں نے کہا کہ بی بی آپ کو ابھی لائسنس نہیں مل سکتا، تو وہ رونے لگی، شدت سے، اور کہنے لگی تم بے ایمان آدمی ہو اور تمہارا ہمارے خاندان کے ساتھ کوئی بیر چلا آرہا ہے اور چونکہ تمہاری ہمارے خاندان کے ساتھ لگتی ہے، اس لیے ٹریفک والو تم مجھے لائسنس نہیں دیتے۔ وہ بڑے حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم تو آپ کے خاندان کو نہیں جانتے۔ وہ کہنے لگی، ہمارے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے اور میں اس ظلم پر احتجاج کروں گی۔ اخبار میں بھی لکھوں گی کہ آپ لوگوں نے مجھے لائسنس دینے سے انکار کیا، ایسا میری امی کے ساتھ اور ایسا ہی سلوک میری نانی کے ساتھ بھی کیا، جو پرانی گریجوایٹ تھیں اور اس طرح ہماری تین "پیڑھیوں" (نسلوں) کے ساتھ ظلم ہوتا چلا آرہا ہے۔ جس سے آپ کا ہمارے ساتھ بیر واضح ہوتا ہے۔

وہ ابھی تک اپنے ذہن میں یہ بات لیے بیٹھی ہے کہ چونکہ ٹریفک پولیس والوں کی میرے خاندان کے ساتھ ناچاقی ہے اور وہ اس کو برا سمجھتے ہیں، اس لیے ہمیں لائسنس نہیں دیتے۔ اپنی کوتاہی دور کرنے کے بجائے آدمی ہمیشہ دوسرے میں خرابی دیکھتا ہے۔ بندے کی یہ خامی ہے۔ میں اپنے آپ کو ٹھیک کرنے کے لیے تیار ہوں اور ہمیشہ دوسرے کی خامی بیان کروں گا، جیسا کہ میں قالین پر کیچڑ کے حوالے سے اپنے فیصلے کو آخری قرار دے دیا تھا کہ سوائے جوتے ہاتھ میں پکڑنے کے اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ اگر کوئی گروہ انسانی اپنے آپ کو Search کرنا چاہتا ہے اور راست روی پر قائم ہونا چاہتا ہے، تو پھر اسے اپنا تجزیہ اور Analysis کرنا پڑے گا۔ میں اپنا تجزیہ کرنے کے لیے بڑا زور لگاتا ہوں، لیکن کر نہیں پاتا۔ حالانکہ دوسرے کا تجزیہ فوراً کرلیتا ہوں۔ میں ایک سیکنڈ میں بتا دیتا ہوں کہ میرے محلے کا کون سا آدمی کرپٹ ہے۔ میرے دوست میں کیا خرابی ہے، لیکن مجھے اپنی خرابی نظر آتی ہی نہیں۔ میں نے بڑا زور لگایا ہے بڑے دم درود کروائے ہیں۔ Psycho Analysis کروایا، ہپناٹزم کروایا کہ میرا کچھ تو باہر آئے اور مجھے اپنی خامیوں کا پتہ چلے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں تو ایک بہت سمجھدار عاقل، فاضل ہوں۔ مجھ سے زیادہ بڑا دانشمند آدمی تو ہے ہی نہیں۔ اگر آپ کا مطالعہ کریں اور کھلی نظروں سے دیکھیں تو آپ پر یہ کیفیات عجیب و

غریب طریقے سے وارد ہوں گی کہ بندہ اپنے آپ کو کیسا سمجھتا ہے اور اصل میں ہوتا کیا ہے۔

میرے ایک کزن ہیں۔ وہ قصور میں رہتے ہیں۔ جب ہم جوان تھے اور نئی نئی ہماری شادی ہوئی تھی، یہ ان دنوں کی بات ہے۔ اس کے ہاں بچہ ہونے والا تھا۔ وہ رات کے ایک بجے قصور سے لاہور چل پڑا۔ بالکل عین وقت پر بجائے اس کے کہ وہ اس کا قبل از وقت بندوبست کرتا، اب ایک بجے وہ گاڑی میں چلے اور سارا راستہ طے کر کے پریشانی کے عالم میں لاہور پہنچے اور اللہ نے کرم کیا کہ وہ وقت پر لاہور پہنچ گئے۔ صبح میں نے اس سے کہا کہ اے جاہل آدمی، تجھے اتنی عقل ہونی چاہیے تھی کہ پہلے اپنی بیوی کو لاہور لے آتا۔ اس نے کہا نہیں نہیں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ میں خود اندازہ لگا سکتا ہوں کہ اسے کب لے جانا ہے اور اللہ نے مجھے یہ فہم دی ہے۔ میں نے کہا فرض کرو رات کے ایک بجے گاڑی چلاتے ہوئے کوئی ایسی پیچیدگی یا مشکل پیدا ہو جاتی اور ریحانہ (بیوی) کی تکلیف بڑھ جاتی، تو پھر تم کیا کرتے؟ کہنے لگا کہ اگر تکلیف بڑھ جاتی تو میں اس کو ڈرائیونگ سیٹ سے اٹھا کر پچھلی سیٹ پر ڈال دیتا اور خود ڈرائیور کرنے لگ جاتا۔ پتہ یہ چلا کہ صاحبزادہ ڈرائیور بھی اسی سے کرواتا آیا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ

میری دانش اور میری سوچ یہ بالکل آخری مقام پر ہے اور اس سے آگے سوچنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

ہمارے سیانے یہ کہا کرتے ہیں کہ دیواروں سے بھی مشورہ کرلینا چاہیے۔ یہ ناظم اور کونسلرز کی کمیٹیاں تو اب بنی ہیں۔ پندرہ سال پہلے ہماری ریڈیو کی ایک یونین ہوا کرتی تھی۔ اس میں ہم کچھ نئی باتیں سوچتے تھے۔ اپنے آپ کو یا کارکردگی بہتر بنانے کے لیے اور سننے والوں کو آسانیاں عطا کرنے کے لیے۔ اس دور میں ریڈیو کا خاصا کام ہوا کرتا تھا۔ ہماری یونین کے ایک صدر تھے۔ انہوں نے ایک روز میٹنگ میں یہ کہا کہ ظاہر ہے کہ اجلاس میں آپ خرابیاں ہی بیان کریں گے اور آپ لوگوں سے یہ درخواست کروں گا کہ آپ تیرہ اور پندرہ منٹ تک جتنی برائیاں بیان کرسکتے ہیں، کریں۔ لیکن پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں اور جو اصحاب اپنا مؤقف تقریر میں بیان نہیں کرسکتے، وہ یہ آسان کام کریں کہ تیرہ گالیاں دیں اور کھڑے ہو کر اچھی گندی بری گالیاں کھٹا کھٹ دے کر بیٹھ جائیں، کیونکہ کسی نے ہمیں کوئی تعمیری چیز تو بتانی نہیں، نقص ہی نکالنے ہیں اور بہتر یہی ہے کہ آپ ایسا کرلیں۔ ہم نے کہا کہ اگر انہوں نے اجازت دے دی ہے تو ایسا ہی کریں اور واقعی بیشتر لوگوں نے گالیوں پر ہی اکتفا کیا، کیونکہ آسان کام یہی

تھا، آپ لوگوں نے اب بھی اخبارات میں دیکھا ہوگا کہ تعمیری کام کیسے کیا جائے کے بجائے ہم زیادہ تر تنقید ہی کرتے ہیں اور حل پر زور کم دیتے ہیں۔

یہ مشکلات بہت چھوٹی اور معمولی ہیں، لیکن انہیں کس طرح سے اپنی گرفت میں لیا جائے۔ یہ کام بظاہر تو آسان نظر آتا ہے، حقیقت میں بہت مشکل ہے۔ جب ہمارا ریڈیو اسٹیشن نیا نیا بنا تھا تو بارش میں اس کی چھتوں پر ایک تو پانی کھڑا ہو جاتا تھا اور دوسرا کھڑکی کے اندر سے پانی کی اتنی دھاریں آجاتیں کہ کاغذ اور ہم خود بھی بھیگ جاتے۔ ایک روز ایسی ہی بارش میں ہم سب بیٹھ کر اس کو تعمیر کرنے والے کو صلوٰاتیں سنانے لگے کہ ایسا ہی ہونا تھا۔ بیچ سے پیسے جو کھا لیے ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔ ہمارے ساتھ ہمارے ایک ساتھی قدیر ملک وہ صوتی اثرات کے ماہر تھے۔ وہ سائیکل بڑی تیزی سے چلاتے تھے۔ دبلے پتلے آدمی تھے۔ وہ تیز بارش میں سائیکل لے کر غائب ہوگئے۔ ان کے گھر میں پرانا کنستر کا ایک ٹکڑا پڑا تھا۔ وہ اسے لے آئے اور چھت پر انہوں نے کنستر کے ٹکڑے کو ٹیڑھا کر کے ایک اینٹ نکال کر فکس کر دیا۔ اس طرح پرنالہ بن گیا اور چھت کا اور بارش کا پانی کمرے میں آئے بغیر شر ررر۔۔۔ کرتا باہر گرنے لگا۔ ہم نے کہا کہ بھئی یہ کیا ہو گیا ابھی بوچھاڑ اندر کو آرہی تھی، تو قدیر ملک کہنے لگا، پتہ نہیں کیا ہو گیا۔ لیکن اب تو ٹھیک ہو گیا ہے، بیٹھ کر کام کرو۔ بڑے برسوں کے بعد

جب ریٹائرمنٹ کے بعد کبھی چائے وائے پیتے ان سے کسی شخص نے اس حوالے سے پوچھا، تو اس نے اصل بات بتائی۔

عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ جب ہم روحانی دنیا میں داخل ہوتے ہیں تو جب تک پہلے زندگی کے روزمرہ کے مسائل حل نہیں ہوں گے، تو آپ روحانی دنیا میں داخل ہو ہی نہیں سکیں گے، اس لیے کہ یہ مرحلہ گزرا کر پھر راستہ آگے چلے گا۔ رفو آپ جب ہی کر سکیں گے جب نانی اماں کی سوئی میں دھاگہ ڈال کر دیں گے، اس کو تو نظر نہیں آرہا، پھر رفو ہو گا پھر وہ اماں وڈھی آپ کو رفو کر کے دے گی۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم روحانی دنیا میں کوئی ایسا فعل اختیار کرلیں۔ کوئی ایسا درد وظیفہ کرلیں کہ فٹافٹ دودھ کی بارش ہونے لگے اور ہم کو روشنیاں نظر آنے لگیں، ایسا ہوا نہیں کبھی۔ جانا اسی روزمرہ کی زندگی کے راستے سے پڑتا ہے۔ چھوٹے دروازے کے قالین کے اوپر سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے اور پکڑی جائے گی گردن اشفاق صاحب کی کہ تم نے کیا غلط راستہ نکالا تھا، قالین صاف رکھنے کا۔ اگر کسی مقام پر بھی لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے، تو آپ روحانی دنیا میں داخل نہیں ہو سکتے، کیونکہ اللہ کریم کو اپنی مخلوق بڑی پیاری ہے۔ جب تک مخلوق کا احترام نہیں ہو گا، بات نہیں بنے گی۔

آپ اکثر دیکھتے ہیں آس پاس کہ احترام انسانیت اور احترام آدمیت کا فقدان ہے۔ اس میں پاکستان بے چارے کی کوئی خرابی نہیں ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ ہم ان لوگوں سے سیکھ کر آئے ہیں، جہاں چھوت، چھات مذہب کی حیثیت رکھتا ہے۔ بھارت میں ۳۲ کروڑ کے قریب انسان ہیں، جو Untouchable کہلاتے ہیں، یعنی اچھوت۔ ان کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ وہ بھی عام بندے ہیں۔ عام لوگوں جیسے ان کے ہاتھ منہ ناک کان ہیں۔ بڑی محنت سے کام بھی کرتے ہیں، لیکن ان کے لیے حکم ہے کہ انہیں ہاتھ نہیں لگانا اور جب ان کے قریب سے گزرنا ہے تو ناک پر رومال رکھنا ہے۔ ہم نے پاکستان تو بنا لیا ہے، لیکن ہم یہ تصور ساتھ لے کر آ گئے ہیں۔ احترام آدمیت کا جو اللہ نے پہلا حکم دیا تھا، اس پر کاربند نہیں رہ سکے۔ جب یہ ہی نہیں ہو گا، تو پھر آپ اگر روحانیت کی دنیا میں داخل ہونا چاہیں گے، کسی بابے کو ملنا چاہیں گے، کسی اعلیٰ ارفع سطح پر ابھرنا چاہیں گے، تو ایسا نہیں ہو گا، کیونکہ درجات کو پانے کے لیے بڑے بڑے فضول، نالائق بندوں کی جوتیاں سیدھی کرنا پڑتی ہیں اور یہ اللہ کو بتانا پڑتا ہے کہ جیسا جیسا بھی انسان ہے، میں اس کا احترام کرنے کے لیے تیار ہوں، کیونکہ تو نے اسے شکل دی ہے۔

دیکھئے ناں! جو شکل و صورت ہوتی ہے، میں نے تو اسے نہیں بنایا، یا آپ نے اسے نہیں بنایا، بلکہ اسے اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے۔ میری بیٹیاں بہوئیں جب بھی کوئی رشتہ دیکھنے جاتی ہیں، تو میں ہمیشہ ایک بات سنتا ہوں کہ بابا جی! لڑکی بڑی اچھی ہے، لیکن اس کی ''چھب'' پیاری نہیں ہے۔ پتہ نہیں یہ ''چھب'' کیا بلا ہوتی ہے۔ وہ ان کو پسند نہیں آتی اور انسان سے کوئی نہ کوئی نقص نکال دیتی ہیں۔ میں انہیں کہا کرتا ہوں کہ اللہ کا خوف کرو۔ شکل و صورت سب کچھ اللہ تعالیٰ نے بنائی ہے۔ یہ کسی جوتا کمپنی نے نہیں بنائی ہے۔ انسان کو تم ایسا مت کہا کرو، ورنہ تمہارے نمبر کٹ جائیں گے اور ساری نمازیں، روزے کٹ جائیں گے، کیونکہ اللہ کی مخلوق کو آپ نے چھوٹا کیا ہے، تو یہ مشکلات ہیں۔ گو یہ چھوٹی سی باتیں تھیں، لیکن چھوٹی باتوں میں سے بڑی باتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ جب تک میں اور آپ احترام آدمیت کا خیال نہیں رکھیں گے اور اپنے لوگوں کو پاکستانیوں کو عزّتِ نفس نہیں دیں گے، روٹی کپڑا کچھ نہ دیں ان کی عزّت نفس انہیں لوٹا دیں۔ مثال کے طور پر آپ اپنے ڈرائیور کو سراج دین صاحب کہنا شروع کر دیں اور اپنے ملازم کے نام کے ساتھ ''صاحب'' کا لفظ لگا دیں۔ جب تک یہ نہیں ہو گا، اس وقت تک ہماری روح کے کام تو بالکل رکے رہیں گے اور دنیا کے کام بھی

پھنسے ہی رہیں گے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا
شرف عطا فرمائے، آمین !!

ترقی کا ابلیسی ناچ

آج سے چند روز پہلے کی بات ہے، میں ایک الیکٹرونکس کی شاپ پر بیٹھا تھا تو وہاں ایک نوجوان لڑکی آئی۔ وہ کسی ٹیپ ریکارڈ کی تلاش میں تھی۔ دوکاندار نے اسے بہت اعلیٰ درجے کے نئے نویلے ٹیپ ریکارڈ دکھائے لیکن وہ کہنے لگی مجھے وہ مخصوص قسم کا مخصوص Made کا مخصوص نمبر والا ٹیپ ریکارڈ چاہیے۔ دوکاندار نے کہا، بی بی یہ تو اب تیسری Generation ہے، اس ٹیپ ریکارڈ کی اور جو اب نئے آئے ہیں، وہ اس کی نسبت کارکردگی میں زیادہ بہتر ہیں۔ لڑکی کہنے لگی کہ یہ نیا ضرور ہے لیکن میرا تجربہ کہتا ہے کہ یہ اس سے بہتر نہیں۔ میں بیٹھا غور سے اس لڑکی کی باتیں سننے لگا کیونکہ اس کی باتیں بڑی دلچسپ تھیں اور وہ الیکٹرونکس کے استعمال کی ماہر معلوم ہوتی تھی۔ انجنیئر تو نہیں تھی لیکن اس کا تجربہ اور مشاہدہ خاصا تھا۔ وہ کہنے لگی کہ آپ مجھے مطلوبہ ٹیپ ریکارڈ تلاش کر دیں۔ میں آپ کی بڑی شکر گزار ہوں گی۔ میں نے اس لڑکی سے پوچھا۔ بی بی آپ اس کو ہی کیوں تلاش کر رہی ہیں؟ اس نے کہا کہ ایک تو اس کی مشین بہتر

تھی اور اس کو میری خالہ مجھ سے مانگ کر دبئی لے گئی ہیں اور میں ان سے واپس لینا بھی نہیں چاہتی لیکن اب جتنے بھی نئے بننے والے ٹیپ ریکارڈز ہیں، ان میں وہ خصوصیات اور خوبیاں نہیں ہیں جو میرے والے میں تھیں۔ اس واقعہ کے دوسرے تیسرے روز مجھے اپنے ایک امیر دوست کے ساتھ کاروں کے ایک بڑے شوروم میں جانے کا اتفاق ہوا۔ شوروم کے مالک نے ہمیں کار کا ایک ماڈل دکھاتے ہوئے کہا کہ یہ ماڈل تو ابھی بعد میں آئے گا لیکن ہم نے اپنے مخصوص گاہکوں کے لیے اسے پہلے ہی منگوا لیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اس ماڈل میں پہلے کی نسبت کافی تبدیلیاں کی گئی ہیں اور یہ کمال کی گاڑی بنی ہے۔ میں نے استفسار کیا کہ کیا پچھلے سال کی گاڑی میں کچھ خرابیاں تھیں جو آپ نے اب دور کر دی ہیں؟ وہ خرابیوں کے ساتھ ہی چلتی رہی ہے۔ اس میں کیا اتنے ہی نقائص تھے جو آپ نے دور کر دیئے ہیں؟ کہنے لگے نہیں اشفاق صاحب یہ بات نہیں۔ ہم کوشش کرتے رہتے ہیں کہ اس میں جدت آتی رہے اور اچھی، باسہولت تبدیلی آتی رہے۔ تو یہ سُن کر میرا دماغ پیچھے کی طرف چل پڑا اور مجھے یہ خیال آنے لگا کہ ہر نئی چیز، ہر پیچیدہ چیز، ہر مختلف شے یقیناً بہتر نہیں ہوتی۔ اس مرتبہ میری سالگرہ پر میری بیوی نے مجھے کافی پر کولیٹر دیا اور وہ اسے خریدنے کے بعد گھر اس قدر خوش آئیں کہ بتا نہیں سکتا۔ کہنے لگیں میں بڑے عرصے سے اس کی

تلاش میں تھی۔ یہ بالکل آپ کی پسند کا ہے اور یہ آپ کو اٹلی کی یاد دلاتا رہے
گا۔ آپ اس میں کافی بنایا کریں۔ میں نے دیکھا، وہ بالکل نیا تھا اور اس میں
پلاسٹک کا استعمال زیادہ تھا لیکن اس کا پیندا کمزور تھا اور وزن زیادہ تھا۔ دوسرا اس
کی بجلی کے پلگ تک جانے والی تار بھی چھوٹی تھی اور جب میں نے اسے لگا کر
استعمال کیا تو اس میں پانی کھولانے کی استطاعت تو زیادہ تھی لیکن کافی بھاپیانے کی
طاقت اس میں بالکل نہیں تھی۔ چنانچہ میں ان کا (بانو قدسیہ) دل تو خراب کرنا
نہیں چاہتا تھا اور میں نے کہا، ہاں یہ اچھا ہے لیکن فی الحال میں اپنے پرانے
پرکولیٹر سے ہی کافی بناتا رہوں گا۔ جب وہ چلی گئیں تو اس وقت میں نے کہا" یا
اللہ (میں نے اللہ سے دعا کی جو میری دعاؤں میں اب بھی شامل ہے) مجھے وہ
صلاحیت اور استطاعت عطا فرما کہ اگر تو نئی چیز اور طرح نو کی کوئی اختراع وہ بہتر
ثابت ہو بنی نوع انسان کے لیے اور تیری بھی پسند ہو تو وہ تو میں اختیار کروں،
لیکن صرف اس وجہ سے کہ چونکہ یہ نئی ہے، کیونکہ لوگوں کا گھیرا اس کے گرد
تنگ ہوتا جا رہا ہے، کیونکہ یہ توجہ طلب ہے تو اس لیے میں اس سے دور
رہوں۔" چنانچہ یہ بات میرے دل میں اتر گئی اور میں Progress کے بارے
میں جگہ بہ جگہ، گھروں میں، گھروں سے باہر، محلوں شہروں میں، حکومتوں اور
اس کے باہر ترقی کی جانب ایک بڑی ظالم دوڑ جاری ہے۔ اس دوڑ سے مجھے ڈر لگتا

ہے کہ حاصل تو اس سے کچھ بھی نہیں ہو گا کیونکہ ترقی میں اور فلاح میں بڑا فرق ہے۔ میں اور میرا معاشرہ، میرے اہل و عیال اور میرے بال بچے فلاح کر طرف جائیں تو میں ان کے ساتھ ہوں، خالی ترقی نہ کریں۔ خواتین و حضرات، یہ انتہائی غور طلب بات ہے کہ کیا ہم ترقی کے پیچھے بھاگیں یا فلاح کی جانب لپکیں اور اپنی جھولیاں فلاح کی طرف پھیلائیں۔ لاہور کے قریب گوجرانوالہ شہر ہے۔ اس میں Adult ایجوکیشن (تعلیم بالغاں) کے بڑے نامی گرامی سکول ہیں۔ مجھے ان Adult Education کے سکول میں ایک دفعہ جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں کسان، زمیندار، گاڑی بان تعلیم حاصل کر رہے تھے اور اس بات پر بڑے خوش تھے کہ چونکہ انہوں نے تعلیم حاصل کر لی ہے اور وہ فقروں اور ہندسوں سے شناسا ہو گئے ہیں۔ اس لیے اب انہوں نے ترقی کر لی ہے۔ چنانچہ وہاں ایک بہت مضبوط اور بڑا ہنس مکھ سا گاڑی بان تھا۔ میں نے کہا کیوں جناب گاڑی بان صاحب، آپ نے علم حاصل کر لیا؟ کہنے لگا، ہاں جی میں نے علم حاصل کر لیا ہے۔ میں نے کہا، اب آپ لکھ پڑھ سکتے ہیں، کہنے لگے لکھنے کی تو مجھے پریکٹس نہیں ہے البتہ میں بڑھ ضرور لیتا ہوں۔ میں نے کہا آپ کیا پڑھتے ہیں؟ کہنے لگا جب میں سڑک پر سے گزرتا ہوں تو جو سنگِ میل ہوتا ہے میں اب اسے پڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس سنگِ میل پر کیا کچھ

لکھا ہوتا ہے۔ کہنے لگا میں ہر سنگِ میل پر یہ تو پڑھ لیتا ہوں کہ اسی میل یا ستر میل لیکن کہاں کا اسی میل، کہاں کا ستر میل۔ یہ مجھے کبھی پتہ نہیں لگا کہ کس طرف ہے۔ یہ ستر میل کہاں کے ہیں۔ اس کے باوجود وہ کہہ رہا تھا کہ میں ترقی یافتہ ہو گیا ہوں اور میں نے اب ترقی کر لی ہے۔ یہ اس قسم کی ترقی ہے (مسکراتے ہوئے) یہ راہ میں نئ چیز ہونے کے باوصف بڑی حائل ہوتی ہے۔ میں اس پر کافی حد تک سوچتا اور غور کرتا رہتا ہوں کہ اے میرے اللہ کیا ہم ہر نئ شے کو ہر Modern چیز کو اپنالیں۔ یہ تو وہ تھا جو گزشتہ دنوں میرے ساتھ پیش آیا اور میں نے اس کی دعا کی کہ یا اللہ میں تجھ سے اس بات کا آرزومند ہوں کہ کچھ پرانی چیزیں جو ہیں، میں ان کا ساتھ دیتا رہوں مثلاً میں پرانی زمین کا ساتھ دیتا رہوں، میں پرانے چاند ستاروں کا ساتھ دیتا رہوں۔ اے اللہ میں اپنے پرانے دین کے ساتھ وابستہ رہوں اور یا اللہ میری بیوی سے جو 38 سال پرانی شادی ہے، میری آرزو ہے کہ وہ بھی پرانی ہی رہے اور اسی طرح چلتی رہے۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے دوست اور میرے جاننے والے مجھ پر ضرور ہنسیں گے اور مجھے ایک دقیانوس انسان سمجھیں گے اور میرا مذاق، ٹھٹھ اڑائیں گے اور مجھے بہت Fundamentalist سمجھیں گے، بنیاد پرست خیال کریں گے لیکن میں کوشش کر کے، جرات کر کے بہت ساری چیزوں کے ساتھ وابستہ رہتا

ہوں۔ انہیں چاہتا ہوں اور کچھ نئی چیزیں جو میری زندگی میں داخل ہو کر میرے پہلوؤں سے ہو کر گزر رہی ہیں، ان میں جو ٹھیک ہے، جو مناسب ہے، جو مجھے فلاح کر طرف لے جاتی ہوں، میں ان کی طرف مائل ہونا چاہتا ہوں اور مجھے یہ یقین ہے کہ خدا میری دعا یقیناً قبول کر لے گا۔ جہاں تک تبدیلی کا تعلق ہے تو اس حوالے سے اگر آپ غور کریں تو ایسی کوئی تبدیلی آئی ہی نہیں ہے یا آتی نہیں جیسی کہ آنی چاہیے۔ اگر آپ تاریخ کے طالبعلم ہیں بھی تو یقیناً آپ تاریخ کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ اپ نے ضرور پڑھا ہو گا یا کسی داستان گو سے یہ کہانی سنی ہو گی کہ پرانے زمانے میں جب شکاری جنگل میں جاتے تھے اور شکار کرتے تھے، کسی ہرن، نیل گائے کا یا کسی خونخوار جانور کا تو وہ ڈھول تاشے بجاتے تھے اور اونچی اونچی گھنی فصلوں میں نیچے نیچے ہو کر چھپ کر اپنے ڈھول اور تاشے کا دائرہ تنگ کرتے جاتے تھے اور اس دائرے کے اندر شکار گھبرا کر، بے چین ہو کر، تنگ آ کر بھاگنے کی کوشش میں پکڑا جاتا تھا اور دبوچ لیا جاتا تھا۔ ان کا یہ شکار کرنے کا ایک طریقہ تھا۔ ہاتھی سے لے کر خرگوش تک اسی طرح سے شکار کیا جاتا تھا۔ یہ طریقہ چلتا رہا اور وقت گزرتا رہا۔

خواتین و حضرات، بڑی عجیب و غریب باتیں میرے سامنے آ جاتی ہیں اور میں پریشان بھی ہوتا ہوں لیکن شکر ہے کہ میں انہیں آپ کے ساتھ Share بھی

کر سکتا ہوں۔ میرے ساتھ ایک واقعہ یہ ہوا کہ میں نے سینما میں، ٹی وی پر اور باہر دیواروں پر کچھ اشتہار دیکھے، کچھ اشتہار متحرک تھے اور کچھ ساکن، کچھ بڑے بڑے اور کچھ چھوٹے چھوٹے تھے اور میں کھڑا ہو کر ان کو غور سے دیکھنے لگا کہ یہ پرانی شکار پکڑنے کی جو رسم ہے، وہ ابھی تک معدوم نہیں ہوئی ویسی کی ویسی ہی چل رہی ہے۔ پہلے ڈھول تاشے بجا کر، شور مچا کر "رولا" ڈال کے شکاری اپنے شکار کو گھیرتے تھے اور پھر اس کو دبوچ لیتے تھے۔ اب جو اشتہار دینے والا ہے وہ ڈھول تاشے بجا کے اپنے سلوگن، نعرے، دعوے بیان کر کے شکار کو گھیرتا ہے، شکار بے چارہ تو معصوم ہوتا ہے۔ اسے ضرورت نہیں ہے کہ میں یہ مخصوص صابن خریدوں یا پاؤڈر خریدوں۔ اسے تو اپنی ضرورت کی چیزیں چاہئیں ہوتی ہیں لیکن چونکہ وہ شکار ہے اور پرانے زمانے سے یہ رسم چلی آ رہی ہے کہ اس کا گھیراؤ کس طرح سے کرنا ہے تو وہ بظاہر تو تبدیل ہو گئی ہے لیکن یہ باطن اس کا رخ اور اس کی سوچ ویسی کی ویسی ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا، آپ خود روز شکار بنتے ہیں۔ میں بنتا ہوں اور ہم اس نرغے اور دائرے سے نکل نہیں سکتے۔ پھر جب ہم شکار کی طرح پکڑے جاتے ہیں اور چیختے چلاتے ہیں تو پھر اپنے ہی گھر والوں سے پنجرے کے اندر آ جانے کے بعد لڑنا شروع کر دیتے ہیں اور اپنے ہی عزیز و اقارب سے جھگڑا کرتے ہیں کہ تمہاری وجہ سے خرچہ زیادہ ہو رہا ہے۔

دوسرا کہتا ہے نہیں تمہاری وجہ سے یہ مسئلہ ہو رہا ہے۔ حالانکہ ہم تو شکاری کے شکار میں پھنسے ہوئے لوگ ہیں۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ترقی ہو گی اور وہ شکار کا پرانا طریقہ گزر چکا ہے تو میں سمجھتا ہوں اور آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ یہ کام ترقی کر طرف مائل نہیں ہوا ہے بلکہ ہم اسی نہج پر اور اسی ڈھب پر چلتے جا رہے ہیں۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ ایسے عجیب و غریب واقعات میرے ساتھ وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں اور میں ان پر حیران بھی ہوتا رہتا ہوں اور کہیں اگر انہیں جب ڈسکس کرنے کا مناسب موقع نہیں ملتا تو میں آپ کی خدمت میں پیش کر دیتا ہوں۔ پھر مجھے کئی خطوط ملتے ہیں اور لوگ، خط لکھنے والے مجھے راست اور درست قدم اٹھانے پر مائل کرتے ہیں۔ میں آپ سب کا شکر گزار ہوں۔

بادشاہت کے زمانے اور اس سے پہلے پتھر اور دھات کے زمانے سے لے کر آج تک جتنے بھی ادوار گزرے غلاموں کی تجارت کو بہت بڑا فعل سمجھا جاتا رہا ہے۔ لوگ غلام لے کر جہازوں میں پھرتے تھے۔ انہیں بالآخر فروخت کر کے اپنے پیسے کھرے کر کے چلے جاتے تھے اور اس سے بڑا اور کیا دکھ ہو گا کہ انسان بکتے تھے اور کہاں کہاں سے آ کر بکتے تھے اور وہ اپنے نئے مالکوں کے پاس کیسے رہ جاتے تھے۔ یہ ایک بڑی دردناک کہانی ہے، کہ مہاراجوں کے حکومت میں '

داسیاں' بکتی تھیں جو مندروں میں ناچ اور پوجا پاٹ کرتی تھیں۔ یہ 'داسیاں' دور دراز سے چل کر آتی تھیں، انہیں زیادہ تر مندروں میں رکھا جاتا تھا۔ کپل وستو کے راجہ شدودن کا بیٹا سدھاک جو اپنے باپ کو بہت ہی پیارا تھا اور وہ بعد میں مہاتما بدھ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کا دل لگانے کے لیے اس کے باپ نے ایک ہزار لونڈیاں خرید کے محل میں رکھی تھیں تاکہ صاحبزادے کو دکھ، غم، بیماری، بڑھاپے اور موت سے آشنائی نہ ہو۔ یہ لونڈیاں شہزادے کا دل بہلاتی تھیں اور یہ رسم پہلے سے ہی چلتی آرہی تھی حتّٰی کے ایک وقت ایسا بھی آیا اور اس بات کی تاریخ گواہ ہے کہ ایک جلیل القدر پیغمبر اور ان کے والد بھی پیغمبر تھے، وہ دنیا کے حسین ترین شخص تھے۔ وہ بھی بک گئے۔ میں یہ حضرت یوسف علیہ السّلام کی بات کر رہا ہوں۔ ان کی بھی باقاعدہ بولی لگی تھی۔ یہ دردناک کہانیاں چلی آتی رہی ہیں اور ایسے واقعات مسلسل ہوتے رہے ہیں۔ حضرت عِیسیٰ، حضرت موسیٰ کے زمانے میں غلامی کا دور اور رسم بھی تھی۔ غلامی اور انسانی تجارت کے خلاف سب سے پہلی آواز جو اٹھی وہ نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ نہایت قبیح رسم ہے۔ چلتی تو زمانوں سے آرہی ہے اور اسے پورا کا پورا روکنا بہت مشکل ہو جائے گا لیکن میں درخواست کرتا ہوں کہ جب بھی موقع ملے تو چلو اپنے سو غلاموں میں سے کسی

ایک غلام کو رہا کر دیا کرو۔ اللہ تمہارے لیے زیادہ آسانیاں پیدا کرے گا۔ پھر جب کسی سے کوئی گناہ کبیرہ سرزد ہو جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ " سب گناہ معاف ہو جائیں گے اگر تم یہ غلام آزاد کر دو۔" اگر وہ شخص کہتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں تو غریب آدمی ہوں، میرے پاس کچھ نہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا غلام کسی سے قسطوں پر لے لو (کوئی پانچ روپے مہینہ، تین روپے مہینہ ادا کرتے رہنا) لیکن غلام آزاد کر دو۔ یہ غلامی کی ایسی قبیح رسم تھی جس سے انسان آہستہ آہستہ نکلنے کی کوشش کرتا رہا لیکن پھر امریکا میں تو اس نے باقاعدہ کھیل کی صورت اختیار کر لی، افریقہ سے غلاموں کے جہاز بھر بھر کر لائے جاتے تھے اور ان افریقی لوگوں کو امریکہ کے شہروں میں فروخت کر دیا جاتا تھا۔ آپ نے سات قسطوں میں چلنے والی فلم "روٹس" تو دیکھی ہی ہو گی۔ اس کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ گورے کس کس طریقے سے کیسے ظلم و ستم کے ساتھ کالے (سیاہ فام) غلاموں کو لا کر منڈیوں میں فروخت کرتے تھے۔ چند دن پہلے کی بات ہے یہ دکھ جو ذہن کے ایک خانے میں موجود ہے، اسے لے کر میں چلتا رہتا تھا جیسا کے آپ بھی چلتے رہتے ہیں تو مجھے ایک انٹرویو کمیٹی میں بطور Subject Expert رکھا گیا۔ میں وہاں چلا گیا۔ اس کمیٹی میں کل آٹھ افراد تھے۔ وہ آٹھ افراد کا پینل تھا جس میں خواتین اور مرد بھی تھے اور وہاں ایک

ایک کر کے Candidate آرہے تھے اور ہم ان سے سوال کرتے تھے۔ براڈ کاسٹنگ اور لکھنے لکھانے کے حوالے سے سوال پوچھنا میرے ذمہ تھا۔ وہ بہت بڑا انٹرویو ہر ایک سے لیا جارہا تھا۔ وہاں کسی صاحب نے باہر سے آکر مجھے کہا کہ ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ گھر سے انہیں پتہ چلا کہ آپ یہاں ہیں تو یہاں پہنچ گئے۔ میں اپنے دیگر کمیٹی کے ارکان سے اجازت لیکر اور معذرت کر کے باہر آگیا کہ براہ کرم ذرا دیر کے لیے اس انٹرویوز کے سلسلے کو روک لیا جائے۔ میں ہال میں اس صاحب سے ملنے کے لیے گیا۔ وہ صاحب ملے، بات ہوئی اور وہ چلے گئے لیکن میں تھوڑی دیر کے لیے ہال میں ان امیدواروں کو دیکھنے لگا جو بڑی بے چینی کی حالت میں اپنی باری آنے کا انتظار کر رہے تھے اور جو باری بھگتا کے باہر نکلتا تھا۔ اس سے بار بار پوچھتے تھے کہ تم سے اندر کیا پوچھا گیا ہے اور کس کس قسم کے سوال ہوئے ہیں؟ اور ان باہر بیٹھے امیدواروں کے چہروں پر تردّد اور بے چینی اور اضطراب عیاں تھا۔ میں کھڑا ہو کر ان لوگوں کو دیکھتا رہا اور حیران ہوتا رہا کہ اگلے زمانے میں تو لونڈی غلام بیچنے کے لیے منڈی میں تاجر باہر سے لایا کرتے تھے۔ آج جب ترقی یافتہ دور ہے اور چیزیں تبدیل ہو گئی ہیں، یہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں خود اپنے آپ کو بیچنے اور غلام بنانے کے لیے یہاں تشریف لائے ہیں اور چیخیں مار مار کر اور تڑپ تڑپ کر اپنے آپ کو،

اپنی ذات، وجود کو، جسم و ذہن اور روح کو فروخت کرنے آئے ہیں اور جب انٹرویو میں ہمارے سامنے حاضر ہوتے ہیں اور کہتے ہیں، سر میں نے یہ کمال کا کام کیا ہے، میرے پاس یہ سرٹیفیکیٹ ہے، میرے پرانے مالک کا جس میں لکھا ہے کہ جناب اس سے اچھا غلام اور کوئی نہیں اور یہ لونڈی اتنے سال تک خدمت گزار رہی ہے اور ہم اس کو پورے نمبر دیتے ہیں اور اس کی کارکردگی بہت اچھی ہے اور سر اب آپ خدا کے واسطے ہمیں رکھ لیں اور ہم خود کو آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ کیا وقت بدل گیا؟ کیا انسان ترقی کر گیا؟ کیا آپ اور میں اس کو ترقی کہیں گے کہ کسی معیشت کے بوجھ تلے، کسی اقتصادی وزن تلے ہم اپنے آپ کو خود بیچنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں لے جا کر یہ کہتے ہیں کہ جناب اس کو رکھ لو۔ اس کو لے لو اور ہمارے ساتھ سودا کرو کہ اس کو غلامی اور اس کو لونڈی گیری کے کتنے پیسے ملتے رہیں گے۔ یہ ایک سوچ کی بات ہے اور ایک مختلف نوعیت کی سوچ کی بات ہے۔ آپ اس پر غور کیجیے اور مجھے بالکل منع کیجیے کہ خدا کے واسطے ایسی سوچ آئندہ میرے آپ کے ذہن میں نہ آیا کرے کیونکہ یہ کچھ خوشگوار سوچ نہیں ہے۔ کیا انسان اس کام کے لیے بنا ہے کہ وہ محنت و مشقت اور تردّد کرے اور پھر خود کو ایک پیکٹ میں لپیٹ کے اس پر خوبصورت پیکنگ کر کے گوٹا لگا کے پیش کرے کہ میں فروخت

کے لیے تیار ہوں۔ کہ ایسی باتیں ہیں جو نظر کے آگے سے گزرتی رہتی ہیں اور پھر یہ خیال کرنا اور یہ سوچنا کہ انسان بہت برتر ہو گیا ہے، برتر تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے ارد گرد کے گرے پڑے لوگوں کو سہارا دے کر اپنے ساتھ بٹھانے کو کوشش کرتے ہیں اور وہی قومیں مضبوط اور طاقتور ہوتی ہیں جو تفریق مٹا دیتی ہیں۔ دولت، عزت، اولاد یہ سب خدا کی طرف سے عطا کردہ چیزیں ہوتی ہیں لیکن عزّتِ نفس لوٹانے میں، لوگوں کو برابری عطا کرنے میں یہ تو وہ عمل ہے جو ہمارے کرنے کا ہے اور اس سے ہم پیچھے ہٹے جاتے ہیں اور اپنی ہی ذات کو معتبر کرتے جاتے ہیں۔ ایک دفعہ ہمارے باباجی کے ڈیرے پر ایک نوجوان سا لڑکا آیا۔ وہ بیچارہ ٹانگوں سے معذور تھا اور اس نے ہاتھ میں پکڑنے اور وزن ڈالنے کے لیے لکڑی کے دو چوکھٹے سے بنوا رکھے تھے۔ وہ باباجی کو ملنے، لنگر لینے اور سلام کرنے آیا کرتا تھا۔ میں وہاں بیٹھا تھا اور اسے دیکھ کر مجھے بہت تکلیف ہوئی اور چونکہ باباجی کے سامنے ہم آزادی سے ہر قسم کی بات کر لیا کرتے تھے۔ اس لیے میں نے کہا، باباجی آپ کے خدا نے اس آدمی کے لیے کچھ نہ سوچا۔ یہ دیکھیۓ نوجوان ہے، اچھا لیکن صحت مند ہے۔ باباجی نے ہنس کر کہا، سوچا کیوں نہیں۔ سوچا بلکہ بہت زیادہ سوچا اور اس آدمی ہی کے لیے تو سوچا۔ میں نے کہا، جی کیا سوچا اس آدمی کے لیے، کہنے لگے، اس کے لیے تم کو پیدا کیا، کتنی بڑی سوچ ہے

اللہ کی۔ اب یہ ذمہ داری تمہاری ہے۔ میں نے کہا جی (مسکراتے ہوئے) آئندہ سے ڈیرے پر نہیں آنا۔ یہ تو کندھوں پر ذمہ داریاں ڈال دیتے ہیں۔ دوسروں کے لیے سوچنا تو فلاح کی راہ ہے اور یہ ترقی جسے ہم ترقی سمجھتے ہیں یا وہ ترقی جو آپ کے، ہمارے ارد گرد ابلیسی ناچ کر رہی ہے یا وہ ترقی جو آپ کو خوفناک ہتھیاروں سے سجا رہی ہے۔ اسے ترقی تو نہیں کہا جا سکتا۔ آج سے کچھ عرصہ قبل آپ جانتے ہیں کہ اس دنیا میں دو سُپر پاورز تھیں اور ان کا آپس میں بڑا مقابلہ رہتا تھا اور وہ کاغذی جنگ لڑتے ہوئے اور الیکٹرونک کی لڑائی لڑتے ہوئے آپس میں ہمیشہ ایک دوسرے کی تقابل کرتے تھے اور ایک دوسری کو یہ طعنہ دیتی کہ میں تم سے بڑی سُپر پاور ہوں اور دوسری پہلی کو اور وہ اپنی سُپر پاور اور ترقی کی پرکھ اور پیمانہ یہ بتاتی تھیں کہ جیسے ایک کہتی کہ تم دس سیکنڈ میں ایک ملین افراد کو ملیا میٹ کر سکتی ہو، ہم 5 سیکنڈ کے اندر ایک ملین انسان ہلاک کر سکتے ہیں۔ اس لیے ہم بڑی سُپر پاور ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے کبھی تقابلی مطالعہ میں یا معاملہ میں اور کسی بات پر فخر ہی نہیں کیا۔ تو کیا انسانیت اس راہ پر چلتی جائے گی اور جو علم ہمیں پیغمبروں نے عطا کیا ہے اور جو باتیں انہوں نے بتائی ہیں، وہ صرف اس وجہ سے پیچھے ہٹتی جائیں گی کہ ہم نئی چیزیں اور نئے لوگ

حاصل کرتے چلے جارہے ہیں۔ بحر کیف یہ دکھ کی باتیں ہیں اور بہت سے لوگ میرے ساتھ اس دکھ میں شریک ہوں گے۔ اب آپ سے اجازت چاہوں گا۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

ہاٹ لائن

ایک مرتبہ پروگرام ”زاویہ“ میں گفتگو کے دوران ”دعا“ کے بارے میں بات ہوئی تھی اور پھر بہت سے لوگ ”دعا“ کے حوالے سے بحث و تمحیض اور غور و خوض کرتے رہے اور اس بابت مجھ سے بھی بار بار پوچھا گیا، میں اس کا کوئی ایسا ماہر تو نہیں ہوں لیکن میں نے ایک تجویز پیش کی تھی جسے بہت سے لوگوں نے پسند کیا اور وہ یہ تھی ”دعا“ کو بجائے کہنے یا بولنے کے ایک عرضی کی صورت میں جائے۔ عرض کرنے اور میرے اس طرح سوچنے کی وجہ یہ تھی کہ پوری نماز میں یا عبادت میں جب ہم دعا کے مقام پر پہنچتے ہیں تو ہم بہت تیزی میں ہوتے ہیں اوت بہت (اتاولی) کے ساتھ دعا مانگتے ہیں۔ ایک پاؤں میں جوتا ہوتا ہے، دوسرا پہن چکے ہوتے ہیں، اُٹھتے اٹھتے، کھڑے کھڑے جلدی سے دعا مانگتے چلے جاتے ہیں یعنی وہ رشتہ اور وہ تعلق جو انسان کا خدا کی ذات سے ہے، وہ اس طرح جلد بازی کی کیفیت میں پورا نہیں ہو پاتا۔ ہمارے بابا نے ایک ترکیب یہ سوچی تھی کہ دعا مانگتے وقت انسان پورے خضوع کے ساتھ اور پوری توجّہ کے ساتھ

رکھتے ہوئے دعا کی طرف توجّہ دے اور جو اس کا نفسِ Full Attention مضمون ہو، اُس کو ذہن میں اُتار کر، تکلّم میں ڈھال کر اور پھر اس کو Communicate کرنے کے انداز میں آگے چلا جائے تا کہ اُس ذات تک پہنچے جس کے سامنے دعا مانگی جا رہی ہے یا پیش کی جا رہی ہے۔ ہمارے ایک دوست تھے، اُنہوں نے مجھے بتایا کہ میں نے دعا کاغذ پر لکھنے کی بجائے ایک اور کام کیا ہے جو آپ کی سوچ سے آگے ہے۔

میرے دوست افضل صاحب نے کہا کہ میں نے ایک رجسٹر بنا لیا ہے اور میں اس پر اپنی دعا بڑی توجّہ کے ساتھ لکھتا ہوں اور اس پر باقاعدہ ڈیٹ بھی لکھتا ہوں اور اس کے بعد میں پیچھے پلٹ کر اس کیفیت کا جائزہ بھی لیتا ہوں جو دعا مانگنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ میرے دوست کے رجسٹر بنانے کا بڑا فائدہ ہے اور ان کا تعلق اپنی ذات، اپنے اللہ اور اُس ہستی کے ساتھ جس کے آگے وہ سر جھکا کر دعا مانگتے ہیں، بہت قریب ہو جاتا ہے۔ اکثر و بیشتر اور میں بھی اس میں شامل ہوں، جو یہ شکایت کرتے ہیں کہ ''جی بڑی دعا مانگی لیکن کوئی اثر نہیں ہوا۔ پر کوئی توجّہ نہیں دی جاتی اور ہماری دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔''

خواتین و حضرات! دعا کا سلسلہ ہی ایسا ہے جیسا نلکا "گیڑ" کے پانی نکالنے کا ہوتا ہے۔ جس طرح ہینڈ پمپ سے پانی نکالتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا جو ہینڈ پمپ بار بار یا مسلسل چلتا رہے یا "گڑتا" رہے، اُس میں سے بڑی جلدی پانی نکل آتا ہے اور جو ہینڈ پمپ سوکھا ہوا ہو اور استعمال نہ کیا جاتا رہا ہو، اُس پر "گڑنے" والی کیفیت کبھی نہ گزری ہو۔ اُس پر آپ کتنا بھی زور لگاتے چلے جائیں، اُس میں سے پانی نہیں نکلتا۔ اس لیے دعا کے سلسلے میں آپ کو ہر وقت اس کی حد کے اندر داخل رہنے کی ضرورت ہے کہ دعا مانگتے ہی چلے جائیں اور مانگیں توجّہ کے ساتھ، چلتے ہوئے، کھڑے ہوئے، بے خیالی میں کہ یا اللہ ایسے کر دے۔ عام طور پر جب لوگ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں "دعاؤں میں یاد رکھنا" اور وہ بھی کہتے ہیں ہم اپ کو دعاؤں میں یاد رکھیں گے اور بہت ممکن ہے کہ وہ دعاؤں میں یاد رکھتے بھی ہوں لیکن آپ کو خود کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھنے کی ضرورت ہے۔

خدا کے واسطے دعا کے دائرے سے ہر گز ہر گز نہیں نکلیے گا اور یہ مت کہیے گا کہ جناب دعا مانگی تھی اور اُس کا کوئی جواب نہیں آیا، دیکھئے دعا خط و کتابت نہیں، دعا Correspondent نہیں ہے کہ آپ نے چٹھی لکھی اور اُس خط کا جواب آئے۔ یہ تو ایک یکطرفہ عمل ہے کہ آپ نے عرضی ڈال دی اور اللہ کے حضور

گزار دی اور پھر مطمئن ہو کر بیٹھ گئے کہ یہ عرضی جاچکی ہے اور اب اس کے اوپر عمل ہو گا۔ اُس کی (اللہ) مرضی کے مطابق کیونکہ وہ بہتر سمجھتا ہے کہ کس دعا یا عرضی کو پورا کیا جانا ہے اور کس دعا نے آگے چل کر اُس شخص کے لیے نقصان دہ بن جانا ہے اور کس دعا نے آگے پہنچ کر اُس کو وہ کچھ عطا کرنا ہے جو اُس کے فائدے میں ہے۔ دعا مانگنے کے لیے صبر کی بڑی ضرورت ہوتی ہے اور اس میں خط کے جواب آنے کے انتظار کا چکر نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے شائد پہلے بھی عرض کیا تھا کہ کچھ دعائیں تو مانگنے کے ساتھ ہی پوری ہو جاتی ہیں، کچھ دعاؤں میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے اور کچھ دعائیں آپ کی مرضی کے مطابق پوری نہیں ہوتیں۔ مثال کے طور پر آپ اللہ سے ایک پھول مانگ رہے ہیں کہ "اے اللہ مجھے زندگی میں ایک ایسا پھول عطا فرما جو مجھے پہلے کبھی نہ ملا ہو۔" لیکن اللہ کی خواہش ہو کہ اسے ایک پھول کی بجائے زیادہ پھول، پورا گلدستہ یا پھولوں کا ایک ٹوکرا دے دیا جائے لیکن آپ ایک پھول پر ہی Insist کرتے رہیں اور ایک پھول کی ہی دعا بار بار کرتے جائیں اور اپنی عقل اور دانش کے مطابق اپنی تجویز کو شامل کرتے ہیں کہ مجھے ایک ہی پھول چاہیے تو پھر اللہ کہتا ہے کہ اگر اس کی خواہش ایک پھول ہی تو اسے پھولوں سے بھرا ٹوکرا رہنے دیا جائے۔ آپ کی دانش اور عقل بالکل آپ کی دستگیری نہیں کر سکتی، مانگنے کا یہ طریقہ ہو کہ

اے اللہ میرے لئے جو بہتر ہے، مجھے وہ عطا فرما۔ میں انسان ہوں اور میری آرزوئیں اور خواہش بھی بہت زیادہ ہیں، میری کمزوریاں بھی میرے ساتھ ہیں اور تُو پروردگارِ مطلق ہے، میں بہت دست بستہ انداز میں عرض کرتا ہوں کہ مجھے کچھ ایسی چیز عطا فرما جو مجھے بھی پسند آئے اور میرے ارد گرد رہنے والوں کو، میرے عزیز و اقارب کو پسند ہو اور اس میں تیری رحمت بھی شامل ہو۔ اگر کہیں کہ اللہ جو چاہے عطا کرے وہ ٹھیک ہے۔ اللہ آپ کو فقیری عطا کر دے جبکہ آپ کی خواہش سی ایس ایس افسر بننے یا ضلع ناظم بننے کی ہو۔ دعا ایسی مانگنی چاہیے کہ اے اللہ مجھے ضلع ناظم بھی بنا دے اور پھر ایسا نیک بھی رکھ کہ رہتی دنیا تک لوگ اس طرح یاد کریں کہ باوصف اس کے کہ اس کو ایک بڑی مشکل درپیش تھی اور انسانوں کے ساتھ اس کے بہت کڑے روابط تھے لیکن پھر بھی وہ اس میں پورا اترا اور کامیاب ٹھہرا۔ دعا کے حوالے سے یہ باریک بات توجہ طلب اور نوٹ کرنے والی ہے۔ پھر بعض اوقات آپ دعا مانگتے مانگتے بہت لمبی عمر کو پہنچ جاتے ہیں اور دعا پوری نہیں ہوتی۔ اللہ بعض اوقات آپ کی دعا کو Defer بھی کر دیتا ہے۔ جیسے آپ ڈیفنس سیونگ بانڈز لیتے ہیں، وہ دس سال کے بعد میچور ہوتے ہیں۔ جس طرح کہتے ہیں کہ یہ بچّہ ہو گیا ہے۔ اب اس کے نام کا ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ لے لیں، اسے آگے چل کر انعام مل جائے گا۔

اس طرح اللہ بھی کہتا ہے اور وہ بہتر جانتا ہے کہ اب اس شخص کے لیے یہ چیز عطا کرنا غیر مفید یا بے سود ثابت ہو گا، ہم اس کو آگے چل کر اس سے بھی بہت بڑا انعام دیں گے بشر طیکہ یہ صبر اختیار کرے اور ہماری مرضی سمجھنے کی کوشش کرے۔ دعا کو خدا کے واسطے ایک معمولی چیز نہ سمجھا کریں۔ پہلی بات تو یہ ہے جو مشاہدے میں آئی ہے کہ دعا ایک اہم چیز ہے۔ جس کے بارے میں خداوند تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ "جب تم نماز ادا کر چکو تو پھر پہلو کے بل لیٹ کر، یا بیٹھ کر میرا ذکر کرو، یعنی میرے ساتھ ایک رابطہ قائم کرو۔ جب تک یہ تعلق پیدا نہیں ہو گا، جب تک یہ Hot Line نہیں لگے گی۔ اُس وقت تک تم بہت ساری چیزیں نہیں سمجھ سکو گے۔" ہم نے بھی بابا جی کے کہنے پر جو بات دل میں ہوتی اُس کو بڑے خوشخط انداز میں لمبے کاغذ پر لکھ کر، لپیٹ کر رکھتے تھے اور اس کے اوپر یوں حاوی ہوتے تھے کہ وہ تحریر اور وہ دعا ہمارے ذہن کے نہاں خانوں میں ہر وقت موجود رہتی تھی۔ ایک صاحب مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ جب وہ دعا پوری ہو جائے تو پھر کیا کریں؟ میں نے کہا کہ پھر اس کاغذ کو پھاڑ کر (ظاہر ہے اس میں آپ نے بہت باتیں بھی لکھی ہوں گی کیونکہ آدمی کی آرزو خالص Materialistic یا مادّہ پرستی کی دعاؤں کی ہی نہیں ہوتی کچھ اور دعائیں بھی انسان مانگتا ہے (پُرزہ پُرزہ کر کے کسی پھل دار درخت کی جڑ میں دبا دیں، یہ

احترام کے لیے کہا ہے۔ ویسے تو آپ خود بھی جانتے ہیں کہ ایسی تحریروں والے مقدّس کاغذوں کے ڈسپوزل کا کیا طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے۔ ہمارے دوست جو افضل صاحب ہیں، انہوں نے دعاؤں کا باقاعدہ ایک رجسٹر بنایا ہوا ہے جو قابل غور بات ہے اور اس میں وہ دیکھتے ہیں کہ فلاں تاریخ کو فلاں سن میں میں نے یہ دعا مانگی تھی، کچھ دعائیں چھوٹی ہوتی ہیں، معمولی معمولی سی۔ وہ ان کو بھی رجسٹر میں سے دیکھتے کہ یہ اس سنہ میں مانگی دعا اس وقت آکر پوری ہوئی اور فلاں دعا کب اور جب جا کر پوری ہوئی۔ دعا پوری توجہ کا تقاضا کرتی ہے۔ چلتے چلتے جلدی جلدی میں دعا منگنے کا کوئی ایسا فائدہ نہیں ہوتا۔ کچھ دعائیں ایسی ہوتی ہیں جو بہت "ٹھاہ" کر کے لگتی ہیں۔ بغداد میں ایک نانبائی تھا، وہ بہت اچھے نان کلچے لگاتا تھا اور بڑی دور دور سے دنیا اس کے گرم گرم نان خریدنے کے لیے آتی تھی۔ کچھ لوگ بعض اوقات اسے معاوضے کے طور پر کھوٹا سکہ دے کے چلے جاتے جیسے ہمارے یہاں بھی ہوتے ہیں۔ وہ نانبائی کھوٹا سکہ لینے کے بعد اسے جانچنے اور آنچنے کے بعد اپنے "گلے" (پیسوں والی صندوقچی) میں ڈال لیتا تھا۔ کبھی واپس نہیں کرتا تھا اور کسی کو آواز دے کر نہیں کہتا تھا کہ تم نے مجھے کھوٹا سکہ دیا ہے۔ بے ایمان آدمی ہو وغیرہ بلکہ محبت سے وہ سکہ بھی رکھ لیتا۔ جب اس نانبائی کا آخری وقت آیا تو اس نے پکار کر اللہ سے کہا (دیکھئے یہ بھی دعا کا ایک

انداز ہے) " اے اللہ تو اچھی طرح سے جانتا ہے کہ میں تیرے بندوں سے کھوٹے سکے لے کر انہیں اعلیٰ درجے کے خوشبودار گرم گرم صحت مند نان دیتا رہا اور وہ لے کر جاتے رہے۔ آج میں تیرے پاس جھوٹی اور کھوٹی عبادت لے کر آ رہا ہوں ، وہ اس طرح سے نہیں جیسا تو چاہتا ہے۔ میری تجھ سے یہ درخواست ہے کہ جس طرح سے میں نے تیری مخلوق کو معاف کیا تو بھی مجھے معاف کر دے۔ میرے پاس اصل عبادت نہیں ہے۔ بزرگ بیان کرتے ہیں کہ کسی نے اس کو خواب میں دیکھا تو وہ اونچے مقام پر فائز تھا اور اللہ نے ان کے ساتھ وہ سلوک کیا جس کا وہ متمنّی تھا۔" کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دعا مانگی گئی ہے لیکن قبولیت نہیں ہوئی اور جواب ملنا چاہیے لیکن جو محسوس کرنے والے دل ہوتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ نہیں جواب ملتا ہے۔ ایک چھوٹی سی بچی تھی۔ اس کی گڑیا کھیلتے ہوئے ٹوٹ گئی تو وہ بیچاری رونے لگی اور جیسے بچوں کی عادت ہوتی ہے تو اس نے کہا کہ اللہ میاں جی میری گڑیا جوڑ دو، یہ ٹوٹ گئی ہے۔ اس کا بھائی ہنسنے لگا کہ بھئی ٹوٹ گئی ہے اور اب یہ جڑ نہیں سکتی۔ اس نے کہا کہ مجھے اس گڑیا کے جڑنے سے کوئی تعلق نہیں ہے، میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ اللہ میاں جواب نہیں دیا کرتے۔ اللہ میاں کو تو بڑے بڑے کام ہوتے ہیں۔ لڑکی نے کہا کہ میں اللہ میاں کو ضرور پکاروں گی اور وہ میری بات کا ضرور

جواب دے گا۔ اس نے کہا، اچھا اور چلا گیا۔ جب تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو دیکھا کہ بہن ویسے ہی ٹوٹی گڑیا لیے بیٹھی ہوئی ہے اور بہن سے کہنے لگا، بتاؤ کہ اللہ میاں کا کوئی جواب آیا۔ وہ کہنے لگی، ہاں آیا ہے۔ اس لڑکے نے کہا تو پھر کیا کہا؟ اس کی بہن کہنے لگی، اللہ میاں نے کہا ہے یہ نہیں جڑ سکتی۔ یہ اس لڑکی کا ایک یقین اور ایمان تھا۔ بہت سی دعاؤں کے جواب میں ایسا بھی حکم آ جاتا ہے۔ ایسی بھی Indication آ جاتی ہے کہ یہ کام نہیں ہو گا۔ اس کو دل کی نہایت خوشی کے ساتھ برداشت کرنا چاہیے۔ ہم برداشت نہیں کرتے ہیں لیکن کوئی بات نہیں۔ پھر بھی ہمیں معافی ہے کہ ہم تقاضہ بشری کے تحت، انسان ہونے کے ناتے بہت ساری چیزوں کو اس طرح چھوڑ دیتے ہیں اور ہم پورے کے پورے اس پر حاوی نہیں ہوتے۔ کئی مرتبہ دعا مانگنے کے سلسلے میں کچھ لوگ بڑی ذہانت استعمال کرتے ہیں۔ آخر انسان ہیں نا! آدمی سوچتا بھی بڑے ٹیڑھے انداز میں ہے۔ ہمارے گاؤں میں ایک لڑکی تھی، جوان تھی لیکن شادی نہیں ہو رہی تھی۔ ہم اسے کہتے کہ تو بھی دعا مانگ اور ہم بھی دعا مانگتے ہیں کہ اللہ تیرا رشتہ کہیں کرا دے۔ اس نے کہا، میں اپنی ذات کے لیے کبھی دعا نہیں مانگوں گی۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔ ہم نے کہا کہ بھئی تو تو پھر بڑی ولی ہے جو صرف دوسروں کے لیے ہی دعا مانگتی ہے۔ اس نے کہا ولی نہیں ہوں لیکن دعا صرف

مخلوقِ خدا کے لیے مانگتی ہوں۔ وہ اللہ زیادہ پوری کرتا ہے۔ ہم اس کی اس بات پر بڑے حیران ہوئے تھے۔ وہ ہمیشہ یہی دعا مانگا کرتی تھی کہ "اے اللہ میں اپنے لیے کچھ نہیں مانگتی، میں اپنی ماں کے لیے دعا مانگتی ہوں کہ اے خدا میری ماں کو ایک اچھا، خوبصورت سا داماد دے دے، تیری بڑی مہربانی ہو گی۔ اس سے میری ماں خوش ہو گی، میں اپنے لیے کچھ نہیں چاہتی۔ وہ ذہین بھی ہو، اس کی اچھی تنخواہ بھی ہو۔ اس کی جائیداد بھی ہو۔ اس طرح کا داماد میری ماں کو دے دے۔" انسان ایسی بھی دعائیں مانگتا ہے۔ یہ میری ذاتی رائے ہے کہ اس قسم کی اور اس طرح سے دعا مانگنا بھی بڑی اچھی بات ہے۔ اس سے بھی اللہ سے ایک تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ اللہ ہر زبان سمجھتا ہے۔ اپنی دعا کو نکھار نکھار کے نتھار نتھار کے چوکھٹا لگا کے اللہ کی خدمت میں پیش کیا جائے کہ جی یہ چاہیے، ان چیزوں کی آرزو ہے۔ یہ بیماری ہے، یہ مشکل ہے، حل کر دیں آپ کی بری مہربانی ہو گی۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو دعا مانگنے والے کے لیے مشکل پیدا کر دیتی ہیں کہ وہ صبر کا دامن چھوڑ کر بہت زیادہ تجویز کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے اور سوچنے لگتا ہے کہ جتنی جلدی میں دکھاؤں گا، جتنی تیزی میں کروں گا اتنی تیزی کے ساتھ میری دعا قبول ہو گی۔ وہ ہر جگہ، ہر مقام پر ہر ایک سے یہی کہتا پھرتا ہے۔ اگر کبھی وہ یہ تجربہ کرے کہ میں نے عرضی ڈال دی ہے اور

لکھ کر ڈال دی ہے اور اب مجھے آرام کے ساتھ بیٹھ جانا چاہیے کیونکہ وہ عرضی ایک بڑے اعلی دربار میں گئی ہے اور اس کا کچھ نہ کچھ فیصلہ ضرور ہو گا۔ کئی دفعہ دعا کے راستے میں یہ چیز حائل ہو جاتی ہے کہ اب جب آپ کوئی کوشش کر ہی رہے ہیں تو پھر انشاء اللہ تعالی آپ کی کوشش کے صدقے کام ہو جائے گا۔ ہم یہ بھی سوچتے ہیں لیکن یہ بھی میرا ایک ذاتی خیال ہے کہ دعا کی طرف پہلے توجہ دینی چاہیے اور کوشش بعد میں ہونی چاہیے ۔ دعا کی بڑی اہمیت ہے۔ دعا کے ساتھ گہری اور یقین کے ساتھ وابستگی ہونی چاہیے، اور جب گہری وابستگی ہو تو اس یقین کے ساتھ کوشش کر کے سوچنا چاہیے کہ اب عرضی چلی گئی ہے، اب اس کا نتیجہ ضرور نکلے گا۔ دعا ہر زبان میں پوری ہوتی ہے جس زبان میں بھی کی جائے۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان جنگ آزادی جاری تھی اور مولوی حضرات اس جنگ کی رہنمائی کر رہے تھے اور توپیں بھر بھر کے چلا رہے تھے تو اس جنگ کے خاتمے پر ایک مولوی نے ایک انگریز سے کہ کہ حیرانی کی بات ہے کہ ہم جو بھی تدبیر یا تجویز کرتے ہیں وہ پوری نہیں ہوتی اور آپ جو بھی کام کرتے ہیں ہر جگہ پر آپ کو کامیابی ملتی رہی ہے، اس کی کیا وجہ ہے۔ انگریز نے ہنس کے کہا "ہم ہر کام کے لیے دعا مانگتے ہیں۔" مولوی صاحب نے کہا، دعا تو ہم بھی مانگتے ہیں۔ انگریز نے کہا، ہم انگریزی میں دعا مانگتے ہیں۔

اب مولوی بیچارہ خاموش ہو گیا۔ اس وقت بھی انگریزی کا ایک خاص رعب اور دبدبہ ہوتا تھا تو مولوی صاحب نے بھی کہا کہ شاید انگریزی میں مانگی ہوئی دعا کامیاب ہوتی ہو گی۔ دعا کے لیے کسی زبان کی قید نہیں ہے۔ بس دلی وابستگی اہم ہے۔ اب میں آپ سے اجازت چاہوں گا۔ میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین۔ اللہ حافظ۔

تکبر اور جمہوریت کا بڑھاپا

ایک انگریز مصنف ہے جس کا میں نام بھولنے لگا ہوں۔ اس کی معافی چاہتا ہوں لیکن شاید گفتگو کے دوران نام یاد آ جائے، وہ مصنف کہتا ہے کہ تکبر، رعونت اور گھمنڈ اور مطلق العنانیت جب قوموں اور حکومتوں میں پیدا ہوتی ہے تو یہ ایک طرح کی ڈویلپمنٹ بلکہ بڑی گہری ڈویلپمنٹ ہوتی ہے اور اس کے بعد جب کوئی حکومت ، کوئی مملکت یا کوئی بھی طرزِ معاشرت یا زندگی وہ Democratic یا شعورائی انداز سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہو تو پھر یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اب جمہوریت بوڑھی ہو گئی، کمزور، بیمار ہو گئی ہے اور اس کے آخری ایام ہیں۔ کسی بھی قوم میں تکبر یا گھمنڈ آ جائے تو وہ اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ وہ جمہوریت جس کو لے کر یہ کئی صدیوں سے چل رہے تھے، اب کمزور اور ماؤف ہو گئے ہیں۔ تکبر اور فرعونیت کے بڑے روپ ہیں، اونچے بھی اور نیچے بھی اور ان کو سنبھالا دینا اور ان کے ساتھ اس شرافت کے ساتھ چلنا جس کا معاملہ نبیوں نے انسانوں کے ساتھ کیا ہے، بڑا ہی مشکل کام ہے۔ کسی قسم

کی تعلیم، کسی قسم کی دنیاوی تربیت ہمارا ساتھ نہیں دیتی اور تکبر سے انسان بس اوپر سے اوپر ہی نکل جاتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی اس حوالے سے بہت کوششیں ہوتی ہیں۔ ۲۲۰ یا ۲۴۰ قبل مسیح میں جب ہمارے خطے میں گندھارا حکمرانی تھی، تب سوات کے قریب بدھوؤں کی ایک بستی تھی اور وہ بڑے بھلے لوگ تھے۔ جیسے بدھ لوگ ہوتے ہیں۔ ان پر ایک ہندو راج دھانی (حکومت) نے حملہ کر دیا۔ بدھوؤں نے فصیل کے دروازے بند کر دیے اور وہ بیچارے اندر چھپ کے بیٹھ گئے۔ ہندو فوج نے اپنے تیر، ترکش اور اگن بم پھینکے تو فصیل کے اندر بے چینی پیدا ہوئی۔ کچھ بوڑھے، بزرگ اور صلح پسند بدھ دروازہ کھول کے باہر نکلے اور انہوں نے کہا ”تم کیا چاہتے ہو“ انہوں نے جواب دیا کہ ہم تم سے لڑنا اور جنگ کرنا چاہتے ہیں۔ بدھوؤں نے کہا کہ جناب، حضور ہم تو لڑنا نہیں چاہتے۔ تب ہندو مہاراجہ نے کہا کہ ہم تمہارا ”بیج ناس“ (نسل ختم) کرنا چاہتے ہیں اور تم کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہتے اور اس چھوٹی سی ریاست پر جو تم نے سوات کے کنارے بسائی ہے، اس پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتے ہیں۔ بدھوؤں نے کہا کہ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ آپ قبضہ کر لیں۔ چنانچہ انہوں نے ہندو مہاراجہ سے ایک گھنٹے کی مہلت مانگی۔ وہ بدھ بزرگ پلٹے، انہوں نے اپنی بستی کے لوگوں سے کہا کہ اپنا سامان اٹھاؤ جو بھی چھوٹا موٹا اٹھا سکتے ہو اور ایک گھنٹے کے اندر اندر بستی کو

خالی کر دو، پھر یوں ہوا کہ وہ جتنے بھی بدھ لوگ تھے، وہ وہاں سے چل پڑے، باہر فوج کھڑی تھی اور بدھ ان کو سلام کرتے ہوئے جارہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ جی ہم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے جارہے رہیں، آپ قبضہ فرمالیجیے۔ جب وہ بستی بالکل خالی ہونے لگی تو ہندو فوج کے سپہ سالار یا "سیناپتی" نے انہیں روک کے کہا" اوہ بدھوؤں یہ تم کیا کر رہے ہو، تم بستی خالی کر کے جارہے ہو۔ ہم اس خالی خولی بستی پر قبضہ کر کے کیا کریں گے ؟" انہوں نے کہا یہ خالی نہیں، اس میں ہمارا سامان بھی رکھا ہوا ہے۔ سپہ سالار نے کہا، خالی سامان نہیں چاہیے۔ ہماری گھمنڈ کی جو آگ ہے، وہ خالی سامان سے نہیں بجھے گی۔ یہ اس وقت بجھے گی جب تک ہم تم کو زیر نگیں نہیں کریں گے۔ جب تک تم کو زیر کریں گے اور تم پر حکمرانی نہیں کریں گے یا تم کو اپنے ہاتھوں لڑ کے ختم نہیں کریں گے۔ بدھوؤں نے کہا کہ ہم تو خود تسلیم کرتے ہیں کہ ہم آپ کے زیر نگیں ہیں اور ہم نے اب جنگل میں بسنے کا اہتمام بھی کر لیا ہے۔ اس کے باوجود ہندوؤں نے جاتے ہوئے گھمنڈ اور تکبر میں بدھ بھکشوؤں پر حملہ کر دیا۔ کچھ کو مار ڈالا، کچھ کو زنجیروں ڈال کر غلام بنالیا اور اپنے گھمنڈ کی آگ کو اس طرح ٹھنڈا کیا۔ انسانی تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں چلتی آئی ہیں اور آرہی ہے۔ یہ مت سمجھئے گا کہ تعلیم کی وجہ سے یا بہت اعلیٰ درجے کی تربیت کی وجہ سے یا قدم قدم یہ قافلہ چلنے کے باعث انسان

کے اندر رعونت، تکبر اور گھمنڈ کا جذبہ کم ہو جائے گا۔ آپ جب بھی تاریخ کے ورق پلٹیں کے، بڑے بڑے حکمرانوں، شہنشاہوں، بادشاہوں اور سلطانوں نے اپنے گھمنڈ اور تکبر کی خاطر چھوٹی چھوٹی مملکتوں اور راج دھانیوں اور بستیوں پر اور اپنے برابر والوں پر بھی بڑھ چڑھ کے حملے کیے ہیں اور ان کو ذلیل و خوار کرنے کی نیت سے ایسا کیا ہے۔

خواتین و حضرات! ہماری زندگی میں اکثر اوقات یہ ہوتا ہے کہ معاشرتی زندگی میں آپ کی کسی ایسے مقام پر بے عزتی ہو جاتی ہے کہ آپ کھڑے کھڑے موم بتی کی طرح پگھل کے خود اپنے قدموں میں گر جاتے ہیں۔ مجھے اس وقت کا ایک واقعہ یاد ہے جب میں اٹلی کے دارالحکومت روم میں رہتا تھا اور تب قدرت اللہ شہاب کورس کرنے کے لیے ہالینڈ گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے وہاں سے خط لکھا کہ میں ایک ہفتے کے لیے تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں اور میں روم کی سیر کروں گا اور وہاں پھروں گا، باوجود اس کے سات دن بہت محدود اور کم عرصہ ہے لیکن کہتے ہیں کہ روم سات دِنوں کے اندر کسی حد تک روم دیکھا جا سکتا ہے تو میں بھی کسی حد تک اسے دیکھنے کے لیے تمہارے پاس آرہا ہوں۔ میں نے ضرور آیئے۔ جب وہ آئے تو تین دن ہم روم کے گلی کوچوں اور بازاروں میں گھومتے رہے اور جتنے بھی وہاں عجائب گھر تھے، انہیں دیکھا لیکن لوگ کہتے کہ روم کے

میوزیم تو سال بلکہ سو سال میں بھی نہیں دیکھے جا سکتے۔ بہر حال ہم پھرتے اور گھومتے رہے۔ ایک شام قدرت اللہ شہاب کے دل میں آیا اور کہنے لگے، میں "پومپائی" (وہ شہر جو ایک بڑے پہاڑ کے لاوے کی وجہ سے تباہ ہو گیا تھا اور اب بھی وہ جلا ہوا اور برباد شہر ویسے کا ویسے کا پڑا ہے اور لاوے کے خوف سے ایک کتا لاوے کے آگے آگے چیختے ہوا بھاگا تھا لیکن ایک مقام پر آکر لاوے نے اسے بھی پکڑ لیا اور وہ جل بھن گیا۔ چنانچہ اس کا حنوط شدہ وجود اب بھی اسی طرح موجود ہے۔) جانا چاہتا ہوں۔ پومپائی کے بارے میں آپ کو مزید بتاؤں کہ لاوے کے باعث وہاں جس طرح لوگ مرے تھے، گرے تھے، انہیں بھی ویسے ہی چھوڑا ہوا ہے۔ حماموں اور غسل خانوں اور دوکانوں میں جس طرح سے لوگ تھے ویسے ہی پڑے ہیں۔ وہ بڑی عبرت کی جگہ ہے۔ قدرت اللہ کہنے لگے، میں اس شہر کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا کیونکہ پھر مجھے ایسا موقع نہیں ملے گا۔ پومپائی روم سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ وہاں جانے میں ٹرین پر غالباً دو پونے دو گھنٹے لگتے ہیں۔ جب ہم وہاں جانے لگے تو کہا کہ میں ایک ایسا جوتا لینا چاہتا ہوں جو بڑا نازک اور لچکیلا ہو اور وہ پاؤں کو تکلیف نہ دے تاکہ میں آسانی سے چل پھر سکوں۔ میں نے کہا یہ تو جوتوں کا گھر ہے، یہاں تو اعلیٰ درجے کے جوتے ملتے ہیں۔ چنانچہ ہم ایک اعلی درجے کی جوتوں کی دوکان پر گئے۔ میں نے

دوکان والے سے کہا کہ ہمارے ملک کے بہت معزز رائٹر ہیں اور انہیں ایک اعلیٰ قسم کا جوتا خریدنا ہے۔ انہوں نے ہمیں ایک انتہائی خوبصورت، نرم اور لچکدار جوتا دکھایا جس کو ہاتھ میں پکڑنے پر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ "چرمی" (کھال) جوتا نہیں ہے بلکہ کپڑے کا ہے اور لچک اس میں ایسی کہ یقین نہ آئے، یقین کریں آپ کا ہاتھ سخت ہو گا لیکن وہ جوتا انتہائی نرم تھا۔ قدرت اللہ نے اسے بہت پسند کیا اور خرید لیا۔ جب چل کے دیکھا تو انہوں نے خوشی سے سیٹی بجائی کہ اس سے اچھا جوتا میں نے ساری زندگی میں نہیں پہنا، ہم وہاں سے پومپائی کے لیے روانہ ہوئے۔ اب ظاہر ہے پومپائی ایک پتھریلا علاقہ ہے، اس کی سڑکیں ٹوٹی ہوئی، جلی ہوئی کیونکہ جیسا کسی زمانے میں تھا ویسا ہی پڑا ہوا ہے۔ ہم چلتے رہے، کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد ایک پاؤں کا جوتا ٹوٹ گیا اور اس کے ٹانکے اکھڑ گے۔ وہ انہوں نے ہاتھ میں پکڑ لیا اور ایسے چلتے رہے جیسے بگلا چلتا ہے۔ اب ہاتھ میں جوتا پکڑے اونچی نیچی گھاٹیوں اور پہاڑیوں پر چل رہے تھے کہ تھوڑی دیر کے بعد دوسرے پاؤں کا جوتا بھی جواب دے گیا۔ چنانچہ دونوں کو تسموں سے لٹکا کر انہوں نے پکڑ لیا اور ننگے پاؤں وہ پومپائی کی زیارت کرتے رہے۔ جیسے یاتری مقدس مقامات کی کرتے ہیں اور شام کو ننگے پاؤں واپس آئے اور کہنے لگے، یار یہ جوتے جو اتنے قیمتی تھے، انہوں نے یہ حال کیا۔ میں نے دیکھا کہ ان جوتوں کے

تلے اور پتاوے تک الگ ہو چکے تھے بہت غصہ آیا اور اس میں میری بے عزتی بھی تھی کیونکہ میں تو ہر وقت روم کی تعریف کرتا رہتا تھا جس طرح اب بھی کرتا رہتا ہوں۔ اگلی صبح میں دوکان پر گیا، ساتھ شہاب صاحب بھی تھے۔ میں نے کہا، دیکھئے آپ نے اتنے مہنگے جوتے ہمیں دیئے ہیں، یہ تو دو گھنٹے سے زیادہ بھی نہیں چلے اور آپ کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے تھا کہ ایک آدمی اتنی دور سے آیا ہے اور تمہارے نامی گرامی اور تاریخی شہر کی زیارت کر رہا ہے لیکن تم نے ایسے جوتے دے دیئے۔ جو دوکاندار تھا وہ بڑے نرم خو اور محبت والے انداز میں کہنے لگا "صاحب ہم شرفاء اور معزز لوگوں کے لیے جوتے بناتے ہیں، پیدل چلنے والوں کے لیے نہیں بناتے۔" یہ ایک تکبر کی تلوار تھی جس نے ہم دونوں کو اس مقام پر بری طرح سے قتل کر دیا۔ انسان اکثر دوسروں کو ذلیل و خوار کرنے کے لیے ایسے فقرے مجتمع کر کے رکھتا ہے کہ وہ اس فقرے کے ذریعے وار کرے اور حملہ آور ہو اور پھر اس کی زندگی اور اس کا جینا اس کے لیے محال کر دے۔ اس طرح حملے بڑی سطح پر بھی ہوتے ہیں اور چھوٹے لیول پر بھی ہوتے ہیں لیکن ہمارے مذہب میں یہ روایت بہت کم تھی۔ اگر تھی تو ہمارے پیغمبر محمد اپنی تعلیمات کے ذریعے لوگوں کو اس فرعونیت سے نکالتے رہتے تھے جس کا گناہ شداد، فرعون، نمرود اور ہامان نے کیا تھا۔ ان کا یہ بس ایک ہی گناہ تھا

جو سب گناہوں سے بھاری تھا۔ ازل سے لے کر آج تک انسان کے ساتھ گناہ اور بدیاں چمٹی رہی، کچھ کم ہوتی ہیں اور کچھ زیادہ۔ کسی کے پاس ایک بدی بالکل نہیں ہوتی۔ کسی کے پاس کافی تعداد میں ہوتی ہیں۔ لیکن کہتے ہیں کہ کائنات میں کوئی آدمی ایسا نہیں گزرا جو تکبر کا مرتکب نہ رہا ہو۔ کسی نہ کسی روپ میں وہ ضرور اس گناہ کا شکار ہوا ہے یا اس میں مبتلا رہا ہے۔ ہمارے صوفی لوگ اس تلاش میں مارے مارے پھرے ہیں کہ کوئی ایسا راہ تلاش کی جائے جس سے تکبر کی شدت میں کمی واقع ہو۔ ایک درویش جنگل میں جا رہے تھے۔ وہاں ایک بہت زہریلا کو برا سانپ پھن اٹھائے بیٹھا تھا۔ اب ان درویشوں ، سانپوں ، خوفناک جنگلی جانوروں اور جنگلوں کا ازل سے ساتھ رہا ہے۔ وہ درویش سانپ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور وہ بیٹھا پھنکار رہا تھا۔ انہوں نے سانپ سے کہا کہ ناگ راجہ یار ایک بات تو بتا کہ جب کوئی تیرے سوراخ کے آگے جہاں تو رہتا ہے ، بین بجاتا ہے تو، تو باہر کیوں آجاتا ہے۔ اس طرح تو تجھے سپیرے پکڑ لیتے ہیں۔ سانپ نے کہا، صوفی صاحب بات یہ ہے کہ اگر کوئی تیرے دروازے پر آکر تجھے پکارے تو یہ شرافت اور مروت سے بعید ہے کہ تو باہر نہ نکلے اور اس کا حال نہ پوچھے۔ میں اس لیے باہر آتا ہوں کہ وہ مجھے بلاتا ہے تو یہ شریف آدمیوں کا شیوا نہیں کہ وہ اندر ہی گھس کے بیٹھے رہیں۔ ایک طرف تو مشرق میں اس قسم کی تعلیم اور

تہذیب کا تذکرہ کر رہا ہے اور دوسرے طرف اسی مشرق کے لوگ اپنے قد کو اونچا کرنے کے لیے اور اپنی مونچھ کو اینٹھ کے رکھنے کے لیے مظلوموں اور محکوموں پر حملے کرتے رہے ہیں تا کہ ان کی رعونیت اور تکبر کا نام بلند ہو۔ بعض اوقات بڑے اچھے اچھے افعال جو بظاہر بڑے معصوم نظر آتے ہیں، وہ بھی تکبر کی ذیل میں آجاتے ہیں۔ میں نے آپ سے یہ بات شاید پہلے بھی کی ہو کہ جب میں اوّل اول میں بابا جی کے ڈیرے پر گیا تو میں نے لوگوں کو دیکھا کہ کچھ لوگ بابا جی سے اندر کوٹھڑی میں بیٹھے باتیں کر رہے ہوتے تھے تو کچھ لوگ ان کے بکھرے ہوئے ''الم بلغم'' اور ''اگڑم بگڑم'' پڑے ہوتے تھے، انہیں اٹھا کر ترتیب سے دروازے کے آگے ایک قطار میں رکھتے چلے جاتے تھے تا کہ جانے والے لوگ جب جانے لگیں تو انہیں زحمت نہ ہو اور وہ آسانی کے ساتھ پاؤں ڈال کے چلے جائیں۔ میں یہ سب چار، پانچ، چھ روز تک دیکھتا رہا اور مجھے لوگوں کی یہ عادت اور انداز بہت بھلا لگا۔ چنانچہ ایک روز میں نے بھی ہمت کر کے (حالانکہ میرے لیے یہ بڑا مشکل کام تھا) میں نے بھی ان جوتوں کو سیدھا کرنے کی کوشش کی لیکن چونکہ اس زمانے میں سوٹ پہنتا تھا اور مجھے یہ فکر رہتا تھا کہ میری ٹائی جیکٹ کے اندر ہی رہے لٹکے نہ پائے۔ اس لیے جھکے ہوئے بار بار اپنے لباس کو اور اپنے وجود کو اور خاص طور پر اپنے بدن کے خم کو نظر میں رکھتا تھا۔

ایک دفعہ دو دفعہ ایسا کیا۔ جب باباجی کو پتہ لگا تو وہ بھاگے بھاگے باہر آئے، کہنے لگے نہ نہ آپ نے ہرگز یہ کام نہیں کرنا، میرے ہاتھ میں جوتوں کا ایک جوڑا تھا۔ انہوں نے فوراً واپس رکھوا دیا اور کہا یہ آپ کے کرنے کا کام نہیں ہے، چھوڑ دیں۔ میں بڑا نالاں ہوا اور مجھے بڑی شرمندگی ہوئی کہ لوگوں کے سامنے مجھے اس طرح سے روکا گیا اور مجھے یہ ایک اور طرح کی ذلت برداشت کرنا پڑی۔ ایک روز جب تخلیہ تھا، میں نے باباجی سے پوچھا کہ "سر یہ آپ نے اس روز میرے ساتھ کیا کیا، میں تو ایک اچھا اور نیکی کا کام کر رہا تھا۔ جو بات میں نے آپ ہی کے ہاں سے سیکھی تھی، اس کا اعادہ کر رہا تھا۔" انہوں نے ہنس کے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا کہ آپ پر یہ واجب نہیں تھا جو آپ کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں، آپ تکبر کی طرف جا رہے تھے۔ اس لیے میں نے آپ کو روک دیا۔ میں نے کہا، جناب یہ آپ کیسی بات کرتے ہیں! کہنے لگے، اگر آپ وہاں جوڑے اسی طرح سے سیدھی قطاروں میں رکھتے رہتے، جس طرح سے اور لوگ رکھتے تھے تو آپ کے اندر تکبر کی ایک اور رمق پیدا ہو جانی تھی کہ دیکھو میں اتنے بڑے ادارے کا اتنا بڑا ڈائریکٹر جنرل ہوں اور اتنے اعلیٰ سرکاری عہدے پر ہوں اور میں یہ جوتے سیدھے کر رہا ہوں، لوگوں نے بھی دیکھ کر کہنا تھا، سبحان اللہ یہ کیسا اچھا نیکی کا کام کر رہا ہے۔ اس سے آپ کے اندر عاجزی کی

بجائے تکبر اور گھمنڈ کو اور ابھرنا تھا۔ اس لیے آپ مہربانی کر کے اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھیں اور یہ کام ہرگز نہ کریں، پھر مجھے رکنا پڑا اور ساری عمر ہی رکنا پڑا۔ اس لیے کہ دل کی سلیٹ پر اندر جو ایک لکیر کھینچی ہوئی ہے، انا کی اور تکبر کی وہ کسی صورت بھی مٹتی نہیں ہے۔ چاہے جس قدر بھی کوشش کی جائے اور اس کے انداز بڑے نرالے ہوتے ہیں۔ ایک شام ہم لندن میں فیض صاحب کے گرد جمع تھے اور ان کی شاعری سن رہے تھے۔ انہوں نے ایک نئی نظم لکھی تھی اور اس کو ہم بار بار سن رہے تھے۔ وہاں ایک بہت خوبصورت، پیاری سی لڑکی تھی۔ اس شعر و سخن کے بعد self کی باتیں ہونے لگیں یعنی "انا" کی بات چل نکلی اور اس کے اوپر تمام موجود حاضرین نے بار بار اقرار و اظہار اور تبادلہ خیال کیا۔ اس نوجوان لڑکی نے کہا فیض صاحب مجھ میں بھی بڑا تکبر ہے اور میں بھی بہت انا کی ماری ہوئی ہوں، کیونکہ صبح جب میں شیشہ دیکھتی ہوں تو میں سمجھتی ہوں کہ مجھ سے زیادہ خوبصورت اس دنیا میں اور کوئی نہیں، اللہ نے فیض صاحب کو بڑی sense of Humour دی تھی، کہنے لگے بی بی۔ یہ تکبر اور انا ہرگز نہیں ہے، یہ غلط فہمی ہے (انہوں نے یہ بات بالکل اپنے مخصوص انداز میں لبھا اور لٹا کے کی) وہ بے چاری قہقہہ لگا کے ہنسی۔ زندگی کے اندر ایسی چیزیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں لیکن قوموں کے لیے اور انسانی گروہوں کے لیے تکبر اور

انا رعونت، گھمنڈ اور مطلق العنانیت بڑی خوفناک چیز ہے، اس انگریز مصنف جس کا نام اب میرے ذہن میں آرہا ہے، وہ انگریز مصنف جی۔ کے چیٹسن کہتا ہے کہ جب تکبر انسان کے ذہن میں آجائے اور وہ یہ سمجھے کہ میرے جیسا اور کوئی بھی نہیں اور میں جس کو چاہوں زیر کر سکتا ہوں اور جس کو چاہوں تباہ کر سکتا ہوں تو وہ حکومت، وہ دور، وہ جمہوریت یا وہ بادشاہت چاہے کتنی ہی کامیابی کے ساتھ جمہوری دور سے گزری ہو، اس بابت یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس جمہوریت کا جس کا نام لے کر وہ چلتے تھے، اس کا آخری پہر آن پہنچا ہے اور وہ جمہوریت ضعیف ہو گئی ہے اور اس میں ناتوانی کے آثار پیدا ہو گئے ہیں اور وہ وقت قریب ہے جب وہ جمہوریت فوت ہو جائے گی اور فوراً ہی گھمنڈ اور فرعونیت میں بدل جائے گی۔ مشرق میں اس پر بطور خاص توجہ دی جارہی ہے اور بار بار مسلسل دہرا دہرا کر ایشیا کے جتنے بھی مذاہب ہیں ان میں بار بار اس بات پر زور دیا جاتا رہا کہ اپنے آپ کو گھمنڈ، فرعونیت اور شدادیت سے بچایا جائے کیونکہ یہ انسان اور نوح انسانی کو بالکل کھا جاتی ہے کیونکہ اس کا مطلب خدا کے مقابلے میں خود لانا ہے۔ حافظ ضامن صاحب کے خلیفہ تھے۔ ان کا نام شمس اللہ خان یا اسد اللہ خان تھا۔ چلیے اسد اللہ خان رکھ لیتے ہیں۔ وہ خلیفہ تھے لیکن طبیعت کے ذرا سخت تھے (پٹھان تھے، طبیعت کے سخت تو ہوں گے ہی)

ان کے ہاں ایک مرتبہ چوری ہو گئی۔ اب وہ گاؤں کے ”مکھیا“ (چودھری) تھے۔ ان کے چوری ہو جانا بڑے دکھ کی بات تھی۔ انہوں نے لوگوں کو اکٹھا کیا اور اپنے طور پر تحقیق و تفتیش شروع کر دی۔ ایک بڑا نیک نمازی جولاہا جو گفتگو میں بڑا کمزور تھا، وہ بھی پیش ہوا۔ اب لوگوں نے اس کے حوالے سے کہا کہ چونکہ یہ بولتا نہیں ہے اور ڈراڈرا سا ہے اور اندازہ یہی ہے کہ اس نے چوری کی ہے۔ چنانچہ اسد اللہ خان نے پکار کر کہا کہ جولاہے سچ سچ بتا ورنہ میں تیری جان لے لوں گا۔ وہ بے چارہ سیدھا آدمی تھا، وہ سہم گیا اور ہکلا گیا اور اس کی زبان میں لکنت آ گئی۔ خان صاحب نے اس کی گھبراہٹ اور لکنت سے یہ اندازہ لگایا کہ یقیناً چوری اسی نے کی ہے۔ انہوں نے اسے زور کا ایک تھپڑ مارا، وہ لڑکھڑا کے زمین پر گر گیا اور خوف سے کانپنے لگا اور سر اثبات میں ہلایا کہ جی ہاں، چوری میں نے ہی کی ہے۔ وہ جولاہا سیدھا مولانا گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا واقعہ انہیں سنایا اور کہا کہ میری زندگی عذاب میں ہے اور میں یہ گاؤں چھوڑ رہا ہوں۔ مولانا گنگوہی نے خان صاحب کو ایک رقعہ لکھا کہ تمہارے گاؤں میں یہ واقعہ گزرا ہے اور اس طرح تم نے اس جولاہے پر ہاتھ اٹھایا ہے تو آپ ایسے کریں کہ کیا آپ نے شرعی عذر کی وجہ سے اس پر ہاتھ اٹھایا ہے؟ آپ کو کیا حق پہنچتا تھا؟ اس بات کا جواب ابھی سے تیار کر کے رکھ دیجیے کیونکہ آگے چل کر

آپ کی اللہ کے ہاں یہ پیشی ہو گی اور پہلا سوال آپ سے یہی پوچھا جائے گا۔
جب یہ رقعہ اسد اللہ خان کے پاس پہنچا تو ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور سٹپٹائے، گھبرائے اور وہیں سے پیدل چل پڑے اور گنگوہا پہنچے۔ جب مولانا گنگوہی کے ہاں پہنچے تو وہ آرام فرمارہے تھے۔ ان کے خادم سے کہنے لگے، آپ مولانا سے کہہ دیجیے ایک ظالم اور خونخوار قسم کا آدمی آیا ہے۔ کہیں تو حاضر ہو جائے، نہیں تو وہ جاکر اپنے آپ کو ہلاک کر لے اور کنویں میں ڈوب کر مر جائے اور میں تہیہ کر کے آیا ہوں۔ مولانا نے انہیں اندر بلوالیا۔ آپ لیٹے ہوئے تھے اور فرمانے لگے، میاں کیوں شور مچایا ہوا ہے ؟ اور کیا ایسا ہو گیا کہ تم وہاں سے پیدل چل کے آگئے۔ غلطی ہو گئی، گناہ ہو گیا۔ معافی مانگ لو اور کیا ہو سکتا ہے۔ جاؤ چھوڑو، اپنے ضمیر پر بوجھ نہ ڈالو۔ چنانچہ خان صاحب واپس آگئے اور آکر گاؤں میں اعلان کیا کہ اس جولاہے کو پھر بلایا جائے۔ (اسی میدان میں جہاں اسے سزادی تھی)

وہ جولاہا بے چارہ پھر کانپتا ڈرتا ہوا حاضر ہو گیا۔ کہنے لگا جتنا میں نے تجھے مارا تھا، اتنا تو مجھے مار، اب لوگ کھڑے دیکھ رہے ہیں۔ لوگوں نے کہا جناب! یہ بے چارہ کانپ رہا ہے، یہ کیسے آپ پر ہاتھ اٹھا سکتا ہے۔ خان صاحب کہنے لگے، اس نے ہاتھ نہ اٹھایا تو میں مارا جاؤں گا۔ جولاہے نے بھی کہا، جناب میری یہ بساط نہیں

ہے اور میرا ایسا کرنے کو دل بھی نہیں چاہتا ہے۔ اگر کوتاہی ہوئی ہے تو اللہ معاف کرنے والا ہے۔ اللہ ہم دونوں کو معاف کرے۔ چنانچہ وہ گھر واپس آ گئے۔ اگلے دن جب وہ جولاہا کھڈی پر کپڑا بن رہا تھا تو خان صاحب اس کی بیوی کے پاس حاضر ہوئے اور کہنے لگے، گھر کے کام کاج کے لیے اب میں حاضر ہوں۔ جو چیز سودا سلف منگوانا ہو مجھے حکم کیا کیجیے، بھائی صاحب کے ہاتھ نہ منگوایا کیجیے (اب عورتوں کو اگر مفت کا نوکر مل جائے تو کہاں چھوڑتی ہیں) پھر خان صاحب آخری دم تک ہر روز صبح اپنی بگھی دور کھڑی کر کے اس جولاہے کی بیوی کے پاس جاتے اور جو بازار سے چیزیں لانا ہوتیں لا کر دیتے رہے اور وہ گھر کا سودا اپنے کندھوں پہ اٹھا کے لا کے دیتے۔ بعض اوقات وہ دوپہر کو بلوا بھیجتی کہ فلاں کام رہ گیا ہے۔ انہوں نے اپنے ملازموں کو حکم دے رکھا تھا کہ اگر میں سویا بھی ہوں تو بھی مجھے بتایا جائے۔ جب تک وہ زندہ رہے، اس جولاہے کی بیوی کا ہر حکم بجالاتے رہے کہ شاید اس وجہ سے جان بخشی ہو جائے اور آگے چل کر وہ سوال نہ پوچھا جائے۔ کس شرعی ضرورت کے تحت آپ نے اس تھپڑ مارا تھا؟ امید ہے ان سے یہ سوال نہیں پوچھا گیا ہو گا۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین۔ اللہ حافظ

شک

میں ایک بہت ضروری اور اہم بات لے کر گھر سے چلا تھا لیکن سٹوڈیو پہنچنے سے پہلے ایک عجیب و غریب واقعہ رونما ہوا جس نے میرا سارا ذہن اور آپ سے بات کرنے کا سوچا ہوا انداز ہی تبدیل ہو کر رہ گیا اور جو بات میرے ذہن میں تھی، وہ بھی پھسل کر ایک اور جگہ مقید ہو گئی ہے۔ میں جب گھر گیا تو میں نے دیکھا کہ میرے بیوی نے ہمارا ایک نیا ملازم جو گاؤں سے آیا ہے، اس کم سن کے ہاتھ کے ساتھ ایک چھوٹی سی رسی باندھ کر اسے چارپائی کے پائے کے ساتھ باندھ کے بندر کی طرح بٹھایا ہوا ہے۔ میں نے کہا، یہ کیا معاملہ ہے؟ وہ کہنے لگی اس نے میرے پرس میں سے ایک پانچ سو کا، دو سو سو اور تین نوٹ دس دس روپے کے چرا لئے ہیں اور اس نے یہ سات سو تیس روپے کی چوری کی ہے۔ یہ ابھی نیا نیا آیا ہے اور اس کی آنکھوں میں دیکھو صاف بے ایمانی جھلکتی ہے۔ میں نے کہا، مجھے تو ایسی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ کہنے لگی، نہیں آپ کو اندازہ نہیں ہے، جب یہ آیا تھا تب اس کے کان ایسے نہیں تھے اور اب جب اس نے چوری کر لی ہے تو اس

کے کانوں میں فرق پیدا ہو گیا ہے۔ میں نے کہا، دیکھئے یہ آپ شک و شبہ کی بات کرتی ہیں۔ اس حوالے سے آپ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتیں۔ خدا کے واسطے اسے چھوڑ دو۔ تو کہنے لگی کہ میں اسے کچھ کہوں گی تو نہیں اور نہ ہی اسے کوئی سزا دوں گی لیکن میں نے اسے باندھ کے اس لئے بٹھایا ہے کہ اسے اندازہ ہو کہ ایک اچھے گھرانے میں جہاں اس کے ساتھ اچھا برتاؤ ہو رہا ہے، اس نے کس قسم کی غلط حرکت کی ہے۔ ابھی ہم اس گفتگو میں مشغول ہی تھے کہ میرا چھوٹا بیٹا گھر آیا اور اس نے آتے ہی پکار کر کہا کہ امی آپ تھیں نہیں اور مجھے باہر جانا تھا تو میں نے آپا کے پرس سے سات سو بیس روپے کے قریب رقم لی تھی۔ یہ آپ واپس لے لیں۔ اب اس کی ماں نے پیسے تو پکڑ لئے اور لوٹ کے اس بندر (لڑکے) کی طرف نہیں دیکھا جو ہاتھ پر رسی بندھوا کر چارپائی کے پاس بیٹھا تھا اور میں شرمندہ کھڑا تھا لیکن مجھ میں تھوڑی سی ایسی تمکنت ضرور تھی کہ جیسے ایک چھوٹے لیول کے بادشاہوں میں ہوا کرتی ہے۔ میں نے کہا بتایئے! وہ کہنے لگی، دیکھیں مجھے تو تقریباً اس لڑکے کی حرکت ہی لگی تھی۔ میں نے کہا کہ شک و شبہ اور ظن میں ایسے ہی ہوا کرتا ہے اور اس میں آدمی بغیر کسی منطق کے، بغیر کسی دلیل کے اور بغیر کسی الجھن کے الجھ جاتا ہے اور یہ اکیلا فرد ہی نہیں، قومیں اور ملک بھی اس میں الجھ جاتے ہیں۔ فرض کریں کہ ایک ملک کو

دوسرے ملک پہ شک پڑ گیا کہ اس نے میرے خلاف کاروائی کی اور تاریخ کے واقعات اس کے شاہد ہیں کہ ایسا بھی ہوا کہ اس ملک نے دوسرے پر حملہ کر دیا اور بغیر سوچے سمجھے، ثبوت حاصل کئے ہزاروں لاکھوں جانیں ختم کر دیں۔ میں جب سٹوڈیو آ رہا تھا تو بات آپ سے کچھ اور کہنی تھی لیکن مجھے اپنی آپا صالح یا آ گئیں۔ وہ عمر میں ہم سے ذرا سی بڑی تھیں اور ہم جب بی۔ اے اور ایم۔ اے میں تھے تو اس وقت ان کی شادی ہو چکی تھی اور وہ اپنے خاوند کے ساتھ ولایت چلی گئیں اور وہاں ایک عرصہ تک رہیں۔ جب دبئ معرضِ وجود میں آیا تو پھر وہ لوگ دبئ آ گئے۔ یہاں انہوں نے کچھ سرکاری اور کچھ نیم سرکاری کام کیے۔ لوٹ کر وہ پھر ولایت چلی گئیں اور وہاں جا کر انہوں نے اپنا وہی پرانا کام سنبھال لیا جو وہ اپنی کمپنی میں کرتے تھے۔ ایک روز کسی انگریز خاتون نے صالح آپا کو بتایا کہ اگر پلاٹینم کے زیورات کو موٹے باجرے کے آٹے میں رکھا جائے تو ان کی دکھ (چمک) میں بڑا اضافہ ہوتا ہے اور یہ بہت صاف سُتھرے ہو جاتے ہیں اور بس یہ ایسا علاج اور نسخہ ہے کہ اس سے بہتر پلاٹینم کے زیورات کے لئے وجود میں نہیں آیا۔ اب ظاہر ہے کہ خواتین کی کاسمیٹک اور زیورات سے گہری دلچسپی ہوتی ہے اور وہ ان کی بابت زیادہ گفتگو کرتی ہیں۔ آپا صالح کو بھی اس خاتون کی بات بڑی دل کو لگی۔ چنانچہ انہوں نے باجرے کا آٹا حاصل کیا اور اس

میں اپنے کان کے دو بالے دبا دیے۔ صبح اٹھ کر انہوں نے آٹے کی پڑیا کھولی تو
حیران رہ گئیں کہ آٹے میں صرف ایک ہی بالا تھا اور دوسرا بالا موجود نہیں تھا۔
اب وہ پریشان ہو گئیں کیونکہ پلاٹینم کا بالا کچھ کم قیمت تو ہوتا نہیں۔ اس کمرے
میں سوائے ان کے اور ارشد بھائی (ان کے خاوند) کے کوئی تھا بھی نہیں۔ اب
جب ارشد بھائی غسل خانے سے شیو بنانے کے بعد باہر نکلے تو آپا صالح کہتی ہیں
کہ مجھے پہلی مرتبہ باوجود اس کے کہ وہ میرے خاوند ہیں اور ہماری شادی کو ۲۱
برس ہو گئے ہیں لیکن وہ مجھے چہرے سے چور نظر آئے اور ایسے محسوس ہوا کہ
انہوں نے راتوں رات وہ بالا چرا لیا ہے اور وہاں پہنچانے کی کوشش کی ہے جہاں
میری منگنی سے پہلے ان کی کسی دوسری رشتہ دار لڑکی کے ساتھ منگنی طے ہو رہی
تھی اور وہ لڑکی (ظاہر ہے اب تو وہ عورت ہو چکی ہو گی) لندن آئی ہوئی تھی اور
اس کا ٹیلی فون ارشد صاحب کو آیا تھا جس میں اس نے ارشد کو بتایا تھا کہ میں اور
میرا خاوند لندن آئے ہوئے ہیں اور ہم ملنا چاہتے ہیں۔ بتائیے ہم کب آ سکتے
ہیں۔ اب آپا صالح کو پکا یقین ہو گیا کہ یہ بالا سوائے ارشد بھائی کے اور کسی نے
نہیں چرایا، کیونکہ کمرے میں اور کوئی تھا ہی نہیں۔ چنانچہ تین چار روز انہوں
نے بڑے کرب کی کیفیت میں گزارے اور جب وہ خاتون جن سے شاید ارشد
بھائی کی شادی ہو جاتی کیونکہ دونوں گھرانوں کے درمیان ہاں بھی ہو گئی تھی

لیکن کسی وجہ سے وہ ہاں ناں میں تبدیل ہو گئی۔ وہ اپنے خاوند کے ساتھ ارشد بھائی سے آکر ملی تو آپا سارا وقت ٹکٹکی باندھ کر ارشد بھائی کے چہرے کی طرف دیکھتی رہیں اور انہیں ارشد صاحب کے چہرے پر سے بھی ایسے آثار واضح نظر آرہے تھے کہ انہوں نے بالا چرایا ہے اور اس خاتون کو دے دیا ہے یا اس کو بعد میں پہنچا دیں گے۔ اب ارشد بھائی اور صالح آپا کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج حائل ہو گئی اور وہ شک وشبہ میں زندگی بسر کرنے لگے۔ باوجود اس کے کہ ارشد بھائی بار بار پوچھتے تھے کہ تمہاری طبعیت پر مجھے کچھ بوجھ سا لگتا ہے لیکن صالح آپا نفی میں سر ہلا دیتیں اور کہتیں کہ خیر جو ہونا تھا، ہو چکا لیکن انہیں اپنے قیمتی بالے کے گم ہونے کا افسوس ہے۔ ارشد بھائی کو بھی اس بات کا بہت افسوس تھا کہ وہ بالا اگر گم ہو گیا ہے تو اسے تلاش کیا جانا چاہیے لیکن چونکہ آپ کی نظر میں خود چور تھے، اس لئے وہ تلاش کرنے میں ارشد بھائی کی کوئی مدد نہیں کرتی تھیں۔ پانچویں روز اس کمرے میں تھوڑی سی بدبُو کے آثار پیدا ہوئے۔ شام تک وہ بدبُو کافی بڑھ گئی۔ پھر یہ ڈھنڈیا پڑی کہ وہ بدبُو کہاں سے آرہی ہے۔ چنانچہ سارے کونے کھدرے تلاش کئے گئے اور ایک بڑا سا قالین جو کہ اخباروں کے اوپر پڑا ہوا تھا اور پرانے اخباروں کی ٹوکری اس پر اوندھی لیٹی ہوئی تھی جب وہ اٹھا کر دیکھا گیا تو اس کے نیچے ایک چوہا مرا ہوا پڑا تھا اور اس چوہے کے گلے میں وہ

پلاٹینم کا بالا پھنسا ہوا تھا۔ رات کو وہ باجرے کا آٹا کھانے آیا اور شوق میں اپنا منہ دھانستا ہوا اتنی دور لے گیا کہ بالا اس کے حلق کا پھندا بن گیا اور پھر وہ اسے پنجوں کی کوشش کے باوجود نکال یا اتار نہ سکا اور اس کا دم گھٹ گیا، بڑی مشکل کے ساتھ اس سڑی ہوئی لاش سے وہ بالا چھڑایا گیا اور صالح آپا کو اطمینان نصیب ہوا جو اللہ کے فضل سے اب تک ہے۔ شک و شبہ کی دنیا بڑی عجیب و غریب ہوتی ہے اور اس پر کسی کا بس نہیں چلتا۔ جب یہ ایک بار ذہن میں جاگ اٹھتی ہے تو اس کا ذہن سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ نفسیات دان یہ کہتے ہیں کہ شک کے نکلنے کے لئے ہمارے پاس کوئی فارمولا نہیں ہے جو Apply کر کے انسان کو شک و شبہ کی اذیت سے نجات دلا دے۔ البتہ اللہ ضرور اس بات کا حکم دیتا ہے کہ تم لوگوں کی ٹوہ میں نہ رہا کرو۔ یہ مت دیکھو کہ اس کے گھر میں کیا آیا ہے، اس کو کون ملنے آیا۔ اس کو چھوڑو، وہ اللہ کا بندہ ہے اور اسے اللہ ہی پوچھے گا اور تم زیادہ تجسس میں نہ پڑو، یہ اللہ کا حکم ہے۔ اسی طرح جب آپ شک میں پڑتے ہیں تو آپ اس حکم کو یقیناً چھوڑ دیتے ہیں جو بڑے واضح انداز میں Categorically اللہ نے ہم، آپ اور سب کو کہ دیا ہے کہ ایسے ''سُوں'' (جاسوسی) لینے کے لیے اور ایسی سی آئی ڈی کرنے کے لئے مت جایا کرو۔ اپنی زندگی کے اندر کوئی سی آئی اے (CIA)، کوئی کے جی بی (KGB) نہ بنائیں،

کوئی موساد، کوئی را نہ بنائیں ورنہ آپ کی زندگی عذاب میں پڑ جائے گی۔ جن ملکوں نے ایسے ادارے بنائے ہیں بظاہر تو وہ بہت خوش ہیں اور ان پر فخر کرتے ہیں لیکن آہستہ آہستہ اس قسم کے ادارے ان کو ایسی اُلجھنوں میں مبتلا کر دیتے ہیں کہ وہ پھر ان سے نکل ہی نہیں سکتے۔ شک کے حوالے سے مجھے بڑی گزری باتیں یاد آ رہی ہیں۔ جوانی میں مجھے درختوں اور پودوں سے بڑا شغف تھا۔ اس وقت میرے پاس ایک چھوٹی آری ہوا کرتی تھی جس سے میں درختوں کی شاخیں کاٹتا تھا اور ان کی اپنی مرضی سے تراش خراش کیا کرتا تھا اور ہمارے ہمسائیوں کو ایک بچہ جو پانچویں، چھٹی میں پڑھتا ہو گا۔ وہ اس ولایتی آری میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ ایک دو مرتبہ مجھ سے دیکھ بھی چکا تھا اور اسے ہاتھ سے چھو کر بھی دیکھ چکا تھا۔ ایک روز میں نے اپنی وہ آری بہت تلاش کی لیکن مجھے نہ ملی۔ میں نے اپنے کمرے اور ہر جگہ اسے تلاش کیا لیکن بے سود۔ اب جب میں گھر سے باہر نکلا تو میں نے پڑوس کے اس لڑکے کو دیکھا۔ اس کی شکل، صورت، چلنے بات کرنے کا انداز، سب بدل گیا تھا۔ جیسے جو ملک دوسرے پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ Culprit ہے یا اس نے کوئی ایسی کوتاہی کی ہے جو ہماری مرضی کے مطابق نہیں ہوئی اور ان کو یہ لگنے لگتا ہے کہ اس میں یہ، یہ خرابی ہے اور مجھے بھی پڑوس کے اس لڑکے پر سارے شک وارد ہونے لگے۔

اب مجھے ایسا لگتا کہ جس طرح وہ پہلے مُسکراتا تھا، اب ویسے نہیں مُسکراتا۔ مجھے ایسے لگتا جیسے وہ مجھے اپنے دانتوں کے ساتھ چڑارہاہو۔ اس کے کان جو پہلے چپٹے تھے، وہ اب مجھے کھڑے دکھائی دیتے اور اس کی آنکھوں میں ایسی چیز دکھائی دیتی جو ایک آری چور کی آنکھوں میں نظر آسکتی ہے لیکن مجھے اس بات سے بڑی تکلیف ہوئی جیسے صالح آپا کو بھی ہوتی تھی۔ جب میں نے اس آری کو گھر میں موجود پایا کیونکہ میں خود ہی اس آری کو اٹھا کر گھر کے اندر سے آیا تھا اور ایک دن ایسے ہی اخباروں کی الٹ پلٹ میں مجھے وہ آری مل گئی، جب مجھے وہ آری مل گئی اور میں شرمندگی کے عالم میں باہر نکلا تو یقین کیجئے وہی لڑکا مجھے اپنی ساری خوبصورتیوں اور بھولے پن کے ساتھ اور ویسی ہی معصومیت کے ساتھ مجھے نظر آرہا تھا۔ میں کہاں تک آپ کو یہ باتیں سناتا چلا جاؤں؟ آپ خود سمجھدار ہیں اور جانتے ہیں شک کی کیفیت میں پوری بات ہاتھ میں نہیں آتی۔ اس موقع پر مجھے علامہ اقبال کا ایک شعر یاد آرہا ہے

مشامِ تیز سے صحرا میں ملتا ہے سراغ اس کا

ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری

جو قومیں شک و شبہ سے یہ اندازہ لگا لیتی ہیں کہ میرے نگاہوں میں جو Culprit ہے، بس وہی مجرم ہے، غلط اور شک پر مبنی اندازوں سے اصل بات یا آہوئے تاتاری گرفت میں نہیں آتا ہے۔ آپا صالح کا ذکر کرتے ہوئے مجھے اپنے ایک دوست سعید اللہ صاحب یاد آگئے، وہ سائیکالوجی کے پروفیسر تھے اور وہ لندن پی ایچ ڈی کرنے گئے تھے۔ جب وہ پی ایچ ڈی کر رہے تھے اور وہاں انہیں تین چار سال ہو گئے تھے (اس زمانے میں پی ایچ ڈی ذرا مشکل کام تھا) تو ان کی بیوی کے ساتھ ایک عجیب و غریب حادثہ گزرا۔ وہ جب تہہ خانے میں نہانے کے لئے جاتی اور پانی گرم کرنے والا الیکٹرک راڈ پانی میں ڈال کر کپڑے اتار کر نہانے لگتی تو عین اسی وقت ان کے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھتی تھی اور وہ دوبارہ سے کپڑے پہن کر سیڑھیاں چڑھ کے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر جب ہیلو کہتی تو انہیں کوئی جواب نہیں ملتا تھا اور ان کے ساتھ یہ واقعہ تقریباً ہر روز پیش آتا۔ اس پر پروفیسر سعید اللہ صاحب نے وہاں کی پولیس کو اطلاع کر دی اور پولیس نے تفتیش اور تحقیق شروع کر دی۔ جب ہماری آپا (پروفیسر دوست کی اہلیہ) نہانے کے لئے نیچے گئیں اور انہوں نے کپڑے اتارے تو گھنٹی بجی۔ پولیس والوں نے فون اٹھایا لیکن کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ پولیس اس حوالے سے تحقیق جاری رکھنے کا کہہ کر چلی گئی۔ اب پروفیسر کو اندازہ ہوا کہ ہمارے

سامنے جو مکار اور موٹا سا آدمی جس کی ٹانگ کٹی ہوئی تھی، رہتا ہے یہی فون کرتا ہو گا اور وہ تھا بھی کچھ بد تمیز قسم کا۔ چنانچہ پولیس نے بھی اس کے نمبر پر پہرہ بٹھا دیا۔ حالانکہ وہ شخص فون نہیں کرتا تھا۔ پولیس نے ایکسچینج سے بھی پتہ کیا لیکن وہاں سے پروفیسر صاحب کے نمبر پر کوئی فون کال آنے کی بابت تصدیق نہ ہوئی۔ لندن کا یہ واقعہ اتنا مشہور ہوا اور یہ ذرائع ابلاغ کی زینت بن گیا۔ ہر چھوٹے بڑے صبح، دوپہر کے اخبارات میں اس بات کا ذکر ضرور آتا تھا۔ ابھی تک وہ ملزم گرفتار نہیں ہوا اور اس چور کا پتہ نہیں چل سکا۔ چنانچہ سب تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ پروفیسر سعید اللہ صاحب کی بیوی نے کہا کہ اب اسے اس ملک میں نہیں رہنا اور انہیں یہاں سے چلے جانا چاہئے کیونکہ یہاں کے لوگ بد تمیز اور بد معاش ہیں اور ان کا اندازِ زیست شریفوں والا نہیں ہے۔ پروفیسر صاحب بے کہا کہ میرا تھوڑا سا کام باقی رہ گیا ہے، وہ ختم کر لیں تو چلتے ہیں۔ ان کی بیوی نے کہا کہ دفع کرو، کیا پی ایچ ڈی کے بغیر زندگی بسر نہیں ہوتی؟ جب پروفیسر صاحب پر اہلیہ کا شدید دباؤ پڑا تو انہیں پی ایچ ڈی بالکل غرق ہوتی نظر آئی تو انہوں نے کہا کہ میں اس کی تحقیق کرتا ہوں۔ پروفیسر صاحب بتایا کرتے ہیں کہ وہ کسی زمانے میں ریڈیو کے ٹرانسسٹر بنایا کرتے تھے۔ ان ٹرانسسٹرز کو کرسٹل سیٹ کہا جاتا تھا جس میں ایک لمبے سے ایریل کو نیچے گملے وغیرہ میں ارتھ دے کر

گھمایا جاتا تھا اور کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی اسٹیشن پکڑا ہی جاتا تھا۔ یہ سن سینتیس اڑ تیس کی بات ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنا الیکٹرونکس کا علم جتنا بھی ہے، اسے استعمال کروں گا۔ چنانچہ انہوں نے اس فون کے بجنے کی آواز پر اپنے کان رکھے اور جونہی نیچے ان کی بیوی نہانے کے لئے گئیں، انہوں نے آواز دے کر کہا، بیگم راڈ لگایا، جب آواز آئی ہاں تو پروفیسر صاحب نے کہا، دیکھو ابھی گھنٹی بجی! اور عین اسی وقت گھنٹی بج اٹھی۔ اس پر پروفیسر صاحب نے تحقیق شروع کر دی اور 6 دن کے اندر اندر انہوں نے چور پکڑ لیا، جو ساری لندن پولیس اور کانسٹیبلری سے پکڑا نہ جاسکا تھا۔ وہ چور پروفیسر صاحب نے پکڑ لیا۔ چور یہ تھا کہ جب وہ بجلی کا راڈ آن ہوتا تھا اور پانی ابالنے کے لئے اس میں ڈالا جاتا تھا تو اس بجلی کی تار کے قریب سے فون کی تار نیچے زمین سے گزرتی تھی۔ جونہی وہ بجلی کی تار Energise ہوتی، وہ فون کی تار کو بھی Heat Up کر دیتی تھی اور اس وجہ سے فون کی تار کرنٹ محسوس کر کے گھنٹی بجانا شروع کر دیتی تھی اور اس میں کوئی آدمی ملوث نہیں تھا۔ پروفیسر صاحب کہتے ہیں کہ جس کرب کی حالت میں انہوں نے وہ پورا سال گزارا تھا، وہ یا میں جانتا ہوں یا میری بیوی جانتی ہے۔ اس طرح کے واقعات حیات انسانی میں گزرتے رہتے ہیں اور اب بھی گزر رہے ہیں تو اس عذاب سے نکلنے کے لئے روحانی طور پر اللہ سے مدد مانگی جاسکتی ہے کیونکہ

اس نے شک سے منع فرمایا ہے۔ ہم خدا سے مدد مانگ کر اس قسم کے کرب ناک مرض سے باہر نکل سکتے ہیں۔ اگر کبھی آپ کو ایسی مشکل در پیش ہو کہ ہم شک و شبہ یا ظن میں مبتلا ہو جائیں تو پھر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام کر اور اپنا آپ سارے کا سارا ڈھیلا چھوڑ کر خود کو اس کے حوالے کر کے اس کا حل تلاش کریں تو اس کا حل تلاش کرنا ممکن ہے۔ میں آپ کو آخر میں یہ تسلی دے دوں کہ اس بچے کو جس کو میری بیوی نے شک میں باندھ دیا تھا، اس سے ہم دونوں میاں بیوی نے معافی مانگ لی ہے اور میرا بیٹا اس کو اپنے ساتھ لے جا کر کچھ مٹھائی شٹھائی بھی کھلا چکا ہے۔ ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں لیکن ان کو بڑی بصیرت، خوش دلی، سبھاؤ اور برداشت کے ساتھ نمٹانا چاہئے۔ اگر جلد بازی اور خوش دلی سے کام نہ لیا گیا تو وہی صورتحال ہو گی جو میری آری چور کے بارے میں ہو گئی تھی یا دیگر واقعات کی مانند۔ اب اجازت چاہوں گا۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ فی امان اللہ۔

رشوت

آج سے کوئی دس بارہ برس بیشتر کچھ Sociologist جن میں دو تین امریکی اور چار پانچ Scandinavian تھے، وہ یہاں تشریف لائے۔ وہ اس بارے میں تحقیق کر رہے تھے کہ پاکستان اور دوسرے ملکوں میں رشوت کی رسم کیوں عام ہے اور سرکاری وغیرہ سرکاری افسر جب بھی موقع ملے رشوت کیوں لیتے ہیں؟ اور اپنے ہی ہم وطنوں کو اس طرح سے کیوں پریشان کرتے ہیں؟ تقریباً ایک برس یا اس سے کچھ زائد عرصہ میں بھی ان کے ساتھ تفریح کے طور پر رہا کہ دیکھتے ہیں ان کی تحقیق کا آخر کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ آخر کار یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی کہ اس کوئی شخص اس وقت تک رشوت نہیں لے سکتا جب تک کہ وہ اپنے آپ کو خوار، ذلیل، پریشان اور زبوں حال نہ سمجھے۔ پہلے اپنے دل اور اپنی روح کے نہاں خانے میں انسان اپنے آپ کو ذلیل، کمینہ، چھوٹا اور گھٹیا سمجھتا ہے۔ اس کے بعد وہ رشوت کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ اگر کوئی شخص عزت و وقار اور اطمینان اور Dignity کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے تو وہ کسی حال میں رشوت

کی طرف رجوع نہیں کرتا۔ ہمارے دین میں بھی اس بات پر بڑا زور دیا گیا ہے کہ آپ وقار، عظمت اور تمکنت کا دامن کسی صورت میں بھی ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور اپنے آپ کو ایک اعلیٰ اور ارفع مخلوق جانیں کیونکہ آپ کو اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کر دیا گیا ہے۔ اس لئے آپ ہر وقت اشرف المخلوقات کے فریم ورک کے اندر اپنی زندگی بسر کریں یا بسر کرنے کی کوشش کریں۔ اکثر ہم سوچتے ہیں اور کتابوں میں بھی پڑھتے ہیں کہ کتے کو ہمارے ہاں نجس جانور سمجھا جاتا ہے اور اسے پالنے کی ترغیب نہیں دی گئی۔ ماسوائے اس کے کہ یہ ریوڑ کی رکھوالی کرے اور محض اس کام کے لئے اس کو رکھنے کی اجازت ہے۔ گھروں میں اسے پالنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس کے بارے میں بہت سے منطقی دلائل بھی دیے جاتے ہیں اور اس میں دینی دلائل بھی شامل ہو جاتے ہیں اور اس صورتحال میں ہمارے نئی نسل کے بچے بہت ناراض ہوتے ہیں (مجھے میرے پوتے پوتیاں کہتے ہیں کہ دادا آپ اس کی کیوں اجازت نہیں دیتے کہ کتے کو گھر میں رکھا جائے) ہم طوعاً و کرہاً بچوں کی بات مانتے ہوئی اجازت تو دے دیتے ہیں لیکن اس پر غور ضرور کیا جاتا رہا ہے اور اب بھی کیا جاتا ہے کہ ایسا حکم آخر کیوں ہے؟ اگر یہ ناپاک ہے یا گند ڈالتا ہے تو بہت سے جانور ایسے ہیں جو ناپاک ہوتے ہیں اور گند ڈالتے ہیں لیکن بطور خاص اس کے اوپر کیوں قدغن ہے؟ پتہ یہ چلا

کہ کتا چونکہ تمام جانوروں میں سے اور خاص طور پر پالتو جانوروں میں سے Psychophysicist (خوشامد پسند) جانور ہے اور ہر وقت مالک کے سامنے جا وبے جا دم ہلاتا رہتا ہے۔ اس لئے ہمارے دین نے یہ نہیں چاہا کہ ایک ایسا ذی روح آپ کے قریب رہے جو ہر وقت آپ کی خوشامد میں مبتلا رہے اور یہ خیال کیا گیا کہ یہ انسانی زندگی پر ایک منفی طور پر اثر انداز ہو گا اور یہ خوشامد پسند ہر وقت دم ہلا ہلا کے اور پاؤں میں لوٹ لوٹ کے اور طور و بے طور آپ کی خدمت میں حاضر رہے۔ اس لئے حکم ہوا کہ ایسا جانور مت رکھیں، یہ خصوصیات آپ میں بھی پیدا ہو جائیں گی اور جب آپ کے اندر Sycophancy اور خوشامد پسندی اور بلاوجہ لوگوں کو خوش کرنے کا جذبہ پیدا ہونے لگے گا تو آپ کی شخصیت، انفرادیت اور وجاہت پر اس کا منفی اور برا اثر پڑے گا۔ اس لئے اس جانور کہ نہ رکھیں۔ آپ بلی کو رکھ کر دیکھیں، کبھی آپ کی خوشامد نہیں کرتی بلکہ جب موڈ بنے، پنجہ مارتی ہے، گھوڑا کتنا پیارا جانور ہے اور انسان کا پرانا دوست ہے۔ انسان پر اپنی جان فدا کرتا ہے لیکن جب آپ اس کو بری نظر سے دیکھیں گے یا زیادتی کریں گے تو "الف" ہو جائے گا اور دونوں ٹانگیں اوپر اٹھا کر سیدھا کھڑا ہو جائے گا اور کبھی خوشامد نہیں کرے گا اور آپ کے ساتھ برابری کی سطح پر چلے گا اور سارے جانور ہیں، عقاب ہے، باز ہے۔ آپ نے اکثر باز کو

دیکھا ہو گا۔ جیسے ہمارے ہاں عرب شہزادے آتے ہیں اور انہوں نے اس کو ہاتھوں پر بٹھایا ہوتا ہے اور اس کی آنکھوں کو بند کر کے رکھا جاتا ہے۔ اس لئے اس کے سر پر ٹوپی دی ہوتی ہے۔ اگر اس کی آنکھوں کو بند کر کے نہ رکھا جائے تو وہ مالک جس نے اس کو اپنی کلائی کے اوپر بٹھایا ہوتا ہے، اس پر بھی جھپٹ سکتا ہے کہ مجھے پاؤں میں دھاگے اور زنجیریں ڈال کر کیوں قیدی بنایا ہے۔ ایسی چیزوں کو رکھنے کی اجازت ہے لیکن جو آپ کی عظمت اور وقار میں کمی کا باعث بنیں اور آپ کو خوشامد سکھائیں تو ایسے جانوروں کو رکھنے کی اجازت نہیں ہے اور ہمیں اس بات کا حکم ہے کہ ہم اپنی وجاہت کو ہر حال میں قائم رکھیں اور اس کے ساتھ ساتھ فرعونیت، تکبر اور گھمنڈ سے پرہیز کرتے رہیں اور اپنے اور تکبر کے درمیان ایک لائن ہر وقت کھینچ کر رکھیں۔ انسان کی اپنی بھی بڑی مجبور زندگی ہے کہ جگہ جگہ پر اسے لائنیں کھینچنی پڑتی ہیں حتیٰ کہ اسے اپنی Biological Needs یعنی اپنی جبلی خواہشات کے آگے بھی لائنیں کھینچنے کا حکم ہے۔ یہ میری جبلی خواہش ہے کہ میں کھانا کھاؤں، اچھا کھانا کھاؤں۔ بہتر، مزید اور لذیذ کھانا کھاؤں لیکن مجھے حکم ہے کہ بس آج لائن کھینچ دوں۔ آج آپ صبح سے شام تک کچھ نہیں کھا سکتے۔ نہایت لذیذ کھانے آپ کے سامنے آتے رہیں گے، اشتہا انگیز چیزیں آپ کو اکساتی رہیں گی لیکن کھا نہیں سکتے۔ حکم

یہ ہے کہ آپ کے لئے آپ کو روک دیا گیا ہے کیونکہ آپ انسان ہیں اور آپ بلند تر چیز ہیں۔ انسان کو اس لئے اشرف المخلوقات کہا گیا ہے کہ جب وہ پورے کا پورا آزاد ہو جاتا ہے اور جب وہ کرنے اور نہ کرنے کی یکساں صلاحیت رکھتا ہو اور یہاں وہ انسان آزاد ہو جاتا ہے لیکن وہ اس لمحے وہ کرتا ہے جس میں وہ اپنی ذات کو لگام ڈال کے بے جا اور ناجائز خواہشیں اور عمل سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس سے وہ اشرف المخلوقات بنتا ہے۔ آزادی یہ نہیں کہ کسی کے خلاف مضمون لکھ دیا، تقریر کر دی بلکہ اپنی ذات کو لگام ڈال کے اور باگیں کھینچ کر رکھنے کا نام آزادیٔ انسان کا نام دیا جاتا ہے۔ بھینس برسیم کے کھیت میں چلی جا رہی ہے تو وہ اِدھر اُدھر منہ مارے گی، کُتّا نجس بھی کھاتا جائے گا اور پاک چیزیں بھی لیکن انسان وہ ہے کہ جو کھا بھی سکتا ہے اور پھر بھی نہیں کھاتا اور خود کو پابند بھی رکھتا ہے اس اور پابندی کے دوران سو مہمان بھی اس کے پاس آئیں تو وہ ان کی خدمت کرتا ہے، کھلاتا پلاتا ہے، مہمان نوازی کرتا ہے لیکن خود نہیں کھائے گا۔ انسان کی جبلی خواہشات پر پابندی لگانے کا مقصد انسانوں کو بھوکا رکھنا نہیں بلکہ انسان کی عظمت اور وقار کو برقرار رکھنا مقصود ہے تاکہ وہ بوقتِ ضرورت خود پر کنٹرول رکھے۔ ہمارے یہاں لاہور ماڈل ٹاؤن میں ایک بریگیڈیئر صاحب ہیں، انہیں کتے رکھنے کا بہت شوق ہے۔ ان کا ایک اچھا السیشن کتا تھا۔ وہ شاید

برگیڈیئر صاحب کی نظر سے گر گیا تھا اور وہ کھلا بھی چھوڑ دیا کرتے تھے اور وہ کتا اپنی مرضی سے ادھر ادھر گھومتا تھا۔ وہ کتا دورانِ آوارگی قصاب کی دوکانوں پر چھیچھڑے اور کچا گوشت کھاتا، سنتے ہیں کہ کچا گوشت کتے کے لئے بہت مہلک ہوتا ہے۔ جب وہ دوکانوں سے گھوم پھر کر اور کچا گوشت کھا کے آجاتا اور اس کے "لچھن" بھی کچھ اچھے نہیں تھے۔ اس وجہ سے برگیڈیئر صاحب نے اس کے گلے میں دھاگہ ڈال کر ایک کارڈ ڈال دیا جس پر لکھا تھا "مہربانی فرما کر اس کتے کو گوشت نہ ڈالا جائے اور اگر یہ قصاب کی دوکان پر آئے تو قصاب حضرات اس کو دھتکار کر پرے بھیج دیں۔" اب بے چارے تمام قصاب ڈر گئے اور وہ برگیڈیئر صاحب کے کتے کو کچھ نہیں دیتے تھے اور ایک دوسرے کو بھی انتباہ کرتے کہ خبردار اسے کچھ نہ دینا ورنہ مارے جاؤ گے۔ اسے یونہی بھوکا پیاسا ہی رہنے دو اور وہ بیچارہ ویسے ہی لوٹ جاتا۔ کتا جیسا کہ میں کہہ رہا تھا کہ ایک خوشامد پسند جانور ہے، اس نے بھی سوچا کہ اس طرح تو میری جان آفت میں پھنس گئی ہے، میں کیا کروں۔ السیشن کتے بڑے ذہین ہوتے ہیں، چنانچہ اسے پتہ چلا کہ یہ سب خرابی میرے گلے میں لٹکتے ہوئے کارڈ کی ہے تو اس نے پنجوں کے زور سے اور دانتوں سے وہ گتا یا کارڈ کاٹ کر گلے سے اتار پھینکا۔ جب اگلے دن وہ باہر گیا تو ظاہر ہے کہ اب اس کے گلے میں کوئی ایسا ویسا نوٹس نہیں تھا اور وہ مزے سے

کھاپی کے واپس آگیا تو ایسی زندگی بسر کرنے سے بہتر ہے کہ انسان ایک غار میں چلا جائے اور بے غیرتی اور کم مائیگی کی زندگی بسر نہ کرے اور ایسی زندگی نہ کرے جس طرح کی عام طور پر حشرات الارض کرتے ہیں۔

ایک بار ایک عالمی سطح کے ہئیت دانوں کی کانفرنس ہو رہی تھی۔ اس میں آئن سٹائن بھی شریک تھے۔ ایک ہئیت دان نے دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد آئن سٹائن سے کہا کہ جناب دیکھئے! اگر ہم کائناتوں کو ذہن میں رکھیں اور جتنے بھی عالم اللہ تعالیٰ نے بنائے ہیں، ان کو بھی اپنی نظر سے جانچنے کی کوشش کریں تو انسان کا مقام Mathematically ایک ذرّے سے بھی بے حد کم تر رہ جاتا ہے یعنی وہ کچھ بھی نہیں ہے اور انسان تو اتنی بڑی کائنات کے اندر ایک بے معانی سی چیز ہے۔ یہ سن کر آئن سٹائن نے کہا، ہاں واقعی آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں اور حیرانی کی بات یہ ہے کہ وہ ایک بے معانی، بے مایہ اور کم تر، کم حقیقت انسان جس کی حیثیت ایک ذرّے سے بھی کم ہے، وہ ہی دوربین لگا کر ان کائناتوں کا مطالعہ کر رہا ہے اور وہی ان کائناتوں کے بھید کھول رہا ہے اور لوگوں کو ان کائناتوں کی تفصیل سے آگاہ کر رہا ہے اور لوگوں کو کائنات کی جزئیات کی بابت بتاتے ہیں۔

اپنے آپ کو اتنا بھی حقیر نہیں سمجھا جانا چاہئے کہ وہ رشوت کی لپیٹ میں آ جائے۔ کوئی بھی آدمی جو بظاہر آپ کو ہنستا ہوا دکھائی دے اور بظاہر یہ کہے کہ جی

ساری دنیا ہی رشوت لیتی ہے۔ بظاہر وہ آپ سے کہے کہ جی Values
Change ہو گئی ہیں اور قدریں وہ نہیں رہیں۔ ان سے وہ اپنے آپ کو ضرور
گھٹیا، کمینہ اور ذلیل انسان ہی سمجھتا رہتا ہے اور اس کے اندر Guilt کا جذبہ ہر
وقت اپنا کام دکھاتا چلا جاتا ہے۔ اللہ میاں نے ہم کو عجیب و غریب طرح سے
باندھا ہوا ہے۔ آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ اس بھری دنیا میں جتنی بھی قومیں،
جتنی بھی نسلیں اور گروہِ انسانی آباد ہیں، ان سب کا دن طلوع آفتاب سے
شروع ہوتا ہے، سورج نمودار ہوا اور دن چڑھ گیا اور کہا گیا کہ آج یکم دسمبر یا
جنوری کی پہلی تاریخ ہے، صرف ایک امہ ایسی ہے پوری کائنات میں جس کا دن
شام کے وقت سے شروع ہوتا ہے۔ جب شام پڑتی ہے تو اس کا نیا دن معرضِ
وجود میں آتا ہے اور وہ امہ اسلام کی امہ ہے، آپ نے رمضان المبارک میں
دیکھا ہو گا شام کو نقارہ بجتا ہے، توپ چلتی ہے، اعلان ہوا یا سائرن بجتا ہے اور
مغرب کے بعد اعلان ہوتا ہے کہ اب ہم رمضان کے مہینے میں داخل ہو گئے
ہیں، ہم رمضان میں صبح کے وقت نہیں داخل ہوتے بلکہ رات کے وقت ہوتے
ہیں۔ یہ عجیب دین ہے کہ شام سے یا رات سے منسوب کر کے اس کے دن اور
مہینہ سے آغاز کیا جاتا ہے، دنیا کے کسی اور مذہب میں ایسا نہیں ہے اور کسی
امت پر ایسا بوجھ نہیں۔ اس کی وجہ جو میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ اس امت کو بارِ

گراں عطا کیا گیا ہے کہ باوصف اس کے کہ تمہارا نیا دِن چڑھ گیا ہے، تم نئے ماہ میں داخل ہو گئے ہو اور اس کے بعد پوری تاریک رات کا سامنا ہے لیکن تم ایک عظیم Dignified امہ ہو۔ تم ایک پُر وقار امت سے تعلق رکھتے ہو۔ تم اس سے تاریکی سے گھبرانا ہرگز ہرگز نہیں بلکہ اس تاریکی میں سے گزر کر اپنے وجود پر اعتماد کر کے تمہیں اس صبح تک پہنچنا ہے جس سے ساری جگہ روشنی پھیلے گی، گویا اس تاریکی کے اندر ہی آپ کو اپنی ذات، وجود اور شخصیت سے روشنی کرنی ہے۔ ہم، تم، آپ سب کے سب اپنا مہینہ، اپنا دن مغرب کے بعد رات سے شروع کرتے ہیں اور بحیثیت مسلمان یقین ہوتا ہے، یہ تاریکی ہمیں کسی قسم کی گزند یا تکلیف نہیں پہنچا سکتی۔ ہم ہیں اور یہ تاریکی ہے اور ہمارے وجود سے ہی اس تاریکی میں روشنی ہے۔ ہم روشن دن کی آرزو میں یا روشن صبح کو پکڑنے کے لئے ہرگز ہرگز اتنے بے چین نہیں ہیں جس قدر دنیا کی دوسری قومیں ہیں مُضطرب ہیں، ہم اپنی سانسوں سے تاریک راتوں میں اجالا کرتے ہیں اور اپنی سانسوں سے شمعیں روشن کرتے ہیں۔ یہ وقار اور عظمت جو ہے یہ ہمارا طرۂ امتیاز ہے لیکن کہیں کہیں ہم کمزور ہو جاتے ہیں اور وقار سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ پھر ہمارے اندر Guilt کا احساس ضرور پیدا ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اپنے آپ پر کچھ ایسی خود تنقیدی سے کہیں کہ نہیں اب زمانہ بدل گیا ہے، اب

ساری دنیا ایسی ہو گئی ہے تو ہم بھی ویسے ہو جائیں۔ یہ بڑے شوق سے کہہ لیں یا بڑے شوق سے لکھ لیں، بڑے شوق سے اپنے Guilt کو Argument کر لیں، جان نہیں چھوٹنی کیونکہ جو حکم آپ کے اوپر جاری کر دیا گیا ہے، اور جس فریم ورک میں آپ کو رکھ دیا گیا ہے ہونا وہی ہے۔ مجھے حضرت نظام الدّین اولیا رح کے خلیفہ خواجہ نصیر الدّین چراغ دہلوی کی وہ بات یاد آتی ہے جب ایک بار قحط پڑ گیا اور دِلّی میں بہت "سوکھا" ہو گیا تو لوگوں نے کہا کہ یا حضرت (وہ چبوترے پر تشریف فرما تھے) آپ تو چراغِ دِلّی ہیں، آپ جا کے نمازِ استسقا پڑھایئے اور بارانِ رحمت کے لئے دعا کیجئے تو وہ کہنے لگے کہ میں کچھ متردد ہوا، پریشان ہوا کہ میں کیسے دعا کروں۔ یہ تو خدا کی مرضی ہے کہ وہ بارانِ رحمت کرے یا نہ کرے۔ خیر وہ طے شدہ مقام پر نمازِ استسقا پڑھانے چلے گئے۔ وہاں جا کر نماز پڑھائی اور دعا کی اور دعا کے بعد دیکھا کہ آسمان پر کچھ بھی نہیں، نہ کوئی ابر کے آثار ہیں نہ بارش کے۔ وہ لوٹ آئے اور کچھ شرمندہ تھے۔ وہاں ایک بزرگ یوسف سرہندی تھے۔ انہوں نے کہا کہ صاحب پہلے بھی ایک ایسا واقعہ پیش آ چکا ہے۔ ہم نے بھی ایک بار بارش کے لئے دعا کی تھی لیکن وہ بدترین قحط اور Drought کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو سکا تھا اور اب کی بار بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ کہنے لگے کہ ہمارے زمانے میں ایک صاحب میرے پاس آئے اور انہوں

نے کہا کہ اگر تم بارانِ رحمت کے لئے دعا کروانا چاہتے ہو تو کسی با وقار آدمی سے کرواؤ اور اللہ با وقار اور غیرت مند آدمی پر بڑا Editorialised اعتماد کرتا ہے اور اس کی بات سنتا ہے۔ تو میں نے کہا، ٹھیک ہے۔ ہمیں اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے تو بتاؤ کہ کس سے دعا کروائیں تو اس شخص نے بتایا کہ سیری دروازے کے پاس ایک بزرگ رہتے ہیں، وہاں چلتے ہیں۔ یوسف سرہندی نے مزید کہا کہ وہ شخص مجھے ان کے پاس لے گیا اور میں دیکھ کر بہت حیران اور شرمندہ بھی ہوا کہ بزرگ جو تھے وہ خواجہ سرا تھے یعنی ہیجڑے (مخنث تھے اور ان کا نام خواجہ راحت تھا)۔ اب وہ شخص کو مجھے وہاں لے کر گیا تھا، اس نے خواجہ رحمت مخنث سے کہا کہ یہ (یوسف سرہندی) آپ کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ مینہ یا باراں یا Rain Fall کے لئے دعا فرمائیں تو انہوں نے کہا، کیوں کیا ہو گا؟ اس شخص نے کہا یا حضرت (اس ہیجڑے سے کہا، مجھے انہیں ہیجڑا کہتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے اور یہ لفظ استعمال کرتے ہوئے ایسی بزرگ شخصیت کے لئے لیکن چونکہ وہ مخنث تھے اور اپنے آپ کو خود بھی کہتے تھے، دیکھئے با وقار لوگ بھی کیا ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق کسی ذات، عورت، مرد یا مخنث سے تعلق نہیں ہوتا۔ یہ وقار ایک الگ سی چیز ہے جو انسان کے اندر روح سے داخل ہوتا ہے) دلی سوکھا ہے، بارش نہیں ہو رہی۔ ان حضرت نے اپنی

خادمہ سے کہا کہ پانی گرم کرو، وضو کیا اور دعا مانگی اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ پھر کہنے لگے کہ اے یوسف سرہندی آپ جائیں اور اپنے معروف طریقے سے بارش کے لئے نماز ادا کرو اور خدا سے دعا مانگیں کہ وہ اپنی مخلوق کو بارش عنایت فرمائے لیکن اگر پھر بھی بارش نہ ہو تو (انہوں نے اپنی قبا سے ایک دھاگہ یا بڑھا ہوا اڈورا کھینچا) اس ڈورے کو اپنے دائیں ہاتھ پر رکھ کر اللہ سے درخواست کرنا کہ یہ خواجہ رحمت مخنث جس نے تیری رضا کا چولا پہن لیا ہے اور اب لوگوں سے نہیں ملتا اور ایک مقام پر ایک وقار کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے اور اس طرح مخلوق میں بھی شامل نہیں ہوتا کہ وہ دعائیں منگواتا پھرے۔ اس نے بارش کے لئے عرض کیا ہے۔ یوسف صاحب کہنے لگے کہ ہم نے ایسا ہی کیا۔ وہاں بہت سے لوگ اکٹھے تھے۔ پورا دِلّی امڈ کے آیا ہوا تھا۔ وہاں نماز استسقا پڑھی لیکن بد قسمتی سے کچھ بھی نہ ہوا۔ پھر میں نے اپنی دستار سے خواجہ رحمت مخنث کی قبا کا وہ ڈورا نکالا اور اسے دائیں ہاتھ پر رکھ کر خدا سے دعا کی تو وہاں کھڑے کھڑے بادل گھِر کر آیا اور موسلا دھار بارش ہونے لگی اور اس قدر زور کی بارش شروع ہو گئی کہ لوگ تیزی سے بھاگنے کے باوجود اپنے گھروں تک نہ پہنچ سکے۔

خواتین و حضرات اب یہ فیصلہ ہمارا ہے کہ ہم کس وقار کے ساتھ اور اس امہ سے تعلق رکھتے ہوئی کیسی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ خدا ہم کو عزت و وقار سے

زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین۔

بشیرا

میں ایک طویل مدت اور لمبے عرصے کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں اور آپ یہ ملاحظہ فرمارہے ہوں گے کہ اب "زاویہ" کا رنگ کچھ مختلف ہے اور اس کی ہئیت میں پہلے کے مقابلے میں تبدیلی آگئی ہے۔ اس طویل مدّت اور اس قدر لمبی مدت کی غیر حاضری کی کیا وجہ ہے؟ اس کا میں ہی سراسر ذمہ دار ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوتاہی میری طرف سے ہوئی ہے۔ مجھے خیال آیا اور ایک مقام پر میں نے سوچا کہ شاید میں زاویے کے پروگرام سے بہتر طور پر آپ کی خدمت کر سکتا ہوں اور کسی ایسے مقام پر پہنچ کر آپ کی دستگیری کروں جہاں پر مجھے پہنچ جانا چاہئے تھا لیکن یہ خیال باطل تھا اور یہ بات میرے نزدیک درست نہیں تھی لیکن اس کا احساس مجھے بہت دیر میں ہوا کہ جو شخص جس کام کے لئے پیدا ہوتا ہے، بس وہی کر سکتا ہے۔ اس سے بڑھ کر کرنے کی کوشش کرے تو وہ معدوم ہو جاتا ہے۔ میں آئندہ کے پروگراموں میں شاید اس بات کا ذکر کروں کہ میں آپ کے بغیر اور آپ کی معیت کے بغیر اور آپ

سے دور کس طرح سے معدوم ہوتا ہوں۔ ہمارے فیصل آباد گورنمنٹ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس ایک جیبی گھڑی تھی۔ اس اعلیٰ درجے کی گھڑی کے ساتھ ایک سنہری زنجیر بندھی ہوئی تھی۔ یہ وہ گھڑی تھی جس کا ڈائل بڑا سفید اور اس کے ہندسے بڑے بڑے اور سیاہ رنگ کے تھے۔ اس گھڑی کے زور پر اور اس کی وجہ سے سارے سکول کا کام چلتا تھا اور اسی گھڑی کے حوالے سے ارد گرد کے لوگ اپنی گھڑیاں ٹھیک کیا کرتے تھے لیکن خدا جانے کیا ہوا کہ ہر روز گھنٹہ گھر کے قریب سے گزرتے ہوئے ہیڈ ماسٹر صاحب زنجیر کھینچ کر اپنی گھڑی کا وقت فیصل آباد کے گھنٹہ گھر سے ملاتے تھے اور دونوں میں مطابقت پیدا کرتے تھے۔ پھر ایک روز یہ ہوا کہ گھڑی کے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ میں بھی گھنٹہ گھر کے مقام پر پہنچوں اور لوگوں کی خدمت کروں۔ ان کو وقت بتاؤں اور ان کے لئے وہی کچھ اور اتنی ہی خوبیاں لا کر ان کی جھولی میں ڈالوں جو فیصل آباد کا گھنٹہ گھر ان کو عطا کرتا ہے۔ سنتے ہیں کہ کسی طلسمی یا کسی روحانی زور سے وہ گھڑی کہ ان کی جیب سے اچھلی اور گھنٹہ گھر کے ماتھے پر جا کر چپک گئی اور جونہی وہ اس مقام پر پہنچی وہ اپنی ہستی بالکل کھو بیٹھی اور معدوم ہو گئی اور وہ لوگوں کو وقت بتا کر جو پہلے خدمت کیا کرتی تھی اس سے بھی دور نکل گئی اور اتنی اونچائی پر پہنچ گئی کہ اس اونچائی پر اسے پہنچنا نہیں چاہیئے تھا۔ اسی انداز میں

میرے ساتھ بھی کچھ ویسا ہی ہوا۔ میں سمجھا کہ میں آپ کی ایک اور طریقے سے اور ایک بلندی یا رفعت پر پہنچ کر خدمت کر سکوں گا لیکن وہ بات کچھ ٹھیک نہ نکلی اور میں لوٹ کر پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب یہ ہرگز ہرگز نہیں ہے کہ ہمارے اور آپ کے درمیان فراق و جدائی رہی۔ اس میں ہم ایک دوسرے کو فراموش کرتے اور چلے گئے ایسا نہیں ہے۔ ایک روز جب میں باباجی کے پاس ڈیرے پر گیا تو میں اس بات پر شرمندہ تھا کہ میں بڑی دیر کے بعد باباجی کو مل رہا تھا۔ تقریباً چھ ماہ میں ان سے نہیں مل سکا تھا۔ میرا کام کچھ اس نوعیت کا تھا کہ مجھے ملک میں ٹھہرنا نصیب نہ ہوا اور مجھے ایران اور ترکی میں کچھ کام کرنا ہوتے تھے۔ وہ آر۔ سی۔ ڈی کا زمانہ تھا۔ جب میں باباجی کے پاس گیا اور بیشتر اس کے کہ میں ان سے معذرت کا کوئی جملہ بولتا، انہوں نے خود سے کہنا شروع کر دیا کہ "یہیں ہوتے ہو، ہمارے درمیان ہی رہتے ہو۔ ہم سے ملتے جلتے ہو۔ باوصف اس کے کہ تم یہاں نہیں آئے لیکن نہ ہم نے تمہیں فراموش کیا، نہ ہم تمہاری یاد بھولے اور عاجز آئے۔" میں اپنی جگہ پر شرمندہ اور ششدر کھڑا تھا، کہنے لگے، جس طرح گاڑی میں سفر کرتے ہوئی، ہوائی جہاز میں بیٹھے ہوئے زندگی کے مراحل طے کرتے ہوئے، سڑکوں پر چلتے ہوئی، محفل مشاعرہ یا گانے سنتے ہوئے آپ کبھی بھی اپنے دل سے، اپنے

گردوں اور جگر کی کارکردگی سے واقف نہیں ہوتے لیکن وہ موجود ہوتے ہیں بالکل اسی طرح ہم بھی ایک دوسرے کی فراموشی میں زندہ تھے اور ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ یہ مت سمجھا کیجئے کہ کسی وجہ سے ہم ایک دوسرے سے دور رہے، یا ہم نے ایک دوسرے کو دور سمجھا ہے۔ مجھے اس سے ایک اور عجیب سی بات جس کا بظاہر تو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، یونہی میرے ذہن میں آئی کہ میری نواسی کا بچہ باہر کوٹھی کی لان میں کھیل رہا تھا۔ مجھے اس کا علم نہیں تھا کہ وہ باہر کھیل رہا ہے۔ میں اپنی نواسی سے باتیں کرتا رہا، اچانک دروازہ کھلا اور وہ بچہ مٹّی میں لتھڑا ہوئے ہاتھوں اور کپڑوں پر کیچڑ اور اس کے منہ پر "چھیچھیاں" (خراب منہ اور بہتی ناک) لگی ہوئی تھیں، وہ اندر آیا اور اس نے دونوں ہاتھ محبت سے اوپر اٹھا کر کہا، امّی مجھے ایک "جپھی" اور ڈالیں۔ پہلی "جپھی" ختم ہوگئی ہے تو میری نواسی نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا با وصف اس کے کہ وہ بچہ باہر کھیلتا رہا ہو گا اور اس کے اندر وہ گرماہٹ اور حدت موجود رہی ہوگی جو اسے ایک "جپھی" نے عطا کی ہوگی اور جب اس نے محسوس کیا کہ مجھے اپنی بیٹری کو ری چارج کرنے کی ضرورت ہے تو وہ جھٹ سے اندر آ گیا۔ میرے اور آپ کے درمیان بھی یہ بیٹری اپنا کام کرتی رہی، گو نہ مجھے اس کا احساس رہا اور نہ شاید آپ کو اس قدر شدت سے رہا لیکن ہم ایک دوسرے

کے ساتھ ساتھ اور ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو چلتے رہے۔ زندگی کے یہ معاملات بڑے عجب ہوتے ہیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں بہت دیر تک اور جیسے ہمارے بزرگ کہا کرتے ہیں "بشرطِ زندگی" ایک دوسرے کے ہم ساتھ رہیں گے اور اس پروگرام کی نوعیت ویسی ہی رہے گی جیسے پہلے پروگراموں میں رہی اور جن میں آپ کی شمولیت میرے لئے فخر کا باعث تھی اور آپ نے مجھے بڑی محبت عطا کی۔ یہ بات آپ بالکل اپنے ذہن میں رکھیے گا کہ باوصف اس کے کہ چیزیں نظر نہیں آتیں، دکھائی نہیں دیتیں لیکن موجود رہتی ہیں۔ فرانس کا ایک بہت بڑا رائٹر جسے میں دل و جان سے پسند کرتا ہوں، وہ تقریباً تیس پینتیس برس تک فرانس سے غیر حاضر رہا اور جب وہ اس طویل غیر حاضری کے بعد لوٹ کر اپنے وطن آیا اور سیدھا اپنے اس محبوب گاؤں پہنچا جہاں اس کا بچپن گزرا تھا۔ رائٹر کفسو کہتا ہے کہ جب وہ اپنے گاؤں پہنچا تو اس پر ایک عجیب طرح کی کیفیت طاری ہو گئی اور مجھے وہ سب چیزیں یاد آنے لگیں جو بچپن میں مَیں نے یہاں دیکھی تھیں، لیکن ان کا نقشہ اس قدر واضح نہیں تھا جیسا کہ ان کا نقشہ اس وقت واضح تھا۔ جب وہ چیزیں میرے قریب سے گزرتی تھیں اور میرے پاس تھیں، کفسو کہتا ہے کہ ایک عجیب واقعہ اسے یاد آیا کہ ایک ندی کی چھوٹی سی پلی پر سے جب وہ گزرا کرتا تھا تو اس کے داہنے ہاتھ

پتھروں کی ایک دیوار تھی جس پر غیر ارادی طور پر میں اپنی انگلیاں اور ہاتھ لگاتا ہوا چلتا جاتا تھا اور وہ آٹھ دس فٹ لمبی دیوار میرے ہاتھوں کے لمس اور میں اس کے لمس کو محسوس کرتا رہا۔ وہ کہنے لگا کہ میرا جی چاہا کہ میں اس پُلی پر سے پھر سے گزروں اور اپنے بچپن کی یاد کو ویسے ہی تازہ کروں لیکن جب میں نے دیوار پر ہاتھ رکھا تو میں نے اس لمس کو محسوس نہ کیا جو وہ پتھر کی دیوار مجھے میرے بچپن میں عطا کیا کرتی تھی۔ میں اس دیوار پر ہاتھ پھیرتا ہوا پورے کا پورا راستہ عبور کر گیا لیکن وہ محبت اور چاہت جو پتھر کی دیوار اور میرے زندہ جسم کے درمیان تھی، وہ مجھے میسر نہ آسکی۔ میں پھر پلٹا لوٹ کے پھر اسی طرح گزرا۔ پھر میں اتنا جھکا جتنا اس زمانے میں میرا قد ہوا کرتا تھا اور پھر میں نے اس پر ہاتھ رکھا اور میں اس قد کے ساتھ جب میں چھٹی ساتویں میں پڑھتا تھا، چلا تو میں نے محسوس کیا اور میرے ہاتھ نے محسوس کیا اور میرے ہاتھ نے میری روح اور جسم کو سگنل دیا جو سگنل میں آج تک اپنی تحویل میں کسی بھی چیز میں نہیں لا سکا۔ اس لمس کو اپنی روح پر طاری کرتے ہوئی یوں لگا جیسے میری ماں صحن خانہ میں کھڑی مجھے پکار رہی ہو اور اس کے ہاتھ میں وہ Cookies ہوں جو وہ مجھے سکول سے واپسی پر دیا کرتی تھی (وہ ہاتھ کے لمس کا ذکر کر رہا ہے کہ اسے ماں کے بدن سے اور اس کے جسم سے لہسن اور پیاز کی خوشبو آرہی ہے۔ ساتھ میری بہن کھڑی

ہے اور مجھے اپنی بہن کے سارے وجود کی خوشبو آ رہی ہے، جو وہ بچپن میں محسوس کیا کرتا تھا)۔

میرے دیوار کے لمس کے ساتھ مجھے وہ سارا اپنا بچپن یاد آگیا اور سارا منظر آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح چلنے لگا اور میں لوٹ کر اس زمانے میں چلا گیا جب میں چھوٹا سا تھا اور اس دیوار کے لمس کی یاد کے سہارے اور اس Imagination کے زور پر سارے کا سارا سین میرے وجود پر حقیقت کی طرح طاری ہو گیا اور میں وہاں سے گزر گیا۔ فرانسیسی رائٹر کی باتوں پر مجھے تھوڑی سی شرمندگی بھی ہوئی کیونکہ آپ نے دیکھا ہو گا کہ کچھ لوگ درگاہوں پہ آتے ہیں اور وہ اپنے بزرگ کی قبر کے ساتھ کھڑے ہو کر چوکھٹوں پر ہاتھ ملتے ہیں؛ قبر کے تابوت تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اور سنگِ مرمر کا جو چوکھٹا ہوتا ہے، اسے چھونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم ان لوگوں کی وہ حرکت سخت ناپسند کرتے ہیں لیکن جان کفسو کی یہ بات پڑھنے کے بعد اب میں کچھ کچھ ان لوگوں کا ساتھی ہو گیا ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ انہیں مرقد کے چوکھٹے پر یا کھڑکی کی چوکھٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کچھ اپناپن محسوس ہوتا ہو، کچھ روحانی رابطہ، کچھ روحانی نسبت، ان کے ساتھ قائم ہوتی ہو۔ میرا خیال ہے انہیں منع نہیں کرنا چاہیئے بلکہ ان کے بارے میں یہ بھی نہیں سوچنا چاہیئے کہ یہ کس قدر

تنگ نظر، دقیانوس اور پرانی وضع کے لوگ ہیں۔ انہیں چھونے دیجئے۔ ان کو ہاتھ لگانے دیں۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں اس طرح سے ہاتھ لگانے میں، چھونے میں کچھ محسوس ہوتا ہو۔ جس طرح میری نواسی کے بیٹے نے کہا تھا کہ مجھے ایک "جپھی" اور ڈالیں۔ میری امی کیونکہ میری پچھلی "جپھی" ختم ہو گئی ہے۔ اسی طرح سے بہت سے لوگ ان یادوں کے سہارے کچھ محسوس کرتے ہیں جو دماغ کے نہاں خانے سے نہیں آتی ہیں بلکہ جسم کے ساتھ ان کا زیادہ اور گہرا تعلق ہوتا ہے اور وہ لمس کے ساتھ اور ہاتھ کی لکیروں کے ساتھ اور انگلیوں کے نشانوں کے ساتھ وجود پر وارد ہوتی ہیں۔ میں اس لمبی بات کے ذریعے آپ کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ جب کبھی آپ ملے، نظر آئے یا نہ آئے یا میں کبھی آپ کے شہر میں سے گزرا یا شہر کے اوپر سے گزرا تو وہ ساری باتیں اور وہ ساری یادیں جو میرے اور آپ کے درمیان تھیں یا نہیں تھیں لیکن ہم ایک دوسرے کے ساتھ "زاویے" کی نسبت سے وابستہ تھے، وہ یادیں لوٹ لوٹ کر ذہن میں آتی رہیں اور میں آپ سے ملتا رہا جس طرح سے آپ اس پروگرام کے لئے مجھ سے ملتے رہے۔ ظاہری طور پر، باطنی طور پر یا معنوی طور پر، اس طرح میں بھی آپ کے ساتھ وابستہ رہا اور ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ کبھی نہ ٹوٹا اور میں اب پھر لوٹ کر آپ کی خدمت میں اسی طرح حاضر ہوتا رہوں گا۔ ہمارے

ماسٹر اللہ داد تھے۔ وہ پڑھاتے تو فیروز پور میں تھے لیکن وہ قصور کے رہنے والے تھے۔ وہ پڑھانے کے بعد ہر روز گاڑی پکڑ کر شام کو گھر چلے جاتے تھے۔ ان کا ایک بڑا الاڈلا بیٹا تھا اور بشیر اس کا نام تھا اور مجھے درمیان میں ہی ایک اور بات یاد آگئی۔ اگر کبھی آپ قصور گئے ہوں یا آپ کا وہاں جانے کا ارادہ ہو تو (میں نے یہ بات محسوس کی ہے، آپ بھی کر کے دیکھئے گا) آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ قصور میں ہر تیسرے بچے کا نام بشیر ہوتا ہے۔ اگر آپ راستہ بھول جائیں یا کچھ پوچھنا چاہیں اور قصور کے کسی بازار میں کھڑے ہو کر بشیر کہیں تو تین چار آدمی ضرور مڑ کر دیکھیں گے اور آپ ان سے رابطہ کر کے اپنا مسئلہ ان کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ ہمارے ماسٹر صاحب اپنے بیٹے سے بڑی محبت کرتے تھے۔ وہ بڑا غصے والا بھی تھا۔ ظاہر ہے کہ لاڈلا بچہ تھا۔ وہ معمولی سی بات پر بھی ناراض ہو جاتا ہو گا اور وہ گھر والوں سے وقتی طور پر قطع تعلق کر لیتا ہو گا۔ ماسٹر صاحب اس کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ایک روز وہ ان سے ایسا ناراض ہوا کہ گھر سے بھاگ گیا اور پھر ملا ہی نہیں۔ ماسٹر صاحب کئی ماہ اس کی تلاش کرتے رہے۔ وہ ٹیچر آدمی تھے اور اُستادوں کا سوچنے کا انداز بڑا مختلف ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے پرانی وضع سے خوش خط اشتہار لکھ کر بابا بلھے شاہ رح کے مزار کے باہر گیٹ پر چسپاں کر دیا جس پر مار کر سے لکھا ہوا تھا کہ "پیارے بیٹے بشیر گھر واپس آجاؤ۔

تمہاری جدائی میں مَیں یہ وقت آسانی اور سکون کے ساتھ نہیں گزار سکتا۔" وہ اشتہار چسپاں کر کے ماسٹر صاحب گھر آ گئے۔ اگلے دن ماسٹر صاحب اس خیال کے پیش نظر کہ جہاں میں نے اشتہار لگایا ہے وہاں میرا بیٹا ضرور آتا ہو گا، درگاہ گئے۔ جب وہ وہاں پہنچے تو ان کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ وہاں سات بشیرے بیٹھے ہوئے تھے لیکن ان کا بشیرا وہاں نہیں تھا۔ماسٹر صاحب پریشانی کے عالم میں اور اس خیال سے کہ شاید کسی روز ان کا بشیرا ابھی وہاں آ جائے، بار بار وہاں کا چکر لگاتے رہے اور ماسٹر صاحب نے ایک دن لڈو بانٹے تو ہمیں پتہ چلا کہ ان کا بشیرا واپس آ گیا ہے۔ میں بھی آپ سے یہی کہنے کے لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کا بشیرا واپس آ گیا ہے اور اب کبھی ناراض ہو کر، ناخوش ہو کر خوشی کی ترنگ میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ میرا اور آپ کا بڑا گہرا، بڑا پرانا بڑی محبتوں کا رشتہ ہے اور اپنی اس غلطی اور کوتاہی کی معافی مانگتا ہوں جو میرے اور آپ کے درمیان ایک وسیع خلیج بن کر چند دن حائل رہی، آئندہ انشاءاللہ ایسا نہیں ہو گا اور مجھے یقین ہے کہ آپ کو اپنے بشیرے کی اس بات پر یقین آ گیا ہو گا۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ

اسطحندوس کے عرق سے سٹین گن تک

آج سے ٹھیک چالیس برس پہلے کی بات ہے، گرمیوں کا موسم اور اگست کا مہینہ تھا اور گرمی یہ نہیں بلکہ بلا کی گرمی تھی اور ہم جس جگہ کام کرتے ہیں وہاں کا جو Cooling System تھا وہ اچانک چلتے چلتے جواب دے گیا اور خراب ہو گیا۔ اس وقت ہم ایک پروگرام کی Editing کر رہے تھے اور سسٹم میں خرابی کے باعث ہمارا وہاں بیٹھنا مشکل ہو گیا اور ہم نے سوچا کہ جسمانی تکلیف ان ذہنی تکالیف سے شدید تر نہیں جو انسانی زندگی میں منفیانہ سوچ اور منفیانہ پیش قدمی اور ایسے منفی رویوں سے پیدا ہوتی ہے جیسے آپ Negative Thoughts کہتے ہیں۔ اس میں سب سے بڑیNegative Thoughts خوف ہے، دوسری نفرت، تیسری کدورت، چوتھی تشدد اور پانچویں جو بھی کسی سے کم درجے یا طاقت کی نہیں وہ غصہ ہوتا ہے۔ انسان میلادِ آدم سے لے کر اب تک اس کوشش میں مصروف رہا ہے کہ وہ ان منفی خیالات اور منفی پیش قدمی سے نجات حاصل کرے۔ انسان نے اس سلسلے اور ضمن میں بڑے پاپڑ بیلے ہیں اور

بڑی ماریں کھائی ہیں لیکن یہ عوارض اس کے ساتھ ساتھ چلتے رہے ہیں اور اس نے انسانی زندگی کو بڑی بُری طرح سے کھدیڑ کے رکھ دیا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا پرانے زمانے میں لوگ کچھ دم درود، کچھ وظائف اور کچھ جھاڑ پھونک سے ڈیروں پر جا کے کچھ فقیروں، سادھوؤں اور سنتوں کی خدمت میں حاضر ہو کر ان Negative Thoughts کو ملیامیٹ کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو پاتے تھے۔ اس کے باوجود انسان کی کوششیں جاری رہیں اور شاید مستقبل میں بھی جاری رہیں گی۔ پھر مجھے یاد ہے کہ ڈیرے پر جہاں ہم اپنے باباجی کے پاس جایا کرتے تھے رات کے وقت جب باباجی اپنا درس دیا کرتے تھے (جو تقریباً اڑھائی بجے شروع ہوتا تھا) تو اس وقت وہ ہم سب کو گاؤزبان کا قہوہ پلایا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ گاؤزبان کے قہوے میں یہ تاثیر ہے کہ وہ انسان کے اندر سے منفی خیالات اور رویوں کو چوس لیتا ہے اور آدمی میں تقریباً ویسی ہی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے جیسا کہ وہ اپنی پیدائش کے وقت تھا۔ ہم باباجی سے قہوہ تو پیتے رہے لیکن اس کا ہم پر ایسا اثر نہیں ہوا جیسا کہ ہونا چاہیے تھا۔ آپ نے حکیموں سے یہ سنا ہو گا کہ اگر دماغ کو بہت گرمی ہو گئی ہے تو "تخم بلنگو" جسے آپ "تخم ملنگاں" کہتے ہیں اس کا استعمال کیا جائے۔ اس دور میں گرمی دانے کا بھی بہت استعمال ہوتا تھا۔ یہ ساری دوائیاں جسمانی عارضوں کے ساتھ

نہیں لڑتی تھیں بلکہ یہ روحانی، ذہنی اور نفسیاتی بیماریوں کا مقابلہ کرتی تھیں۔ کہیں تو یہ خوش قسمتی سے کامیاب ہو جاتی تھیں اور کہیں نہیں ہوتی تھیں۔ ان ساری دوائیوں میں مجھے ایک ایسی دوا یاد ہے جو واقعی بڑی مفید ہے اور اس کے نہایت اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور وہ ذہنی بالیدگی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اسطخدوس ہے۔ ہمیں ہفتے میں ایک روز ایک چمچ بھر اسطخدوس اور اس میں سات سیاہ مرچیں ڈال کر اس کا ابلا ہوا پانی چھان کے دیا جاتا تھا اور حکماء اور صوفیا کہتے ہیں کہ اس کے پینے سے دماغ پر اس کا بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔۔۔ اس کو "جھاڑو بہ دماغ" بھی کہتے ہیں کیونکہ کہا جاتا ہے کہ یہ دماغ کے سارے جالے جھاڑو کی طرح سمیٹ کر ذہن میں صفائی کر کے جلا بخشتا ہے۔ Herbal Treatment کا زمانہ بھی گزرا۔ پھر نفسیاتی علاج دان آئے وہ بھی ذہن کے اندر پراگندگی کو دور کرنے کے لئے اپنے اپنے درماں لوگوں کے سامنے پیش کرتے رہے۔ آپ کو مجھ سے بہتر علم ہو گا کہ فرائیڈ اس ضمن میں Psycho Analysis لے کر آیا۔ ایڈلر کچھ اور کہہ کے لوگوں کے ذہن سے وہ منفیانہ پیش قدمی کو دور کرتا ہے جو انسانی زندگی پر اپنا پنجہ جما کر بیٹھی ہوئی ہوتی ہے اور کسی صورت بھی انسانی ذہن کو، انسانی روح کو نہیں چھوڑتی۔ پھر سائیکوڈرامہ آیا جس میں لوگ مل جل کے ایک ڈرامہ کرتے تھے جس میں وہ اپنے دکھ درد کا

اظہار کرتے تھے اور انسان بیچارہ اس تناظر میں بس ”ترلے“ ہی کرتا رہا، تڑپتا ہی رہا لیکن اس کے ذہن سے وہ باتیں دور نہ ہو سکیں جسے وہ دور کرنا چاہتا تھا۔ منفی خیالات بھی بڑے عجیب و غریب ہوتے ہیں اور وہ بہت عجیب و غریب طریقے اور انداز سے حملہ آور ہوتے ہیں اور جو لوگ شدت سے اس کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں وہ بیچارے یہ بھی کہتے ہیں کہ بزرگ اور پاکیزہ ہستیوں کے بارے میں بہت بہت بُرے خیالات ذہن میں آتے ہیں۔ باوصف اس کے ہمارے روحانی پیشوا اور ہمارے ذہنی مبلغ اس امر کا یقین دلاتے ہیں کہ یہ خیالات اختیاری نہیں ہوتے اس لئے اس سے حوالے سے زیادہ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن یہ انسانی زندگی پر حملہ آور ہوتے ہی رہتے ہیں۔ جب ہم Editing پر کام کر رہے تھے اور گرمی اپنی جوبن پر تھی تو وہ بڑے جہازی سائز کے امریکی کولنگ سسٹم سے ٹھنڈا رہنے والا بڑا ہال اور اس سے منسلک تیرہ کمرے گرمی میں ڈوب گئے اور ہمیں کام جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔ وہاں ہم ریکارڈنگ کرتے تھے اور ریکارڈنگ کو پھر آگے وائس آف امریکہ واشنگٹن ڈی سی بھیجتے تھے جہاں امریکہ کہ خوبیاں بیان کی جاتی تھیں کہ یہ بہت اچھا ملک ہے۔ یہ لوگوں کے ساتھ بہت محبت اور بھلائی کا سلوک کرتا ہے اور پسماندہ اور گرے پڑے لوگوں پر خاص توجہ دیتا ہے اور ہم امریکہ کے اس سحر میں آئے ہوئے تھے اور تب بھی آئے

ہوئے تھے اور اب بھی بہت حد تک آئے ہوئے ہیں لیکن اس گرمی میں کام کرنا ہمارے لئے مشکل تھا اور مشینیں بھی جواب دے رہی تھیں۔ مستری یعنی مقامی ماہرین کو بلا کر پوچھا گیا کہ اس سسٹم کو کیا مسئلہ ہو گیا ہے۔ وہ ماہرین اس کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرتے تھے اور پورے سات دن تک عملی طور پر وہ دفتر اور وہ کارخانہ بالکل ویسے ہی بند رہا جیسا کہ عام طور پر چھٹی کے روز بند ہوتا ہے۔ ہم وہاں جاتے ضرور تھے لیکن کام نہیں کر پاتے تھے۔ آخر تنگ آ کر گیارہویں دن ہم نے اسلام آباد سے Experts منگوائے۔ ان میں ایک امریکی ماہر تھا اور اس کے ساتھ ایک لبنانی ایکسپرٹ تھا۔ ان دونوں نے شروع سے آخر تک اس پلانٹ کو چیک کرنا شروع کیا کہ آخر اس میں ایسی کون سی خرابی پیدا ہو گئی ہے یہ کولنگ سے عاجز آ گیا ہے اور عاری ہو گیا ہے۔ وہ دونوں لگے رہے اور بڑی دیر تک سوچتے رہے لیکن تین دن کی مسلسل شب و روز کی محنت کے بعد ان کی سمجھ اور گرفت میں کچھ نہ آ سکا۔ آخر ایک روز اللہ نے ہم پر اور ہماری جانوں پر مہربانی کرنی تھی اور اس لبنانی نے خوشی سے ایک زور کا نعرہ بلند کیا اور اس نے چلا کر کہا کہ میں نے خرابی پکڑ لی ہے۔ اس پلانٹ میں ایک نہایت ہی پیچیدہ جگہ پر جہاں بڑا ہی حساس آلہ (تھرموسٹیٹ) لگا ہوتا ہے جو سسٹم کے چلنے اور بند ہونے کو کنٹرول کرتا ہے اس کے اندر ایک حساس مقام پر چھپکلی کا ایک بچہ

پھنس کر کٹ چکا تھا اور اس کی نرم و نازک ہڈیاں وہ ساری اس مشین میں پیوست ہو چکی تھیں اور اس چھپکلی کے بچے نے اس سارے پلانٹ کو روک رکھا تھا تو اب مجھے یاد آتا ہے کہ جس طرح ایک معمولی سے چھپکلی اتنے بڑے پلانٹ کو یوں روک لیتی ہے کہ انسان کا بس ہی نہیں چلتا اور اس طرح نفرت، کدورت اور منفی سوچ کی چھپکلی انسانی زندگی میں پھنس کر کس طرح سے انسان کی ساری زندگی ویسے ہی روک لے گی جیسے کہ اس معمولی چھپکلی نے اس پلانٹ کو جام کر دیا تھا۔ آدمی کوشش کرتا رہتا ہے اور بڑا نیک نیت ہوتا ہے، بڑا بھلا اور اچھا ہوتا ہے لیکن ایسے خیالات سے نکل نہیں سکتا۔ تشدّد، ایک نفرت، ایک غصّہ، ایک خوف اگر انسان کی زندگی میں کسی طرح سے اس چھپکلی کی طرح پھنس جائے تو ستر اسّی سال اور اس سے لمبی عمر بھی اس کا ساتھ نہیں دے سکے گی اور ان عوارض میں مبتلا شخص اس مرض کا شکار ہو کر اس دنیا سے چلا جائے گا۔ مجھے ہمیشہ اس بات کا خیال رہا، رہتا ہے اور اب بھی ہے اور بہت سے لوگ، بہت سے بچے اب زیادہ ہی ہو گئے ہیں جو اس بیماری کو ڈیپریشن کا نام دیتے ہیں چونکہ یہ انگریزی زبان کی Term میڈیکل کی دنیا سے ہمارے اوپر آئی ہے اور یہ لفظ یا بیماری جسے ڈیپریشن کہتے ہیں اور اس کے بارے میں بہت کچھ کہا جاتا ہے اس کے وجود میں آنے اور پیدا ہونے کی ساری وجہ یہ ہے کہ انسان کی چلتی ہوئی

زندگی میں ایک چھپکلی پھنس جاتی ہے اور یہ پھنستی بھی ایک ایسے انتہائی حساس مقام پر ہے جو آپ کی روح کے تھرموسٹیٹ کو کنٹرول کرتا ہے اور وہ چھپکلی وہی منفی پیش قدمی اور Negative Approach ہوتی ہے جس کو میں بار بار آپ کی خدمت میں یہ کہہ کر پیش کرتا ہوں کہ وہ یا تو تشدد کی صورت میں آتی ہے یا پھر غصّہ، خوف یا نفرت کی شکل میں آتی ہے۔

آپ کبھی بھی اپنی زندگی کا جائزہ لے لیں یہ عارضہ جس شخص میں کم ہو گا یا جس کسی نے اس کے اوپر کنٹرول کر رکھا ہو گا وہ خوش نصیب ہے اور وہ کم بیمار ہے۔ کچھ نہ کچھ خرابی تو آدمی میں رہتی ہی ہے لیکن اللہ جسمانی عارضے کے مقابلے میں روحانی اور نفسیاتی عارضے سے بچائے۔

ہم ایک بار تھرپارکر کے ریگستان میں تھے اور جیپ پر محوِ سفر تھے۔ ریت میں جیپ آہستہ آہستہ حرکت کر رہی تھی۔ ریت میں گاڑی چلانا خاصا محال ہوتا ہے۔ اسے وہاں کے ماہر ڈرائیور ہی چلا سکتے ہیں۔ آدھا Desert عبور کر کے ہم اسلام کوٹ پہنچے۔ وہاں ہمارے میزبان مکھی نہال چند تھے جو ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ شام کے وقت جب میں اور ممتاز مفتی سیر کرنے کے لئے نکلے تو ہمیں وہاں پر عجیب و غریب طرز کی دو چیزیں نظر آئیں۔ یہ تو یہ کہ کھلے ریگستان میں جگہ

جگہ ٹینٹ لگے ہوئے تھے اور ان میں بڑے ہی خوبصورت پیارے پیارے بچوں والے خاندان آباد تھے اور ان میں نہایت کڑیل نوجوان مرد تھے اور عورتیں چونکہ لمبا گھونگھٹ نکال کے پردہ کرتی تھیں اس لئے ان کے بارے میں ہم کچھ وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ کس شکل وصورت کی تھیں۔ دوسرا ان ٹینٹوں کے آگے یا اس کارواں کے آگے جو خیمہ زن تھا ایک چھوٹا سا کچا گھر تھا جس کے باہر ایک پرانی پیٹی پڑی ہوئی تھی ایسی پیٹی جیسی آموں والی ہوتی ہے اور اس پر پرانی مسواک سے لال رنگ میں جامعہ اشرفیہ لکھا ہوا تھا۔ میں نے ممتاز مفتی سے کہا کہ اس مقام پر اتنی دور جامعہ اشرفیہ کہاں سے آ گیا۔ ہم نے اس کچے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے ایک صاحب نکلے۔ ان کی پینتالیس پچاس برس عمر ہو گی۔ ہم نے ان سے کہا! صاحب آپ کے گھر کا نام جامعہ اشرفیہ کیوں ہے؟ انہوں نے کہا کہ جی میں نے کچھ وقت مولانا اشرف علی رح کی خدمت میں تھانہ بھون میں گزارا تھا۔ میں ان سے متاثر ہوں اور انہی کی یاد میں مَیں نے اپنے گھر کو یہ نام دے دیا۔ ہماری ان کے ساتھ بڑی باتیں ہوتی رہیں اور آخر میں ممتاز مفتی نے پوچھا کہ دل میں طرح طرح کے خیالات آتے ہیں جن میں منفی قسم کے خیالات بہت زیادہ ہیں اور ان خیالات میں بری بری باتیں بھی ہیں۔ کچھ ایسی بری باتیں جو میرے دل کو بھی بری لگتی ہیں اور کچھ ایسی باتیں جو لوگوں کو

ناگوار گزریں، تو مولوی صاحب آپ یہ بتائیں کہ کیا آپ نے اس کے بارے میں کچھ سوچا۔ دوائیاں تو بنی ہیں، حکیموں نے اس کے توڑ کے لئے جوشاندے بھی بنائے ہیں اور لوگ دم درود بھی کرتے ہیں لیکن یہ خیالات ذہن اور دل سے نکل نہیں پاتے تو مولوی صاحب نے کہا جی میں نے تو یہ سوچا ہے کہ اگر آپ تشدد پر مائل ہوں، اگر آپ کی طبیعت میں غصہ ہو اور آپ خوفزدہ رہتے ہوں اور آپ کو کسی شخص کے ساتھ نفرت ہو تو آپ ہمیشہ اپنی سٹین گن اپنے ساتھ رکھیں اور جو مد مقابل ہے، جس سے آپ کو نفرت ہے اس کو کمرے میں داخل ہوتے ہی یا ملتے ہی (انہوں نے باقاعدہ سٹین گن پکڑ کا پوزیشن بنا کر دکھائی) اس پر فائر کر دیں پھر آپ کی جان بچ گئی اور اس کے بارے میں پروانہ کریں۔ اب میں بھی اور ممتاز مفتی بھی حیران کہ بھئی یہ اچھا آدمی ہے یہ سٹین گن سے بندوں کو ہی تباہ کیے جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ جناب جب تک آپ اپنی سٹین گن ہر وقت تیار نہیں رکھیں گے اس وقت تک اس عمل سے آپ گزر نہیں سکیں گے اور یاد رکھئے سٹین گن میں ہر طرح کی گولی پڑے گی چوکور، لمبی، چھوٹی اور بڑی اور وہ چلے گی۔ ہم نے کہا مولوی صاحب ہم نے تو ایسی سٹین گن نہیں دیکھی جس میں گولیوں کی شکل وصورت اور حجم بھی مختلف ہو۔ کہنے لگے کہ آپ کو بس یہ گن ہر وقت تیار رکھنی ہے اور اپنے بائیں کندھے کے ساتھ لٹکا کر چلنا ہے اور

اس سے غافل نہیں ہونا۔ مفتی بڑا متجسس آدمی تھا۔ انہوں نے کہا کہ جی یہ گن کہاں سے ملتی ہے، تو مولوی صاحب نے کہا کہ یہ آپ کو خود ہی تیار کرنا پڑے گی۔ مفتی صاحب نے کہا باڑے سے ملے گی؟ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ پوچھا سندھ سے، تو بھی جواب نفی میں ملا۔

ہم نے کہا کہ صاحب یہ تو ایک مشکل کام ہمیں بتا دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس کے تیار کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ سارا دارومدار گولیوں پر رکھیں جن کا میں نے ذکر کیا "یعنی چھوٹی، موٹی، لمبی، پتلی، چوکور، چورس"۔ جب وہ تیار ہوں گی تو پھر آپ حملہ آور ہوں گے۔ میں نے کہا جناب وہ کس قسم کی گولیاں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ جو گولیاں ہیں وہ آیات کی گولیاں ہیں جتنی بھی آیات آپ کو یاد ہوں اور سورتوں کے ٹکڑے اور جتنی بھی دعائیں یاد ہیں یہ آپ محفوظ رکھیں اور انہیں عربی میں یاد کر کے رکھیں اس کا آپ کو بڑا فائدہ ہو گا۔ یہ آئتیں اور یہ دعائیں اور یہ درود و وظائف کے جو طے شدہ الفاظ ہیں اور جو اللہ کے پاک نام میں استعمال ہوں ان کو گولیوں کے طور پر اپنے وجود کی سٹین گن میں ہر وقت فٹ رکھیں اور جونہی آپ کو اپنا مد مقابل نظر آئے جس سے آپ کو سخت نفرت ہے تو اسے دیکھتے ہی فائر کر دیں اور جو کچھ آپ کو اپنے مخالف کو زیر کرنے کے لئے یاد ہے پڑھنا شروع کر دیں اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے رہیں کہ یا

اللہ یہ شخص بہت برا لگتا ہے، مجھے اس سے نفرت ہے، میں اس شخص (نفرت، غصہ اور دیگر منفی سوچیں) کو قتل کرنے پر مائل ہوں اور میں اس سے کسی صورت محبت نہیں کر سکتا۔ اب تو ہی اس کا بندوبست کر، جب آپ سوچتے جائیں گے اور اپنی قرآنی سٹین گن سے گولیوں (آیات) کی بوچھاڑ کرتے جائیں گے تو آپ کا منفی خیالات پر غلبہ ہوتا جائے گا۔ ہم مولوی صاحب کی اس بات پر اپنے اپنے دل میں غور کرتے رہے، میں اور ممتاز مفتی اپنے اپنے بستر پر لیٹے تو اس پر غور کرتے رہے لیکن ہم نے اس پر کوئی بات نہیں کی۔ اگلے دن صبح سیر کے وقت ممتاز مفتی نے کہا کہ بھئی اس کی بات تو ٹھیک ہے لیکن پتہ نہیں ہم اس میں کامیاب ہو بھی سکیں گے کہ نہیں۔ میں نے کہا ہاں یار ہے تو مشکل بات لیکن تجربہ کر کے دیکھا جا سکتا ہے۔

میری ریٹائرمنٹ سے کچھ عرصہ قبل ایک سردیوں کی خوشگوار چمکتی دوپہر تھی۔ میں اپنے دفتر کے لان میں چھتری لگا کر مزے سے دھوپ میں بیٹھا تھا کہ میں نے دفتر کے بڑے پھاٹک پر یعنی سڑک کے موڑ پر وہ کار دیکھی جس کے اندر میرا انہایت ہی منحوس اور نہایت قبیح دشمن بیٹھا تھا اور جو "کنی" کاٹ کر میری طرف ہی آ رہا تھا۔ جونہی میں نے اسے دیکھا وہ کار کھڑی کر کے اس میں سے نکل آیا۔ جب وہ اپنی کار کا دروازہ کھول کر باہر نکل رہا تھا تو مجھے اسلام کوٹ (تھر

پار کر) کے مولوی صاحب کی بات یاد آگئی جس میں انہوں نے Defence کا طریقہ بتایا تھا چنانچہ میں اچھل کر اٹھ کھڑا ہو گیا اور میں نے پوزیشن لے لی تو میرا ہاتھ سٹین گن پکڑنے کے انداز میں اور ایک نیچا ہو گیا اور میں نے فٹافٹ اور کھٹا کھٹ درود اور آیات کا ورد شروع کر دیا۔ چھوٹی کچھ بڑی جو بھی منہ اور ذہن میں آیا ان آیات کی گولیوں کی بوچھاڑ میں نے جاری رکھی۔ جوں جوں وہ میرے قریب آرہا ہے میں اور الرٹ ہوتا جا رہا ہوں۔ وہ بڑا ہی نالائق، بے وقوف، منحوس اور تکلیف دہ آدمی تھا۔ جب اس نے قریب پہنچ کر السّلام علیکم کہا تو میں نے اسے وعلیکم السّلام کہا اور بیٹھنے کا کہا تو وہ حیرانی سے میری جانب دیکھ کر کہنے لگا! اشفاق صاحب میں نے دور سے یہ سمجھ کہ آپ کوئی بلب لگا رہے ہیں لیکن یہاں آکر میں دیکھتا ہوں کہ یہاں نہ کوئی بلب ہے اور نہ کوئی تار ہے اور نہ ہی یہاں کوئی ایسا لیمپ ہے تو یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔۔۔ میں نے کہا تشریف رکھیے۔ آدھا میرا غصہ تو دور ہو چکا ہے اور انشاء اللہ ابھی ہو جائے گا کیونکہ میری سٹین گن میں ابھی چند گولیاں باقی ہیں اور یہ آپ کے بیٹھتے بیٹھتے اسی طرح سے چلتی جائیں گی۔ وہ بیٹھ گیا اور باتیں ہونے لگیں۔ (میں نے پھر صحرا میں رہنے والے مولوی صاحب کی بات یاد کی۔ خدا ان کی عمر دراز کرے شاید اس وقت بھی وہ حیات ہوں گے) میں نے آنے والے شخص سے کہا کہ دیکھئے مولوی

صاحب نے کیسا اچھا نسخہ بتایا ہے کہ اتنی دیر کے بعد آنے والے صاحب جو مجھے
ہمیشہ اذیت اور تکلیف دیا کرتے تھے اب میرے سامنے بیٹھے ہیں اور میری
طبیعت پر اتنا بوجھ نہیں پڑ رہا جس قدر پہلے پڑا کرتا تھا چنانچہ اب زندگی میں جب
بھی کبھی موقع ملتا ہے اور میں اس حوالے سے خوش قسمت ہوں اور مجھے ان
بابوں نے بڑی آسانیاں عطا کی ہیں۔ یہ بابے ہی ہوتے ہیں جن سے انسان پوچھتا
رہتا ہے۔ آپ بھی پوچھتے رہا کریں کہ جناب مجھے یہ مسئلہ ہے یا تکلیف ہے۔ اس
کا کیا سدباب کیا جائے۔

میں اسطخدوس کے عرق سے لے کر اپنی سٹین گن چلانے تک جتنی بھی عمر
گزری ہے اس میں کافی آسانیوں سے گزر گیا ہوں اور میری آرزو ہے کہ آپ
بھی میرے ساتھ اس دعا میں شریک ہوں کہ اللہ مجھے اور آپ کو آسانیاں عطا
فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا مزید شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ

پانی کی لڑائی اور سندیلے کی طوائفیں

ہم اہل "زاویہ" کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب ہم میز کے گرد جمع ہو رہے تھے تو ہم دریاؤں، پانیوں اور بادلوں کی بات کر رہے تھے اور ہمارے وجود کا سارا اندرونی حصہ جو تھا وہ پانی میں بھیگا ہوا تھا اور ہم اپنے اپنے طور پر دریاؤں کے منبع ذہنی طور پر تلاش کر رہے تھے کیونکہ زیادہ باہر نکلنا تو ہمیں نصیب نہیں ہوتا۔ جغرافیے کی کتابوں یا رسالوں، جریدوں کے ذریعے ہم باہر کی دنیا کے بارے معلوم کرنا چاہتے ہیں اور معلوم کر بھی لیتے ہیں۔ دریاؤں کی باتیں جب ہو رہی تھیں تو میں سوچ رہا تھا کہ دریا بھی عجیب و غریب چیز ہیں اور ان کو کیسے پتہ چل جاتا ہے، نہ ان کا کوئی نروس سسٹم ہے نہ دماغ ہے پھر کس طرح سے دریا کو پتہ چل جاتا ہے کہ سمندر کس طرف ہے اور اسے ایک دن جا کے ملنا ہے، بغیر کسی نقشے کے۔ دریا بغیر کسی سے پوچھے رواں دواں ہے اور کہیں اگر اس کے دو حصے ہو جاتے ہیں تو دونوں چکر کاٹ کے مل کے پھر سمندر ہی کی طرف محوِ سفر رہتے ہیں اور اگر بدقسمتی سے

دریا کی کوئی شاخ کسی ایسے مقام پر رک جاتی ہے جہاں بہت ہی سنگلاخ چٹان ہو اور وہ شاخ اس سے سر ٹکراتی ہے اور وہاں سر پھوڑتی ہے کہ مجھے مت روکو، مجھے جانے دو اور سنگلاخ چٹان اسے کہتی ہے کہ میں تو سوا کروڑ سال سے یہاں کھڑی ہوں، میں کیسے ایک طرف کو ہٹ جاؤں۔ وہ بھی (دریا کی شاخ) ضدی ہوتی ہے اور کہتی ہے اگر تو مجھے نہیں گزرنے دے گی تو میں بھی یہاں کھڑی ہوں، چنانچہ دریا کے اس پانی کے ساتھ جو اس سنگلاخ چٹان کے ساتھ ٹکرا کر رک جاتا ہے کیڑے پڑ جاتے ہیں، وہاں بھینسیں آ جاتی ہیں، گوبر جمع ہونے لگتا ہے، بدبودار اور متعفن پانی گزرتا ہے اور اس کا وہ حصہ جو سفر پر رواں دواں تھا اور ایسی سنگلاخ چٹان آنے پر راستہ چھوڑ کے دوسری طرف سے گزر جاتا ہے وہ دریا اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے، بالکل اسی طرح سے انسانی زندگی ہے جہاں انسان ضد میں آ کر رکتا ہے، لڑائی جھگڑا کرتا ہے تو پھر اس کے آگے بڑھنے اور منزل تک پہنچنے کے جو بھی مقامات ہیں مسدود ہو جاتے ہیں۔ آج سے بہت عرصہ پہلے، میرے خیال میں سو ڈیڑھ سو برس قبل کی بات ہے، لکھنؤ (بھارتی شہر) کے قریب ایک قصبہ "سندیلہ" ہے وہاں کے لڈو اور شاعر مشہور ہیں۔ وہ شاعر بڑے اعلیٰ پائے کے ہیں۔ لکھنؤ میں بھی بڑے شاعر تھے لیکن سندیلے کے شاعر اصلاح دیتے تھے اور اس کی اجرت وصول کرتے تھے۔ ایک دفعہ یہ ہوا کہ

سندیلے میں بہر زبردست Drought یعنی خشک سالی ہو گئی اور وہاں کے نواب اور چھوٹی چھوٹی راج دھانیاں تمام کی تمام سوکھے (خشک سالی) کا شکار ہو گئیں۔ اس قدر صورتحال خراب ہوئی کہ زمین کا کلیجہ خشکی سے پھٹنے لگا۔ جگہ جگہ پر پھٹی ہوئی زمین کے آثار نظر آنے لگے۔ ڈھور ڈنگر (مویشی) مرنے لگے اور ان کے بڑے بڑے پنجر اور سینگ جگہ جگہ پڑے نظر آتے۔ پرندوں نے وہ علاقہ چھوڑ دیا۔ ایک دفعہ گئے تو پھر لوٹ کر نہیں آئے، لوگوں نے آکر ''مکھیا'' سردار کے پاس شکایت کی۔ وہ مکھیا لڑکھڑاتا نواب کے پاس گیا کہ حضور لوگ گاؤں چھوڑ کر جانا چاہ رہے ہیں لہٰذا نمازِ استسقا پڑھی جانی چاہیے کیونکہ اس طرح تو گاؤں ہی خالی ہو جائے گا۔ چنانچہ نمازِ استسقا ادا کی گئی لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا جس سے لوگوں کی مایوسی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ہندوؤں نے کہا کہ ہم اپنا ''ناقوس'' بجا کر اور بھجن گا کر بھگوان کو راضی کرتے ہیں شاید وہ بارش بھیج دے۔ انہوں نے اپنا پورا زور لگایا لیکن کچھ نہ ہوا۔ جب ڈھور ڈنگروں کے ساتھ انسان بھی مرنے لگے تو اس علاقے کی طوائفیں (وہ سارے اتر پردیش میں مشہور تھیں) اپنا چھوٹا سا گروہ لے کر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور انہوں نے کہا کہ جنتا (عوام) پر بہت کڑا اور برا وقت آیا ہے اور اس برے وقت میں ہم سب ماؤف ہو گئے ہیں۔ ہمارے ذہن میں ایک بات آتی ہے اگر ہمیں

اس کی اجازت دی جائے تو ہم شاید اس علاقے اور آپ لوگوں کی مدد کر سکیں۔ نواب صاحب نے کہا کہ اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ طوائفوں نے کہا کہ ہم بھی ایک مخصوص مقام پر پہنچ کر کھلے میدان میں جا کر بیٹھیں گی اور ہم بھی کچھ گریہ زاری کریں گی لیکن شرط یہ ہے کہ کوئی آدمی اس طرف نہ آنے پائے۔ ان کی وہ شرط منظور کر لی گئی۔ وہ اپنے قیمتی گھروں اور سونے چاندی کے زیورات اور جو کچھ بھی ان کے پاس تھا اپنے بالا خانوں پر چھوڑ کر سیڑھیاں اتریں۔ انہوں نے سفید رنگ کی نیلی کنی والی دھوتیاں باندھی ہوئی تھیں۔ جیسے کلکتے والی خواتین پہنتی ہیں۔ خاص طور پر جیسے مدر ٹریسا پہنتی تھیں۔(ایک چرواہے نے آنکھوں دیکھا حال بتایا تھا حالانکہ کسی مرد کو وہاں جانے کی اجازت نہ تھی) وہ جب اس مخصوص جگہ پر آئیں تو انہوں نے گڑگڑا کر اللہ سے درخواست کی اے خدا تو جانتا ہے ہمارے افعال کیسے ہیں اور کردار کیسا ہے اور ہم کس نوعیت کی عورتیں ہیں۔ تو نے ہمیں بڑا برداشت کیا ہے۔ ہم تری بڑی شکر گزار ہیں لیکن یہ ساری مصیبت جو انسانیت پر بڑی ہے یہ ہماری یہ وجہ سے ہے۔ اس علاقے میں جو خشک سالی آئی ہے وہ ہماری موجودگی سے آئی ہے اور اس ساری خشک سالی کا "کارن" ہم ہیں۔ ہم تیرے آگے سجدہ ریز ہو کر دل سے دعا کرتی ہیں کہ بارش برسا اور ان لوگوں اور جانوروں کو پانی عطا کر تا کہ اس

بستی پر رحم ہو اور وہ ہجرت کر کے جانے والے پرندوں کو واپس آنے کا پھر سے موقع ملے اور وہ یہاں خوشی کے نغمے گائیں۔ چرواہا کہتا ہے کہ جب انہوں نے سجدے سے سر اٹھایا تو اتنی گِھر کے سیاہ گھٹا آئی اور وہ چشمِ زدن میں بارش میں تبدیل ہو گئی اور ایسی زبردست موسلا دھار بارش ہوئی کہ سب جل تھل ہو گیا اور وہ عورتیں اس بارش میں بھیگیں اور ان کی بغلوں میں چھوٹی چھوٹی پوٹلیاں تھیں جنہیں لے کر وہ ایک طرف کو نکل گئیں۔ پھر کسی نے نہ ان کا پوچھا اور نہ ہی ان کا کوئی پتہ چلا کہ کہاں سے آئیں تھیں اور کہاں چلی گئیں۔ انہیں زمیں چاٹ گئی یا آسمان کھا گیا لیکن ساری بستی پھر سے ہری بھری ہو گئی۔ ان طوائفوں کے گھروں کے دروازے کھلے تھے، لوگوں نے ایک دو ماہ تو جبر کیا لیکن پھر آہستہ آہستہ ان کا قیمتی سامان چرانا شروع کر دیا اور تاریخ دان کہتے ہیں کہ ان کے گھروں سے بڑی دیر تک ایسی قیمتی چیزیں بر آمد ہوتی رہیں اور اناڑی چور اور پکے چور کئی سال تک وہاں سے چیزیں لاتے رہے۔ ان کی یہ Sacrifice ان کی یہ قربانی اور لوگوں کے ساتھ محبت اور تال میل اور گہری وابستگی کو جب میں آج کے تناظر میں دیکھتا ہوں اور آج میں اپنا اخبار پڑھتا ہوں تو مجھے بڑی حیرانی ہوتی ہے کہ ہم جو پڑھے لکھے لوگ ہیں جو ان (طوائفوں) سے بہت آگے نکل کر پانی پر جھگڑا کرتے ہیں کہ اس صوبے نے میرے اتنے قطرے پانی کے چھین

لیے۔ دوسرا کہتا ہے کہ میں نے تجھے اتنے قطرے زیادہ دے دیے۔ ان بیبیوں جیسی بلکہ بازاری بیبیوں جیسی کام کی بات نہیں کرتا اور ایسی کوئی بات کسی کے دل میں نہیں آتی اور کوئی بھی اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ یہ پانی جو اللہ کی عطا ہے اور جو ہم کو جس قدر بھی مل رہا ہے اس کو بانٹ کے کس طرح استعمال کرنا ہے۔ جب بھی ایسی خبریں دیکھتا ہوں تو میرے ذہن میں اور دل میں ان طوائفوں سے منسوب اس کہانی کا پس منظر آ جاتا ہے، تو میں اپنے ارد گرد کے لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا ہم جو بہت اچھے بھلے اور پاکیزہ لوگ ہیں ان طوائفوں کی قربانی کے جذبے کے نقشِ قدم پر چل سکتے ہیں۔ تو مجھے ہر طرف سے چہروں پر نفی کے آثار ملتے ہیں کہ نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔! ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ ہم کیسے اس Source کو ڈھونڈ سکیں اور پانی کے اس منبع تک پہنچ سکیں جو ہماری روحوں کی آبیاری کرے لیکن یہ ہو نہیں پاتا۔ اس کی طرف ہم جا نہیں سکتے۔

بہت ممکن ہے کہ میرے پیارے مہمانوں (حاضرین زاویہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) میں سے کوئی مجھے تھوڑی سی Guidance اس حوالے سے عطا کرے کہ کس طرح سے ہم اس منزل تک پہنچ سکیں جس منزل تک وہ پاکیزہ بیبیاں ایک ہی فیصلے پر پہنچ گئیں۔

)پروگرام میں سوال وجواب کا سیشن شروع ہوتا ہے (

اشفاق صاحب سوال کرتے ہیں۔ شہزاد صاحب وہ بیبیاں ایک ہی فیصلے پر پہنچ گئیں۔اس حوالے سے آپ کا کیا خیال ہے؟

شہزاد صاحب:۔ آپ نے یہ جو سوال اٹھایا ہے یہ آپ کے لیے بھی بہت مشکل سوال ہے اور ہم سب کے لیے بھی مشکل ہے۔اصل میں جو کہانی آپ نے بیان کی اس کے جو معانی میرے ذہن میں آتے ہیں وہ یہ ہیں کہ ہم سب اپنے اپنے گناہوں اور اعمال کی ذمہ داری قبول کریں اور پھر اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے بعد نہ صرف یہ کہ اپنی ہی اصلاح کریں بلکہ کسی بہت بڑی قربانی کے لیے تیار ہو جائیں اور یہ گلا نہ کریں کہ کس کو کتنا پانی ملا اور کس کو کتنا پانی نہیں ملا۔ اس سے ایک ایسی بارش ہو سکتی ہے جو ہم سب کو سیر اب کر دے۔

اشفاق احمد صاحب:۔ ہماری اس محفل میں ڈاکٹر توفیق صاحب بھی موجود ہیں۔ ان کے پاس بھی بڑے مریض آتے ہیں اور یہ بڑے نیکی کے کام کرتے ہیں۔ ان سے بھی پوچھا جائے کہ ہم میں کس طرح سے وہ جذبہ پیدا ہو جو آپ میں ہے کیونکہ میں نے آپ کو لگن اور محنت سے کام کرتے دیکھا ہے جبکہ اس کے بر عکس ہم رکتے اور گھٹتے ہیں۔ ہم بھی پھیلنا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر توفیق:۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں چاہیے کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کی بھی کوشش کریں اور ایک دوسرے سے جو توقعات ہم رکھ رہے ہیں ان توقعات کا دائرہ بھی جانچیں اور ایک دوسرے کو چیزیں دینے کی ہمت بھی رکھیں۔ صرف لینے پر ہی مصر نہیں رہیں۔ جب یہ سارے جذبے ہم میں آجائیں گے تو ہم مل بیٹھ کر پانی کے قطروں کو جو بھی ہمارے پاس ہیں ان کو خوش اسلوبی سے بانٹ لیں۔

اشفاق احمد:۔ پروین اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

پروین صاحبہ:۔ میں سمجھتی ہوں کہ میرا جو زاویہ نظر ہے وہ یہ ہے کہ جیسے توفیق صاحب نے فرمایا کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھیں گے تو ہم قطرے بانٹیں گے مجھے یہ نہیں لگتا کہ میں اور آپ اس میں قصوروار ہیں یا کہ ہم لوگ اپنی سطح پر غلطی پر ہیں۔ ہمیں ان عناصر کے مذموم مفادات کو پن پوائنٹ کرنا ہوگا جو اپنے ذاتی اغراض و مقاصد اور فوائد کے لیے اس طرح کی بانٹ یا اس طرح کی بندر بانٹ ہم کو سکھاتے ہیں۔ اگر ہم میں حب الوطنی کا جذبہ بیدار ہو جائے اور ہم سمجھیں کہ اتفاق اور محبت سے ہی مسائل حل کر سکتے ہیں۔ وہ بیبیاں جن کی مثال دی گئی ہے وہ متحد ہو کر جنگل میں گئی تھیں اور ان کے دل میں درد تھا اور انہوں

نے اپنا ذاتی فائدہ چھوڑ دیا تھا تب وہ مسئلہ حل ہوا تھا۔ ہمارے اوپر جو بھی مسائل آرہے ہیں وہ پانی کے ہوں یا اناج کے اس میں Vested Interest کا بہت زیادہ ہاتھ ہے۔

اشفاق احمد:۔ چونکہ پانی کی باتیں ہو رہی ہیں اور ہم نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ گلیشیر کو پگھلا کر اپنے آئندہ مصارف کے لیے پانی حاصل کریں گے تو مجھے یاد آیا کہ ایک دفعہ ہم ناران جارہے تھے کہ ہمیں یہ کہ کر روک دیا کہ گلیشیر کی کیفیت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کو ایک دو دن یہاں بالا کوٹ میں قیام کرنا پڑے گا۔ بالا کوٹ میں تب ایسا کوئی ہوٹل نہیں تھا۔ ہمارے ساتھ ممتاز مفتی صاحب بھی تھے۔ وہ کہنے لگے یا ہم نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ مسافر مسجد میں وقت گزارتے تھے تو چلو کسی مولوی صاحب سے پوچھتے ہیں۔ ہم پانچ آدمی تھے مولوی صاحب کے پاس گئے ان سے کہا کہ آپ کیا ہمیں مسجد میں رہنے کی اجازت دیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں جی کیوں نہیں۔ ادھر برآمدہ ہے، صف ہے، مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس ایسی کوئی دری نہیں جو میں آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا۔ ہم نے کہا نہیں اس کی ضرورت نہیں ہمارے پاس Sleeping Bags ہیں۔ مولوی صاحب بھی وہ سلیپنگ بیگ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ یہ بڑی مزیدار چیز ہے کہ آدمی اس کے اندر گھس جائے اور

سکون سے سو جائے۔ ہم ایک دو دن وہاں ویسے ہی سوتے رہے۔ ابھی ہمیں آگے جانے کی کلیرنس نہیں مل رہی تھی۔ وہ مولوی صاحب بھی عجیب و غریب آدمی تھے ان کے گھر کے دو حجرے تھے۔ ہم سے کہنے لگے (ممتاز مفتی ان کے بڑے دوست ہو گئے) میرے ساتھ چائے پئیں وہ ہمیں اپنے گھر لے گئے اور جس کمرے میں ہمیں بٹھایا اس میں ایک صندوقچی تھی بیٹھ کر جس پر وہ لکھتے تھے اور باقی صف بچھی ہوئی تھی۔ ممتاز مفتی تھوڑی دیر ادھر ادھر دیکھ کر کہنے لگے مولوی صاحب آپ کا سامان کہاں ہے، تو وہ کہنے لگے آپ ہم کو بتاؤ آپ کا سامان کدھر ہے؟ ممتاز مفتی کہنے لگے میں تو مسافر ہوں۔ مولوی صاحب نے کہا میں بھی تو مسافر ہوں۔ کیا جواب تھا، اس طرح کے لوگ بھی ہوتے ہیں مولوی صاحب کا ایک خادم تھا وہ اذان دیتا تھا۔ اس نے واسکٹ پہنی ہوئی تھی۔ وہ اندر آ کر کبھی ایک اور کبھی دوسری جیب میں ہاتھ ڈالتا تھا۔ میں سمجھا کہ اسے کوئی خارش کا مرض لاحق ہو گا یا ایک ''جھولے'' کا مرض ہو جاتا ہے اور وہ ہو گا۔ وہ بار بار جیب دیکھتا تھا۔ اس سے مجھے بڑا تجسس پیدا ہوا۔ میں نے کہ مولوی صاحب آپ کا یہ خادم کیا بیمار ہے۔ کہنے لگے نہیں، اللہ کے فضل سے بہر صحت مند، بہت اچھا اور نیک آدمی ہے۔ میں نے کہا جی یہ ہر وقت جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ ٹٹولتا رہتا ہے۔ کہنے لگے جی یہ اللہ والا آدمی ہے اور خدا کے اصل بندے

جو ہیں وہ ہر وقت جیبوں کی تلاشی لیتے رہتے ہیں کہ اس میں کوئی چیز تو نہیں پڑی جو اللہ کو ناپسند ہو۔ میں نے کہا ہم تو بڑے بدنصیب ہیں اور اس شہر سے آتے ہیں جہاں ناپسند چیزیں ہم جیبوں میں ہی نہیں دل کے اندر تک بھرتے ہیں اور بہت خوش بھی ہوتے ہیں۔ اس طرح کے آدمی یا کردار جب پیدا ہونے لگیں گے تو پھر ظاہر ہے کچھ مشکلات دور ہوں گی اور یہ کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے اور ایک دوسرے کو جاننے کے لیے ہمیں شاید وقت درکار ہو یا ہمیں اپنے ارد گرد کے لوگ ویسے نہ نظر آتے ہوں جیسے نظر آنے چاہئیں یا وہ Level ہم نے Create ہی نہ کیا ہو جو بڑے مہذب ملکوں نے کیا ہوا ہے یا ہمارے سامنے اور دیکھتے دیکھتے چائنہ نے Create کر لیا ہے۔ ہمارے چودہ کروڑ افراد ایک طرف ہیں اور ہم جو مراعات یافتہ لوگ ہیں ہم نے انہیں خود سے الگ کیا ہوا ہے۔ ہمارے اور ان کے درمیاں ایک بہت بڑی گہری کھائی ہے جو کبھی تو پانی سے بھر جاتی ہے اور کبھی سوکھ جاتی ہے پانی سے خالی ہو جاتی ہے۔ ان اس مکالمے میں ہم عطاء الحق قاسمی سے پوچھتے ہیں کہ ہم وہ کونسا راستہ پکڑیں جس میں ہم لوگوں کو آسانیاں عطا فرمائیں اور یہ معاشرتی مسائل جو پیدا ہوتے ہیں یہ پیدا نہ ہوں۔

عطاءالحق قاسمی:۔ اشفاق صاحب! آپ نے جو حقائق بیان کیے ہیں اور جو حکایت بیان کی ہے وہ اس قدر دلچسپ ہے اور اس میں اتنے معانی پوشیدہ ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ میں آپ ہی کی بات کو دھرانا چاہتا ہوں کہ ہم ۱۴ کروڑ عوام سب بہت اچھے ہیں۔ ہم میں سے کچھ کو چاہیے کہ اپنے آپ کو برا سمجھیں اور جا کر ان ہی بازاری عورتوں کی طرح گریہ زاری کریں تب شاید ہمارا مسئلہ حل ہو جائے۔

اشفاق احمد:۔ عاصم قادری آپ بھی کچھ فرمائیں۔

عاصم قادری:۔ لوگ ایثار و قربانی کی شیئرنگ اور مل بانٹنے کی بات کرتے ہیں۔ ہم لوگ ہر گھنٹہ ہر منٹ ایک ایسی بے یقینی اور غربت کی طرف چلتے چلے جا رہے ہیں جہاں پر سوچ کی Maturity ہم سے بہت دور ہے اور ہم میں چھین کے کھا لینے کی حس بیدار ہوتی جا رہی ہے۔ آپ اس مسئلے کو جو مسئلہ ہر دن ہمیں غربت اور بے یقینی کی جانب گھسیٹتا چلا جا رہا ہے اس کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔

اشفاق احمد:۔ ہمارے اندر نیلم احمد تشریف رکھتی ہیں۔ وہ اس عہد کی بہت معتبر نوجوان افسانہ نگار اور قلم کار ہیں اس سلسلے میں جس میں ہم پھنسے ہوئے ہیں اس کی بابت ان سے پوچھتے ہیں۔

نیلم احمد:۔ اشفاق صاحب کی بیان کردہ حکایت سے دو باتیں میرے ذہن میں آئیں۔ ایک یہ کہ جن خواتین کا انہوں نے تذکرہ کیا انہیں معاشی طور پر اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا لیکن پھر بھی ان کے دل میں ایک مقصد تھا جس کی وجہ سے انہوں نے خدا سے دعا کی اور وہ ایک عظیم تر مقصد تھا۔ دوسری بات جو پانی کی ہے یہ مسئلہ روز اخباروں میں آتا ہے اور اس سے ہم کافی افسردہ بھی ہوتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہم سب میں Tolerance کی کمی ہے۔ برداشت کا مادہ شاید کم ہو گیا ہے اور ایک دوسرے کے لیے کچھ کر گزرنے کا جذبہ بھی کافی کم ہے اس لیے اگر ہم میں سے کچھ قطرے کسی کو زیادہ مل جائیں یا کچھ کم تو ہم لوگ واویلا مچا دیتے ہیں جبکہ یہ پوری قوم کا مسئلہ ہے اگر ایک صوبے کو پانی ملے گا اور دوسرے کو نہیں تو یہ بھی ٹھیک نہیں ہو گا۔ سارے ملک کو پانی ملے گا اور فصلیں پیدا ہوں گی تو سب ہی خوشحال ہوں گے۔

(عطاءالحق قاسمی درمیان میں بولتے ہیں)

اشفاق صاحب اس حوالے سے ایک بہت ضروری بات میں کہنا چاہ رہا ہوں اور وہ اخباروں کے کردار کے حوالے سے ہے۔ اخبار اس ایشو کو جس طرح سے اٹھاتے ہیں میں سمجھتا ہوں وہ بالکل قومی مفاد میں نہیں ہے۔ سیکر ٹیریوں کی جو

میٹنگز ہوتی ہیں یہ بات وہیں تک رہنی چاہیے جبکہ اس کے برعکس یوں لگتا ہے کہ دو صوبوں کی صف آرا ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف طبلِ جنگ بجا دیا گیا ہے۔ یہ صورتحال قطعاً قومی مفاد میں نہیں ہے۔ اس سلسلے میں اخبارات کو اپنا کردار بہت احتیاط کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔

اشفاق احمد:۔ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں اور گھوم پھر کر بات پھر اسی مرکز پر آجاتی ہے کہ جب تک ہم میں تعلیم کا فقدان رہے گا اور جب تک تعلیم یافتہ لوگوں کی تربیت درست انداز، خطوط اور سطح پر نہیں ہو گی اس وقت تک ہم ایسی اُلجھنوں کا شکار ہوتے رہیں گے اور اس میں مبتلا ہوتے رہیں گے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ جو صاحبانِ اختیار و اقتدار ہیں اور جن کے ہاتھ میں لوگوں کی زندگیوں کی قدرت ہے ان کو دوبارہ اپنے آپ کو بھی درست کرنا چاہیے اور اس تعلیم کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے۔ اس حوالے سے تربیت کی واقعی ضرورت ہے۔ تربیت حاصل کرنے کے لیے کوئی اور راستہ اختیار کیا جانا چاہیے میں تو اکثر ایک ہی بات کہا کرتا ہوں کہ جب تک آپ اپنے ۱۴ کروڑ بھائیوں کو ان کو عزّتِ نفس نہیں لوٹائیں گے آپ پوری طرح سے بٹے رہیں گے اور کوئی مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ ان کو ان کی عزت لوٹا دیجیے اور ان کو سلام کیجیے۔ آپ کے گھر دانوں سے بھر جائیں گے اور آپ کی چاٹیاں مکھن سے لبریز ہو جائیں گی۔ آپ

سے اجازت لوں گا۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا
شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

بندے کا دارو بندہ

ہمارے ہاں آج کل لوگوں کی لوگوں پر توجہ بہت زیادہ ہے اور اس اعتبار سے یہاں اللہ کے فضل سے بہت سارے شفاخانے اور ہسپتال بن رہے ہیں اور جس مخیر آدمی کے ذہن میں لوگوں کی خدمت کا تصور اٹھتا ہے تو وہ ایک ہسپتال کی داغ بیل ضرور ڈالتا ہے اور پھر اس میں اللہ کی مدد شامل حال ہوتی ہے اور وہ ہسپتال پایہ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے لیکن سارے ہی لوگوں کی کسی نہ کسی جسمانی عارضے میں مبتلا خیال کرنا کچھ ایسی خوش آئند بات نہیں ہے۔ لوگ جسمانی عوارض کے علاوہ ذہنی، روحانی، نفسیاتی بیماریوں میں بھی مبتلا ہوتے ہیں یا یوں کہیے کہ لوگوں پر کبھی ایسا بوجھ بھی آن پڑتا ہے کہ وہ بلبلاتے ہوئے ساری دنیا کا چکر کاٹتے ہیں اور کوئی بھی ان کی دستگیری کرنے کے لیے نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں ایک یونس مالی تھا۔ وہ بیچارہ بہت پریشان تھا اور وہ یہ سمجھتے ہوئے کہ کوئی ہسپتال ہی اس کے دکھوں کا مداوا کرے گا وہ ایک بہت بڑے ہسپتال میں چلا گیا اور وہاں جا کر واویلا کرنے لگا کہ مجھے یہاں داخل کر لو کیونکہ علاقے کے تھانیدار

نے مجھ پر بڑی زیادتی کی ہے اور میری بڑی بے عزتی کی ہے جس کے باعث میں بیمار ہو گیا ہوں۔ اب ہسپتال والے اسے کیسے داخل کر لیں۔ انہوں نے اس سے کہا کہ ہمارے ہاں ایسا کوئی بندوبست نہیں ہے کہ ہم آپ کو دکھوں کا مداوا کر سکیں یا آپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ سکیں یا آپ کی تشفی کر سکیں۔ اس کے لیے تو کوئی اور جگہ ہونی چاہیے اور ہم اس بات سے بھی معذور ہیں کہ آپ کو کوئی ایسی جگہ بتا سکیں۔ یونس بے چارہ پریشان حال سڑکوں پر مارا مارا پھرتا رہا اور اب تک پھرتا ہے اور اس کی تشفی، دستگیری یا حوصلہ جوئی کرنے والا کوئی بھی شخص یا ادارہ نہیں ہے۔ پرانے زمانے میں بطورِ خاص برصغیر اور وسطی ایشیا کے اسلامی ملکوں میں خانقاہیں ہوتی تھیں، ڈیرے ہوتے تھے اور درگاہیں ہوتی تھیں جہاں سے کھانا بھی ملتا تھا اور رہنے اور وقت گزارنے کے لیے جگہ بھی ملتی تھی اور ایسی جگہوں پر ایسے لوگ بھی ملتے تھے جو دکھ بانٹتے تھے اور یونس جیسے دکھی لوگ ان کے پاس اپنے دکھ لے کر جاتے تھے گو وہ ان کے دکھوں کا علاج تو نہیں کر سکتے تھے لیکن جتنے بھی آدمی وہاں جمع ہوتے تھے تو سارے لوگ اکٹھے ہو کر اس دکھی شخص کی دل جوئی کرتے اور اللہ سے اس کے حق میں دعا کرتے کہ اے اللہ اس کا دکھ دور فرما دے اور ایسے ڈیروں، درگاہوں اور خانقاہوں پر موجود سوغاتیں کھانے والے اور لانے والے سب لوگ اس شخص کے لیے ہاتھ اٹھا کر

دعا کرتے تھے۔ کئی یونسوں کے کندھوں سے بوجھ اتر جاتا تھا لیکن اب ایسی چیزیں مفقود ہو گئی ہیں کیونکہ نئی تعلیم اور ترقی کے دور نے یہ بات واضح کی ہے کہ اس قسم کے ڈیرے اور درگاہیں اور اس قسم کے زاویے (زاویہ پروگرام کی مثال دیتے ہوئے جہاں کئی لوگ اکٹھے ہوتے ہیں) اور دائرے ہمیں نہیں چاہیں کیونکہ انسان صرف جسمانی طور پر ہی مریض ہوتا ہے اور اس کی کیمسٹری میں ہی کوئی فرق پڑتا ہے۔ خواتین و حضرات لوگ ایک دوسرے کا سہارا مانگتے ہیں۔ ایک دوسرے کے قریب آنا چاہتے ہیں لیکن ترقی کے اس دور میں ایک دوسرے کے قریب آنے کی ساری راہیں مسدود و مفقود ہو گئی ہیں لیکن پھر بھی انسان اپنے ساتھ والوں کو، اپنے پرکھوں اور آباؤاجداد کو ساتھ ساتھ اٹھائے پھرتا ہے۔ اگر کسی روشن دان میں آپ اپنا ہاتھ کھول کر دیکھیں تو آپ کے ہاتھ کی ان لکیروں میں ان چوکھٹوں، چوکھڑیوں اور مساموں کے اندر بہت سے ایسے لوگ نظر آئیں گے جن کے جینز موجود ہوں گے اور یہ وہ لوگ ہوں گے جو آپ کے آباؤاجداد یا آپ کے پُرکھ تھے۔ ہر وقت ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور آپ کا ہنسنا، بولنا، غصہ اور آپ کی شوخی و ضد آپ کے اندر ان ہی لوگوں کی طرف سے منتقل ہوتی ہے۔ اگر کسی نہ کسی طرح سے آپ ان کے قریب رہیں یا وہ آپ کے قریب رہیں یا آپ کے اردگرد کے موجود لوگ آپ کو ہاتھ لگا کر

محسوس کرتے ہیں یا آپ ان کو Touch کر کے ایک دوسرے کے ہونے کا ثبوت بہم پہنچاتے رہیں تو پھر ایسے ذہنی اور نفسیاتی عارضے لاحق نہیں ہوں گے۔ انسان انسان کی قربت چاہتا ہے اس سے علاج نہیں کروانا چاہتا ہے اور مختلف کمروں میں منتقل ہو کر یہ تقاضا نہیں کرتا کہ میرا کمرہ نمبر ۱۴۴ یا ۲۱۳ ہے آپ مجھے وہاں ملنے آجاؤ۔ لیکن آج کی ترقی ہمیں کمروں میں بند کر کے علاج کروانے کی ترغیب دیتی ہے کہ وقت پر ڈاکٹر آتا ہے اور وقت پر نرس چیک کرتی ہے پھر مشینوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے کہ آپ سی ٹی سکین کے عمل سے گزریں اور دیگر مشینوں سے علاج کروائیں لیکن اس طرح سے علاج ہو نہیں پاتا کیونکہ انسان بکھرا ہوا ہے۔ مجھے اپنے بچپن کے قصبے کا واقعہ یاد ہے۔ قصبوں میں عجب و غریب قسم کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک دفعہ منہ کھر کی بیماری لاحق ہو گئی(اب بھی یہ بیماری آئی ہوئی ہے جس میں بے شمار جانور مر جاتے ہیں) تو ہمارے قصبے میں کچھ لوگ آئے جنہیں بھوکے قسم کے لوگ کہا جاتا تھا انہوں نے کھدر کے کئی تھان منگوائے اور شام کو گڈوں(چھکڑوں) پر ان تھانوں کو پھیلا کر (ہم چھوٹے بچے انہیں دیکھتے تھے کہ یہ کیا کر رہے ہیں) بڑے بڑے ہاتھیوں کی شکل بنا(آپ ہاتھیوں سے تو واقف ہوں گے یہ بڑا مویشی ہوتا ہے اور اس سے بڑا کام لیا جاتا ہے سری لنکا میں لوگ اس سے ہل بھی چلاتے ہیں) کر ان گڈوں کو دریا

کنارے لے گئے اور وہ لوگ ان پر اپنے کچھ مخصوص سے منتر پڑھتے تھے اور دعا کرتے تھے کہ یا اللہ اس قصبے سے یہ بیماری چلی جائے۔ میں اب ٹھیک سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ ایسی چیزوں سے علاج ہوتا تھا یا نہیں لیکن لوگوں کا یہ اجتماع انہیں ایسی طاقت عطا کرتا تھا کہ وہ بیماری پر بری شدت اور زور کا حملہ کرتے تھے اسی لیے ہمارے بزرگانِ دین اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مخلوقِ خدا کا ساتھ دو اور مخلوقِ خدا کی خدمت کرو اس میں آپ کا بھی فائدہ ہے کیونکہ مخلوقِ خدا کی Magnetic Force الٹ کر آپ کے اندر کی جو خرابیاں ہیں وہ بھی ٹھیک کر دے گی اور ان کا بھی علاج کر دے گی۔ میں تقسیم برصغیر کے اتر پردیش کے جس قصبے کا ذکر کر رہا تھا وہاں مویشیوں کا اس طرح سے علاج کیا جاتا تھا وہاں ایک مرتبہ بارش نہ ہوئی۔ وہاں اکثر ایسا ہو جاتا تھا اور اب اس طرح ہمارے ہاں بھی مسئلہ ہے۔ میرے قصبے والے سخت خشک سالی کے خاتمے کی دعا کروانے کے لیے ایک صاحب دعا کو لے آئے اور اس سے درخواست کی کہ آپ ہمارے قصبے میں دعا کریں کہ ابرِ رحمت برسے کیونکہ بڑی تنگی ہے۔ اس صاحبِ دعا نے کہا کہ میں قصبے کے کنارے ایک جھونپڑی میں رہوں گا اور کوئی آدمی مجھے Disturb نہ کرے اور پھر میں دعا کروں گا آپ لوگوں کو سات دن تک انتظار کرنا ہو گا چنانچہ ان کے لیے ایک جھونپڑی کا انتظام کر دیا گیا۔ ساتویں دن

سے پہلے ہی یعنی پانچویں دن ہی اللہ کا فضل ہو گیا اور بارش ہونے لگی اور ہر طرف جل تھل ہو گیا۔ لوگ بڑی مٹھائی، سوغاتیں اور پھولوں کے ہار لے کر اس صاحبِ دعا کی جھونپڑی میں آئے تو انہوں نے ہنس کر کہا بھئی میں نے تو کائی خاص دعا نہیں کی۔ میں نے تو کچھ خاص نہیں کیا' جب آپ لوگ مجھے قصبے میں لائے تھے تو میں نے دیکھا کہ آپ سارے لوگ بکھرے ہوئے اور Dis Order کی کیفیت میں پھر رہے ہیں' بے ہنگم سے ہیں اور کسی کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جب ایک آدمی دوسرے کے پاس سے گزرتا ہے تو دوسرے کو مخاطب کر کے نہ سلام کہتا ہے نہ دعا دیتا ہے بس گزر جاتا ہے۔ میں دیکھ کر بڑا حیران ہوا کہ ان کے اندر Unity کا جو کرنٹ ہے وہ نہیں چل رہا۔ ہر آدمی الگ الگ زندگی بسر کر رہا ہے اور مجھے جانوروں کے دیکھ کر آپ کے رویے سے تکلیف ہوئی کہ یہاں تو چیونٹیاں بہت اچھی ہیں جو جب قطار میں چل رہی ہوتی ہیں تو رک کر دوسری چیونٹی سے اس کا حال ضرور پوچھتی ہیں۔ (اگر آپ نے بھی کبھی غور سے دیکھا ہو تو آپ نے بھی یہ مشاہدہ کیا ہو گا) اور میں یہ دیکھ کر ایک الگ جھونپڑی میں چلا آیا اور میں نے اپنے آپ کو ہی مجتمع کیا کیونکہ آپ لوگوں کے ساتھ رہنے سے میری ذات بھی بٹ گئی تھی اور الگ الگ حصوں بخروں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ میں اس لیے الگ تھلگ بیٹھا رہا اور پھر میں

نے اللہ کے فضل سے محسوس کیا کہ آپ لوگوں کے اندر بھی تعاون اور یکجہتی اور یگانگت پیدا ہونے لگی ہے۔ کیونکہ میری خدا سے یہی دعا تھی۔ جب آپ لوگوں میں یگانگت پیدا ہونے لگی تو آپ کے ارد گرد کے موسم اور ان بخارات میں بھی یکجہتی پیدا ہونے لگی اور مل کر بادل بنتے ہیں چنانچہ بادل بنے اور برکھا ہوئی۔ میں نے تو کوئی کمال نہیں کیا اور نہ ہی میں نے بارش کے لیے دعا مانگی ہے بلکہ میں تو اس جھونپڑی میں بیٹھ کر اس بات پر زور دیتا رہا کہ آپ میں اتحاد ہو اور آپ کی سوچ میں اتحاد ہو۔ میں نے اس دوران آپ کو پہچانا ہے اور محسوس کیا ہے کہ آپ کیا خطا ہے۔ ہمارے بابا جی تھے وہ رات کو کبھی ڈیڑھ کبھی دو بجے تہجد کے بعد ہمیں درس دیا کرتے تھے۔ وہ وقت بڑا خاموش لمحہ ہوتا ہے اور وہاں چند ایک آدمی ہوتے تھے۔ درس کے بعد پھر فجر کی نماز آ جاتی تھی اور سلام پھیرنے کے بعد روشنی آنے لگتی تھی۔ ایک روز فجر کی نماز سے قبل بابا جی نے پوچھا کہ بتاؤ" اندھیرا روشنی میں کب تبدیل ہوتا ہے اور اجالا کب ہوتا ہے۔"

وہاں ہمارے دوست ڈاکٹر صاحب تھے وہ ہم سے بڑے تھے اور بڑے ذہین آدمی تھے۔ انہوں نے کہا کہ سرکار جب آدمی کو دور سے یہ نظر آنے لگے کہ یہ کونسا جانور ہے تو تب اجالا ہو رہا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہ جب کتے اور بکری کی پہچان واضع طور پر ہونے لگے تو روشنی ہو رہی ہوتی ہے۔ وہاں آفتاب

صاحب جنہیں ہم سیکرٹری صاحب کہتے تھے انہوں نے کہا جب درخت اچھی طرح سے نظر آنے لگیں اور آدمی کی نگاہیں یہ بھانپ جائیں کہ یہ نیم یا شہتوت کا ہے تو روشنی قریب تر آجاتی ہے۔

بابا جی نے کہا نہیں یہ بات نہیں ہے۔ روشنی تب ہوتی ہے جب آپ ایک شخص کو دیکھ کر یقین کے ساتھ یہ کہنے لگیں کہ یہ میری ہمشیرہ ہے۔ یہ میرا بھائی ہے۔ جب انسانوں کے چہرے آپ پہچاننے لگیں اور آپ کو ان کی پوری شناخت ہو جائے تو اس کے بعد اجالا ہوتا ہے۔ جانوروں یا نباتات جو جاننے سے اجالا نہیں ہوتا ان کا مطلب تھا کہ "آدمی آدمی کا دارو ہے۔"

آدمی جب آدمی کے قریب آئے گا تو پھر ہی کچھ حاصل ہو گا جب یہ دور جائے گا تو پھر کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ آج کل آپ افغانستان کی جنگ کے حوالے سے ڈیزی کٹر بم کی بڑی بات کرتے ہیں کہ اس نے ایسا کام کیا کہ پتھروں کو ریت میں تبدیل کر دیا اور ہزاروں انسانوں کو چشم زدن میں تہ و تیغ کر دیا۔ ڈیزی کٹر کا ذکر کرتے ہوئے کئی لوگوں کے چہروں پر عجیب طرح کی فتح مندی کے آثار دیکھتا ہوں۔ یہ چشم زدن میں انسانی و نباتاتی تباہی کرنے والے آلات یا بم ترقی یا روشن مستقبل کی دلیل ہر گز ہر گز نہیں ہے کیونکہ جب تک انسان انسان کے

قریب نہیں آئے گا اور اس کے دکھوں کا "دارو" نہیں کرے گا بات نہیں بنے گی۔

ایک بڑے اچھے جلد ساز تھے اور ہم سب علم دوست ان سے مخصوص کاغذوں کی جلدیں کروایا کرتے تھے۔ یہ ہماری جوانی کے دنوں کی بات ہے اور اس جلد ساز کا نام نواز محمد تھا۔ جب ہم ایم۔ اے میں پڑھتے تھے تو ہمارا ایک دوست نشے کا عادی ہو گیا۔ ہم چونکہ سمجھدار، پڑھے لکھے اور سیانے دوست تھے ہم اسے مجبور کرنے لگے کہ تمہیں یہ بری عادت چھوڑ دینی چاہیے ورنہ ہم تمہارا ساتھ نہیں دے سکیں گے اور ہم تمہارے ساتھ نہیں چل سکیں گے۔ وہ بیچارہ ایک تو نشے کی لعنت میں گرفتار تھا دوسرا وہ روز ہماری جھڑکیاں سہتا تھا جس کے باعث وہ ہم سے کنارہ کشی کرنے لگا۔ محمد نواز جلد ساز بڑے خوبصورت دل کا آدمی تھا۔ ہر وقت مُسکراتا رہتا تھا۔ گو وہ اقتصادی طور پر ہمارے دائرے کے اندر نہیں تھا لیکن وہ خوشگوار طبیعت کا مالک تھا۔ اس نے ایک دن اس آدمی (ہمارے دوست) کا ہاتھ تھام کر کہا کہ بھلے تم نشہ کرو اور جتنا مرضی کرو مجھے اس پر اعتراض نہیں ہے اور تو چاہے نشہ کرے یا نہ کرے میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں، تو ہمارا یار ہے اور یار رہے گا۔ اس نے پنجابی کا ایک محاورہ ہے کہ یار کی یاری دیکھنی چاہیے یار کے عیبوں کی طرف نہیں جانا چاہیے۔ خواتین و حضرات آپ

یقین کیجیے کہ بغیر کسی طبعی علاج اور ماہر نفسیات کی مدد کے جب ہمارے نشئی دوست کو محمد نواز جلد ساز کا سہارا ملا تو وہ نشے کی بری اور گندی عادت سے باہر نکل آیا اور صحت مند ہونا شروع ہو گیا۔ انسان کو انسان ہی سہارا دے سکتا ہے۔ اب ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ کیا انفرادی طور پر ہی کسی کا ساتھ دیا جا سکتا ہے یا پھر انسان مدد کے لیے ادارے ہی بناتا رہے۔ پرانے زمانے میں اس بات کی بڑی تلقین کی جاتی تھی کہ "مخلوقِ خدا کا ساتھ دیں" کیونکہ جب تک اس کا ساتھ نہیں دیں گے ان کی طرف سے آنے والی طاقت آپ تک نہیں پہنچ پائے گی۔ مجھے وہ بات یاد آ رہی جو میں نے شاید ٹی وی پر ہی سنی ہے کہ ایک اخبار کے مالک نے اپنے اخبار کی اس کاپی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جس میں دنیا کا رنگین نقشہ تھا اور اس نقشے کو ۳۲ ٹکروں میں تقسیم کر دیا اور اپنے پانچ چھ سال کے کمسن بیٹے کو آواز دے کر بلایا اور اس سے کہا کہ لو بھئی یہ دنیا کا نقشہ ہے جو ٹکڑوں میں ہے تم اسے جوڑ کر دکھاؤ۔ اب وہ بے چارہ تمام ٹکڑے لے کر پریشان ہو کے بیٹھ گیا کیونکہ اب سارے ملکوں کے بارے میں کہ کون کہاں پر ہے کوئی میرے جیسا بڑی عمر کا آدمی بھی نہیں جانتا ہے۔ وہ کافی دیر تک پریشان بیٹھا رہا لیکن کچھ دیر کے بعد اس نے تمام کا تمام نقشہ درست انداز میں جوڑ کر اپنے باپ کو دے

دیا۔ اس کا باپ بڑا حیران ہوا اور کہا کہ بیٹے مجھے اس کا راز بتا کیونکہ اگر مجھے یہ نقشہ جوڑنا پڑتا تو میں اسے نہیں جوڑ سکتا تھا۔

اس پر اس لڑکے نے کہا بابا جان میں نے دنیا کا نقشہ نہیں جوڑا بلکہ نقشے کی دوسری طرف سیفٹی بلیڈ کا اشتہار تھا اور اس میں ایک شخص کا بڑا سا چہرہ تھا جو شیو کرتا دکھایا گیا تھا۔ میں نے سارے ٹکڑوں کو الٹا کیا اور اس آدمی کو جوڑنا شروع کر دیا اور چار منٹ کی مدت میں میں نے پورا آدمی جوڑ دیا۔ اس لڑکے نے کہا کہ بابا اگر آدمی جڑ جائے تو ساری دنیا جُڑ جائے گی۔ خواتین و حضرات میں یہی درخواست اپنی ذات سے بھی کرتا ہوں کہ کاش جانے سے پہلے ایک ایسی صورت پیدا ہو کہ ارد گرد بسنے والے لوگ اور انسان اور اپنے عزیز و اقارب اور ان کے علاوہ لوگوں میں محبت الفت اور یگانگت پیدا ہو جائے اور اچھے لگنے لگیں اور اتنے اچھے لگنے لگیں کہ جتنی اپنی ذات اچھی لگتی ہے، لیکن ایسے ہوتا نہیں ہے۔ ہم تو رفاعی ادارے بنانے پر لگے ہوئے ہیں۔ ماشاءاللہ یہ کام قابل داد ہے۔ ضرور بنائیں لیکن انفرادی طور پر انسانوں کا خیال رکھیں۔ لوگ عام طور پر سسٹم کی بات کرتے ہیں۔ انسان کی بات نہیں کرتے۔ گورنمنٹ کالج (جس کا نام اب گورنمنٹ کالج یونیورسٹی ہے) کے پیچھے ایک محلہ ہے جہاں سے اسٹیشنری کی چیزیں ملتی ہیں۔ میں وہاں سے کبھی کاپیاں، کاغذ، لفافے وغیرہ خریدنے چلا جاتا

ہوں۔ کچھ عرصہ قبل میں وہاں گیا تو ایک دکان پر اسّی پچاسی سال کا بوڑھا آدمی بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ اسی عمر کی اس کی بیوی بیٹھی تھی۔ آخر بوڑھا آدمی سخت مزاج تو ہو ہی جاتا ہے اس طرح وہ بوڑھا شخص اپنی بیوی کی جان عذاب میں ڈال رہا تھا اور اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا "مر جا مر جا، آخر تو نے مر تو جانا ہی ہے اور مجھے اس بات کا پتہ ہے لیکن تیرے مرنے کی مجھے کوئی پروا نہیں ہے تو مر جا دفع ہو جا۔"

وہ کہنے لگی "میں نئیں مردی جدوں اللہ دا حکم ہوئے گا اودوں مراں گی۔" میں نے اس سے کہا بابا کیا بات ہے اس سے کیوں لڑتا ہے۔ کہنے لگا میں اس کے لیے دوائیاں لاتا ہوں لیکن یہ کھاتی نہیں ہے اور جب یہ انہیں کھائے گی نہیں زندہ نہیں رہے گی اور جب یہ زندہ نہیں بچے گی تو میں بھی زندہ نہیں بچوں گا اور اس کا دوائی کھانا میری خُود غرضی کا معاملہ ہے۔ یہ تو ایک تعلق کی بات ہوتی ہے اور بابا اسی بات پر ناراض ہو رہا تھا۔ اس کا اس بڑھیا سے گہرا تعلق تھا اور وہ اس تعلق کا خاتمہ نہیں چاہتا تھا۔ کوئی لڑائی جھگڑا ہو' محبت ہو یا کوئی گیت گا رہا ہو تو یہ باتیں انسان اور انسان کے درمیان ہوتی ہیں اور یہ انسان کو ایک دوسرے کے قریب لا رہی ہوتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب تک انسان انسان کے قریب نہیں آئے گا تب تک وہ سب کچھ ہونے کے باوصف کچھ نہیں ہو سکے گا جس کی ہمیں

آرزو ہے اور جس خواہش اور آرزو کے لیے ہم اپنا دامن پھیلائے رکھتے ہیں اور اس آس میں زندہ رہتے ہیں کہ وہ جنت ارضی کہاں ہے جس کی ہمیں تلاش ہے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین۔ اللہ حافظ۔

عالمِ اصغر سے عالمِ اکبر تک

ہم سب کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔ ہمارے ہاں بڑی دیر سے عالمِ اکبر کا تصور چلا آ رہا ہے اور اس پر بڑا کام بھی ہوا ہے اور اِس کے بارے میں صاحبِ حال لوگ جانتے ہیں اور جو اس میں گزرے ہیں ان کی کیفیت ہم لوگوں سے ذرا مختلف رہی ہے۔

Macrocosm (عالمِ اکبر) کے ساتھ ساتھ Microcosmos (عالمِ اصغر) کا بھی سلسلہ چلا، کہ جو کچھ ہے وہ اس خدا کی طرف سے ہے۔ مغرب کے لوگ خاص طور پر امریکہ اور روس نے اس موضوع پر بڑا کام کیا ہے۔ ہمارے ہاں مشرق میں مولانا روم نے اور ان کے بعد مولانا روم کے شاگرد حضرت علامہ محمد اقبال نے بھی اس پر بہت کچھ لکھا اور بتایا ہے لیکن اس کے اسرار آہستہ آہستہ اس وقت کھلنے لگے جب مغرب میں Parapsychology کا علم بطورِ خاص پڑھایا جانے لگا اور اس کی تفاسیر باہر نکلنے لگیں۔ امریکہ کی انیس کے قریب یونیورسٹیوں جن میں نارتھ کیرولینا کی یونیورسٹی بہت معروف ہے وہ اس سلسلے

میں بہر آگے ہے۔ بھارت کی گیارہ کے قریب یونیورسٹیاں بھی اس پر کام کر رہی ہیں۔ ہم اس پر کام نہیں کرتے کیونکہ اس کو وقت کا ضیاع خیال کرتے ہیں یا سمجھتے ہیں کہ یہ بالکل دقیانوسی تصور ہے لیکن West نے جو تصور قائم کیا ہے وہ Macrocosm اور Microcosmos کا تصور تھا جسے عالمِ اکبر اور عالمِ اصغر کہتے ہیں۔ مغرب والے کہتے ہیں کہ عالمِ اکبر تو وہ کائنات ہے جو آپ کے ارد گرد پھیلی ہوئی ہے اور عالمِ اصغر "میں" ہوں یعنی چھوٹا سا ایک وجود' میرے سے لے کر مینڈک کا وجود۔ اب اس بات پر غور ہو رہا ہے اور بڑی اچھی لائنوں اور خطوط پر سوچا جا رہا ہے کہ عالمِ اکبر کا عالمِ اصغر کے اوپر کوئی اثر پڑتا ہے یا عالمِ اصغر کا کوئی کیا ہوا کام عالمِ اکبر میں پہنچتا ہے؟

کیا یہ بات سچ ہے کہ

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں

وہ اس نتیجہ پر پہنچے (خاص طور پر ویانا یونیورسٹی کے پروفیسر) ہیں کہ اس کا برا شدید اثر بڑتا ہے اور وہ بات جس پر ہم ہنسا کرتے تھے کہ جی ستاروں کا آدمی کے ساتھ اور اس کی قسمت کے ساتھ کیا تعلق؟ ستارہ ستارہ ہے اور اس کی اپنی گردش اور اپنی چال ہے اور آدمی یہاں بیٹھا ہے آخر تعلق کیسے ہو سکتا ہے۔ لیکن

علم بتاتا ہے کہ نہیں آدمی یہاں ایسے ہی بیٹھا نہیں ہے اس کے پُرکھوں اور Arche Types کے ذریعے ایک پورا عمل جاری ہے۔

میں معافی چاہتا ہوں کہ میں ایسے ہی Technically Detail میں چلا گیا۔ میں یہ بات آپ سے اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ ۱۹۵۳ء میں میں پہلی مرتبہ انگلستان گیا۔ میرے لندن میں بڑے پیارے دوست تھے جن سے ملے ہوئے مجھے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ جن میں جاوید، اعجاز، الیاس، گرو بخش اور جگجیت سنگھ وغیرہ شامل تھے۔ یہ سارے لوگ بی بی سی میں کام کرتے تھے اور انہوں نے اپنی پڑھائی بھی جاری رکھی ہوئی تھی۔ اس وقت بی بی سی کا ٹی ہاؤس ایک ایسی جگہ تھی جہاں ہم سارے اکٹھے ہوتے تھے اور گپیں ہانکتے تھے۔ وہاں پر ہمارا دوست الیاس جو تھا وہ بڑا خاموش طبع آدمی تھا۔ وہ سدھانیہ سے پاکستان اور پھر یہاں سے انگلستان چلا گیا تھا۔ اسے بائیں کان سے سنائی نہیں دیتا تھا۔ لاہور میں اس نے آپریشن بھی کروائے لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس نے لندن سے بھی آپریشن کروایا لیکن ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اس کا یہ مسئلہ لا علاج ہے۔ پہلے اس نے چارٹرڈ اکاؤنٹنگ کا کام شروع کیا لیکن وہ اس میں ناکام ہو گیا پھر اس نے بیرسٹری والا پڑھائی کا سلسلہ شروع کیا جو اس کے دوسرے دوست کر رہے تھے۔ اس میں بھی اس کا دل نہ لگا۔ یہ بس عجیب آدمی تھا۔ ایک دن ہم شام کو

بیٹھے ہوئے تھے تو جگجیت کہنے لگا ”اوئے تم تو ہم سکھوں سے بھی گئے گزرے ہو‘ یہ تمہاری اردو زبان بھی کیا زبان ہے اس میں تم لکھتے ”خ و آب“ ہو اور پڑھتے ”خاب“ ہو۔ لکھتے ”خ وش“ ہو اور پڑھتے ”خش“ ہو۔ یہ تو کوئی زبان نہ ہوئی۔ اعجاز یہ سن کے کہنے لگا۔ دیکھو بھئی گرائمر کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ کافی دیر تک یہ بحث ہوتی رہی اور ہم بڑے غور سے اسے سنتے رہے۔ میں نے بھی اپنے علم کے بمطابق اس موضوع پر بات کی۔ الیاس ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ جگجیت سنگھ ”ایہہ جیہڑی خواب دے وچ ’و‘ اے نا ایہہ کیہندی اے میں نئیں بولدی بس اینا ای راز اے“ وہ اس مزاج کا آدمی تھا اور وہ کہتا تھا کہ ”بس میں نئیں بولدی“ وہ ذرا دھیما اور ڈھیلا سا آدمی تھا۔ مجھے اعجاز کہنے لگا کہ تو الیاس سے پوچھ کہ اس کے ساتھ یہاں کیا واقع گزرا۔ میں نے اس سے پوچھا کیوں بھئی تیرے ساتھ کیا ہوا؟ کہنے لگا یار میں نے ایک پڑھائی شروع کی‘ پھر چھوڑ دی۔ پھر دوسری کی اس میں بھی دل نہ لگا۔ میں تھوڑا سا پریشان تھا اور ایک دن شام کے وقت آ رہا تھا اور مجھے سینٹ جونز ووڈ سٹریٹ سے ہو کے البرٹ روڈ جانا تھا۔ البرٹ روڈ کراس کر کے پھر مجھے ریمنز پارک جانا تھا۔ میں Potato Chips کھاتا جا رہا تھا اور سڑک سنسان تھی۔ ایک اور سنسان گلی کے درمیان میں میں جب پہنچا تو ایک لمبے تڑنگے امریکن سیاح نے مجھ سے کہا

کہ Do you know the Hyde park اور میں نے اس سے پتا نہیں کیوں کہہ دیا کہ Yes I know but I do not tell you کیونکہ اس طرح کا جواب دینے کا کوئی "تک" نہیں تھا۔ وہ امریکی سیاح "کھسچو" تھا اس نے "کھبے" بائیں ہاتھ کا ایک گھونسا میری کنپٹی پہ مارا اور میں گھٹنوں کے بل زمین پر گر گیا۔ جب میں گھٹنوں کے بل گر گیا تو میں نے سر اٹھا کر اس سے کہا Thank you very much

اور اس امریکی نے برجستہ کہا: you are well come

الیاس نے کہا کہ میں اس کے یہ الفاظ تو سن سکا لیکن پھر میں بے ہوش ہو گیا اور وہیں پڑا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے ہوش آیا تو مجھے شرمندگی اس بات پر تھی کہ میں نے اسے "تھینک یو" کیوں کہا۔ مجھے چاہیے تھا کہ اسے جواباً مارتا یا پھر نہ مارتا۔ الیاس اب دوستوں کے تنگ کرنے پر جواز یہ پیش کر رہا تھا کہ غالباً اس کا جو گھونسا تھا وہ میری کنپٹی کے ایسے مقام پر لگا تھا جہاں سے شریانیں دماغ کے اس حصے میں جاتی ہیں جو بڑا ہی شکر گزار ہوتا ہے اور وہ تھینک یو تھینک یو کہتا ہے اور میں نے اسے مجبور ہو کر Thank you کہہ دیا۔

الیاس نے مزید بتایا کہ اگلے دن جب وہ صبح سویرے اٹھا(میرے پاس ایک الارم تھا جو جب چلتا تھا تو اس کے ساتھ بی بی سی ریڈیو کی نشریات چلنا شروع ہو جاتی تھیں)اور جب الارم کے ساتھ ریڈیو چلا تو میں حیران رہ گیا کہ اس کی آواز کچھ عجیب سی تھی چنانچہ جب میں نے اپنے دائیں کان میں انگلی ڈال کے بند کیا تو میرا بایاں کان ڈن ڈنا ڈن کام کر رہا تھا۔ میں پھر چیخ مار کے باہر نکلا اور اپنی لینڈ لیڈی سے لپٹ گیا اور خوشی سے کہا کہ I can listen and hear from both Ears

وہ بھی بڑی خوش ہوئی اور کہا کہ Really Ilyas

میں نے کہا کہ بالکل تم کچھ لفظ بولو اور اس طرح وہ میرا ایک کان بند کر کے ٹیسٹ لیتی رہی۔ الیاس کہنے لگا کہ میں اب سوچتا ہوں کہ کیا یہ حادثاتی واقعہ تھا؟ ایسے ہی ہو گیا یا ایک آدمی کو کیلیفورنیا سے نیویارک، نیویارک سے لندن بھیجا گیا اور وہ چلتا ہوا اور سارا سفر طے کر کے یہاں پہنچا اور عین اس وقت اس گلی میں پہنچا جب کہ مجھے بھی وہاں سے گزرنا تھا اور ایک شریف آدمی کی طرح میں نے اسے راستہ بتانا تھا جو دراصل میری طرف سے حماقت کے مترادف تھا اور میں نے اس کے برعکس اسے کیوں کہا کہ ہاں راستہ تو میں جانتا ہوں بتاؤں گا نہیں۔

یہ سب کچھ کیا ہے؟ اور اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ اور کیا ہم بڑی کائنات میں جو عالمِ اکبر ہے اس کے ساتھ وابستہ ہیں اور جو کچھ وہاں سے طے ہوتا ہے یا لکھا گیا ہے اور کیا اس لکھے کے مطابق سارے کام ہو رہے ہیں یا کہ ہمارے سارے افعال انفرادی طور پر طے پاتے ہیں۔ یہ بات ان دنوں بی بی سی کی کینٹین میں زیرِ بحث تھی لیکن کوئی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا تھا اور سارے الیاس کو اس کی خام خیالی اور نالائقی کی بات ہی قرار دیتے تھے۔ اس وقت شاید عالمِ اکبر اور عالمِ اصغر کا علم اس قدر آگے نہیں بڑھا تھا۔ ہم جب بھی اس حوالے سے بحث کرتے ہیں تو اکثر بحث میں یہ کہتے ہیں اگر اللہ پر پورا ایمان ہو اور اگر انسان کو اپنی ذات پر اعتماد ہو یا اگر انسان کی خودی بلند ہو تو وہ کچھ کر سکتا ہے۔ پھر خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب تو کتابی باتیں ہیں اور ٹیکسٹ کی باتیں ہیں جو ہم نے پڑھی ہوئی ہیں۔ ہم تو یہ پوچھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ اللہ پر ہم ویسا اعتماد کیسے لائیں جیسا کہ ہونا چاہیے اور جس طرح کے اعتماد کو ہم ذکر کرتے ہیں میرے اباجی نے بتایا تھا کہ اللہ میاں ہوتے ہیں اور میں اس بات کو لے کر چلا آرہا ہوں۔ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں،فوت ہو جاؤں گا اور اس کا محض یہی تصور میرے ساتھ رہے گا۔ زندگی کے اور بھی تو بہت سارے معاملات ہیں۔ ان میں ہمارا کتابی اور ٹکسٹ بک کا علم وہ ہمیں ایک بات فیڈ کر دیتا ہے لیکن وہ ہمارا سہارا نہیں بنتا۔ آگے نہیں لے جاتا

لیکن جو مرشدوں اور گروؤں کا علم ہوتا ہے وہ انفارمیشن کے علم سے مختلف ہوتا ہے۔ یہ انفارمیشن کا علم وہ ہے جو ہم اور آپ نے حاصل کیا ہے۔ یہ علم ہمیں اطلاعات کے طور پر ملتا ہے اور استاد اور طالب علم کے درمیان ہمیشہ ایک فاصلہ ہوتا ہے اور علم دور کھڑے ہو کر یا چاک سے لکھ کر دور بیٹھے اسٹوڈنٹس کو فراہم کیا جاتا ہے اور یہ فلائنگ علم Flying Kiss کی طرح سے پہنچتا ہے اور ایسے ہی اثر انداز ہوتا ہے جیسے Flying Kiss اثر انداز ہوتی ہے (اس مثال پر معافی چاہتا ہوں) لیکن گرو کا جو علم وہ اس سے مختلف ہے۔ یہ اس لیے مختلف ہے کہ گرو اور چیلے کے درمیان یا مرشد اور مرید کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہوتا فاصلہ رکھا نہیں جاتا۔ قربت ہوتی ہے۔ مرشد چٹائی پر بیٹھ کر مرید کو تعلیم دیتا ہے اور مرید تعلیم حاصل کرتا ہے۔ اکثر و بیشتر اس کے ہاتھ گرو کے پاؤں پر ہوتے ہیں یا زانوں پر ہوتے ہیں۔ اتنی قربت کے باعث وہ اپنے استاد یا مرشد کے اتنے قریب آجاتا ہے کہ وہ اس کو بہت اچھا لگنے لگتا ہے اور اسے اپنے گرو یا مرشد سے پیار ہو جاتا ہے اور ایک دن ایسا ہوتا ہے کہ وہ شاگرد شوق میں آکے فرطِ محبت سے اپنے گرو کی "چھنگی" کھا جاتا ہے۔ گرو اس کو نہ منع کرتا ہے نہ اس کو انکار کرتا ہے اور اسے کھانے دیتا ہے۔ دوسرے دن شاگرد اس کی دوسری "چھنگی" بھی کھا جاتا ہے اور آہستہ آہستہ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے

وہ سارے مرشد کو کھا جاتا ہے۔ اب مرشد اس کے پیٹ کے اندر ہے اور معدے میں اتر کر اس کی رگ رگ میں سرائیت کر گیا ہے اور مرشد کا سارا علم سارے کا سارا مرید کے بدن کے اندر خون کی صورت دوڑنے لگتا ہے۔ اسی لیے آپ نے دیکھا ہو گا کہ آستانوں پر جب میلادیا درود شریف کی محفل ہوتی ہے تو(خاص طور پر سلسلہ نقشبندیہ میں کیونکہ میں نے ولایت میں اکثر ایسے ہی دیکھا ہے۔ لندن اور نیویارک میں بھی وہاں انگریز ترک بھی خوب درود شریف پڑھتے ہیں) تو وہاں کھڑے ہو کر ایک شجرہ پڑھا جاتا ہے جس میں شاعری نہیں ہوتی۔ وہ ایسے ہی ہوتا ہے کہ

میرے پیر اولیا کے واسطے

حضرت نظام الدّین کے واسطے

وہ اس طرح سے پڑھتے چلے جاتے ہیں اور ایک کے بعد ایک گرو کا نام آتا چلا جاتا ہے۔ وہ اس بات کا اشارہ ہوتا ہے۔ دوسرے نے پہلے سے علم حاصل کیا اور اس طرح یہ پٹی آگے چلتی جاتی ہے۔ اس طرح سے علم آگے سے آگے عطا ہوتا ہے۔ ولایت کی طرح ڈگریاں عطا نہیں ہوتیں۔ گرو کے علم میں یہ آسانی ہوتی ہے کہ آپ کو کتابی علم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ ایسی جو بھی بات جس میں

مرشد یا گرو بولتا ہے وہ کرتے ہیں تو وہی ہو گی جو مرشد کرتا رہا ہے۔ آپ منہ میں روٹی کا ایک لقمہ رکھ کے تین دن گھومتے رہیں وہ آپ کی نشوونما کا باعث نہیں بن سکے گا۔ جب تک وہ آپ کے معدے میں نہ اتر جائے اور معدے میں اتر کر آپ کے خون کا حصہ نہ بن جائے اور پھر آپ کو تقویت عطا ہوتی ہے۔ میں آپ اور ہم سب منہ کے اندر رکھے علم کو ایک دوسرے کے اوپر اگلتے رہتے ہیں اور پھینکتے رہتے ہیں اور پھر اس بات کی توقع کرتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ ہم کو اس سے خیر کیوں حاصل نہیں ہوتی۔ حالانکہ میں نے یہ بات بڑی اچھی کی تھی اور بڑی سوچ سمجھ کے کی تھی اور وہ بات جو گرو آپ کو عالمِ اکبر سے عالمِ کبیر کے ساتھ وابستہ کر کے دیتا ہے اور اس کے اسرار و رموز بیان کرتا ہے جبکہ کتابی صورت میں صرف اپنا آپ پیش کر کے یا اپنے آپ کو فولڈر بنا کے پیش کیا جاتا ہے۔ میرا یہ ذاتی خیال ہے کہ کہ واقعی جو عالمِ صغیر ہے جو میں ہوں' جو آپ ہیں یہ سارے کے سارے بنی آدم ادائے یک جگرن کی طرح سے ہیں اور جب اقبال کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ انسان تو بڑی حدیں عبور کر کے کئی بار تو عالمِ کبیر سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔

بات الیاس میاں سے کہاں سے کہاں چلی گئی لیکن اگر وہ واقعی عالمِ اصغر اور عالمِ اکبر میں کسی وابستگی کو جاننے کے خواہاں ہیں تو اس کے لیے ہمارے بزرگوں نے

پہلے ہی کہ دیا ہے کہ آپ اپنے نفس کو جان جائیں تو پھر آپ خدا کو جان لیتے ہیں' پا سکتے ہیں اور جب خدا کو جان جائیں گے تو پھر آپ عالمِ اکبر سے بھی آگے گزر جائیں گے۔ اپنے نفس کو جاننے کے لیے بڑی اہم بات اور فارمولا یہ ہے کہ شام کے وقت آپ مغرب کی نماز کے بعد دیوار کے ساتھ ''ڈھو'' لگا کر اپنے آپ کو اور اپنے اس چھوٹے سے چوزے کو تلاش کریں جو بڑے بڑے تختوں کے نیچے چھپا ہوا ہے۔ وہ چوزہ ہمارا نفس ہے۔ اس کے اوپر ہم نے بڑے بڑے تختے لگائے ہوئے ہیں۔ ایک تختہ ہوتا ہے دانشور، ایک ہوتا ہے پہلوان۔ ایک لیڈر کے نام کا ہوتا ہے۔ ایک امیر آدمی کے نام سے ہوتا ہے تو دوسرا کسی اور نام کا۔

اس طرح ہم بچپن سے لے کر اوپر تک بہت سارے ''پھٹے'' لگاتے چلے جاتے ہیں تو جب ہمارا چوزہ باہر بازار میں نکلتا ہے تو یہ تختے کھڑ کنے لگتے ہیں اور سارے لوگ دیکھتے ہیں کہ جناب وہ ہیرو جا رہا ہے۔ جناب وہ رائٹر جا رہا ہے۔ یہ اشفاق صاحب ہیں جی اور دانشور ہیں۔ اگر کوئی باہمّت آدمی جس طرح کچھ لوگ کرتے بھی ہیں وہ ہمت سے زور لگا کر' کندھا دے کر ان پھٹوں یا تختوں کے نیچے سے اپنے نفس کو نکال کر اس کی اصل شکل و صورت سے آشنائی حاصل کر کے عالمِ اکبر سے وابستہ ہو کر بہت آگے نکل جاتے ہیں اور جو کہا گیا ہے کہ ''جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔'' اور رب کو پہچان لینے کے

بعد کوئی مشکل رہ ہی نہیں جاتی ہے۔ دنیاوی زندگی میں سب سے مشکل کام اس تختے کو ہٹانا ہے جو ہم نے بری محنت سے بڑے بڑے وزنی صندوقوں میں اپنے اوپر بٹھا رکھے ہیں۔ اب یہ سب آپ کے سامنے ہیں۔ میں تو ساری زندگی ان تختوں کو ہٹا نہیں سکا۔ میں تو ان پٹھّوں تختوں سمیت ہی لحد میں جاؤں گا اور فرشتے وہ تختے دیکھ کر حیران ہوں گے کہ یہ کن چیزوں کو اپنے ساتھ لگائے پھرتا ہے جس طرح لوگ اپنی ڈگریوں کو فریم کر کے لگاتے ہیں' ہمارے بزرگ اپنے نفس کی تلاش کے کام کو تلاوت الوجود کہتے ہیں کہ اپنے وجود کی تلاوت کرو۔ الیاس میاں ابھی تک لندن میں ہی ہے لیکن ابھی تک اس کا وہاں دل نہیں لگا اور وہ ابھی تک یہی سمجھتا ہے کہ "خواب" کی "و" ہم سب سے ناراض ہے اور کہتی ہے کہ جا میں نہیں بولتی۔ بڑی مہربانی' آپ کا بہت بہت شکریہ۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

انسانوں کا قرض

میری زندگی میں عجیب و غریب واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں اور ان میں سے کچھ کچھ میں آپ کی خدمت میں بھی پیش کرتا رہتا ہوں۔ اکثر لوگ مجھے راستہ روک کر پوچھتے ہیں کہ ہمارے ساتھ ایسے واقعات کیوں پیش نہیں آتے جس طرح کے آپ کے ساتھ پیش آتے ہیں تو میں ان سے عرض کرتا ہوں کہ میں تھوڑا وصول کنندہ یا (Receptive) ہوں اور جو Vibration آپ اپنے بدن یا وجود میں رکھتے ہیں وہ باہر کی وائبریشن (ارتعاش) سے مل جاتا ہے اور پھر وہ ہی کچھ ہونے لگتا ہے جس کی آپ کے اندر کو توقع تھی یا جس کا انتظار تھا۔ میں ہر روز صبح سویرے اپنے بستر سے ہمیشہ ایک دستک پر بیدار ہوتا ہوں اور جب میں دروازہ کھولتا ہوں اور جب میں دروازہ کھولتا ہوں تو میرے گھر کے دروازے پر ایک سر ٹوپ لگائے ہوئے، چیک کا سوٹ پہنے ہوئے اور ہاتھ میں رولر پکڑے ہوئے ایک شخص کھڑا ہوتا تھا۔ وہ میرے گھر کے دروازے کو زور

سے بجاتا ہے اور جب میں باہر نکل کر اس سے ملتا ہوں تو وہ مجھے ہمیشہ ایک ہی بات کہتا ہے کہ "آپ کے ذمہ میرا قرض واجب ہے، وہ قرض لوٹائیے۔"

اور میں بہت حیران ہو کر اس کی شکل دیکھتا ہوں اور اس سے کہتا ہوں کہ میں نے تو آپ سے کبھی کوئی قرض نہیں لیا لیکن وہ بہت سے کاغذات کے پلندے نکال کر میری طرف بڑھا دیتا ہے اور کہتا ہے کہ "آپ نے مجھ سے 35 بلین ڈالر قرض لیا ہے اور یہ دستخط ہیں آپ کے بڑوں کے' آپ کے آباؤاجداد کے جنہوں نے یہ قرض لے کر کہیں استعمال کیا ہے۔"

اور میں اس کی بات سن کر شرمندہ اور نہایت "کچا" پڑ کے اس سے کہتا ہوں کہ اس قرض بابت مجھے تو علم نہیں کہ یہ کب لیا گیا تھا؟ کیوں لیا گیا؟ اور کس جگہ پر استعمال ہوا؟

لیکن وہ کہتا ہے کہ اس قرض کی ادائیگی کا جلد بندوبست کریں ورنہ یہ آپ کے لیے اچھا نہیں ہو گا۔ خواتین و حضرات میرے ہر دن کی ابتدا کچھ اسی طرح سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد میں پھر گلیوں، بازاروں، پارکوں میں گھومتا رہتا ہوں اور اس بوجھ کو اپنے ساتھ اٹھائے پھرتا ہوں۔ بہت تنگ سے لوگ ایسے ہوں گے جن کی طبیعتوں اور کندھوں پر یہ بوجھ نہیں ہو گا لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے اس

شخص کی شکل سے بھی خوف آتا ہے ار مجھے اس بات کا خوف بھی رہتا ہے کہ کل صبح پھر وہ میرے دروازے پر آکر اسی زور سے ڈنڈا بجائے گا اور مجھ سے اپنے قرض کا تقاضا کرے گا۔ میں پارکوں میں گھومتا رہتا ہوں اور وقت گزار تا رہتا ہوں لیکن مجھے معلوم نہیں ہے کہ وہ قرضہ جو میرے ساتھیوں، بڑوں یا پرکھوں نے لیا تھا وہ کہاں ختم ہوا؟ کیسے خرچ ہوا؟ کس مقام یا جگہ پر اس کا استعمال ہوا؟ یا اس قرض کی رقم سے کیا فائدہ اٹھایا گیا؟ اور اس دولت کا ذاتی، اجتماعی یا قومی طور پر کیا فائدہ حاصل ہوا؟ ایسی باتوں کا میری طبیعت پر بوجھ پڑ تا رہتا ہے اس لیے آپ سے عموماً کہتا رہتا ہوں اور اس بوجھ کی موجودگی میں میں شرمندگی کے عالم میں کچھ اپنے آپ سے شرمسار، کچھ اپنے عزیز و اقارب اور کچھ اپنی آنے والی نسل اور خاص طور پر پوتوں سے شرمندہ سا وقت گزر تا ہوں۔ اللہ نہ کرے کہ آپ پر ایسا وقت آئے۔ مجھ پر ایک طرح سے تھوڑی سے تشفی اس طرح سے ہو جاتی ہے اور ذرا سا Respite یوں کم ہو جاتا ہے۔ کہ جو قرض خواہ ہے اس کو بھی بڑی الجھن کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ قرض خواہ بھی آسانی میں نہیں ہوتا۔ مقروض کو خیر بالکل ہی دبا ہوا ہوا ہوتا ہے لیکن قرض دینے والا بھی ایک عجیب طرح کے شکنجے میں پھنسا ہوا ہوتا ہے۔ اور دونوں ایک دوسرے کی جان کے دشمن بنے ہوتے ہیں اور ان کے درمیان انسانی رشتے وہ سارے کے سارے

منقطع ہو جاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے بچپن میں ہمارے قصبے میں ایک شوکت صاحب تھے وہ ابتدائی قسم کا ڈینٹسٹری کا امتحان پاس کر کے آئے تھے اور انہوں نے گاؤں میں کلینک کھولا تھا۔ وہ مصنوعی دانت تیار کرتے تھے اور ڈاکٹر شوکت نے گاؤں میں پہلی بار مصنوعی دانت متعارف کروائے۔ وہاں گاؤں میں ایک سردار تھے (سردار کئی قسم کے ہوتے ہیں آپ کے ذہنوں میں تو فلمیں یا ٹی وی ڈرامے دیکھ کر سرداروں کا کچھ اور ہی امیج بنا ہوا ہو گا۔ وہ سارے ہی ویسے نہیں ہوتے۔ سارے ہی ٹی وی والے بابا سائیں نہیں ہوتے، کچھ چاچا سائیں بھی ہوتے ہیں اور خالی سائیں بھی ہوتے ہیں)۔ انہوں نے ڈاکٹر شوکت سے مصنوعی دانت لگوائے اور تمام کے تمام دانت نئے لگوائے اور وہ یہ مہنگا لیکن آرام دہ سودا کر کے مزے سے گھومتے پھرتے رہے لیکن رقم ادا نہ کی۔

ایک دن ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ سردار صاحب میرے پیسے ادا کریں لیکن اس دور میں ڈیڑھ سو کی رقم ادا کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اب ڈاکٹر صاحب قرض خواہ تھے اور گاؤں کے سردار یا بابا سائی مقروض تھے۔ ڈاکٹر صاحب ان سے روز صبح سویرے رقم کا تقاضا کرتے تھے اور وہ آج کل کے وعدے پت ٹرخاتے رہتے تھے لیکن رقم دے نہیں پاتے تھے۔ ایک روز دوپہر کے وقت ڈاکٹر شوکت صاحب غصے کے عالم میں سردار جی کے پاس آئے اور وہاں تو تو میں

میں شروع ہو گئی اور وہ کہنے لگے کہ آپ میرے پیسے ادا کریں ورنہ میں نے آپ کو یہ جو "بیڑھ" (بتیسی) لگایا ہے وہ واپس کر دیں۔ وہ سردار صاحب بھی علاقے کے آخر مالک تھے۔ غصہ کھا گئے چنانچہ تو تو میں میں کے بعد ان دونوں میں باقاعدہ ہاتھا پائی کی نوبت بھی آن پہنچی اور اس کے بعد ڈاکٹر شوکت بڑی مایوسی کے عالم میں واپس اپنے کلینک پر پہنچ گئے۔ میں ڈاکٹر صاحب کے کلینک میں مشینیں، آلات اور یہ دیکھنے کہ مصنوعی دانت کیسے بنتے ہیں بڑے شوق سے چلا جاتا تھا۔ اس وقت میں فرسٹ ائیر میں پڑھتا تھا۔ میں وہاں بیٹھا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنا بازو میرے آگے کر کے کہا "دیکھ رہے ہو بابا سائیں کے کرتوت میں اس سے اپنا قرض مانگنے گیا اور اس ظالم نے مجھے دندی کاٹ لی جیسے کتا کاٹتا ہے۔"

اس نے کہا کہ دکھ کی بات یہ ہے کہ اس نے "دندی" بھی ان دانتوں سے کاٹی جو میں نے اسے بنا کر دیئے تھے۔ اس طرح خواتین و حضرات قرض خواہ کا ایک اپنا دکھ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ اگر میں نے اس کو دانت نہ بنا کر دیئے ہوتے تو وہ مجھے کاٹ نہیں سکتا تھا۔ جب میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں تو مجھے وہ واقعہ یاد آ جاتا ہے اور میں سوچتا ہوں کہ میں بھی کہیں نہ کہیں کاٹا ضرور ہوں کیونکہ میں مقروض ہوں اور میرے سر پر 35 بلین ڈالر کا قرض ہے۔ میری

طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ یہ بوجھ اس قدر زیادہ ہے کہ میں اس کا کوئی مداوا نہیں کر سکتا، ہر وقت مجھے کسی نہ کسی ایسے الجھاؤ میں اس لیے الجھنا پڑتا ہے کہ میں اس قرض کو بھولا رہوں لیکن ہمارا اپنے قرض خواہ کے ساتھ رشتہ استوار نہیں ہوتا اور قرض خواہ بھی بہانے نکال نکال کے اور ہماری غلطیاں پکڑ پکڑ کر ہمارے کندھوں پر بوجھ اور بڑھاتا رہتا ہے تاکہ ہمیں واجب الادا قرض کا احساس رہے۔

اوکاڑہ میں ایک میلہ لگتا ہے (اب پتہ نہیں لگتا ہے یا نہیں کیونکہ میری جوانی کے زمانے میں لگا کرتا تھا) اور مجھے ان میلوں ٹھیلوں سے بہت دلچسپی ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہاں پر ایک پنگوڑا لگا ہے اور کا مالک آٹھ آٹھ آنے لے کر گول گھومنے والے پنگھوڑے سے جھولے دے رہا ہے۔ وہ پنگوڑا آج کل کے پنگوڑوں کی طرح بجلی یا مشین سے چلنے والا نہیں تھا بلکہ پنگھوڑے والا اسے ہاتھ کے زور سے گھماتا تھا۔ میں وہاں بغیر کسی مقصد کے کھڑا ہو کر اسے دیکھنے لگا تو ایک گاؤں کا آدمی وہاں آیا۔ اس کی پگڑی کھل کر گلے میں پڑی ہوئی تھی اور اس نے کھدر کی تہ بند باندھی ہوئی تھی۔ وہ بھی اس پنگھوڑے کے لکڑی کے گھوڑے پر سوار ''جھوٹے'' (جھولے) لے رہا تھا۔ جب ایک ''پور'' (چکر) ختم ہوا اور سارے اتر گئے تو تب بھی وہ شخص وہیں بیٹھا رہا اور وہ اکڑوں حالت میں بڑی تکلیف اور

پریشانی میں ویسے ہی گھومتا رہا جب وہ تیسرے چکر کے اختتام پر بھی نہ اترا تو میرا اس میں تجسّس بہت بڑھ گیا اور میں نے آگے بڑھ کر اسے کہا کہ آپ نے ''جھوٹے'' لے لیے ہیں اور آپ اترتے کیوں نہیں ہیں۔ اگر آپ کو یہ چکر پسند ہیں تو پھر آپ کے چہرے پر خوشی، مزے اور بشاشت کے اشارہ ہونے چاہیں جو بالکل نہیں ہیں۔ اس نے کہا کہ جناب بات یہ ہے کہ یہ جو پنگھوڑے والا ہے اس سے میں نے تیس روپے لینے ہیں اور میں ہفتہ بھر سے اس کے پیچھے گھوم رہا ہوں اور یہ میرا قرضہ نہیں دے رہا ہے اور اب میں نے اس کا یہی حل سوچا ہے کہ میں اپنے قرضے کے بدلے اس کے پنگھوڑے پر ''جھوٹے'' لوں۔ اب یہ میرا 29واں پھیرا جا رہا ہے اور ہر مرتبہ میں آٹھ آنے کم کرتا جا رہا ہوں اور اس طرح سے میں اپنا قرضہ واپس لے رہا ہوں۔ حاضرین محترم میرے دل میں بھی ایسا خیال آتا ہے کہ کاش میرا بھی کوئی اس طرح سے سودا طے ہو جائے اور میں نے اپنے قرض خواہ کو جو 35 بلین ڈالر دینے ہیں تو میں اس کو بھی کسی گھوڑے پر بٹھا کر ایسے چکر دوں جو ذہنی، جسمانی، نفسیاتی انداز کے چکر ہوں اور وہ 20 ویں پھیرے پر ہی کہہ دے کہ میں تمہیں قرض معاف کرتا ہوں اور تم میری جان چھوڑو لیکن میرا قرض خواہ اس دیہاتی جیسا نہیں ہے۔ وہ دیہاتی تو بڑا سیدھا، بھلا سا اور نیک آدمی تھا اس کا غصہ تو ایک چھوٹی سی پٹڑی پر چل رہا تھا جبکہ میرے

قرض خواہ کا غصہ میری ساری کائنات پر محیط ہے۔ اس نے میری زندگانی کو اپنے شکنجے میں لے رکھا ہے اور وہ مجھے چھوڑتا ہی نہیں ہے۔ آغا حشر کا جب طوطی بولتا تھا تو فلم والے ان کے پیچھے پیچھے بھاگتے تھے کہ آپ فلم کے لئے کچھ لکھیں لیکن وہ اپنی تھیٹر کی زندگی اور اس تصور میں اتنے مگن تھے کہ وہ فلم والوں کو گھاس نہیں ڈالتے تھے۔ مختار بیگم بتاتی ہیں کہ انہیں کپڑے سلوانے اور پہننے کا بڑا شوق تھا۔ بمبئی کا ایک بڑا معروف درزی تھا۔ آغا حشر نے اپنا سوٹ سلنے کے لئے اسے دیا اور کہا کہ آپ مجھے ایک تاریخ بتا دیں تاکہ میں اپنا سوٹ آ کر لے جاؤں کیونکہ وقت کی کمی کے باعث میں بار بار نہیں آ پاؤں گا۔ انہیں تاریخ بتا دی گئی اور جب مقررہ تاریخ پر وہ اپنا سوٹ لینے آئے پر درزی نے کہا کہ جی میں ابھی تک سوٹ کی کٹنگ نہیں کر سکا۔ اس پر آغا صاحب بہت ناراض ہوئے اور واپس آ گئے۔ اس درزی نے عرض کی کہ میں آئندہ ہفتہ کو آپ کا سوٹ تیار کر کے رکھوں گا۔ آغا صاحب ہفتے ہو گئے تو بھی سوٹ تیار نہ تھا، درزی نے کہا کہ سر آپ اتوار کو آ جایئے گا میں چھٹی کے دن بھی آپ کی خاطر دوکان کھول لوں گا۔ جب وہ سنڈے کو گئے تو تب بھی سوٹ تیار نہ تھا۔ اس طرح وہ آتے اور جاتے رہے۔ جب آغا حشر نے ٹیلر ماسٹر کی دوکان پر جانا چھوڑ دیا تو وہ درزی سوٹ سی کر اور اسے پیک کر کے خدمت میں حاضر ہو گیا۔ آغا صاحب نے کہا کہ تمہارے

پیسے تمہیں مل جائیں گے اور اس طرح سے مقروض اور قرض خواہ کا رشتہ شروع ہو گیا۔ ایک ہفتے کے بعد درزی بل مانگنے آ گیا تو انہوں نے کہا کہ آپ فکر مت کریں آپ کا بل آپ کو مل جائے گا۔ اب آغا صاحب کو درزی پر قیمتی وقت ضائع کرنے کا غصہ تھا اور وہ بدلہ لے رہے تھے۔ درزی نے کوئی چار پانچ چکر لگائے۔ مختار بیگم بتاتی ہیں کہ وہ درزی بے چارہ ایک دن رونے والا ہو گیا اور کہنے لگا کہ آغا صاحب آپ ایسا کریں کہ مجھے ایک آخری وقت یا تاریخ بتا دیں میں آپ کو درمیان میں تنگ نہیں کروں گا۔ آغا صاحب نے کہا کہ آپ ایسا کریں کہ ہر جمعرات کو صبح 10 بجے آ جایا کریں۔ وہ بے چارہ روتا پیٹتا چلا گیا۔ یہ واقعہ بتانے کا میرا مقصد یہ ہے کہ خالی مقروض پر ہی بوجھ نہیں ہوتا قرض خواہ بھی جال میں پھنسا ہوتا ہے۔

ایک آدمی بڑا پریشان تھا وہ راتوں کو جاگتا تھا اور چیخیں مار مار کر روتا تھا۔ وہ ایک ڈاکٹر کے پاس آیا تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آپ اپنے ڈپریشن کی اصل وجہ بیان کریں؟ آپ کیوں اس قدر پریشان ہیں۔ اس نے بتایا کہ میرے ذمہ ایک لاکھ روپے قرض واجب الادا ہے جو مجھے ادا کرنا ہے لیکن میں اس کی ادائیگی نہیں کر سکتا۔ راتوں کو اس فکر سے جاگتا ہوں اور دن کو اس قرض کو چکانے کی تدبیریں کرتا رہتا ہوں۔ ڈاکٹر نے کہا دیکھئے آپ کے ذمے قرض ایک کاغذ کے ٹکڑے پر

ہی لکھا ہوا ہے ناں! اس کو اہمیت نہ دیں، دفع کریں جائیں اور اس کاغذ کے ٹکڑے کو پھاڑ دیں۔ اس نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب بڑی مہربانی اور وہ چلا گیا۔ وہاں ایک اور شخص بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب یہ جو شخص پریشان آیا تھا اور خوش خوش واپس گیا ہے آپ نے اسے کیا کہا ہے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں نے اسے قرض کے معاہدے والا کاغذ پھاڑنے کا مشورہ دیا ہے۔ یہ سن کر وہ شخص رونے دھونے لگا اور کہنے لگا ڈاکٹر صاحب اس شخص نے مجھ ہی ہی ایک لاکھ روپے کا قرض لے رکھا ہے۔ عید کے روز بھی میں یہیں کہیں ایک غیر معروف کونے میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک بابا آگیا، وہ پرانی وضع کا نیم فقیر یا نیم صوفی قسم کا تھا۔ وہ میرے پاس مخصوص قسم کے شعری جملے جو ہم بچپن میں سنا کرتے تھے۔

میرے پاس ایک پانچ روپے کا نوٹ تھا وہ میں نے اس کو دیا کیونکہ میرے بچے مجھے کہا کرتے ہیں کہ اب آپ کسی فقیر کو پانچ روپے سے کم نہ دیجئے گا کیونکہ وہ ناراض ہوتے ہیں۔ اس شخص نے خوش ہو کے وہ نوٹ لے لیا اور کہنے لگا کہ تو بڑا پریشان سا ہے اور یہاں اکیلا بیٹھا ہوا ہے کیا بات ہے؟

میں نے کہا کہ مجھ پر بڑا قرض ہے اور میں کوشش کرتا ہوں کہ اس سے کسی طرح باہر نکل جاؤں۔ یہی میری پریشانی کا باعث ہے۔ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کہا "شکر کر اللہ کا اور خوش ہو کہ تیرے اوپر کاغذوں، روپوں اور ڈالروں کا قرض ہے، اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو اور ہر وقت جھک کر رہا کر کہ تیرے اوپر انسانوں کا قرض نہیں ہے، تم نے کسی کو انسان نہیں لوٹانے۔"

میں نے کہا بابا میں تیری بات نہیں سمجھا۔ کہنے لگا کہ شکر کر تو نے کوئی قتل نہیں کیے، کسی انسان کی جان نہیں لی۔ اگر خدانخواستہ تیرے اوپر جانوں کا بوجھ ہوتا تو تو اسے کیسے لوٹاتا اور تیرے ملک والے بھی اللہ کا شکر ادا کریں کہ ان کے اوپر جانوں کا بوجھ نہیں ہے کیونکہ اللہ قرآن میں فرماتا ہے کہ اگر تم نے ایک شخص کو ناحق قتل کیا تو گویا تم نے پوری انسانیت کو قتل کر دیا۔ میں نے اس سے کہا کہ الحمدللہ میرے اوپر ایسا کوئی بوجھ نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ تم اپنے پڑوسیوں کو دیکھو 73 ہزار بے گناہ کشمیریوں کے قتل کا بوجھ (اب یہ تعداد 75 ہزار سے بھی زائد ہو چکی ہے) ان کی گردن پر ہے کہ وہ کیسے لوٹائیں گے۔ کتنی بھی کوشش کر لیں، جدھر بھی مرضی بھاگ لیں وہ 73 ہزار آدمی جن کے وہ مقروض ہیں وہ کیسے آدمی لوٹائیں گے۔ تمہارا تو قرض روپوں کا قرض ہے کسی نہ کسی صورت لوٹایا جا سکے گا۔ پھر ان کو دیکھو انہوں نے ایک لاکھ پندرہ ہزار سکھوں کو

Blue Star کے Process میں قتل کیا۔ وہ ان کی ماؤں کو اور بہنوں کو ان کے بیٹے اور بھائی کیسے لوٹا سکیں گے؟ ان سے اگر وہ مانگنے والا (خدا تعالیٰ) آ گیا کہ میرے انسان واپس کر و تو وہ کہاں سے دیں گے۔ وہ کہنے لگا تمہیں پتہ ہے میں تو جانتا نہیں کہ ''ایتھوں دور سمندر وچ کوئی پنڈ اے۔'' کہنے لگا وہاں پر دو جگہوں پر بم پھینک کر لاکھوں انسانوں کو ہلاک کر دیا۔ میں نے کہا کہ بابا ان شہروں کو ''ہیروشیما'' اور ''ناگاساکی'' کہتے ہیں۔ اب وہ کس طرح لاکھوں بندے لوٹائیں گے۔ وہ بابا ''ٹپوسی'' مار کر چلتا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا ''میں نے سنا ہے کہ جب امریکہ آباد ہوا تو وہاں پر ایک قوم آباد تھی جسے Red Indian کہتے تھے۔ وہ قوم اب ساری کی ساری ختم ہو گئی ہے اور اب اگر کوئی کھاتے والا اپنار جسٹر لے کر آ گیا اور اس نے موجودہ قوم کو بڑی طاقتور اور سیانی اور ماہر قوم ہے اس سے کہا کہ مجھے وہ آدمی واپس کرو تم نے انہیں ناحق مارا ہے اور کیوں مارا ہے؟ جواب دو اور بندے واپس کرو تو وہ کیا کریں گے؟ مجھے کہنے لگا کہ تم کونے میں لگ کے پریشان بیٹھے ہو حالانکہ تمہیں خوش ہونا چاہئے اور تمہاری قوم کے لوگوں کو خوش ہونا چاہئے کہ چلو تم قتل کر دیے گئے لیکن قاتلوں میں سے نہیں ہو۔ اس نے کہا کہ میں تو خوشی سے ناچتا ہوں کہ الحمدللہ مسلمان امہ پر یہ بوجھ نہیں ہے۔ مسلمان بے وقوف اور مقتول ہیں، قاتل نہیں ہیں۔ یہ پتھر لے کر مدِّمقابل کو

مارتے ہیں اور پتھروں سے ان کے (اسرائیل) ٹینکوں کو نشانہ بناتے ہیں اور ان کے نیچے کچلے جاتے ہیں۔ جان سے جاتے ہیں لیکن ان ظالموں میں سے نہیں ہیں جو انسانوں کا ناحق خون کرتے ہیں اور پوری کائنات اور معاشرے کو قتل کر دیتے ہیں۔ اس کی بات سن کر میں خوشی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس روز سے اب تک میں کافی خوش ہوں کہ الحمدللہ میری ذات کے اوپر اور میری قوم پر خون یا آدمی لوٹانے کا بوجھ نہیں ہے اور انشاء اللہ وہ وقت بھی قریب ہے کہ ہم ڈھیر سارا قرضہ لوٹا سکیں گے اور شکر ہے کہ ہمیں زندہ جیتے جاگتے انسان نہیں واپس کرنے ہیں۔ انسانوں کو لوٹانے کے قرض دار ایسے بھی ہیں جو لمبی اڑانیں بھر بھر کر سکاٹ لینڈ پر جو نہ پیسے والا ہے اور نہ ان کا کوئی قصور تھا ان پر بمباری کرتے رہے۔ ان سے تو ہمارا قرض اچھا ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین۔

بابے کی تلاش

بڑے برسوں کے بعد کچھ روز پہلے کی بات ہے کہ میں سینما دیکھنے گیا۔ کالج کے زمانے میں ہم "منڈوا" (سینما) دیکھنے جایا کرتے تھے۔ تب بھی اس وقت ہی جاتے تھے جب Matinee Show ہوتا تھا اور اتنے سال کے بعد جب دوبارہ سینما جانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو بھی یہ میٹنی شو ہی تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کئی پروگراموں میں ذکر کر چکا ہوں کہ لوگ مجھ سے اس پروگرام کی مناسبت سے کسی بابے کا پتہ پوچھتے ہیں یا پوچھتے ہیں کہ ہم روحانیت کی منازل تلاش کر سکیں یا ہمیں کوئی ایسا طریقہ بتا دیں کہ ہم باطن کا پتہ کر سکیں اور اس منزل پر پہنچیں جہاں تک پہنچنے کے لیے ہمیں کہا گیا ہے اور میں ان سے اکثر یہی عرض کیا کرتا ہوں کہ بابوں کی دنیا وہ ایسی نہیں ہے کہ جس طرح وہ کسی ماہر ڈاکٹر کا پتہ ہو اور آپ آرام سے کسی ماہر طبیب یا سپیشلسٹ کا پتہ اور فون نمبر حاصل کر لیں یا آپ کا نامی گرامی وکیل جو کبھی ہارتا ہی نہ ہو اس کے چیمبر کا پتہ، فون یا فیکس نمبر لے لیں بلکہ یہ بابے تو آپ کے اندر سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔

جب آپ تہیہ کر لیتے ہیں اور فیصلہ کرتے ہیں بالکل ایسا ہی فیصلہ جس طرح آپ اور آپ کے گھر والے کرتے ہیں کہ آپ نے بی۔ اے۔ کرنا ہے۔ جس طرح بی۔ اے کرنے کے لیے چودہ برس کا عرصہ درکار ہوتا ہے اسی طرح باطن کے سفر کے لیے بھی آپ کو اپنی ذات کے لیے ویسا ہی فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ دیکھئے۔۔۔۔!

انسان جو ہے وہ دوسرے جانداروں کے مقابلے میں ایک مختلف جاندار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دیگر جانداروں میں بھی جان ہوتی ہے اور انسان میں بھی جان ہے اور انسان بھی دوسرے جانداروں کی طرح حرکت کرتا ہے، بولتا اور چلتا پھرتا ہے لیکن ان دونوں میں ایک بڑا واضع فرق ہے کہ انسان میں روح ہوتی ہے اور جانوروں میں روح نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر چار بکرے کھڑے ہیں ان میں سے ایک کو ذبح کر دیں۔ اس کی کھال اتاریں اور باقی تین کو چارہ ڈال دیں تو وہ بڑے شوق سے چارہ کھانے لگ جائیں گے اور ان کی توجہ نہیں ہو گی کہ ان کا ساتھی تختہ دار پر چڑھ چکا ہے۔ انہیں کوئی ملال یا دکھ نہیں ہو گا۔ دوسری طرف ایک انسان کو آپ قتل کر کے پھینک دیں یا خدانخواستہ قتل کیے جانے کے بعد کہیں پڑا ہو اور آپ وہاں لوگوں سے کہیں کہ آپ سکون سے بیٹھ کر سکون سے کھانا کھائیں یا خوش رہیں تو وہ ایسا نہیں کر سکیں گے۔ میں جہاں تک

جان سکا ہوں وہ یہ ہے کہ روح اور میں ایک یہی فرق ہے کہ جان ہر جاندار کا ایک چھوٹے لیول پر ساتھ دیتی ہے لیکن جو روح عطا کی گئی ہے وہ صرف انسان کو دی گئی ہے۔ ہر انسان کے اندر ایک ایسی چپ لگا دی گئی ہے اور پہلے سے پروگرامنگ کر دی گئی ہے جس طرح آپ نے اپنے جسم اور اپنی جان کو پرورش کی آنکھ سے دیکھنا ہے بالکل اسی طرح سے آپ نے اپنی روح کو بھی ان بلندیوں پر لے جانا ہے جن بلندیوں سے یہ اتر کر آپ کے وجود کے ساتھ پوست ہو جائے اگر آپ یہ پوچھتے رہیں گے کہ جناب مجھے بتایئے کہ ہم یہ کیسے کریں؟ تو آپ کی یہ بات محض کتابی اور اکتسابی سی بات ہی ہو گی۔ آپ ایک تجسس کے طور پر ہی پوچھیں گے کہ ایسے بھی ہوتا ہے؟ اور فرض کریں کہ آپ کو بتا بھی دیا جائے کہ فلاں صاحب بڑی روحانی منازل طے کر چکے ہیں اور ان کے پاس سمجھانے اور بتانے کے لیے کچھ ہے اور اس کے بعد آپ تہیّہ بھی کریں کہ ان سے کچھ حاصل کریں تو آپ یوں ان سے کچھ حاصل نہ کر سکیں گے کہ آپ کی ایک آنکھ اور سارا وجود اور اس کے ساتھ نصف دماغ اس بات پر متعین ہو جائے گا کہ میں اس صاحب کی کوئی ایسی چوری پکڑوں جس پر میں تنقید کر سکوں اور لوگوں کو بتا سکوں کہ یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ عام طور پر جتنے بھی لوگ آتے ہیں وہ خاص طور پر ایسی ہی نگاہ رکھتے ہیں اور عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے کہ

ہم اس بات پر زیادہ نظر رکھتے ہیں کہ ایک آدمی سے بابے نے ہاتھ ملایا اور اس آدمی نے ہاتھ ملاتے ہوئے بابے کو پانچ روپے کا نوٹ دیا اور انہوں نے اسے لپیٹ کر جیب میں ڈال لیا۔ یہاں آکر آپ کے سوچنے، سمجھنے اور اختیار کرنے کی ساری صلاحیتیں مسدود ہو جاتی ہیں کیونکہ اب آپ نے اس شخص کی چوری پکڑ لی ہے اور اس آدمی کو اپنے سے بدتر خیال کیا۔ میں آج سارے پروگرام میں اسی موضوع پر فوکس رکھوں گا کیونکہ مجھ سے عام طور پر یہ پوچھا جاتا ہے کہ آپ "بابوں" کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ باتیں اس لیے کرتا ہوں کہ یہ ہماری روح کو بلندی عطا کرنے کے لیے ہماری مدد کرتے ہیں اور ہماری روح کو ارفع اور بلندی اس صورت میں عطا ہوتی کہ ہم دوسرے جانداروں کے مقابلے میں خود کو ثابت کریں کہ ہم حرکت، سوچ اور کھانے پینے میں Movement اور Reproduction میں تو ان کے ساتھی ہیں لیکن ہم ان سے آزاد ہیں اور ان معنوں میں آزاد ہیں کہ "اگر ہم چاہیں تو کریں اور چاہیں تو نہ کریں۔" بھینس جب کھیت میں سے گزرتی ہے تو وہ آزاد نہیں ہوتی وہ ہر صورت میں چارہ کھانے یا اِدھر اُدھر منہ مارنے پر مجبور ہوتی ہے۔ جانوروں میں نسبت ایک آدمی چالیس افراد کو یا پانچ سو افراد کو کھانے کی دعوت پر بلا سکتا ہے، کھانا کھلا سکتا ہے اور خود الگ سے کھڑا ہو سکتا ہے کہ میرا روزہ ہے میں نہیں کھاؤں گا۔ اگر وہ روزے

سے نہ بھی ہو تو بھی وہ اگر ضروری خیال کرے تو کھا پی لے اگر اچھا ہے تو نہ کھائے۔اس کی Animal Drive جو ہے وہ اس کی Instinctive Drive ہے اور وہ اس پر کنٹرول کرتا ہے اور یہ اس کی روح ہے جو اسے کنٹرول کی طاقت اور بلندی عطا کرتی ہے۔اس کے لیے اگر آپ مجھ سے بار بار اصرار کریں کہ آپ کو وہ راستہ بتایا جائے جس کی معرفت ایسے آدمی سے آپ ملاقات کر سکیں جو آپ کی روح کی سربلندی میں آپ کی مدد کرے تو اس حوالے سے میں عرض کروں گا کہ اس کے لیے آپ کو آنکھ کھول کر رکھنی ہو گی اور منہ بند کر کے رکھنا ہو گا۔ ایک مرتبہ سمندر کے اندر ایک چھوٹی مچھلی نے بڑی مچھلی کو روک کر کہا کہ "آپا مجھے بتاؤ کہ سمندر کہاں ہے میں بڑی پریشان پھرتی ہیں، مجھے سمندر نہیں ملتا، میں نے سمندر کا لفظ سن رکھا ہے۔"

اس پر بڑی مچھلی نے اسے مخاطب کر کے کہا کہ جہاں ہم دونوں کھڑی ہیں یہ ہی سمندر ہے۔ چھوٹی مچھلی بولی واہ آپا آپ نے بھی وہی بات کی جو سارے لوگ کرتے ہیں۔ یہ تو پانی ہے سمندر نہیں ہے اور وہ یہ کہ کر وہاں سے چل پڑی، اسے بڑی مچھلی آوازیں دیتی رہی کہ رُک جاؤ۔ میری پوری بات سن کر جاؤ اور یہ بات سننی تمہارے لیے بہت ضروری ہے کہ اگر تم سمندر کی کھوج میں نکلو گی تو تمہیں سمندر نہیں ملے گا لیکن اگر آنکھیں اور اپنے کان کھول کر مشاہدہ کرو گی تو پھر وہ

سمندر ضرور نظر آئے گا جس کی تمہیں تلاش ہے، لیکن بڑی مچھلی کی بات ختم ہونے سے قبل چھوٹی مچھلی بڑی دور جا چکی تھی اور اس نے میری طرح سے اپنی بڑی آپا کی بات نہیں سنی۔

۳۲ سال کے بعد بلکہ اس سے بھی زیادہ سالوں کے بعد میں ایک بار پھر چند روز قبل سینما دیکھنے گیا۔ کڑی دھوپ تھی لیکن جب میں سینما کے اندر داخل ہوا تو مجھے اندر اندھیرا نظر آیا جیسا کہ باہر سے اچانک اندر جائیں تو آنکھیں چندھیائی ہوئی ہوتی ہیں۔ ہال میں میری سیٹ قریب ہی تھی اور میں بیٹھ گیا۔ اس کے بعد سکرین چلنے سے قبل اور صاحب ڈائس پر آئے جنہوں نے روشنی کے ایک ہالے کے اندر اس فلم کا تعارف کرایا کہ اس فلم کو بنانے کا مقصد کیا تھا اور کس لیے چلایا گیا؟ اور کس لیے ہم نے یہاں بطورِ خاص پڑھے لکھے لوگوں کو دعوت دی ہے۔ ان صاحب کو روشنی کے ہالے میں دیکھ کر مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ کوئی شخص کس طرح، کسی روشنی کے ہالے میں آجائے تو وہ خود بخود اجاگر ہونے لگتا ہے، اس کو یہ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ دیکھو اس وقت میں اپنا آپ ظاہر کر رہا ہوں۔ فلم شروع ہوئی اور ہال میں بالکل اندھیرا چھا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہال کا دروازہ کھلا اور ایک تماشائی اندر داخل ہوا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ مجھے نظر تو نہیں آیا کیونکہ دروازہ بند ہو گیا تھا۔ جب دروازہ کھلا تھا تو

اندر آنے والے شخص کا وجود مجھے نظر آیا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ آدمی تو کسی صورت میں اپنی سیٹ تک نہیں پہنچ سکتا لیکن تھوڑی ہی دیر میں ایک ٹارچ جلی اور اس ٹارچ نے اس شخص کے پاؤں کے اوپر ایک چھوٹا سا ہالہ بنایا اور اس ہالے کی مدد سے وہ شخص چلتا گیا، ٹارچ والا اس کے پیچھے پیچھے آتا گیا اور جہاں اس شخص کی سیٹ تھی اس کو بٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد میں نے پھر فلم تو کم دیکھی۔ یہی سوچتا رہا کہ اگر کسی شخص کی زندگی میں ایسا ہالہ آئے اور کوئی گائیڈ کرنے والا اسے میسر ہو تو پھر وہ شخص یقیناً اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے لیکن اس کے لیے ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے، سینما کا رخ کرنا پڑتا ہے اور فلم کے لگنے کے اوقات کا علم ہونا چاہیے۔ دروازہ کھلنا چاہیے، پھر ٹارچ والا خود بخود آکر مدد کرتا ہے اور آپ کو مدد کے لیے کسی کو پکارنے یا آواز دینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ آپ جب آوازیں دیتے ہیں، چیخ و پکار کرتے ہیں اور دنیاداری کے معاملات کے اندر رہتے ہوئے آہ و بکا کرتے ہیں تو پھر وہ ٹارچ والا نہیں آتا۔ اس طرح آپ بس پتے اکٹھے کرتے رہتے ہیں اور ٹیلیفون نمبر جمع کرتے رہتے ہیں لیکن وہ بات جو بڑی مچھلی نے چھوٹی مچھلی سے کہی تھی کہ آنکھیں کھول کے رکھو اور مشاہد بن کے رہو تاکہ تم پر سارے بھید آشکار ہوں اور روشن ہوں۔ اس مادی زندگی میں جس میں بار بار آپ کے دوست احباب، عزیز و اقارب مادہ پرستی کی بات کرتے

ہیں کہ جی پاکستان میں لوگ بہت مادہ پرست ہو گئے ہیں، لوگوں میں پہلی سی محبت پیار اور یگانگت نہیں رہی۔ مادہ پرستی کا کھیل صرف پاکستان میں ہی نہیں چلا بلکہ ساری کی ساری دنیا اس وقت مادہ پرستی کے چکر میں ہے میں سمجھتا ہوں کی یہ بری بات نہیں ہے، میں ایک ایسے علاقے میں رہا ہوں اور ایسی جگہ جما پلا ہوں جہاں سانپ بہت ہوتے تھے اور کلر کے سانپ بکثرت پائے جاتے تھے۔ ہم بچپن میں جنگل میں جا کر یا ویران اور گرے پرے کھروں میں سانپوں کی کینچلیاں اکٹھی کیا کرتے تھے۔ کیا آپ کو سانپوں کی کینچلیوں کا پتہ ہے؟ سانپ ایک خاص وقت پر سو جاتا ہے اور اس کے جسم کے اوپر ایک پلاسٹک کے شاپر بیگ کی طرح کی باریک کھال یا کینچلی چڑھ آتی ہے اور اس کینچلی پر اس سانپ کے سے نقش و نگار منتقل ہو جاتے ہیں اور سانپ ایک خاص عرصے کے لیے اس کینچلی کے اندر رہ کر Hibernate کرتا ہے، تب وہ نہ سانس لیتا ہے نہ کھانا کھاتا ہے، بالکل مردہ یا سدھ بدھ ہو کے پڑا رہتا ہے۔ میں اس Economic World میں جب بھی اس کو (کینچلی) کو دیکھتا ہوں تو غور کرتا ہوں کہ ہم سانپ ہیں جو Economics یا پیسے کی دوڑ کے اندر اپنے بدن پر کینچلی چڑھا کر خاموش پڑے ہوئے ہیں۔ ہم بے حس و حرکت ہیں اور ہمارا کوئی بس نہیں چلتا۔ ہمیں Consumer Goods بنانے والی کمپنیاں جس طرح چاہتی ہیں استعمال

کرتی ہیں اور کرتی چلی آ رہی ہیں۔ خواتین و حضرات جس بات سے آپ خوفزدہ ہیں زیادہ دیر تک چل نہیں سکے گی کیونکہ ایک وقت ایسا آتا ہے جب سانپ کو اپنی Growth کے لیے اس کینچلی کے اندر سے نکلنا پڑتا ہے اور وہ کمال سے اور بڑی عجیب و غریب حرکات و سکنات کر کے اپنے بدن کو پرانی ٹوٹی دیواروں سے رگڑ رگڑ اور گھسا گھسا کے کنج (کینچلی) سے باہر نکلتا ہے اور اپنی وہ کینچلی پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ جب وہ باہر نکلتا ہے تو زندگی میں اور زندگی کے دوسرے جانوروں کے ساتھ شامل ہوتا ہے۔ سانپ جس طرح اپنی نشوونما کے لیے ایک خاص وقت پر اس خول میں سے نکلتا ہے اور باہر آ کر زندگی میں شامل ہوتا ہے اور نئے انداز و ڈھنگ اور نئے سرے سے سانس لیتا ہے اسی طرح انسانوں کی یہ ساری بستیاں جو مجموعی طور پر اس وقت اپنی Economics کی کینچلی کے اندر لپٹی پڑی ہیں۔ ان کو اپنی گروتھ کے لیے باہر نکلنا ہی پڑے گا اور یہ نکل کے ہی رہیں گی کیونکہ یہ معاشرہ، یہ دنیا اور خدائی اور جنتا اس کام کے لیے نہیں بنی جس میں اس کو داخل کر دیا گیا ہے یا ایک مخصوص کینچلی چڑھا دی گئی ہے۔ یہ بستیاں اپنی روحانی نشوونما کے لیے بنی ہیں اور ان بستیوں کے باسیوں کو اپنی روحانیت کا مظاہرہ کرنا ہے اور اپنے باطن کے سفر میں آگے نکلنا ہے۔ باطن کے اس سفر میں آپ شور و غوغا کر کے کسی کو ٹیلیفون کر کے، کسی کو Message بھیج کر یا کسی کو اپنے

کمپیوٹر کے ذریعے ہوشیار کر کے نہ کوئی پیغام دے سکتے ہیں اور نہ لے سکتے ہیں۔ یہ خاموشی کی ایک دنیا ہے اس میں اگر آپ کبھی داخل ہو سکتے ہیں تو پھر ہی آپ اس کا مزہ لے سکتے ہیں۔ مت پوچھیں کہ ہمیں کسی بابے کا پتہ بتائیں، آپ خود بابا ہیں۔ جب آپ کو دیوار سے ڈھو (ٹیک) لگا کر آرام سے بیٹھنا آ گیا اور دنیا کی سب سے بڑی عبادت یعنی آپ خاموشی میں داخل ہو گئے تو آپ کے اوپر انوار و برکات کی بارش بھی ہونے لگے گی اور انواع و اقسام کا رزق بھی آپ کا مقدر بنتا چلا جائے گا۔

میں جب اٹلی سے لوٹا تو بحری جہاز "موتاناوے وکتوریہ" کے ذریعے وطن آیا۔ یہ میرا آبی جہاز پر سفر کرنے کا پہلا تجربہ تھا۔ جب نیپال کی بندرگاہ پر جہاز مغرب کے وقت آہستہ آہستہ پیچھے ہٹا اور شہر کی روشنیاں دور ہونے لگیں تو وہ نہایت سست رفتاری کے ساتھ گہرے پانیوں کی طرف چل رہا تھا اور عشاء کے وقت تک شہر ہماری نظروں سے بالکل اوجھل ہو گیا اور ہم آ کر کھانے کی میز پر بیٹھ گئے اور اس کے بعد ہم اپنے اپنے کیبنوں میں آ کر لیٹ گئے۔ صبح اٹھے تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ جہاز کس رخ جا رہا ہے، اسے کون چلا رہا ہے اور یہ کیسے چل رہا ہے۔ ہم جب ناشتہ کر رہی رہے تھے تو سپیکر پر ایک آواز گونجی، وہ نہایت میٹھی سی Italian انداز میں انگریزی بولنے کی آواز تھی جو کہ رہی تھی کہ "میں

کپتان بول رہا ہوں۔" And I want to say some thing to you and give some instructions

ہم سب نے یہ سن کر اپنا کھانا وہیں چھوڑ دیا اور کپتان کی آواز آتی رہی اور وہ ہمیں بتاتا رہا کہ ہمیں کیا کرنا ہے اور کس طرح سے یہ گیارہ دن کا سفر اس کے ساتھ گزارنا ہے۔ نہ ہمیں کپتان کبھی نظر آیا' نہ اس سے تعارف ہوا، نہ ملاقات ہوئی اور نہ ہی اس سے ملنے کے مواقع میسر آئے۔ ایک صرف اس کی آواز ہی تھی جو آتی تھی اور ہمیں زندگی کے نئے مرحلے میں داخل کر جاتی تھی۔ میں نے اس وقت جب بہت طوفانی سمندر سے جہاز گزر رہا تھا تو میں نے سوچا کہ ایک اور بھی کشتی ہے جس کو ہم دنیا کہ سکتے ہیں اور اس کشتی کا ایک نگہبان اور کپتان بھی ہے جس کی آواز ہم تک پہنچتی رہتی ہے جو ہمیں ہدایات دیتا رہتا ہے اور احکام صادر کرتا رہتا ہے، وہ ہمیں دکھائی نہیں دیتا، ہمیں ملتا نہیں ہے اور نہ ہی ملنے کی امید ہوتی ہے اور ہم اس کے حکم کے مطابق چلتے رہتے ہیں اور جو اس کے احکام ماننے والے ہوتے ہیں انہیں کسی بابے یا کسی Instructions دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ خاموشی اور تنہائی کا سفر ہے جو بھی اس Silence کے سفر کو اختیار کرتا ہے اس کو بند اندھیرے کمرے میں ایک دروازہ ضرور نظر آتا ہے جس میں وہ روحانی طور پر داخل ہو سکتا ہے۔ اس کے

پاس اور ہمارے پاس روح کا وہ جلوہ موجود ہے اور وہ Chip جس کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے وہ کسی اور کے Ignite کرنے سے نہیں چلے گا۔ وہ آپ ہی کو کوشش اور جدوجہد سے چلے گا لیکن یہ کوشش اور Struggle اس سے مختلف ہے جو آپ اکنامک ورلڈ میں کرتے ہیں یا جو آپ Competition میں کرتے ہیں اور جس طرح سے ہمیں حکم ہے جس طرح اسلام نے رخ مقرر کیا ہے کہ آپ نے اس رخ کھڑے ہو کر اور خدا نے تو فرمایا ہے کہ میں ہر جگہ موجود ہوں لیکن ہمیں حکم دیا کہ تم خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے ساری کوشش کرو۔ ہم نے سب سے پہلے رخ کو متعین کرنا ہے۔ اگر آپ روحانیت کی دنیا میں داخل ہونے کے آرزو مند ہیں تو سب سے پہلے آپ کو اپنی ذات کو یہ سمجھانا پڑے گا کہ ہم ایک رخ لے کر اس طرف بڑھیں۔ پچھلے دنوں ایک جغرافیے کے رسالے میں مَیں نے ایک مضمون دیکھا جس میں لکھا تھا کہ بہت دیر پہلے لوگوں نے ایک چھوٹے سے جزیرے پر ایک عبادت گاہ بنائی اور اس میں دنیا کی ہر قسم کی دھات کی گھنٹیاں لگائیں اور وہ گھنٹیاں ہوا کے چلنے سے بجتی تھیں۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ وہ جزیرہ آہستہ آہستہ زیر آب آ گیا اور وہ مندر یا عبادت گاہ پانی کی آغوش میں آ کر ختم ہو گئی۔ کچھ پرانے لوگ بتاتے ہیں کہ ابھی بھی وہاں پانی کے اندر سے گھنٹیوں کی آوازیں آتی ہیں اور جو سننے والے کان رکھتے ہیں انہیں وہ آواز

اب بھی صبح شام آتی ہے لیکن ان سننے والوں کا کہنا ہے کہ آپ کو گھنٹیوں کی آواز سننے کے لیے سمندر کی آواز سے ہم آہنگ ہونا پڑے گا۔ اس طرح خدا سے بات کرنے اور اس کو سننے کے لیے مخلوق کے درشن کرنا ہوں گے جو لوگ مخلوق خدا کے متعلق خور کرتے ہیں اور اس کے ہو جاتے ہیں اور مخلوق خدا کی خدمت کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں یا وہ لوگوں سے کیڑے نکالنا بند کر دیتے ہیں ان کو کسی بابے، رہنما یا ہادی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ ڈائریکٹ اس آواز میں پہنچ جاتے ہیں جو سمندر کے نیچے چھپے ہوئے عبادت کدے کو ہر وقت نمودار ہوتا دیکھتے رہتے ہیں۔ خدا آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

محاورے

ایسے مقام پر پہنچ کر اور ایک ایسی پر فضا جگہ پر آ جانے کے بعد مجھے اپنے لڑکپن کا زمانہ یاد آتا ہے جب ہم سکول میں پڑھتے تھے۔ اس وقت ہمارے ماسٹر صدیق صاحب ہمیں اکثر اپنے ساتھ کلاس سے اٹھا کر ایسے باغوں اور گلستانوں میں لے جاتے تھے جہاں قدرت کے نظارے کتابی و نصابی علوم سے بڑھ کر ہوتے تھے اور جو ہماری زندگی کے قریب تر ہوا کرتے تھے اور ماسٹر صدیق صاحب بات کو سمجھانے اور بتانے کا بہتر فن جانتے تھے اور اس قدرت پر ملکہ رکھتے تھے۔ وہ ایک ایک پتّے سے لے کر ایک تنا آور درخت تک اور ایک اڑتی ہوئی چڑیا سے لے کر ایک بیٹھی ہوئی گدھ تک ہر ایک بات اور مفہوم پر سیر حاصل کرتے تھے۔ ہمیں ان کی کچھ باتیں سمجھ میں آتی تھیں اور کچھ نہیں آتی تھیں لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا ان کی باتیں آہستہ آہستہ ہمارے اوپر کھلتی گئیں پھر ایک وقت ایسا بھی آ گیا جب ہم ساتویں جماعت پاس کر کے آٹھویں میں داخل ہو گئے تو انھوں نے خصوصی طور پر ہمیں اس بات کا حکم دیا کہ انگریزی کے محاوروں کو

اچھی طرح سے زبانی یاد کرو اور ان کو اپنے ذہن میں بٹھاؤ کیونکہ آگے چل کر جب آپ کو انگریزی لکھنے کا موقع ملے گا تو یہ یاد کیے ہوئے محاورے آپ کی مدد کرتے رہیں گے چنانچہ وہ بیشمار محاورے جن کو انہوں نے ترتیب دے رکھا ہوا تھا ان کا بوجھ ہمارے اوپر لاد دیا۔

A bird in hand is worth two in the Bush

(نو نقد نہ تیرہ ادھار)

Never put off till tomorrow, what you can do today

(آج کا کام کل پر نہ چھوڑو)

Might is Right

(جس کی لاٹھی اس کی بھینس)

اس طرح کے کئی اور محاورے انہوں نے ہمیں یاد کروائے اور ان محاوروں اور Idioms کے سہارے اور اس گراری پر چلتے ہوئے آگے آگے زندگی کے سفر میں چلتے ہی چلتے گئے لیکن جب ہم فرسٹ ائیر میں داخل ہوئے انہی انگریزی

محاوروں میں سے جو ہماری زندگی کے اندر رچ بس چکے تھے اور جو ہمارے اندر اپنی کئی منزلیں طے کر چکے تھے، ہم نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ کچھ محاورے ایسے ہیں کہ جن کا مفہوم تو سمجھ میں آتا ہے لیکن وہ ہماری زندگی پر کچھ اور ہی طرح سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ شاید اس سے پہلے آپ نے اس کا جائزہ نہیں لیا ہو گا لیکن آج میں آپ کی خدمت میں اپنی مشکلات کا ذکر کرتا ہوں۔

جب میں نے پہلی مرتبہ انگریزی کے دو الفاظ "Take Care" جو عام طور پر بہت استعمال ہوتے ہیں۔ تو دل میں خیال آیا کہ ہم ان کا کیا کریں یعنی اگر میں گاڑی پر جارہا ہوں اور میری خالہ جو لندن سے تشریف لائی تھیں انہوں نے کہا Ashfaq Take Care۔

اب میں حیران ہوں کہ میں اپنی ہی ذات کا Care Taker ہوں کیونکہ ہمارے ہاں تو "اللہ حافظ" (اللہ تم کو اپنی حفظ و امان میں رکھے) کہنے کا رواج ہے لیکن انگریزی بولنے والے کہتے ہیں کہ اللہ حافظ نہیں، ہم اللہ کے اوپر یہ ذمہ داری نہیں تھوپتے اور نہ ہی ہم اپنے اوپر ذمہ داری لیتے ہیں بلکہ یہ تمہاری اپنی ذمہ داری ہے کہ تم خود ہی اپنی Take Care کرو اور تم احتیاط کے ساتھ زندگی بسر کرو۔ بڑے زمانے کی بات ہے ہم ایک روز گاڑی پر جارہے تھے اور

آگے سڑک کھدی ہوئی تھی اور وہاں ایک بہت بڑا سائن بورڈ لگا ہوا تھا جس میں انتباہ کی گئی تھی کہ Travel at your own risk.

میں نے بورڈ پڑھ کے ڈرائیور سے کہا کہ بھائی ذرا آہستہ اور احتیاط کے ساتھ چلو۔ ساتھ میری خالہ بیٹھی ہوئی تھیں انہوں نے کہا احتیاط سے کیوں؟ کیا وجہ ہے؟ تو میں نے کہا کہ یہاں اتنا بڑا بورڈ لگا ہوا ہے کہ "آپ اپنی ذمہ داری پر سفر کریں، سڑک ٹوٹی ہوئی ہے اور زیرِ تعمیر ہے۔" اس پر میری خالہ ہنسی اور کہنے لگی پچھلا سفر ہم کس کی ذمہ داری پر طے کر کے آئے ہیں اور اگلا کس کی ذمہ داری پر طے کریں گے۔ یہ بورڈ یہاں کیوں لگایا ہوا ہے۔ اس پر مجھے خیال آیا کہ Take Care کا بھی بڑا عجیب و غریب معاملہ ہے کہ مجھ ہی سے کہا جا رہا ہے کہ میں اپنا خیال رکھوں۔ میرا ہی پروفیسر مجھے گاڑی پر چھوڑتے وقت مجھے کہتا ہے کہ Ashfaq you are going to abroad, Take care.

اس حوالے سے میری خالہ کی بات تو ٹھیک تھی کہ ہم زندگی کا جو بھی سفر طے کرتے ہیں اپنی ذمہ داری پر یا اللہ کے حوالے سے یا اس کی مہربانی سے طے کرتے ہیں۔ یہ لکھنا یا کہنا کہ دیکھو یہاں سڑک ٹوٹی ہوئی ہے اور تم اپنی ذمہ داری سے سفر کرو آگے گورنمنٹ تمہاری ذمہ دار ہے یا معاشرہ اس ذمّہ داری کو پورا

ادا کرے گا ایسا ہوتا نہیں ہے۔ اس طرح جب ان معمول یا روزمرہ کے فقرات یا محاوروں پر نظر پڑنے لگی تو اس حوالے سے مشاہدہ بھی تیز ہونے لگا۔ جب ہم نے جیوگرافک میگزین پڑھنا شروع کیا اور دنیا کے ان منطقوں کے مطالعہ میں بہت گہرے اترے جہاں جانور کثیر تعداد میں بستے ہیں جسے افریقہ کہا جاتا ہے تو ہمیں پتہ چلا کہ جانوروں کا باقاعدہ ایک قانون ہوتا ہے اور کوئی جانور اس قانون سے تجاوز نہیں کرتا۔ یہ صرف انسان ہی ہے جو اپنے قانون اور طے شدہ باتوں میں آہستہ آہستہ تنسیخ کرتا رہتا ہے اور اس میں تبدیلیاں پیدا کرتا رہتا ہے۔ شیر جب بھوکا ہوتا ہے تب شکار کرتا ہے اور جب وہ شکار کو مار چکتا ہے تو تین روز تک مزید کسی جانور کا شکار نہیں کرتا۔ شکار ہونے والے جانور بھی اچھی طرح سے سمجھتے ہیں کہ اب ہمیں اپنے آپ کو قربانی کے لیے تیار کرنا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ شیر اعلیٰ درجے کے ہوائی جہاز میں بم بھر کر اونچے آسمانوں میں اڑنا شروع کرے اور اوپر سے بم پھینک کر بغیر سوچے سمجھے انسانوں، جانوروں یا دوسرے بشروں کو قتل کرنا شروع کرے۔ یہ انسان کا ہی ایک خوفناک قانون ہے جو ایک ظالم کا قانون ہے۔ آپ ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیں کی انسان نے بیچارے، معصوم، شریف جانوروں کے حوالے سے ''جنگل کا قانون'' کا لفظ بنا کر خود کو بری الزمہ کر لیا ہے۔ آپ زندگی میں چھوٹے چھوٹے معاملات سے لے

کر بڑے بڑے مسائلِ معاشرت تک نظر دوڑا کر دیکھیں تو آپ کو سب اندازہ ہو جائے گا۔ بڑے ملک غریب' کمزور اور چھوٹے ملکوں پر حملہ آور ہوتے ہیں اور آپ دم نہیں مار سکتے اور یہ انسانی قانون ہی ہے جو اس قدر تکلیف دہ اور انسان کو آزار پہنچانے والا ہے۔ خواتین و حضرات ایک اور بھی محاورہ ہے جس نے ہمیں ہلا کر رکھ دیا۔ جب ہم بی اے میں پہنچے تو ایک نیا محاورہ سامنے آیا جس کا سامنا کرنے کے لیے ہم کسی بھی صورت میں تیار نہیں تھے۔ وہ تھا" It is too Good to be True" یعنی یہ بات اتنی سچی، اچھی اور پاکیزہ ہے کہ یہ سچی ہو ہی نہیں سکتی۔ اب آپ یہ بتائیں ہم کیا کریں یعنی اس محاورے کو ساتھ لے کر کہاں تک اور کدھر تک جائیں اور یہ ہماری زندگیوں پر ایسے اثر انداز ہوا کہ ہم نے لاشعوری طور پر یہ سوچنا شروع کر دیا کہ جو بات اچھی ہوتی ہے وہ بات پاکیزہ، صباح اور نیکی پر مبنی ہوتی ہے وہ سچی نہیں ہوتی اس لیے سچی بات پر دارو مدار کرنے کے لیے' اس کے پس منظر کی بات کو گھٹیا' ظالم' بے انصاف اور سنگدل ہونا چاہیے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میری خالہ زاد بہن جن کے خاوند ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرتے ہیں۔ ان کی زندگی زیادہ ہنگامہ خیز کبھی نہیں رہی۔ کام پر جاتے ہیں اور واپس سیدھے گھر آ جاتے ہیں لیکن ہیں بڑے اچھے۔ وہ ایک دن اچانک دفتر سے اٹھ کر گھر آ گئے اور آ کر میری بہن سے کہنے لگے کہ

لو بھئی عذرا میں نے تو آج مچھلی پکڑ کے لانے کا پروگرام بنایا ہے۔ انہوں نے کہا کہ آپ نے زندگی میں پہلے کبھی مچھلی پکڑی تو ہے نہیں' وہ ان سے پھر گویا ہوئیں کہ آپ نے مچھلی پکڑنے والی کنڈی دیکھی ہے؟ کہنے لگے نہیں دیکھی۔ کبھی وہ پانی دیکھا ہے جس میں مچھلیاں ہوتی ہیں انہوں نے کہا اتنی مقدار میں تو نہیں دیکھا۔ گھڑے یا گلاس کا پانی ہی دیکھا ہے۔ وہ کہنے لگیں آپ کا پھر بھی مچھلی پکڑنے کا ارادہ ہے تو وہ کہنے لگے 'بس میرا جی چاہا' دفتر میں ایک فائل بڑی پیچیدہ قسم کی تھی۔ میں نے سوچا اس کو کل نمٹا لیں گے اور مجھے انگریزوں نے کہا (دفتر میں کام کرنے والے ساتھی انگریز) تم آج مچھلی پکڑنے جاؤ اور اب میں نے مچھلی پکڑنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اگر تمہاری بھی خواہش ہے تو میرے ساتھ چلو' بلو کی کے مقام پر دریا بڑی ٹھاٹھیں مارتا ہوا گزرتا ہے اور سنا ہے وہاں مچھلی بہت ہوتی ہے۔ میں ڈوری' کانٹا اور مچھلی پکڑنے کے دیگر لوازمات ساتھ لایا ہوں۔ اس نے (عذرا) نے کہا میں تو ساتھ جا نہیں سکتی کیونکہ آپ نے اچانک پروگرام بنا لیا ہے تو وہ کہنے لگے کوئی بات نہیں میں اکیلا چلا جاؤں گا۔ تب میری خالہ زاد بہن پریشان ہوئیں اور کہا ہائے ہائے آپ نے زندگی میں پہلی بار از خود پکنک کا ایسا پروگرام بنایا ہے اور میں پھر گھر میں کیوں بیٹھی رہوں۔ یہ مجھ سے برداشت

نہیں ہوتا لیکن وہ بڑی بے چین کبھی گھر کے اندر جائے اور کبھی گھر کے باہر آئے۔

اس پر ان کے میاں کہنے لگے کہ تم اس قدر پریشان کیوں ہو؟

وہ کہنے لگی کہ میں نے آج تین مرتبان اچار ڈالنے کا فیصلہ کیا تھا اور آپا صغریٰ سے درخواست کی تھی کہ وہ آکر مجھے اچار ڈال دیں۔ خواتین و حضرات ہمارے اکثر گھروں میں کئی آپا صغریٰ آئیں ہوتی ہیں جو گو poor relations ہوتی ہیں اور ہم ان کے ساتھ کچھ زیادہ محبت نہیں رکھتے لیکن مشکل اوقات میں وہ ہمارا بڑا ساتھ دیتی ہیں مثلاً شادیاں ہوں' مہندی کی رات ہو تو آپا صغریٰ آجاتی ہیں۔ وہ ساری بنی ٹھنی بچیوں کے پرس سنبھال کے گود میں بیٹھی رہتی ہیں اور پھر جانے کے وقت ان کو دے دیتی ہیں' اچار ڈالنا ہو' چٹنیاں بنانی ہوں' رضائی سینی ہو تو وہ بڑے کام آتی ہیں۔ عذرا کہنے لگی کہ میں نے اتنے سارے آم لے کے رکھے ہوئے ہیں اور آپا صغریٰ نے بھی آنا ہے۔ سارے مصالحے بھی تیار ہیں لہذا میں نہیں جاسکتی۔ پھر جب وہ چلنے لگے تو کہنے لگی نہیں نہیں میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں اور تیار ہو گئیں اور اس نے آپا صغریٰ کے نام ایک پرچی لکھ کر لیٹر بکس میں ڈال دی (عذرا اور آپا صغریٰ کے درمیان یہ بات طے تھی کہ اگر کبھی وہ گھر

پر نہ ہوں تو گھر کی چابی اور ہدایات لیٹر بکس میں پڑی ہوں گی) چنانچہ وہ دونوں میاں بیوی چلے گئے۔ جب وہاں پہنچ گئے تو ان سے مچھلی و چھلی تو کیا پکڑی جانی تھی لیکن انہوں نے بہت زیادہ Enjoy کیا' دن بھر وہ دونوں وہاں رہے۔ جب وہ لوٹ کر شام کو گھر آئے تو میری ہمشیرہ (عذرا) کہتی ہیں تو میرا اوپر کا دم اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا اور میری چیخ نکل گئی کیونکہ جس گھر میں ہم داخل ہو رہے تھے وہ کچھ اور ہی عجیب و غریب نقشہ پیش کر رہا تھا اور جب میں اندر گئی تو حیران ہوئی کہ تین مرتبانوں میں اچار ڈال کے رکھا ہوا تھا اور ان کے اوپر ڈھکنا پڑا ہوا تھا لیکن میری چیخ اس وجہ سے نکلی کہ میرے گھر کی جو سیڑھیاں تھیں وہ عرصہ دس سال سے خراب تھیں وہ تمام کی تمام چمکدار اور بہت اعلیٰ درجے کی پالش کی ہوئی لگتی تھیں۔ میز کے اوپر ایک کاغذ پڑا تھا اور اس پر لکھا تھا کہ محترمہ آپا جی السّلام علیکم میرا نام کرم داد ہے۔ میں یہاں سے گزرا آپ کے گھر کی گھنٹی بجائی تو آپ نے دروازہ نہیں کھولا۔ پھر میں ہمت کر کے پھاٹک کھول کے اندر داخل ہو گیا۔ اندر داخل ہوا تو آپ کا دروازہ بند تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ کوئی بھی گھر پر نہیں ہے' اِدھر اُدھر دیکھا تو مجھے لیٹر بکس نظر آیا۔ اس میں مجھے گھر کی چابی نظر آئی اور اس کے ساتھ ہی ایک خط پڑا تھا جو آپ نے آپا صغریٰ کے نام لکھا تھا۔ وہ میں نے پڑھا اور سوچا کہ آپا صغریٰ تو آئی نہیں میں ہی یہ کام کر دوں۔ میں نے

آپ کا اچار ڈال دیا ہے۔ میری ماں اچار میں کلونجی زیادہ ڈالا کرتی تھی میں نے بھی اسی لحاظ سے ڈالی ہے اور نمک مرچیں میں نے کم رکھی ہیں۔ اگر آپ اسے بڑھانا چاہیں تو بڑھا دیں۔ باقی آپا آپ کا اتنا خوبصورت گھر ہے اور اس کی ریلنگ کا ستیاناس ہوا پڑا تھا اس پر کسی نے توجہ ہی نہیں دی' میں نے کوشش کر کے یہیں پڑے برش پالش سے سب ٹھیک کر دیا ہے۔ اس رقعہ میں مزید لکھا تھا کہ ساتھ والوں کا ملازم کُکر مانگنے آیا تھا تو میں نے آپا انکار کر دیا کیونکہ معاف کرنا آپا یہ لوگ چیزیں مانگ کر لے جاتے ہیں تو واپس نہیں کرتے یا خراب کر دیتے ہیں لہٰذا میں نے اس سے کہا کہ ہمارے کُکر کا ربڑ خراب ہے تو وہ چلا گیا۔ باقی کمروں میں گھوما اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا اور آپ مجھے بہت نیک خاتون معلوم ہوتی ہیں آپ کی ہیرے کی دو انگوٹھیاں تکیے کے نیچے پڑی ہوئی تھیں وہ کافی خراب ہو چکی تھیں اس لیے میں نے انہیں کھٹا لگا کر صاف کر دیا ہے اور میں نے انہیں دھو کر ٹشو پیپر میں لپیٹ کے مجبوراً ویسے ہی تکیے کے نیچے ہی رکھ دیا ہے۔ خدا کے واسطے خیال کریں تیس تیس پینتیس پینتیس ہزار کی ایک ایک انگوٹھی کو آپ نے کتنی لاپرواہی سے رکھا ہوا ہے۔ اس نے مزید لکھا کہ میں نے غسل خانے میں دیکھا کہ صاحب کی شیونگ کٹ میں تمام کے تمام بلیڈ پرانے ہیں اور وہ صاحب ان سے گھسا گھسا کے شیو کر لیتے ہوں گے۔ یہ تو بہت بری بات ہے۔

آپ مہربانی فرما کر آج ہی انہیں نئے بلیڈوں کا ایک پیکٹ لے کر دیں اور جو چیزیں آپ نے پکنک پر لے جانے کے لیے تیار کی تھیں وہ چیزیں میں نے اٹھالی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ میرا حق ہے۔ میں حیدر آباد نوکری کی غرض سے جارہا ہوں۔ وہاں مربے اور چٹنیاں بنانے والی فیکٹری میں میرا ایک "گرائیں" (علاقے کا آدمی) ہے اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے وہاں نوکری دلوا دے گا کیونکہ میں سال ڈیڑھ سال سے بے روزگار ہوں۔ آپ میرے حق میں دعا کرنا اور میں آپ کا آپا صغریٰ کے لیے کھانے کا رکھا ہوا سامان ساتھ لے جارہا ہوں تاکہ رستے میں کھا سکوں۔ میں آپ کو اس کھانے کے لیے دعا دوں گا۔ اس رقعے کے نیچے اس نے درج کیا تھا۔

"کرم داد"

ریٹائرڈ بیٹ مین بریگیڈیئر فلاں فلاں۔

جب میری بہن نے مجھے یہ خط دکھایا تو میں یہ خط لے کر میں اخبار کے ایک بڑے دفتر میں گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ تم خوفزدہ کرنے والی خبریں تو چھاپتے ہو۔ ایک یہ خبر بھی چھاپو کہ ایسا ایک واقع ہوا ہے۔ تو وہ صاحب کہنے لگے۔ Sir, It is too good to be true ایسے تو ہو ہی نہیں سکتا کہ ایک انجان آدمی

بھرے پڑے گھر میں داخل ہوا اور صفائی وغیرہ اور کام کر کے چلا جائے اور باقی سب کچھ چھوڑ جائے اور ہمیں تو خبریں ہی ایسی چھاپنی پڑتی ہیں جو خوفزدہ کرنے والی ہوں' جب تک ایسی خبریں نہیں چھاپی جائیں گی تو لوگ اخبار ہی نہیں خریدیں گے۔ اس نے مجھے کہا کہ دیکھیں جب کوئی بنک لوٹنے آتا ہے تو وہ خوفزدہ کر کے اور پستول دیکھا کے پیسے چھینتے ہیں اور ہمارے پاس بھی اسی طرح کے خوفناک خبروں کے پستول ہوتے ہیں اور ہم ان سے اپنی سیل میں اضافہ کرتے ہیں اور یہ کہ کر اس خبر چھاپنے کا ارادہ انہوں نے ترک کر دیا۔

اس کے بعد ایسا ہی ایک واقعہ میرے ساتھ بھی پیش آیا۔ میں نے یہ بات شاید آپ کو پہلے بھی سنائی ہو گی کہ ایک بڑی خوبصورت دھان پان کی پتلی سی لڑکی ایک ٹوٹے سے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر انار کلی بازار میں آئی۔ وہاں میں اپنے دوست ریاض صاحب کے کپڑے کی دوکان میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس لڑکی نے کہا کہ کیا آپ کے پاس کوئی اعلیٰ درجے کا عروسی جوڑا ہو گا تو میرے دوست نے کہا جی بالکل ہے۔ یہ دس ہزار کا، یہ پندرہ ہزار کا ہے، یہ بیس ہزار کا ہے، پسند کر لیجیے۔ بہت اچھے ہیں۔ یہ پچیس ہزار کا بھی ہے۔

وہ کہنے لگی بس بس یہاں تک کا ہی ٹھیک ہے۔ کیا مجھے اسے پہن کر دیکھنے کی اجازت ہے۔ میرے دوست کہنے لگے ہاں ہاں ضرور۔ یہ ساتھ ہمارا ٹرائی روم ہے آپ ٹرائی کریں۔ وہ لڑکی اندر گئی۔ اس کے ساتھ ایک سہما اور ڈرا ہوا نوجوان بھی تھا۔ (جیسے آج کل کے سارے خوفزدہ سے نوجوان ہیں کہ زندگی کیسے کاٹیں گے اور مستقبل کا فکر انہیں لاحق ہوتا ہے) وہ عروسی جوڑا پہن کر باہر نکلی اور دکاندار نے اسے دیکھ کر کہا "سبحان اللہ بی بی یہ تو آپ پر بہت ہی سجتا ہے ایسی دلہن تو ہمارے پورے لاہور میں کبھی ہوئی نہ ہو گی" (جس طرح دکاندار کہتے ہیں)۔ کہنے لگی جی بڑی مہربانی ٹھیک ہے اسے دوبارہ پیک کر لیں۔ وہ مزید کہنے لگی کہ میں تو صرف ٹرائی کرنے کے لیے آئی تھی میں اپنے اس خاوند کو جو میرے ساتھ آیا ہے یہ بتانے کے لیے لائی تھی کی اگر ہم امیر ہوتے اور ہمارے پاس عروسی جوڑا ہوتا اور اگر میں اسے پہن سکتی تو ایسی دکھائی دیتی۔ آج ہماری شادی کو سات دن گزر چکے ہیں۔ ہم اللہ کے فضل سے بہت خوش ہیں لیکن میں اپنے خاوند کو جو بڑا ہی Depressed رہتا ہے اسے خوش کرنے آئی تھی۔ میرے دوست نے کہا کیا آپ کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اس نے کہا نہیں ہمارے پاس پیسے تو تھے لیکن میری ایک چھوٹی بہن جو ایم بی بی ایس کر رہی ہے اس کو پیسوں کی ضرورت تھی اور میرے والدین نے کہا کہ اگر میں یہ قربانی دوں تو

اس کی ضرورت پوری ہو جائے۔ تب میں نے کہا کہ بسم اللہ یہ زیادہ ضروری ہے۔ چنانچہ میں نے سادہ کپڑوں میں شادی کر لی۔ جب میں یہ بات اپنے دوستوں کے پاس لے کر گیا تو انہوں نے کہا کہ۔ It is too good to be true۔ خواتین و حضرات اب وقت کم ہے لیکن میں ایک آخری اور خوفناک و خطرناک محاورہ ابھی آپ کی خدمت میں پیش کر ہی دوں وہ ہے Live and : Let to Live۔

پاکستان کا ہر شخص آج کل اس وقت بڑی شدت کے ساتھ اس محاورے پر عمل کر رہا ہے۔ میں اپنے بہت امیر دوستوں سے ملتا ہوں تو وہ کہتے ہیں اشفاق صاحب ہم تو Live and Let to Live پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم جس طرح سے زندگی بسر کر رہے ہیں اس پر خوش ہیں اور ہم لوگوں کی زندگیوں میں دخل نہیں دیتے۔ ہمارے ارد گرد جھگی والے رہتے ہیں' دوسرے لوگ رہتے ہیں ہم نے کبھی جا کر ان سے نہیں پوچھا کہ تم کیسے ہو۔ ہمارا اصول Live and Let to Live ہے۔ ہمارے اب یہ اصول ہی چل رہا ہے کہ کوئی زندہ رہے، مرے کھپے، جیئے ہم اس میں دخل نہیں دیں گے۔ پچھلے سے پچھلے سال مجھے امریکہ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ریاست کیلیفورنیا میں ایک صاحب نے ہماری دعوت کی۔ میرے ساتھ بانو قدسیہ بھی تھیں۔ وہ دعوت بڑی ہی پر تکلف تھی۔ وہ

ہمارے دوست ائیر فورس کے بھاگے ہوئے افسر تھے۔ وہ ماشاءاللہ پاکستان سے بڑی دولت لوٹ کر ساتھ لے گیے تھے۔ وہ آج کل امریکہ میں انگور سکھا کر دنیا بھر میں سپلائی کے نئے کا کاروبار کرتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا آپ تو یہاں ہمارا سارا پیسہ لے کر آ گئے ہیں۔ وہ کہنے لگے اشفاق صاحب ہم تو Live and Let to Live پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم یہاں Live کر رہے ہیں اور آپ کو ہم نے Let Live کے لیے چوڑ دیا ہے کہ جیسے مرضی زندگی بسر کرو۔ میں نے کہا کہ میں ایک دن صبح جاگا تو جیسے سود خور پٹھان ڈنڈا پکڑ کر دروازے پر آیا کرتا ہے اس طرح آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کا ایک بندہ ہم سے وصولی کے لیے آ جاتا ہے اور پٹھان کی طرح کہتا ہے کہ "دیکھو ہمارا پیسہ نکالو۔"

اور میں اس سے کہتا ہوں کہ میں نے تو تم سے ساری زندگی کوئی پیسہ نہیں لیا تو وہ کہتا ہے کہ تم نے لیا ہے اور تمہیں ۳۲ بلین ڈالر دینا پڑیں گے۔

میں نے کہا کب لیا؟ کس نے لیا؟ تو اس نے کہا تمہارے بڑوں نے قرضہ لیا۔

اس پر میرے دوست نے کہا کہ ہم نے پیسہ لیا اور اسے اچھی طرح کے ساتھ استعمال کیا اور اگر اب بھی ہمیں موقع ملا تو ہم انشاءاللہ اسی طرح سے استعمال

کریں گے۔ خواتین و حضرات دنیا کا یہ معروف ترین محاورہ پاکستان میں بڑے اطمینان، اعتماد اور یقین کے ساتھ بولا جاتا ہے لیکن کسی نے کسی موٹر کا شیشہ نیچا کر کے یہ نہیں دیکھا کہ پیچھے آنے والا زندہ ہے کہ مر گیا ہے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

ڈپریشن کا نشہ

ہم بڑی دیر سے ایک عجیب طرح کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ ہمیں بار بار اس بات کا سندیسہ دیا جاتا ہے کہ ہمارے ملک میں نشے کی عادت بہت بڑھ گئی ہے اور ڈاکٹر و والدین دونوں ہی بڑے فکر مند ہیں اور والدین دانشور لوگوں سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ اس کے قلع قمع کے لئے کچھ کام کیا جائے۔ میں نے بھی ایک سوسائٹی کے ساتھ مل کر اس مسئلے کا مطالعہ کیا۔ میں نے اس سوسائٹی سے کہا کہ نشہ بری چیز ہے لیکن اتنا سا تو قوموں کی زندگی میں آ ہی جاتا ہے اور یہ بیہودہ چیز ہے جو کب سے چلی آ رہی ہے اور معلوم نہیں کب تک چلتی رہے گی۔ اس تحقیق کے دوران جو میں نے ایک عجیب چیز نوٹ کی وہ یہ کہ ایک اور قسم کا نشہ بھی ہے اور آپ مجھے اس بات کی اجازت دیں کہ میں اسے نشہ کہوں کیونکہ وہ ہماری زندگیوں پر بہت شدت کے ساتھ اثر انداز ہے۔ وہ نشہ Stress ،فشار، پریشانی اور دکھ کو قبول کرنے کا ہے۔ اس نشے کو ہم نے وطیرہ بنا لیا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ جب تک ہم Stressful نہیں ہوں گے اس وقت تک نارمل

زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ آپ محسوس کریں گے کہ اس نشے کو ترک کرنے کی اس نشے سے بھی زیادہ ضرورت ہے۔ میں ایک بار کچہری گیا، ایک چھوٹا سا کام تھا اور مجھے باقاعدگی سے دو تین بار وہاں جانا پڑا۔ کئی سیڑھیاں چڑھ کر اور اتر کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ بہت سے میری عمر سے بھی زیادہ عمر کے بابے کچہری میں بنچوں کے اوپر بیٹھے ہوئے ہیں اور مقدمے لڑ رہے ہیں۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق ان سے پوچھا کہ آپ کیسے آئے ہیں۔ کہنے لگے جی ہمارا مقدمہ چل رہا ہے۔

میں نے کہا کہ کب سے چل رہا ہے۔ ایک بابے نے کہا کہ پاکستان بننے سے دو سال پہلے سے چل رہا ہے اور ابھی تک چلا جا رہا ہے۔ وہ سسٹم کے اوپر لعن طعن بھی کر رہا تھا۔ میں نے کہا کہ مقدمہ کس چیز کا ہے۔ اس نے بتایا کہ ہماری نو کنال زمین تھی اس پر کسی نے قبضہ کر لیا ہے۔ میں نے کہا کہ 53 میں 2 سال ملا کر 55 سال بنتے ہیں۔ آپ دفع کریں، چھوڑیں اس قصے کو۔ وہ کہنے لگا کہ جی اللہ کے فضل سے بچوں کا کام بڑا اچھا ہے اور میں اس کو دفع بھی کر دوں لیکن اگر مقدمہ ختم ہو جائے تو میں پھر کیا کروں گا؟ مجھے بھی تو ایک نشہ چاہیے۔ صبح اٹھتا ہوں کاغذ لے کر وکیل صاحب کے پاس آتا ہوں اور پھر بات آگے چلتی رہتی ہے اور شام کو گھر چلا جاتا ہوں۔ اس بابے کی بات سے میں نے اندازہ لگایا کہ ہمارے

ہاں تو اس نشے نے خوفناک صورتحال اختیار کر لی ہوئی ہے۔ سکولوں میں ماسٹروں، گھروں میں عورتوں نے اور دفتروں میں صاحبوں کو یہ نشہ لگا ہوا ہے۔ جسے دیکھیں وہ پریشانی کے عالم میں ہے اور کسی نے اس نشے کو چھوڑنے کی بھی کبھی زحمت گوارا نہیں کی۔ اگر کسی یوٹیلٹی بل کی آخری تاریخ 17 ہے تو اسے صرف چند لوگوں کو چھوڑ کر باقی دو دن پہلے بھی ادا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے آپ کو صرف فشار کے حوالے کر رکھا ہے۔ اس دکھ سے ہمیں نکلنا پڑے گا۔ تیسری دینا اور بطور خاص ہم پاکستانی اس قدر دکھ کی طرف تیزی سے بڑھتے ہیں کہ جیسے ہمیں اس کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں رہا۔ ایک زمانے میں سمن آباد رہتا تھا۔ ان دنوں ہمارے پاس پیسے بھی کم ہوتے تھے لیکن جو بوجھ ہم نے اب اپنے اوپر طاری کر لیا ہے ایسا نہیں تھا لیکن اب ہم اس بوجھ اور دکھ کے نشے سے باہر نکلنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ میرے ایک دوست ہیں انہیں آدھے سر کے درد کی شکایت ہے اور وہ ایسا طے شدہ درد ہے کہ ہفتے میں ایک بار بدھ کے دن شام کو تین بجے کے بعد ضرور ہوتا ہے اور اس درد کا حملہ بڑا شدید ہوتا ہے لہٰذا وہ صاحب دو بجے ایک چھوٹے سے سٹول پر اپنی دوائیاں اور ایک بڑے سے سٹول پر اپنے رسالے اور کتابیں لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور کتابوں کو پڑھتے ہوئے اس درد کے حملے کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ اس وقت ان کی بیوی آرام

کرتی ہے اور اسے پتہ ہے کہ اب اسے اٹیک ہو گا اور یہ جانیں اور اس کا کام۔ لیکن وہ صاحب اس ''بھاؤ'' کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں کہ وہ کب آتا ہے۔ جس طرح پہلے زمانے میں ہم کہانیاں سنا کرتے تھے کہ ایک بستی کے اندر بلا پڑتی ہے تو وہ ایک بندہ یا لڑکی دیتے تھے کہ اس کو قتل کر کے کھا جا اور چلی جا۔ اب وہ ''بھاؤ'' سب کو پڑنے لگا ہے اور ہر بندہ اس انتظار میں بیٹھا ہوا ہے کہ یا اللہ میرا ''بھاؤ'' کب آئے گا تاکہ میں اس کو اپنے اوپر طاری کروں حالانکہ انسان اس نشے سے نکل بھی سکتا ہے کیونکہ وہ اللہ کے فضل سے بڑا طاقتور ہے۔ اللہ نے اس کو بڑی صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ وہ صاحب بیٹھے ہوئے ہیں اور ساڑھے تین بجے ٹھاہ کر کے انہیں اٹیک ہوتا ہے۔ جب وہ اٹیک ہوتا تو وہ سخت تکلیف میں کانپتے ہیں۔ پھر وہ ایک دوائی کھاتے پھر دوسری اور شام کے چھ بجے تک نڈھال ہو کے بستر پر لیٹ جاتے اور پھر صبح جا کے وہ بالکل ٹھیک ہوتے۔ ایک روز جب میں اور ممتاز مفتی ان سے ملنے گئے تو وہ اپنی دوائیاں رکھ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا یہ کیا ہے۔ کہنے لگے یہ میری دوائیاں ہیں اور اب میرے اوپر اٹیک ہونے والا ہے اور میں ان دوائیوں سے اس کا سدباب کروں گا۔

ان دنوں ممتاز مفتی کو ہومیو پیتھی کا شوق تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ہمارے ہومیو پیتھک طریقۂ علاج میں ایک ایسی دوائی ہوتی ہے جو اس مرض کے لئے ہوتی

ہے۔ ان صاحب نے کہا کہ نہیں میرے پاس یہ دوائیاں پڑی ہیں لیکن ممتاز مفتی اپنے سکوٹر پر گئے اور جا کے دوائی لے آئے۔

اور انہوں نے گول گول میٹھی سی گولیاں ان کے منہ میں ڈال دیں۔

اب اللہ کی مہربانی اور اتفاق دیکھئے کہ پہلے ساڑھے تین بجے، پھر چار بج گئے اور پانچ بجے ان صاحب کے زور سے چیخ ماری اور پریشان ہو کر کہنے لگے کہ میری بیماری کہاں گئی۔ (اب وہ صاحب تو اس بیماری کے عادی ہو چکے تھے۔)

وہ کہنے لگے کہ میرے ساتھ یہ دھوکا ہوا ہے۔ یہ کیوں ایسا ہوا ہے۔ اس کی بیوی کہنے لگی کہ یہ تو اچھی بات ہے لیکن ان صاحب نے رات بڑی بے چینی میں گزار دی۔ اگلے دن وہ سی ایم ایچ گئے اور اس دوائی کو دکھایا۔ ہسپتال والوں نے اس دوائی کا ٹیسٹ کیا اور کہا کہ یہ کوئی دوائی نہیں ہے یہ تو میٹھا ہے۔ انہوں نے آ کر ممتاز مفتی صاحب سے پوچھا کہ آپ بتائیں کہ وہ کیا تھا۔

مفتی صاحب نے کہا کہ یہ ہماری ایک مشہور دوائی ہے اور خاص طور پر سر آدھے سر کے درد کی شکایت کے لئے ہے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے یہ دوائی بالکل نہیں چاہئے۔

خواتین و حضرات! وہ بیماری ہی ان کی محبوبہ ہو گئی تھی۔ اتنی پیاری کہ نہ انہیں بیوی اچھی لگتی تھی نہ انہیں بچے اچھے لگتے تھے۔ بس انہیں بدھ والے دن آنے والی اس بیماری سے عشق تھا۔

آپ اگر اپنے گھروں میں غور کریں تو آپ کو احساس ہو گا کہ ہر بندہ اپنی اپنی بیماری سے چمٹا ہوا ہے اور مثبت زندگی گزارنے کی طرف کسی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں یہ بات بھی جانتا ہوں اور محسوس بھی کرتا ہوں کہ ہمارے سب کے مالی حالات اتنے اچھے نہیں ہیں جتنے ہونے چاہئیں لیکن اس کے باوصف گزارا چلتا تو ہے ناں!

میں عمر کے بالکل آخری حصے میں ہوں لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ 1964 ہمارا یہ ٹی وی اسٹیشن چلا تھا اس وقت میں جو کماتا تھا یا جو میری تنخواہ تھی اور اب جو کچھ میں کماتا ہوں اس میں بڑا فرق ہے۔ اِس وقت میری کمائی کا ستّر فیصد حصہ ان چیزوں پر لگ رہا ہے جو 1964 میں موجود ہی نہیں تھیں اور میں حلفیہ کہتا ہوں کہ میں سن چونسٹھ میں بھی زندہ تھا۔ اس زمانے میں فوٹو اسٹیٹ مشین نہیں تھی۔ شیمپو نہیں ہوتے تھے جبکہ آج ٹی وی کے اشتہاروں سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ شیمپو کا ہے کہ کون سا شیمپو استعمال کیا جائے اور

ہمارے بچے شیمپو کے انتخاب کے عذاب میں مبتلا ہیں۔ اگر سب عذاب اکٹھے کئے جائیں تو زیادہ عذاب ایسے ہیں جو 1964 میں موجود نہیں تھے لیکن ہم بڑے مزے کی زندگی گزارتے تھے۔

کیا ہم اس عذاب سے باہر نہیں نکل سکتے؟ کیا ہم اپنی بیماری کو اس طرح کلیجے سے لگا کر بیٹھے رہیں گے؟

کیا ہماری زندگی میں خوشی کا کوئی دن بھی نہیں آئے گا؟

یہ خوشی ایسی چیز ہے جو صرف اندر سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ یہ باہر سے نہیں لی جا سکتی۔ آج کل کے بچے کہتے ہیں کہ اگر ہمارے پاس زیادہ چیزیں اکٹھی ہوں گی تو ہمارے پاس زیادہ خوشیاں ہوں گی۔ میری بہو کہتی ہے کہ اگر اس کے پاس پنے (زمرد) کا ہار ہو تو وہ بڑی خوش ہو۔ وہ مجھے کہتی ہے کہ ماموں اگر دو ہار بن جائیں تو پھر بڑی بات ہے۔ میں نے کہا کہ اچھا میں تمہیں لا دیتا ہوں۔

وہ کہنے لگی 35 ہزار کا ہے۔ میں نے کہا کہ کوئی بات نہیں لیکن یہ بتاؤ کہ وہ لے کر تم کتنے دن خوش رہو گی؟ کہنے لگی میں کافی دن خوش رہوں گی۔

میں نے کہا کہ تم اپنی سہیلیوں کے سامنے شیخی بگھارو گی کہ میرے پاس یہ سیٹ بھی آ گیا ہے۔ پھر کیا کرو گی؟

وہ مجھے کہنے لگی کہ Possession کا اپنا ایک نشہ ہوتا ہے اور یہ خمار ہوتا ہے کہ فلاں چیز میرے قبضے میں ہے۔

میں نے کہا پیارے بچے!

میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ اتنی ساری قیمتی چیزیں اکٹھی کر کے جب تم سوتی ہو یا سونے لگتی ہو تو ان ساری چیزوں سے تمہارا تصرف تو ٹوٹ جاتا ہے اور میں تمہیں جب کبھی صبح جگاتا ہوں تو تم کہتی ہو کہ ماموں بس دو منٹ اور سو لینے دیں۔ یعنی جو خوشی آپ کے اندر سے پیدا ہو رہی ہے وہ زیادہ عزیز ہے اور وہ جو Possession آپ نے اکٹھے کئے ہوئے ہیں وہ اس وقت آپ بھلائے ہوئے ہوتی ہیں لیکن اس بات پر ہم نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔

میری بہو جس کی سمجھ میں میری باتیں تھوڑی تھوڑی آنے لگی ہیں وہ کہتی ہے کہ ماموں ان باتوں پر عمل کر کے کہیں مارے ہی نہ جائیں۔

میں کہتا ہوں کہ مارے جانے والی کوئی بات ہیں نہیں ہے۔ بلکہ آپ خوش ہوں گے۔ میں اس سے کہتا ہوں کہ میں جب تمہاری عمر کا تھا اور اٹلی میں تھا تو وہاں مجھے جب گھبراہٹ کے آثار پیدا ہونے لگے تو میری لینڈ لیڈی جس کے گھر میں ٹھہرا ہوا تھا یا رہتا تھا اس کا نام تانی تھا وہ کہنے لگی کہ پروفیسر تمہیں کیا مسئلہ ہے؟ میں نے اس سے کہا کہ میں پریشان ہو گیا ہوں، مجھ پر بڑا دباؤ ہے۔ وہ کہنے لگی کہ تم ایک دن چھٹی کر لو۔ میں نے کہا کہ میں چھٹی کر کے کیا کروں گا۔ میں پردیس میں ہوں اور دفتر میں جا کے ہی میرا دل لگتا ہے۔

اس نے کہا کہ روم اتنا بڑا شہر ہے تم گھومنے جاؤ اور بے مقصد جاؤ۔ میں نے کہا کہ بے مقصد کیسے گھوما جا سکتا ہے؟

کہنے لگی گھوما جا سکتا ہے۔

میں نے مسلسل 23 دن کام کیا تھا اور کوئی چھٹی نہیں کی تھی۔ میں نے اپنے دفتر والوں سے کہا کہ میں آج نہیں آؤں گا تو انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ خواتین و حضرات اس دن میں نے جو پہلا کام کیا تھا وہ یہ تھا کہ نئے کپڑے پہن کر میں دفتر میں پہنچا لیکن کام کرنے کے مقصد سے نہیں بلکہ یہ دیکھنے کے لئے کہ میرے کولیگ کیا کر رہے ہیں۔ میں نے سونورینا کو دیکھا۔ وہ بیٹھی ٹائپ کر رہی تھی۔

مجھے دیکھ کر کہنے لگی "مزے کر رہے ہو نا آج چھٹی جو ہے۔" میں نے کہا کہ ہاں اور میں اپنی کام کرنے والی کرسی پر بغیر کوئی کام کیے بیٹھا رہا۔

پھر دوسرے دفتری دوستوں سے گپ شپ کرتا رہا۔ دفتر میں وقت گزارنے کے بعد میں سیڑھیاں اترا تو وہاں قریب ہی "سانتا ماریا" میں ایک گرجے کے نیچے انڈر گراؤنڈ بازار ہے اس میں چلا گیا۔ وہاں عورتیں چیزیں بیچ رہی تھیں اور وہاں آواز دے دے کر چیزیں بیچنے کا رواج ہے۔ ایک خاتون نے مجھے بلا کر کہا کہ تم یہ جالی کے دستانے لے لو۔ وہ بڑے اچھے بنے ہوئے دستانے تھے۔ وہ کہنے لگی کہ یہ تمہاری محبوبہ کے لئے ہیں یا منگیتر کے لئے ہیں۔

میں نے کہا کہ میری تو کوئی منگیتر نہیں ہے۔ کہنے لگی بے وقوف کبھی تو ہو گی۔ میں نے کہا نہیں مجھے ان کی ضرورت نہیں لیکن وہ اصرار کرنے لگی کہ میں تمہیں زبردستی دوں گی اور اس نے وہ لفافے میں ڈال کے دے دیئے۔ اب مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے یہ کس کو دینے ہیں۔ اس وقت نہ کوئی میری منگیتر تھی اور بانو قدسیہ کا بھی تب کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ بہر حال میں نے وہ دستانے لے لیے۔

میں وہ دستانے لے کر بازار سے باہر آگیا تو دیکھا کہ ریلوے اسٹیشن کے پاس ایک سیاہ فام خاتون ایک چھابے میں زرد گلاب کے پھول رکھ کر اپنا پیر کھجا رہی تھی اور اسے جمائیاں سی آ رہی تھیں۔ اس نے مجھے کہا کہ یہ پھول بڑا اچھا ہے اور اس نے بھی کہا کہ یہ پھول تیرے بیوی کے لئے بڑا اچھا رہے گا۔ میں نے وہ بھی ''بڑا خوبصورت ہے'' کہ کر خرید لیا۔ پھر میں نے اسٹیشن پر ٹرام پکڑنے سے پہلے اپنا ایک شام کا محبوب پرچہ (اخبار) خریدا اور میں 77 نمبر کی بس میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس میں ایک بوڑھا سا آدمی جو بظاہر پروفیسر لگتا تھا گلے میں عینک لٹکائے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ میں دھڑام سے سیٹ پر بیٹھا تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ میں نے کہا کہ آپ کیسے ہیں؟ اس نے کہا کہ ٹھیک ہوں۔ میں ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ اچانک میرے ہاتھ سے گر گئی ہے اور میں نے اسے اٹھانے کی کوشش گوارا نہیں کی اور سوچا کہ کوئی بندہ آئے گا تو مجھے اٹھا دے گا۔ میں نے وہ کتاب اٹھا کر اسے دے دی۔

وہ ایک ریٹائرڈ سکول ٹیچر تھا۔ ہم باتیں کرنے لگے۔ اس نے کہا آج موسم کتنا اچھا ہے۔ میں نے کہا ہاں جی موسم واقعی بہت اچھا ہے۔

جب میں گھر کے پاس پہنچا تو شام ہو چلی تھی۔ میں نے آسمان پر ایک ستارہ دیکھا جو میں نے دو سال سے نہیں دیکھا تھا۔ یہ ستارہ ایک گائیڈ کی طرح سے نشاندہی کر رہا تھا کہ میرا گھر اس طرف ہے۔ مجھے وہ بڑا اچھا لگا اور میں کافی دیر تک اس کو دیکھتا رہا۔ میں نے گھر آ کر اخبار، سفید دستانے اور لمبی ڈنڈی والا پھول جب میز پر رکھا تو آپ یقین کریں، میں آپ کو سچ سچ عرض کرتا ہوں کہ مجھے ویسے خوشی عطا کرنے والا دن پھر کبھی نصیب نہیں ہوا حالانکہ میرے پاس کوئی Possession نہیں تھا۔ اب بھی میں کسی دن ویسے ہی چوبرجی کی طرف نکل جاؤں گا اور جب چلتے چلتے شام ہو جائے گی تو میں کہوں گا کہ میں یہ نشہ نہیں کرنا چاہتا جو نشہ ہمارے اوپر عائد کر دیا گیا ہے۔ میری آپ سے بھی پُرزور درخواست کہ ہم دوسرے نشوں پر توجہ دینے کی بجائے Stress کے نشے سے نکلنے کی کوشش کریں۔ میں پھر کہوں گا کہ بڑی تکالیف اور تنگیاں ہیں لیکن جس طرح سے بارش کے دنوں میں جب آپ کچی گلیوں سے گزرتے ہیں اور وہاں رکھی پکی اینٹوں پر آپ پاؤں رکھتے ہوئے اپنی منزل پر پہنچ جاتے ہیں ویسے ہی ان مشکلات کو جانچتے ہوئے، پاؤں رکھتے ہوئے اگر خوشی کی طرف نکل جائیں۔ یہ میرے اس دوست کی طرح ہمیں یہ خوف لگا ہوا ہے کہ ہم اپنی بیماری کو چھوڑنا بھی ایک بیماری ہی تصور کرتے ہیں اور اپنے اوپر مسلط کردہ بیماریوں سے

جان نہیں چھڑانا چاہتے۔ میں پھر یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ہمیں بڑی پریشانیاں ہیں اور بچوں کے حوالے سے بڑی مشکلات ہیں۔ ہمیں انہیں اس طرح سے زندگی کے سفر میں کامیاب طریقے سے گامزن ہونے کے لئے کوئی راستہ نہیں مل رہا جیسے انہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن میری اس آرزو میں آپ بھی شریک ہوں گے کہ ہم ڈیپریشن کی ایسی بیماری کی طرف بڑھ رہے ہیں جو بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے اور ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ پانچ سے سات سال کی مدت میں یہ بیماری لوگوں میں ایسے پھیل جائے گی جیسے کینسر یا ایڈز کی بیماری ہے۔

اس ذہنی بیماری کا سدّ ِباب کرنے کے لئے میں اور لوگوں کے لیے بھی دعا گو ہوں لیکن اپنے ملک اور اس کے باشندوں کے لئے یہ ضرور تمنا کرتا ہوں کہ اللہ نہ کرے ہم ڈیپریشن کی بیماری میں شدت سے مبتلا ہو جائیں جس کی نشاندہی دنیا بھر کے ڈاکٹر چیخ چیخ کر کر رہے ہیں۔ ہمیں ایک ہی ذات اور نبی اکرم ص کی رہنمائی کا سہارا ہے جو ہر وقت ہمارے ساتھ ہے اور یہ سہارا ہمارے پاس ہے۔ اس وقت تک نہیں جائے گا جب تک ہم اللہ پر اتنا بھروسہ نہیں کرنے لگیں گے جتنا کہ فرمانے والوں نے فرما دیا ہے کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔

میرے بڑے بڑی ہی آسان زندگی گزار گئے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ سب کچھ جو ہو رہاہے یہ خاص سکیم کے تحت ہو رہا ہے جبکہ میں بدنصیب یہ کہتاہوں کہ ہو تا ہے توہو تا رہے لیکن میں اس میں اپنی عقل اور دانش ضرور استعمال کروں گا اور اس عذاب میں ضرور مبتلا ہوں گا جس کا وسط تو پورے طور پر ہو چکا ہے اور ہم اس کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔ ہمیں روحانیت کی رسی تھام کر مادیت کی زمین کے اوپر چلنے کی بڑی اشد ضرورت ہے لیکن رسی وہی تھامنا پڑے گی، اسی میں نجات ہے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

زندگی سے پیار کی اجازت درکار ہے

پچھلے دنوں کچھ ایسے بوجھ طبیعت پہ رہے، ان کچھ اور چند دنوں کو میں اگر پھیلاؤں تو وہ بہت سارے سالوں پر محیط ہو جاتے ہیں لیکن اللہ کا فضل ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی میں دوماہ ایسے آئے کہ بوجھ میں کچھ کمی کا احساس پیدا ہوا اور یوں جی چاہا کہ ہم بھی زندوں میں شامل ہو جائیں اور جس مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں اس سنجیدگی میں کچھ کمی پیدا کریں۔ ہم سے بڑوں نے بھی خود کو خوش کرنے کے لیے خوش بختی کا سامان بہم کیا تھا لیکن بد قسمتی سے وہ سارے یہی سمجھتے رہے کہ اگر ہمارے پاس ڈھیر ساری دولت ہو گی تو ہم خوش ہوں گے۔ ان بڑوں نے یہی ورثہ اپنے بچوں میں منتقل کیا۔ ہمارے طالبعلموں کو بھی یہی بتایا گیا کہ بہت سارے پیسے اور اقتصادی طور پر مضبوط مستقبل ہی خوشی ہے۔ ان مادی خوشیوں کو سمیٹتے سمیٹتے اب حالت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ صورتحال نہایت تکلیف دہ ہو گئی ہے۔ آپ آئے روز اخباروں میں نیب کے نتائج پڑھتے ہوں گے کہ فلاں شخص سے 5 یا 8 کروڑ واپس لے لیا گیا۔

یہ ہمارے وہ پیسے تھے جو لوگ لے کر بھاگ گئے تھے۔ یہ بڑی دردناک کہانی ہے۔ میری تمنا اور آرزو ہے کہ ہم کاش ایسا بھی سوچنے لگیں کہ بہت زیادہ سنجیدگی کی دنیا سے نکل کر تھوڑی سی آسائش کی طرف بھی توجہ فرمائیں۔ خواتین و حضرات آسائش خالی پیسے کے جمع کرنے یا اپنی ذات کو مضبوط کرنے سے میسر نہیں آتی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کو محسوس کرنے میں، گلستانوں کی سیر کرنے اور جھیلوں کو دیکھنے میں بھی اتنی خوشی ملتی ہے جس کا اندازہ کرنا ہم شاید بھول گئے ہیں۔ میں ایک مرتبہ لاہور سے قصور جا رہا تھا تو ایک پُلی پر لڑکا بیٹھا ہوا تھا اور اس پلی کو ڈنڈے سے بجا رہا تھا اور آسمان کو دیکھنے میں محو تھا۔ مجھے بحیثیت ایک استاد کے اس پر بڑا غصہ آیا کہ دیکھو وقت ضائع کر رہا ہے اس کو تو پڑھنا چاہیے۔ خیر میں وہاں سے گزر گیا۔ تھوڑی دور آگے جانے کے بعد مجھے یاد آیا کہ جو فائلیں اور کاغذات میرے ہمراہ ہونے چاہئیں تھے وہ نہیں تھے لہٰذا مجھے لوٹ کر دفتر جانا پڑا۔ میں واپس لوٹا تو وہ لڑکا پھر ڈنڈا بجا رہا تھا۔ مجھ اس پر اور غصہ آیا۔ جب میں وہ کاغذات لے کر واپس آ رہا تھا تو تب بھی اس لڑکے کی کیفیت ویسی ہی تھی۔ میں نے وہاں گاڑی روک دی اور کہا، ”یارو دیکھو تم یہاں بیٹھے وقت ضائع کر رہے ہو تمہاری عمر کتنی ہے۔“

اس نے بتایا کہ تیرہ یا چودہ سال ہے۔ میں نے کہا کہ تمہیں پڑھنا چاہیے۔ وہ کہنے لگا جی میں پڑھنا نہیں جانتا۔

تب میں نے کہا کہ تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔ میرے خیال میں فضول میں اپنا اور قوم کا وقت ضائع کر رہے ہو۔ تمہیں شرم آنی چاہیے۔

وہ کہنے لگا جی میں تو یہاں بیٹھا بڑا کام کر رہا ہوں۔ میں نے کہا آپ کیا کام کر رہے ہیں۔

کہنے لگا جی میں چڑی کو دیکھ رہا ہوں۔ یہ وہی چڑی ہے جو پچھلے سے پچھلے سال ادھر آئی تھی اور اس نے یہیں گھونسلا ڈالا تھا۔ تب اس کے ساتھ کوئی اور چڑا تھا، اب کی بار یہ شاید اور کسی سے شادی کر کے آئی ہے۔

میں نے کہا کہ تم کیسے پہچانتے ہو کہ یہ وہی چڑیا ہے۔ وہ کہنے لگا کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ میں اس کو پہچانتا ہوں۔ یہ مجھے پہچانتی ہے۔ مجھے اس کی بات سن کر پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ میرے ملک میں ایک اورنی تھالوجسٹ بھی ہے۔

(The person who knows the details of the birds)

اس کا کوئی گائیڈ نہیں ہے۔ یہ کسی یونیورسٹی سے یہ مضمون نہیں پڑھا ہوا کیونکہ ہماری کسی یونیورسٹی میں یہ Subject نہیں پڑھایا جاتا ہے۔ میں چونکہ شرمندہ ہو چکا تھا اور میں اس سے کہہ چکا تھا کہ تم بڑا وقت ضائع کر رہے ہو اور فضول کام میں لگے ہو اور اب میں نے اپنے مؤقف سے نہ ہٹتے ہوئے اور شرمندگی ٹالتے ہوئے کہا کہ یار تمہیں کوئی کام کرنا چاہیے۔ میری طرف دیکھو میں کیسی اچھی گاڑی میں ہوں اور میں اپنی ایک میٹنگ میں جا رہا ہوں۔ لوگ مجھے اجلاسوں میں بلاتے ہیں اور میں تم سے بڑے درجے میں ہوں اور یہ اس وجہ سے ہے کہ میں تعلیم یافتہ ہوں اور تم نے گویا تعلیم حاصل نہیں کی ہے اور تم فضول لڑکے ہو۔

وہ میری بات سن کر ہنس کے کہنے لگا" صاحب جی بات یہ ہے کہ ہم تم دونوں ہی برابر ہیں۔ میں اس پلی پر بیٹھا بھاگتی ہوئی موٹریں دیکھ رہا ہوں۔ آپ موٹر میں بیٹھے ہوئے پلیاں بھاگتی ہوئی دیکھ رہے ہیں۔ آپ نے بھی کچھ زیادہ اکٹھا نہیں کیا۔"

خواتین و حضرات، کبھی کبھی اس لڑکے کی بات مجھے یاد آجاتی ہے۔ میں نے اب حال ہی میں پچھلے سے پچھلے ہفتے یہ فیصلہ کیا کہ اتنی زیادہ Rigid خشک اور اتنی زیادہ سنجیدہ زندگی بسر کرنے کی نہ تو انفرادی طور پر ضرورت ہے اور نہ ہی

اجتماعی طور پر ضرورت ہے بلکہ ہمیں ڈھیلے ڈھالے اور پیارے پیارے آدمی ہو کر Relax رہنے کا فن سیکھنا چاہیے۔ خواتین و حضرات اگر آپ مجھ سے میری زندگی کو سب سے بڑی خوشی پوچھیں تو میں آپ کو بتاؤں گا کہ جب میں سیکنڈ ائیر میں تھا تو لاہور میں (جو لوگ لاہور کو جانتے ہیں انہیں پتہ ہے کہ نسبت روڈ اور میکلوڈ روڈ کو ایک چھوٹی سی سڑک ملاتی ہے اور وہ سڑک بالکل دیال سنگھ کالج کے سامنے ہے) دیال سنگھ کالج کے پاس ایک حلوائی کی دکان ہوتی تھی جو سموسے بیچتا تھا۔ تب اس کے سموسے پورے لاہور کے مہنگے ترین ہوتے تھے اور وہ تین آنے کا ایک سموسہ بیچتا تھا۔ اس کے سموسوں کی خوبی یہ تھی کہ ان میں آلو کی بجائے مٹر کے سر سبز دانے ہوتے تھے۔ یہ قیام پاکستان سے پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد کسی نے اس طرح کے مٹر کے سموسے بنائے ہی نہیں ہیں شاید۔ ہم سب دوستوں کی بڑی آرزو ہوتی تھی کہ ایک عدد سموسہ ایک دن میں ضرور کھایا جانا چاہیے اور ہماری بدقسمتی یہ ہوتی تھی کہ میری ماں مجھے کالج جانے کے لیے دو آنے دیتی تھی۔ اب دو آنے میں ایک آنہ ملانا خاصا مشکل کام تھا۔ ہم تین آنے اکٹھے کرنے کے چکر میں پڑے رہتے تھے اور وہ ایک سموسہ کھاتے بھی دوستوں سے نظر بچا کے تھے کیونکہ جو دوست دیکھ لیتا وہ تو پھر حصے دار بن جاتا تھا۔ ہم اس تین آنے میں میسر آنے والی عیاشی سے بڑے لطف

اندوز ہوتے تھے اور آج ساٹھ برس سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ہم یاد کرتے ہیں کہ عیاشی کو جو لمحے تھے وہ تھے اور میری افسانہ نگاری، ناموری اور ڈرامہ نگاری کے لمحات کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں۔ اگر کالج کی زندگی سے ذرا پیچھے جاؤں تو اور خوشی کے لمحات آتے ہیں۔ ابھی کل ہی میرے پوتیاں پوتے مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ دادا، نانا آپ کی زندگی کا سب سے خوبصورت دن کون سا ہے۔ میں انہیں بتا رہا تھا کہ میں دوسری جماعت میں پڑھتا تھا اور میں تب خوش خط تختی لکھا کرتا تھا اور مجھے کبھی کبھی اس خوش خطی پر ایک یا دو پیسہ انعام بھی ملتا تھا اور تب بھی اتوار کی چھٹی ہوتی تھی۔ ایک دن میری ماں نے مجھے بتایا اور ان کی یہ بات سن کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ انہوں نے چتری مرغی کے نیچے انڈے رکھے ہیں اور وہ انہیں سی رہی ہے۔ اکیس دن کے بعد ان انڈوں سے چوزے نکلیں گے اور وہ تمہارے کھیلنے کا سامان ہو گا۔ تم ان چوزوں سے کھیلا کرنا۔ میں نے ماں سے کہا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ کسی ایسے دن نکلیں گے جب میں سکول میں ہوں گا۔ میری ماں نے کہا کہ تم گھبراؤ مت میں نے مرغی کے نیچے انڈے اس حساب سے رکھے ہیں کہ اتوار کو صبح کو ہی چوزے نکلیں گے اور وہ تمہارا چھٹی کا دن ہو گا۔ تم ان سے خوب کھیلنا۔

خواتین و حضرات، جب وہ بچے نکلے وہ ہفتے کا دن تھا۔ میں خوش خط تختی لے کر جب سکول جانے لگا تو میری ماں نے مجھے خوشخبری دی کہ "اشفاق چوزے نکل آئے اور چھ ابھی نکلے ہیں باقی نکل رہے ہیں۔"

پیارے بچو آپ اندازہ نہیں لگا سکتے اس وقت میرے دکھ اور میری مایوسی کا۔ کیونکہ چوزے نکل آئے تھے اور میں سکول جا رہا تھا اور میں نہ انہیں انڈوں سے نکلتے ہوئے دیکھ سکتا تھا اور نہ ان کے پاس سارا دن بیٹھ سکتا تھا۔ میں نے رنجیدہ ہو کر کہا، "اماں تو نے تو کہا تھا کہ اتوار کو نکلیں گے آج ہفتہ ہے۔"

میری ماں نے مجھ سے کہا کہ بیٹے جب چوزے نکل آتے ہیں تو ہفتہ بھی اتوار ہو جاتا ہے۔ تیرے لیے بھی آج اتوار ہی ہے۔ تختی بستہ رکھ دے، سکول نہیں جانا۔ وہ دن آج تک میری زندگی کا خوبصورت دن ہے اور مجھ یاد ہے کہ وہ ہفتہ کیسے اتوار بن گیا اور وہ سارا دن میں نے کتنی خوشی کی لہر میں گزارا۔ میں اسے با وصف اس لیے نہیں بھول سکتا کہ مجھے زندگی میں بڑی کامیابیاں ملیں۔ میرے لیے بڑے باجے بجے، بڑے کمرے سجائے گئے لیکن اس خوشی کا میں آپ کو ترجمہ کر کے نہیں بتا سکتا، اس کی ترجمانی نہیں کر سکتا۔

ہمیں ایسی خوشیوں کی طرف رجوع کرنے کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ اب میں نے پچھلے دو ہفتوں سے یہ فیصلہ کیا ہے اور یہ فیصلہ اپنے مشاہدے کی بنا پر کیا ہے کہ زندگی پر تھوڑا اختیار تو ہونا چاہیے یا اس پر کنٹرول حاصل کرنا چاہیے۔ یہ تو اپنی مرضی سے چلی آرہی ہے۔

Life is Bigger than Life

میرا یہ مشاہدہ یہ دیکھ کر ہوا کہ یوٹیلٹی بِلز جن کے بارے میں آپ روتے پھرتے ہیں۔ یہ آپ تک 24 گھنٹے کے اندر اندر پہنچ جاتے ہیں لیکن وہ چیک جو آپ کی تنخواہ یا محنت کا پیسہ ہوتا ہے وہ ایک ماہ سے پہلے آپ تک نہیں پہنچتا۔ بعض اوقات تو ایک مہینے سے بھی زیادہ کا عرصہ لگ جاتا ہے۔گنیز بک والوں کا کہنا ہے کہ دنیا کے تین بڑے جھوٹوں میں سے ایک جھوٹ یہ بھی ہے کہ "جی ہم نے آپ کا چیک روانہ کر دیا ہے۔ وہ بس پہنچنے ہی والا ہو گا۔" حالانکہ چیک نہیں پہنچتا۔ میرے پوتے پوتیاں اور ان کے سکول کے باقی دوست ایک ہی موٹر پر آتے ہیں اور راستے میں وہ اپنے دوستوں کو ان کے گھروں میں چھوڑتے آتے ہیں لیکن میرے پوتے پوتیاں گھر آکر اپنے انہی دوستوں سے فون کر کے بات کرتے ہیں اور خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیتے ہیں حالانکہ ابھی چند منٹ پہلے وہ

انہیں چھوڑ کر آئے ہوتے ہیں۔ جب میں پورا منہ کھولے بڑی تکلیف میں اپنے ڈینٹسٹ کے آگے بیٹھا ہوتا ہوں تو وہ بار بار مجھ سے پوچھتا ہے جب نہیں میں بول سکتا ہوں، نہ سر ہلا سکتا ہوں۔ بس زندگی بھی کچھ اسی ڈینٹسٹ اور مریض کر طرح سے ہے۔ اب میں نے جو دو ہفتوں سے سوچ رہا ہوں تو بڑے اعتدال پسندی کے موڈ میں ہوں۔ آپ پر بڑی نصیحتوں اور بابوں کی بات کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔ میری سوچ کی طرح آپ بھی سیر کریں۔ پرندوں بارے غور کریں۔ اچھا سوچیں کیونکہ جب تک آپ کے اندر کی pollution دور نہیں ہوگی باہر کی تو بالکل ختم نہیں ہوگی۔ پہلے اندر کی صفائی ہونی چاہیے۔ اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اب زندگی میں Relaxed رہنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ میں اب زندگی کے اس آخری حصے میں کبھی Dieting نہیں کروں گا۔ میں 70 برس ڈائٹنگ کرنے کی کوشش کرتا رہا اور میرے ساتھ اور بھی عورتیں، لڑکیاں لڑکے زور لگاتے رہے لیکن وہ ڈائٹنگ نہیں کر سکے کیونکہ یہ دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ پتہ نہیں یہ کیوں نہیں ہوتا۔ میری آپا رضیہ ایک دن اپنے خاوند سے کہنے لگیں کہ "ارشد آپ کو ڈائٹنگ کرنی چاہیے، دیکھیں نا آپ چلتے ہوئے ایسے لگتے ہیں جیسے دو آدمی چل رہے ہوں۔"

لہٰذا ارشد بھائی نے ڈائٹنگ شروع کر دی۔ پھر دو ماہ کے بعد کہنے لگیں کہ آپ تو آم کی گٹھلی کی طرح چوسے ہوئے لگتے ہیں۔ آپ اپنا چہرہ آئینے میں دیکھیں تو سہی، آپ نے اتنی لمبی اور خوفناک ڈائٹنگ کیوں کر لی۔

ارشد بھائی کہنے لگے، رضیہ تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم کو میری کون سے سائیڈ سے محبت ہے۔ کبھی تم موٹاپے پر تنقید کرتی ہو تو کبھی دبلے پن پر۔

خواتین و حضرات ڈائٹنگ مشکل کام ہے اور اگر اب میرے پوتے پوتیاں مجھے کہیں گے کہ نانا آپ چوڑائی کے رخ پھیلتے جا رہے ہیں تو میں کہوں گا کہ اب تو میں چوڑائی کے رخ ہی پھیلوں گا۔

"Let Me Relax"

میں نے دوسرا فیصلہ یہ کیا ہے کہ میری میز پر جو گند پڑا ہوتا ہے، جو ٹوٹی سرنجیں جن سے میں پین میں سیاہی ڈالتا ہوں، پرانے پین، پھٹی پرانی کتابیں اور سوکھی دواتیں پڑی ہوئی ہیں۔ یہ میں اب ویسے ہی پڑی رہنے دوں گا۔ میں صفائی نہیں کروں گا۔ میری بے ترتیبی اور صفائی نہ کرنے پر میری بیوی مجھے کہا کرتی ہے کہ کیا یہ پڑھے لکھے لوگوں والا کام آپ کرتے ہیں کہ کسی چیز کی آپ کو خبر ہی نہیں

ہے اور میں اس کی باتیں سن کر شرمندہ ہو جاتا ہوں۔ اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں شرمندہ بھی نہیں ہوں گا۔ میں آپ سے بھی یہی درخواست کروں گا کہ اب آپ بھی اپنی شرمندگیوں کو، اپنے دکھوں اور دباؤ کو کم کرنا شروع کریں اور ایک آزاد اور ہلکی پھلکی زندگی بسر کرنے کی کوشش کریں۔ خواتین و حضرات میرے سر پر کچھ کتابوں کا بوجھ تھا کہ یہ ضرور پڑھنی ہیں اور ختم کرنی ہیں۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ میں History of God کے ساتھ ساتھ مولانا رومی کی مثنوی بھی شروع کروں گا اور کسی پریشانی کا اظہار نہیں کروں گا کیونکہ بلاوجہ کا اتنا سارا بوجھ لے کر میں کیا کروں گا۔

(پروگرام میں شریک ایک خاتون سوال کرتی ہیں)

سوال: اگر ہم اپنی ذات کو عذاب میں مبتلا نہیں کریں گے اس وقت تک ہم کامیاب زندگی کیسے بسر کریں گے۔

اشفاق احمد: میرے ارد گرد کامیاب زندگی بسر کرنے والے بہت سے لوگ ہیں، جنہوں نے زندگی سے پیار نہیں کیا بلکہ کامیابی سے پیار کیا ہے۔ جب آپ زندگی کو کامیابی سے علیحدہ کر دیتے ہیں اور زندگی کو مقفّل کر دیتے ہیں اور صرف کامیابی کو پکڑ لیتے ہیں تو پھر آپ کی کیفیت وہی ہوتی ہے جو ابھی ماضی قریب میں

ہم نے دیکھا کہ جن لوگوں نے بہت پیسے اکٹھے کر کے اپنی زندگیاں بنائیں پھر ان پر بدعنوانی کے مقدمات چلے اور پھر ان کی گردنیں ناپی گئیں۔ کامیاب ہونا اور چیز ہے، زندگی کے ساتھ وابستہ رہنا الگ چیز ہے۔ بے شک بچوں کو ہم سب استاد یہی کہتے ہیں کہ عذاب میں مبتلا ہوئے بغیر کامیابی ممکن نہیں لیکن آج میں آپ لوگوں کے سامنے اپنا دل کھول کے لایا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں کامیاب بھی ہوں اور میرے زندگی بھی خوشگوار اور ضمیر بھی مطمئن ہو۔ صرف کامیابی ہی کامیابی نہ ہو۔ ترقی اور فلاح میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔ ترقی فلاح نہیں ہے فلاح کے اندر ترقی موجود ہے۔ خالی ترقی آپ کا ساتھ نہیں دے گی۔ اب میں نے یہ جو فیصلے کیے ہیں یہ آپ کی مرضی کے بغیر کیے ہیں لیکن آپ مجھے اس بات کی اجازت دیں اور کہیں کہ "ٹھیک ہے بابا آپ اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزاریں لیکن اس میں فلاح کا رخ ہو اور میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ انشاء اللہ تعالیٰ اب میری زندگی میں فلاح کا رخ ضرور ہو گا۔ میں صرف ترقی کی طرف جانے والا نہیں ہوں گا۔ اگر میں خالی ترقی کی طرف جاؤں گا تو پھر میں ڈیزی کٹر (وہ تباہ کن تم جو امریکہ نے افغانستان میں استعمال کیے) بناؤں گا۔ پھر میں تورا بورا کو فنا کر کے ریت میں تبدیل کر دوں گا۔ مجھ ایسی ترقی

نہیں چاہیے۔ مجھے زندگی سے پیار کرنے کی اجازت دیں اور میں بھی آپ کو یہ اجازت دیتا ہوں۔"

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور میری بڑی آرزو ہے کہ اللہ ان آسانیوں کو تقسیم کرنے کا بھی شرف عطا فرمائے۔ آمین۔ اللہ حافظ۔

نظرِ بد

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں محبت بھرا اسلام پہنچے۔

میں ایک تھوڑے سے دکھی دل کے ساتھ، طبیعت پر بوجھ لے کر آپ سے بات کر رہا ہوں اور امید ہے کہ آپ بھی میرے اس دکھ میں شرکت فرمائیں گے۔ ایک زمانے میں جب میں بہت چھوٹا تھا تو میری بڑی آپا جو نظرِ بد پر بڑا اعتقاد رکھتی تھیں، میں اس وقت باوصف کہ بہت چھوٹا تھا اور میں بھی نظر وظر کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا تھا لیکن چونکہ میرے بڑے بھائی مجھے سیر کے لیے اپنے ساتھ لے جاتے تھے اور میں نیلی نیکر پہن کر اپنے سنہرے بالوں کے ساتھ "باوا "سا بنا ہوا ساتھ چلتا تھا تو میری بڑی آپا کہتی تھیں کہ ٹھہرو میں اس کے ماتھے پر تھوڑی کالک لگا دون کہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔ لیکن میں ان کے اس عمل سے بڑا گھبراتا تھا۔ کئی گھرانوں میں نظر کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ میں کالک لگانے سے گھبراتا کہ میرے ماتھے پر کالک کیوں لگائی جاتی ہے؟ میری چھوٹی آپا اس پر کوئی یقین نہیں رکھتی تھیں اور جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا تو مجھے پتہ چلا کہ یہ ماتھے

پر کالک نہیں لگاتے بلکہ اس طریقے سے نظر اتاری جاتی ہے۔ میری ماں سرخ مرچیں لے کر انہیں جلتے ہوئے کوئلوں پہ رکھ کر کہا کرتیں کہ اگر ان کے جلنے سے بدبُو آتی ہے تو نظر ہے اگر نہیں آتی تو پھر نظر نہیں ہوتی ہے۔ میرے والد صاحب اور میرے بھائی ان کے اس اعتقاد پر بہت ہنسا کرتے تھے کہ یہ کیا فضول بات ہے۔ نظر نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ میری نانی کہتی تھیں کہ تمہارے ماموں اعجاز اور تمہاری ممانی رضیہ جو منگورہ (سوات) میں اس وقت موقع پر ہی جاں بحق ہر گئے جب ایک درخت ان کی کار پر آن گرا، انہیں نظر لگ گئی تھی۔ اس بارے میں میری ماں بتاتی تھیں کہ ہم نے ماں کو ایسے ہی بتایا ہے۔ ان کی کار پر کوئی درخت ورخت نہیں گرا تھا بلکہ سڑک کنارے ایک بلڈوزر کھڑا ہوا تھا۔ جب ان کی کار گزری تو اس بلڈوزر کا مٹی اٹھانے والا بھاری بھر کم "چمچہ" عین اس وقت ان کی گاڑی پر گر گیا جب موٹر اس کے نیچے سے گزر رہی تھی۔ ایسی بہت سی کہانیاں زندگی میں چلتی رہتی ہیں۔ آپ نے بھی سنی ہوں گی لیکن ہم تعلیم کی وجہ سے ایسی کہانیوں پر کچھ زیادہ اعتماد نہیں کرتے۔ ایک وقت ایسی صورتحال میری زندگی میں بھی پیدا ہوئی جب میں بڑی بری طرح سے نظر آیا گیا۔ میں بڑا ہو چکا تھا اور پڑھ لکھ چکا تھا۔ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو چکا تھا۔ اس واقعہ میں مجھ پر اس قدر بوجھ پڑا کہ میں نے گھبرا کر اور سر جھکا کے اس بات

کا اعلان کیا کہ واقعی نظرِ بد کوئی چیز ہے اور نظر لگانے والا بڑے اہتمام کے ساتھ Plan کر کے نظر لگاتا ہے۔ یہ نہیں کہ نظر اتفاق سے لگ گئی۔ نظر لگانے والا اندر سے بڑا کینہ پرور ہوتا ہے اور بے ایمان ہوتا ہے۔ ہم 52-1950ء کے قریب پہلی مرتبہ مشرقی پاکستان گئے۔ ہم نے چار پانچ دن وہاں گزارے اور پہلی مرتبہ ہم نے جی بھر کے کیلے کھائے۔ جب ہمارا وہاں سے لوٹنے کا پروگرام ختم ہوا تو ہمارا وہاں سے واپس آنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایسی محبت والے لوگ تھے جو خود بھی نہیں چاہتے تھے کہ ہم واپس جائیں لیکن ہمیں مجبوراً واپس آنا پڑا۔ اللہ نے ہماری خواہش ایک بار پھر پوری کی کہ ہمیں تقریباً آٹھ ماہ کے بعد دوبارہ وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ ہم بہت سارے شاعر، ادیب اور رائٹر تھے جو وہاں ایک اجلاس میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ ہمیں وہاں حد سے زیادہ محبت ملی اور ہمارے وہ بھائی ہمیں ایسی چیزیں کھانے کو دیتے جو ہم نے پہلے کبھی دیکھی بھی نہیں تھیں۔ بنگال اکیڈمی والوں نے مجھے کہا کہ اشفاق صاحب ہم نے آپ کے لیے یہ ایک بہت بڑا پھل رکھا ہے جو ناریل سے بھی بڑا تھا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ اپ اس کو کاٹیں لیکن اسے آپ احتیاط سے کاٹیں کیونکہ یہ پیچھے پڑ جاتا ہے۔ اسے "کٹھل" کہتے تھے۔ جب میں نے اسے چھری سے کاٹنا شروع کیا۔

میں نے ایک آدھ بار تو چھری چلائی لیکن اس نے واقعی میرے دونوں ہاتھوں کو وہیں سے پکڑ لیا جہاں پر تھے۔

دنیا کی اگر کوئی پاور فل گوند یا گلو اگر کہیں سے ملتی ہے تو وہ "کٹھل" سے نکلتی ہے۔ وہ سب ہمیں کہتے تھے کہ کوئی داڑھی والا آدمی اسے نہ کاٹے کیونکہ اگر اس کے کاٹتے ہوئے ہاتھ داڑھی کو لگ گیا تو وہ ساری نوچ کے نکالنی پڑے گی۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں ہو گا۔ وہاں ہم نے خوب کٹھل کھایا۔ میں نے اپنے استاد غلام مصطفیٰ تبسم کے کہا جی میں ہوٹل سے نیچے گیا تھا اور آپ کے لیے یہ اناس لایا ہوں۔ میں نے دس اناس کو دھاگے کے ساتھ باندھ کے لٹکا رکھا تھا۔ وہ کہنے لگے تو ان کو کیوں لے آیا۔ میں نے کہا سر یہاں آئے ہیں تو اناس تو کھائیں گے۔

وہ پوچھنے لگے کتنے کے آئے؟

میں نے جواب دی جی ایک روپیہ دس آنے کے یہ دو اناس آئے ہیں۔

وہ غصے میں آکر کہنے لگے اسے کاٹے گا تیرا باپ۔ ہم کو تو پتہ ہی نہیں کہ انہیں کیسے کاٹا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ جی میں وہ تھی "سائی" (طے کر کے) لگا کے آیا

ہوں ابھی ہوٹل میں کام کرنے والا لڑکا اوپر آئے گا اور وہ دو مزید انناس بھی لا رہا ہے۔

وہ کہنے لگے ارے برباد ہو جائیں گے۔ میں نے کہا جناب انہیں فرج میں رکھیں گے اور شوق سے کھائیں گے ایسا موقع بار بار کہاں ملتا ہے۔ چنانچہ وہ لڑکا آیا، اس نے کاٹ کے طشتری میں رکھ دیئے۔ ہمارے وہاں قیام کے وقت ہمارے لیے اور ہمارے پیارے میزبانوں کے لیے یہ ایک عید کا سا سماں تھا۔ وہاں محبت کی اتنی بڑی دنیا آباد ہو گئی تھی کہ میں نے زندگی میں اس سے پہلے محبت کا ایسا مظہر نہیں دیکھا تھا۔

وہاں پر ایک بی بی جس کا نام اوما تھا اس نے ہمیں علامہ اقبال کی ایک نظم:

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن

مجھ کو پھر افسانوں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن

سنائی۔ ایسی خوبصورت آواز اور اچھی انداز میں میں نے یہ نظم نہیں سنی۔ اس موقع پر مجھے انشاء جی کہنے لگے کہ ہمیں شرم آنی چاہیے اور ہمیں بھی کچھ آنا چاہیے۔ یہ اقبال کی نظم کتنے اچھے انداز میں گا رہی ہے۔ ہم نے اپنے بیرے سے

کہا کہ یار ہمیں بھی کچھ گانا سکھا دو چنانچہ ہم نے پہلا گانا مشرقی پاکستان میں اپنے پاکستانی بھائیوں سے سیکھا وہ یہ تھا:

اللہ میک دے، پانی دے، چھایا دے تُو ای

ہو اللہ میک دے، پانی دے، چھایا دے تُو ای

(گانے کے انداز میں)

ہم یہ شعر تو گا کر کہہ لیتے تھے لیکن "اللہ" کہنے کا خوبصورت انداز صرف انہی کو آتا تھا۔

خواتین و حضرات کیا آپ نے کبھی کسی سندھی کو "اللہ" کہتے ہوئے سنا ہے۔ جب کوئی سندھی اپنی کسی نظم میں یا کلام میں "اللہ" کہتا ہے تو میں اس پر قربان ہو جاتا ہوں یعنی میرے میں طاقت ہی نہیں رہتی۔ میں نے "اللہ" کا اُچارن "اللہ" کا تلفظ اور اس لفظ کی قرات ان سے زیادہ خوبصورت انداز میں سوائے سندھیوں کے کسی کے منہ سے نہیں سنی۔ ایسے ہی ہمارے مشرقی پاکستان کے بھائی وہ ادا کرتے تھے۔ ہم نے وہاں سائیکلیں لے لیں۔ وہ اپنا گھر تھا اور میزبان

اپنے بھائی تھے۔ ہم صبح سویرے سائیکلیں لے کر نکلتے اور سائیکلیں چلاتے ہوئے گانا گاتے پھرتے تھے۔ جس کا ترجمہ کچھ اس طرح سے تھا:

"اے اللہ ہم تو تیرے بندے ہیں اور تیرا نام بار بار لیتے ہیں۔"

ہم سب اپنی اپنی اونچی، نیچی اور بیٹھی آوازوں میں گانے گاتے پھرتے تھے۔ ہمارے ساتھ گانے والے احمد راہی کی آواز تو بالکل ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ ہم جب وہاں شہر میں گاتے پھرتے تھے اور شہر کا چکر لگاتے تو پتہ چلتا کہ جیسے جسم میں توانائی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اور میں نے اس وقت یہ بھی محسوس کیا کہ ایک تیسری آنکھ جو نظرِ بد والی آنکھ کہلاتی ہے وہ ہم لوگوں کو دیکھ رہی ہے۔ میں نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ وہ آنکھ ہم پر اثر انداز ہو رہی ہے اور اس آنکھ نے باقاعدہ Plan کرکے منصوبہ بندی کرکے ہمارے درمیان تفرقہ ڈالا ہے اور یہ آپ سب کو معلوم ہے مشرقی پاکستان کی سرحد سے تقریباً پچاس ساٹھ میل کے فاصلے پر ایک شہر ہے۔ خواتین و حضرات، برِاعظم ایشیا کے اندر اگر کوئی دہشت گردی کا مرکز پہلی مرتبہ قائم ہوا تو وہ اس "اگر تلہ" شہر میں ہوا۔ وہاں تیسری آنکھ نے بڑی ہمت سے بڑی محنت کرکے ہمارے درمیان نفرتیں بھی پھیلائیں۔ غلط فہمیاں بھی پھیلائیں اور اس سے وہ تانا بانا بُنا کہ وہ دہشت

گردی نہ صرف اس علاقے میں رہی بلکہ وہاں سے پھیلتی پھیلتی دوسرے علاقوں میں بھی چلی گئی۔ وہاں سے نکل کر سری لنکا میں بھی چلی گئی، وہاں کے ٹرینڈ کیے ہوئے دہشت گرد باہر نکل کر دوسرے علاقوں پر حملہ آور ہوتے اور بڑی اچھی اور پر سکون زندگی گزارنے والوں کو ذلیل و خوار کرتے پھر انہوں نے میرے ہی ان بھائیوں کو جن کے ساتھ مل کر ہم گانے گاتے تھے جن میں ہم نے قدرت اللہ شہاب کو بھی ملا لیا تھا اور ہم وہاں سے میٹھا دہی کھایا کرتے تھے اور اس دہی کے بڑے بڑے بھرے ہوئے "کونڈے" جہاز میں رکھ کر لاہور بھی لے آئے تھے۔ (وہ اس دہی میں کھجور کا شیرہ ڈالتے ہیں اور اس سے اچھی سویٹ ڈش میں نے پہلے یقیناً نہیں کھائی تھی اور نہ آپ نے کھائی ہو گی)۔ ان کے اور ہمارے دلوں میں غلط فہمیاں ڈال دیں اور اس تیسری نظرِ بد والی آنکھ نے وہیں سے ہمارے اپنوں، دوستوں، جاننے والوں اور ہماری جان و جگر کو لیا اور ان کو مکتی باہنی کا نام دے کر ان کی ٹریننگ شروع کر کی جس میں انڈین فورسز کے آدمی بھی تھے اور انہوں نے بھی مکتی باہنی کی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ اس تیسری آنکھ کو یہ خوف تھا کہ اگر ان دونوں (مشرقی اور مغربی پاکستان) کے درمیان محبت اور یگانگت بڑھتی رہی اور یہ ایک دوسرے کے اس شدت کے ساتھ قریب آتے رہے اور دین کے رشتے کے بعد یہ ثقافتی رشتوں

میں بھی مزید بند ھتے چلے گئے تو پھر ہمیں انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا یا "نکھیڑنا" بڑا مشکل ہو جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے منصوبہ بندی کر کے اور دنیا کے دوسرے ملکوں کو ساتھ ملا کے یہ پروگرام بنایا کہ کسی نہ کسی طرح سے اس رشتے کو توڑ دیا جائے۔

انہوں نے جو سب سے بڑا کام کیا وہ یہ تھا کہ اس تیسری نظرِ بد والی آنکھ نے ہمیں اپنی ہی نگاہوں میں پامال کر دیا۔ شرمندہ کر دیا۔ سارا بوجھ اور الزام اٹھا کر ہمارے اوپر رکھ دیا اور ہم وہ سارا بوجھ ابھی تک اٹھائے پھرتے ہیں۔ یہ ان کا بڑا کمال ہے۔ اس شرمندگی نے کس طرح سے آپ پر اور آپ کی نفسیات پر اثر ڈالا ہے۔ یہ وہ لوگ بڑی اچھی طرح سے جانتے ہیں لیکن ایشیا کے اور پاکستان کے لوگ نہیں جانتے صرف ہندوستان کے لوگ ہی جانتے ہیں کہ دہشت گردی کا جو پہلا اڈا اور مرکز قائم ہوا وہ کہاں قائم ہوا تھا۔ جہاں سے دہشت گردی کی شاخیں پھوٹی تھیں۔ جب آپ دہشت گردی کا نام لیتے ہیں اور دہشت گردی کی بات کرتے ہیں تو ان کا پہلا مقام "اگر تلہ" ہی تھا اور وہ دہشت گردی کا پودا اب تک پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ ہم جو مظلوم و مقہور ہیں، جن پر ظلم کیا گیا ہے اور پوری دنیا یا گلوب میں پاکستان واحد ملک ہے جو دہشت گردی کا شکار ہوا اور اس کا ایک حصہ دہشت گردی کے زور پر جدا کیا

گیا۔ یہ نظرِ بد یونہی نہیں لگ جاتی اس کے لیے خاص منصوبہ بندی کرنی پڑتی ہے۔ ہم جو بھائی آپس میں ملتے تھے "جپھیاں" ڈالتے تھے، کل کر کبھی سُر میں اور کبھی بے سُرے ہو کر گاتے تھے وہ سارے کے سارے ملیا میٹ ہو گئے۔ (اس موقع پر اشفاق احمد بنگلہ زبان میں کوئی محبت اور دوستی کا گیت گاتے ہیں۔)
اب لوگ چلے تو پھرتے ہیں اور ابلاغ کا ایسا زور ہے کہ بہت سے لوگ سچ مچ یہ ماننے لگے ہیں کہ شاید پاکستانی بھی دہشت گرد ہیں۔ ہمیں ہر روز دہشت گرد باور کرایا جاتا ہے اور ہم ہر روز شرمندگی کی آنکھوں پر لجاجت کا ہاتھ رکھ کر گھروں میں داخل ہوتے ہیں اور باہر نکلتے ہیں۔ یہ آخر کیسے اور کس طرح سے ہو گیا۔ اب پھر کون سا ایسا گانا اور ترانا گایا جائے کہ ہمیں اس بات کا احساس نہ رہے ہم ایک بڑی پوری اور زندہ قوم ہیں اور ہم نیوکلیئر پاور ہیں۔ کسی سے کم تر نہیں ہیں۔ میں اب کس بابے کو جا کر ملوں کہ وہ میرے ملک کے بندوں کے دل سے شکوک و شبہات نکال دے۔

مجھے ہالینڈ میں ایک بھارتی دوست ملے۔ میں نے کہا کہ وہ ایک ظلم تو تم نے کیا اور کمال اور بڑی چالاکی کے ساتھ کیا لیکن یہ فن تم نے کس طرح سے اجتماعی زندگیوں پر اپلائی کیا کہ ہم خود کو ذمہ دار سمجھنے لگے۔

وہ کہنے لگے کہ اگر ہم یہ کمال آپ کو بتا دیں تو پھر ہمارے پاس کیا رہ جائے گا۔ ہم اب بھی کوشش کریں گے اور کرتے رہیں گے اور آپ کو چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔ یہ ہمارا منتہائے مقصود ہے۔ اس نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ اگر پاکستان جغرافیائی طور پر ہندوستان سے دور ہو یا مثال کے طور پر انڈونیشیا کے قریب ہو تو پھر ساری دنیا اس ملک کو ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے دیکھے۔ اب یہ ایسی جگہ پر پھنس گیا ہے ایک ایسے ظالم پڑوسی کے چنگل میں آ گیا ہے کہ یہ جسمانی طور پر تو شاید طاقتور رہے گا اور ہے بھی لیکن نفسیاتی طور پر اس شرمندگی سے نہیں نکل سکتا۔ جس میں اسے مبتلا کر دیا گیا ہے۔ نظر اور نظرِ بد کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ میں اس کو تسلیم نہیں کرتا تھا اور ماتھے پر کالک لگانے کے فلسفے کو نہیں مانتا تھا۔ اب مان گیا ہوں۔

چٹاگانگ میں دریائے ہگلی کے کنارے ایک بزرگ معزالدّین شازیؒ تھے۔ وہاں انہوں نے کٹیا ڈالی ہوئی تھی۔ ہم سب ان کو سلام کرنے گئے۔ اس زمانے میں میں نظرِ بد کے معاملے کو نہیں مانتا تھا۔ وہ ہم سے بڑی محبت سے ملے۔ سوکھے اور دبلے سے تھے۔ ان میں روحانی طاقت ظاہری طور پر نظر آتی تھی اور بڑی شائستہ گفتگو کرتے تھے۔ ہم سے دین، ایمان اور یکجہتی کی باتیں کرتے رہے۔ ہم جب اجازت لے کر جانے لگے تو انہوں نے اپنی انگلی سے ہمارے ماتھے کے اوپر

ایسے کچھ لکھا۔ ہم اس کو مانتے نہیں تھے لیکن جب ایک بزرگ محبت سے ایسا کر رہا تھا تو ہم کیسے انکار کر سکتے تھے۔ ابن انشاء نے کہا کہ میں نہیں لکھواتا اور وہ ایک طرف ہو کر کھڑے ہو گئے۔ جمیل الدّین عالی نے کہا کہ میں لکھوا تو لیا ہے لیکن میں اسے مانتا نہیں۔ میں نے کہا کہ نہیں جی میں لکھوا بھی لیتا ہوں اور مان بھی لیتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی بڑی برکت تھی۔ میں بعد میں بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔

ایک بار چٹا گانگ میں میں فیض احمد فیض سے ملا تو انہوں نے کہا کہ اشفاق میں تجھے ایک دنیا کی مزیدار ترین آئس کریم کھلاتا ہوں اور انہوں نے ایسی آئس کریم لا کر دی جو ہم نے واقعی ہی پہلے کبھی نہیں کھائی تھی۔ میری بیوی نے کھاتے ہی کہا کہ اشفاق صاحب دودھ دہی تو ہمارے ملک میں بھی ہوتا ہے یہ اتنی مزیدار آئس کریم یہاں کیسے بنتی ہے۔ اس پر فیض احمد فیض کہنے لگے کہ سارا دودھ دہی تو تم کھا جاتے ہو آئس کریم کیسے بنے۔ میں نے آئس کریم کھلانے پر ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آئیں میں اب آپ کو ایک بابے سے ملواتا ہوں۔ وہ بھی بڑی محبت کے ساتھ چل پڑے۔

اب میں عمر کے اس حصے میں جب ان باتوں کو اپنے اس ملک اور بھائیوں کو سوچتا ہوں تو میرے دل میں یہ بات آتی ہے کہ جتنا بڑا ظلم ہماری ذات پر بھائیوں سے جدائی کو صورت میں ہوا ہے اس سے بڑا ظلم کرہ عرض پر کسی قوم پر نہیں ہوا اور پھر صورتِ حال ایسی ہے کہ چور "چتر" بھی بن گیا۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور میری بڑی آرزو ہے کہ اللہ ان آسانیوں کو تقسیم کرنے کا بھی شرف عطا فرمائے۔ آمین۔

اللہ حافظ۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے

خطوط کی دنیا بھی ایک نرالی دنیا ہے اس کا انسانی زندگی پر اور انسانی تاریخ پر بڑا گہرا اثر ہے۔ خط کب سے لکھے جانے شروع ہوئے اور کب آکر ختم ہوئے۔ میں اس کے بارے میں یہ تو عرض کر سکتا ہوں کہ کب آکر ختم ہوئے لیکن ان کے لکھے جانے کی تاریخ اس کے بارے میں یقین اور وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لکھے جانے تو اب ختم ہوئے ہیں جب کوئی ای۔ میل کا سلسلہ شروع ہوا۔ جب Chatting کا نیا لفظ ایجاد ہوا۔ جب کمپیوٹر کے ذریعے طرح طرح کے طریقے انسان کے درمیان رابطے کا ذریعہ بنے ہیں لیکن خطوں کا جو حسن تھا اور خطوں میں جو بات ہوتی تھی اور ان کے اندر جس طرح سے اپنا آپ، اپنی روح، زندگی اور نفسیات نکال کر پیش کر دی جاتی تھی وہ اب نہیں رہی۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید ہم اس یونیورسٹی کے آخری طالبِ علم تھے جو چوری چوری خط لکھا کرتے تھے اور بڑے اچھے خط لکھا کرتے تھے۔ اب میں اپنے اسٹوڈنٹس، بیٹوں، پوتوں اور نواسیوں کو دیکھتا ہوں تو وہ کہتے ہیں Stop it Dada because this

way of Communication is very silly and we can not write.

ہمیں تو اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ خط لکھتے پھریں۔ خواتین و حضرات وقت خدا جانے کدھر چلا گیا ہے کہ آدمی آدمی سے خط و کتابت کے ذریعے رابطہ قائم نہیں کر سکتا۔ آپ یہ تو ضرور جانتے ہوں گے کہ خط کس کس طرح کے لکھے گئے، کیسی کیسی خطوط پر مبنی کتابیں چھپیں۔ آپ دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ رومی فلاسفر جو فورم میں کھڑے ہو کے باتیں کرتے تھے اور ان کی باتیں آگے پہنچائی جاتی تھیں۔ سقراط آیا، اس کے بعد افلاطون اور ارسطو آیا۔ ارسطو کے فلسفے کو آگے پہنچانے کے لیے لوگوں نے چھوٹے چھوٹے رقعوں میں اس کے فلسفے کو بیان کیا اور اسے آگے اپنے دوستوں تک ارسال کیا۔ اس طرح ہمارے صوفیائے کرام نے خطوں کے ذریعے دور بسنے والے اپنے مریدوں کے لیے اپنے پیغامات پہنچائے۔ بادشاہوں نے بھی خطوط کا یہی سہارا لیا۔ مجھے اورنگزیب عالمگیر کی مشہور تصنیف رقعاتِ عالمگیری یاد آ رہی ہے جو خطوط پر مبنی ہے۔ اس میں وہ خط ہیں جو وہ اپنے بیٹوں کو لکھتا رہا تھا جس میں وہ شہزادوں کو مخاطب کرتا ہے۔ ایک خط فارسی میں لکھا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ”شکار بے کاروں کا کام ہے۔“

(شہزادہ شکار پر گیا ہو گا تو بادشاہ نے اسے یہ خط لکھا ہو گا۔ محبت کے خزانے بھی خطوط کے ذریعے ہی بھرے گئے۔)

ادب نواز لیلیٰ کے خطوط کو جانتے ہیں اس کے بعد مجنوں کی ڈائری چھپنی شروع ہوئی پھر سجاد، زبیر اور رضیہ کے خطوط چھپے۔ اس طرح خط زندگی پر چھائے رہے اور بہت قریب اور غالب آ کر چھائے رہے۔ مرزا غالب کے خط تو آپ سب نے ضرور پڑھے ہوں گے۔ غالب بڑی محبت اور روانی و شستگی سے بات کرتا تھا۔ اور اس کی باتیں ایسی ہوتی تھیں جیسے کوئی ڈائیلاگ رائٹر لکھ سکتا ہے۔ جتنے بھی بچے جو ڈرامہ نگار میرے پاس کچھ پوچھنے یا سیکھنے کے لیے آتے میں انہیں یہی مشورہ دیتا کہ آپ غالب کے خط جب تک نہیں پڑھیں گے آپ کے اندر ڈرامے اور مکالمے کی سینس پیدا نہیں ہو گی کیونکہ غالب کے بات کرنے کا ڈھنگ ہی نرالا ہے۔ آٹھویں یا نویں جماعت کی اردو کی کتاب میں سے مجھے غالب کے خط کے چند فقرے یاد آ رہے ہیں:

”میر مہدی مجروح تم مشقِ سخن کر رہے ہو میں مشقِ فنا میں مستغرق ہوں۔ ارے میاں، ارے میاں اس دنیا میں اگر کوئی پہلوان ہوا تو کیا؟ کوئی نامی گرامی جیا تو کیا؟ کوئی گمنام مرا تو کیا؟ یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ

تھوڑی سے پونجی ہے، تھوڑی سی صحت جسمانی، باقی سب وہم ہے پیارے جانی۔"

جب کبھی غالب تھک جاتا ہے تو کہتا ہے

"میں کیا کروں، اگرچہ اس وقت اللہ کے ساتھ شکوہ نہیں کیا جا سکتا لیکن آرزو کرنا آئینِ عبودیت کے خلاف نہیں ہے۔ میری آرزو ہے کہ اب میں زندہ نہ رہوں اور اگر رہوں تو کم از کم اس ملک میں نہ رہوں کہیں اور خراسان، ایران نکل جاؤں۔ یہاں کے لوگ بڑے ظالم ہیں۔"

ایک اور جگہ کہتا ہے:

"رکاب پر پاؤں ہے اور راس پر ہاتھ ہے۔ دور دراز کا سفر درپیش ہے۔" سقر مکر ہے اور حاویہ زاویہ ہے اور کیا کسی کا ایک اچھا شعر ہے (ذوق کا ہے)

اب تو گھبرا کے کہتے ہیں کہ مر جائیں گے

مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ایک زمانے میں محبوب کبوتر کے گلے میں پرچی ڈال کر بھیج دیا کرتے تھے کیونکہ ایک دوسرے سے ملنا جلنا مشکل ہوتا تھا۔ ان کبوتروں کی خدمات سے بعد میں جنگوں میں بھی فائدہ اٹھایا گیا اور دوسری جنگِ عظیم میں باقاعدہ کبوتر کو ٹریننگ دی گئی اور ان کے پنجوں کے ساتھ ایلومینیم کی ایک باریک سے پنسل جیسی نلکی میں خط لپیٹ کر رکھ دیا جاتا تھا اور کبوتروں نے جاسوسی کا کام خوب کیا اور خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ میں یہ ساری باتیں اس لیے کر رہا ہوں کہ میرے پاس بھی ایک خط ہے اور میں اسے لیے پھرتا ہوں۔ میں اسے ضرور سناؤں گا۔ یہ خط سنانے سے پہلے مجھے خطوں کی اور باتیں بھی یاد آرہی ہیں۔

اکبر الہٰ آبادی کے بیٹے جو لندن میں تھے وہ خط نہیں لکھتے تھے جس پر اکبر الہٰ آبادی ان سے بہت شاکی رہتے تھے۔ اس زمانے میں خط سمندر سے یا بحری جہازوں کے ذریعے آتے تھے۔ ایک بار انہوں نے اپنے بیٹے کو خط میں لکھا تو ان کے بیٹے نے جواب میں لکھا کہ ابا جان جب واقعات گزرتے ہیں تو میں مصروف ہوتا ہوں جس کے باعث خط نہیں لکھ سکتا اور جب واقعات نہیں ہوتے تو کوئی چیز لکھنے والی نہیں ہوتی اور میں اس وجہ سے خط نہیں لکھتا۔

(محفل میں سے ایک صاحب اس خط کے بابت ایک شعر بھی یاد کرواتے ہیں، جس کا ایک مصرعہ اس طرح سے ہے "کھا کے لندن کی ہوا عہد وفا بھول گیا"۔)

جب بچے بڑی یونیورسٹیوں میں پڑھنے کے لیے چلے جاتے ہیں تو میری طرح کے تھوڑے پڑھے لکھے والدین خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ ایک بار دو بابے بیٹھے ہوئے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے کہا کہ یار میرا بیٹا جو خط لکھتا ہے تو مجھے بڑی پریشانی ہوتی ہے اور مجھے اس کے خط کو لے کر لائبریری جانا پڑتا ہے اور مجھے وہاں جا کر موٹی ڈکشنری کھول کے مشکل الفاظ کے معانی دیکھنے پڑتے ہیں۔ کیونکہ میں زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں۔

دوسرا کہنے لگا یار کیا کمال کی بات ہے میرے بیٹے کا جب بھی خط آتا ہے تو مجھے بینک جانا پڑتا ہے کیونکہ اس نے خط میں پیسے مانگے ہوئے ہوتے ہیں۔

خطوں سے وابستہ بڑی لمبی داستانیں ہیں۔ اگر ہم اس کی طرف چل نکلے تو بڑا وقت لگ جائے گا اور میرا یہ خط رہ جائے گا جو آپ کو سنانا بڑا ضروری ہے۔ ہم نے پہلے دوسری جنگِ عظیم کا ذکر کیا تو آپ کو یہ بتاتا چلوں کہ اس جنگ میں ہمارے علاقے کا سب سے بڑا اور طاقتور محاذ برما تھا اور ہمارے بہت سارے فوجی وہاں پر تھے۔ وہ فوجی جو محاذِ جنگ پر ہوتے ہیں ان کی سب سے بڑی آرزو اور تمنا

گھر سے آنے والے خط کی ہوتی ہے چنانچہ ان پر پریشانیوں کی جو پر چھائیاں پڑتی ہیں وہ خطوں کے ریفرنس سے ہی ہوتی ہیں۔ فوجی دورانِ جنگ جنگل میں تھے اور ڈاک جب تقسیم ہوئی تو کسی فوجی کے گھر سے کوئی خط نہ آیا اور چار پانچ چھ دن ایسے ہی گزر گئے۔ ایک دن ایک خوش نصیب کا خط آگیا اور دوسرے جو تین چار پانچ فوجی بیٹھے تھے کیونکہ ان کا کوئی خط نہیں آیا تھا اور جس کا خط آیا تھا اس نے خوشی سے لفافہ لہرایا اور کہا کہ دیکھو ایسے خط ہوتے ہیں جو گھر سے آتے ہیں۔ اس نے لفافہ چاک کیا اور اس سے کاغذ نکالا۔ اس کاغذ کے دونوں طرف کچھ بھی لکھا ہوا نہیں تھا، وہ بالکل کورا کاغذ تھا۔

دوسرے فوجی اس کا مذاق اڑانے لگے لیکن اس نے کہا کہ نہیں کہ کورا کاغذ نہیں بلکہ باقاعدہ ایک خط ہے۔ یہ میری بیوی کا خط ہے۔ آج کل ہماری بول چال بند ہے اس لیے یہ خالی کاغذ ہے لیکن مجھے یہ پتہ ہے کہ خط میری بیوی کا ہے۔

خواتین و حضرات، میرے ہاتھ میں جو خط ہے وہ کچھ اس طرح سے ہے:

”جناب نامعلوم مگر موجود یہیں کہیں السّلام علیکم!“

مجھے یقین ہے کہ آپ کو 8 جون کی تاریخ اسی طرح سے یاد ہو گی جیسی کہ مجھ کو ہے۔ اس روز میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں آپ کو عمر بھر نہیں بھلاؤں گا۔ اس تاریخ سے پہلے میں اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ پارک میں جاتا تھا۔ ہم بینچ پر بیٹھتے تھے اور ہمارا بچہ ہمارے سامنے پھولوں کی کیاریوں کے درمیان بھاگا کرتا تھا۔ اس تاریخ سے پہلے میں نے اپنے پورے خاندان کا بوجھ اٹھایا ہوا تھا اور میں کبھی کبھی دو چار آنے فقیروں کو بھی خیرات کر دیا کرتا تھا۔ اب عرصہ دس سال سے میں بیکار پڑا ہوں۔ ٹھیک آٹھ جون سے، ٹھیک اس رات سے جب تم نے میری کمر میں اپنے پستول کو گولی اتاری تھی اور وہ ریڑھ کی ہڈی میں پھنس گئی تھی۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ اس رات تم بہت ہی نروس تھے اور پستول تمہارے ہاتھ میں کانپ رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ تم پہلی بار کسی پٹرول پمپ کو لوٹنے آئے ہو۔ میں نے دن بھر کی کمائی ساری کی ساری تم کو دے دی تھی۔ پھر پتہ نہیں تم کو کیا ہوا اور تم نے کیوں میرا دایاں بازو مروڑ کر میری کمر سے لگا دیا اور مجھے دھکیلتے ہوئے اندر کمرے میں لے گئے۔ وہاں تم نے میرے سر میں پستول کا بٹ مار کر مجھے اوندھے منہ فرش پر گرا دیا۔ پھر پتہ نہیں میرے اوندھے منہ گر جانے کے بعد تم نے پستول کیوں چلایا؟ ایک زور دار دھماکہ ہوا اور اندھیرے کمرے میں ایک شعلہ سا لپکا۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا اور جب میں

جاگا تو گردن کے نیچے میرا سارا جسم شل ہو چکا تھا اور میں فرش پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ پھر تین لڑکے اپنی موٹر سائیکلوں میں پٹرول بھروانے آئے اور انہوں نے مجھ سے میرا حال دریافت کیا۔ میرا خیال تھا کہ میں زور زور سے پکار کر چیخیں مار کر لوگوں کو اپنی طرف بُلا رہا تھا مگر ان لڑکوں نے مجھے بتایا کہ تمہارے منہ سے صرف سرگوشی جیسی آواز نکل رہی تھی جو بہت ہلکی تھی۔ مجھے بالکل یاد نہیں کہ کس طرح مجھ کو لوگوں نے حیدر آباد کے ہسپتال میں پہنچایا جہاں مجھے داخل کرا دیا گیا۔ میری 19 سالہ روتی ہوئی بیوی کو ڈاکٹروں نے بتایا کہ ہم مجبور ہیں اور ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ہڈی میں پھنسی ہوئی گولی کو نکالنا خطرناک ہے۔ میری بیوی مجھے اٹھا کر گوٹھ لے آئی اور ہم سب میرے مرنے کا انتظار کرنے لگے۔ میں دن رات ایک پھٹے (تختے) پر لیٹا ایک کوٹھری میں پڑا رہتا اور میری بیوی مجھے دوا کی گولیاں کھلاتی رہتی۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ ایک نہایت تیز دھار قینچی میرے تختے کے پاس کھلی پڑی تھی۔ اس کا ایک پھل بہت آسانی سے میرا کام تمام کر سکتا تھا۔ مجھے اسے اس قدر قریب دیکھ کر خوشی ہوئی لیکن میرا بے حس ہاتھ اسے اٹھانے سے معذور تھا۔ میری موت بھی میرے اختیار میں نہیں تھی۔ میں اس کو دیکھ رہا تھا اور وہ میرے قریب نہیں آ رہی تھی۔ میں تمہیں صاف صاف بتا دوں کہ تمہارے پستول کی گولی پورے چھ

ماہ میری ریڑھ کے مہرے میں موجود رہی اور میں اسے دل سے لگا کے بے حس و حرکت جیتا رہا۔ پھر مجھے کراچی کے آغا خان ہسپتال لے جایا گیا۔ جہاں ڈاکٹروں نے مل کر بڑی احتیاط سے پھنسی ہوئی گولی میرے وجود سے نکال دی لیکن مجھے بتایا گیا کہ میں زیادہ سے زیادہ اب اٹھ کر اپنی چارپائی کے کنارے پر بیٹھ سکوں گا۔ بشرطیکہ میرے ارد گرد اور میری کمر کے پیچھے لکڑی کا ایک مخصوص ڈبہ بنا کر رکھا جائے۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ میں تھوڑا سا بیٹھ کر کھانا کھا سکا کروں گا لیکن یہ بہت مشکل تھا۔ میری بیوی اور میرا بوڑھا باپ مجھے اٹھا کر لکڑی کے سہارے بٹھا دیتے تھے اور پھر مجھے اس لکڑی کے تختے کے ساتھ باندھ دیتے تھے۔ میں کچھ لقمے خود کھا سکتا اور گلاس اٹھا کر پانی بھی پینے لگا تھا۔ گھر والے شام کر مجھے اٹھا کر صحن میں لمبی صف پر ڈال دیتے اور میں اس پر کھسکتا کھسکتا اس صف کے دوسرے کنارے پہنچ جاتا ہوں پھر ادھر سے اسی طرح سے واپس آ جاتا۔ میں خوش ہوں کہ کسی کے مدد کے بغیر بدن کو خود حرکت دے سکتا ہوں۔ پھر مجھ پر درد کے خزانے نچھاور ہو گئے۔ پہلے میرے بازوؤں میں درد اٹھا اور میں پندرہ دن تک تڑپتا رہا۔ پھر درد ٹانگ میں منتقل ہو گیا اور مجھے یوں لگتا گویا میری ٹانگ آری سے کاٹی جا رہی ہے اور الگ ہونے کو نہیں آتی پھر یہی درد پیٹ میں چلا گیا اور میں قے کر کر کے عاجز آ گیا۔ اس کے بعد میرے اوپر کے دھڑ

میں تھوڑی طاقت آنے لگی اور میں بیساکھیوں کے سہارے کھڑا بھی ہونے لگ گیا لیکن چونکہ ٹانگوں میں کوئی حس موجود نہیں اس لیے میں چل نہیں سکتا۔ اب میرے ہاتھوں اور بازوؤں میں ایک سنسناہٹ ہے لیکن ٹانگیں بالکل ساکت ہیں۔ بیساکھیوں کے سہارے کھڑے کھڑے کئی مرتبہ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے کھولتے ہوئے پانی کے حمام میں اتار دیا ہو۔ میرا سارا بدن جل جاتا ہے سوائے میری ٹانگوں کے۔ میں نے خدا سے دعا کی تھی کہ یااللہ اگر تو نے مجھے کچھ اور نہیں دینا تو مجھے مسلسل درد عنایت فرمادے کیونکہ مکمل بے حسی کے مقابلے میں درد ایک بڑی نعمت ہے۔ انسان کو پتہ چلتا رہتا ہے کہ وہ موجود ہے اور وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ موجود ہے۔ درد کے زور پر کئی مرتبہ میرے دونوں ہاتھ ایک ساتھ اٹھ جاتے ہیں اور میں آدھے منٹ تک انہیں وہاں فضا میں رکھ سکتا ہوں۔ پھر میرے ہاتھ نیچے گر جاتے ہیں۔ اور میں درد کی دوسری لہر کا انتظار کرنے لگتا ہوں۔ جس رات تو نے مجھے گولی ماری تھی اس سے کچھ ماہ بعد جب میرا سارا وجود ساکت اور صرف گردن کے اوپر کا حصہ زندہ تھا میں نے خدا سے ایک اور آرزو کی تھی کہ میرے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر دو منٹ تک کے لیے اٹھے رہنے کی سکت عنایت فرمادے تاکہ میں کوئی چھوٹی سے دعا مانگ سکوں۔ میری آرزو پوری ہو گئی اور میں چارپائی پر لیٹ کر

اس عید کے موقع پر جو ابھی گزری ہے گاؤں کی عید گاہ میں پہنچ گیا۔ میرے والد اور ماموں نے مجھے بیساکھیاں دے کر ایک درخت کے سہارے کھڑا کر کے مجھے وہاں باندھ دیا تاکہ گر نہ جاؤں اور میں نمازیوں کو وہاں جمع ہوتے ہوئے دیکھنے لگا۔ مولوی صاحب نے خطبے میں فتح مکہ کے تعلق سے ایک شخص کی معافی کا واقعہ سنایا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب چچا حضرت حمزہ رضی اللہ کو نیزہ مار کر شہید کیا تھا اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دوستوں جیسے پیارے چچا کی رحلت کا بڑا ہی غم تھا لیکن اس گہرے غم کے باوجود آپ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص "وحشی" کو معاف کر دیا۔ میں نے عین اسی وقت جب میں یہ واقعہ سن رہا تھا دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کی کہ "اے میرے اللہ اس نوجوان کو جس نے 8 جون کو مجھے گولی ماری تھی، وہ جہاں کہیں بھی ہے معاف کر دینا۔ اس بے چارے کو پتہ نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ میرے گمنام دوست مجھے آپ کا نام معلوم نہیں ہے اور نہ ہی آپ مجھ سے کبھی مل سکیں گے اس لیے میں آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔ میرے پاس آپ تک پہنچنے کا اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں تھا جو میں نے اختیار کر لیا ہے۔ اس دن سے لے کر آج تک کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب میں نے صبح سویرے سب سے پہلے تمہاری صحت و سلامتی کی دعا نہ کی ہو اور اونچی آواز میں پی ٹی وی کی مشہور

عالم صدانہ دی ہو کہ اللہ تم کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔"

خدا حافظ۔

چیلسی کے باعزّت ماجھے گامے

میں ایک بات پر بہت زور دیتا رہا ہوں اور اب بھی مجھے اسی بات پر زور دینے کی تمنا ہے لیکن الحمدللہ کچھ اصلاح بھی ہوتی رہتی ہے پھر میں محسوس کرتا ہوں کہ میں جس شدت سے اس صیغہ پر قائم تھا وہ اتنا اہم نہیں تھا۔ میرا اس پر کامل یقین ہے کہ ہمارے ملک کے لوگوں کو ایک سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ (روٹی، کپڑا اور مکان کی کہانی تو عام چلتی رہی ہے اور اس بارے بڑا پرچار ہوتا رہا ہے) لوگوں کو ان کی عزّتِ نفس سے محروم رکھا گیا ہے۔ ہر شخص کا حق ہے کہ وہ اپنی توقیر ذات کے لیے آپ سے، اپنے ملک سے تقاضا کرے، میری عزّتِ نفس اور Self Respect مجھے دی جائے۔ دولت، شہرت، روپیہ پیسہ اور علم کی ہر شخص ڈیمانڈ نہیں کرتا بلکہ عزت کا تقاضا سب سے پہلے کرتا ہے۔ دنیا کے جتنے بھی مہذب ملک ہیں انہوں نے اپنے لوگوں کو جو ایک بڑا انعام عطا کیا ہے وہ سارے کے سارے لوگ عزّتِ نفس میں ایک سطح پر ہیں۔ یہ ان ملکوں کی جمہوریت کا خاصا کہہ لیں یا ان کی سوچ و فکر کی خوبی کہہ لیں یا پھر کوئی اور نام

دے لیں۔ میں غیر ملکوں کی مثال دیا تو نہیں کرتا لیکن مجبوری کے تحت دے رہا ہوں کہ آپ ولایت چلے جائیں یا پھر لندن چلے جائیں وہاں آکسفورڈ سٹریٹ یا بون سٹریٹ میں دیکھیں تو وہاں کے نخریلے رہائشیوں نے اس جدید دور میں دو گھوڑوں والی بگھیاں رکھی ہوئی ہیں اور وہ لارڈز اس طرح وقار سے رہتے ہیں، آپ وہاں ایک جگہ چیلسی کے لوگوں کو دیکھ لیں وہ ہمارے جیسے گامے ماجھے کی طرح سے ہیں۔ ایک پاؤں میں جوتا ہے ایک میں نہیں ہے۔ پہلے چیلسی کے سارے لوگ "ہپی" ہوتے تھے۔ ان کی مالی حیثیت نہایت قابلِ رحم ہے لیکن ان کے مقابلے میں لارڈز اعلیٰ حیثیت میں ہیں۔ لیکن اگر ڈاکخانے پر (یہ واقعہ چونکہ میرے سامنے پیش آیا اس لیے عرض کر رہا ہوں) قطار میں کھڑے ہو کر آپ ٹکٹ لینا چاہ رہے ہیں تو پھر وہ شخص جو قطار میں آگے کھڑا ہے اسے پیچھے کر کے لارڈ آگے نہیں آسکتا اور کسی بھی صورت میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ لارڈ جانتا ہے کہ یہ آگے کھڑے شخص کی عزّتِ نفس کا معاملہ ہے اور یہ اس کا استحقاق ہے۔ جب گندی مندی حالت کا آدمی تھانے میں بھی جائے اور اس کی شکل و صورت ایسی ہو کہ آپ اس بات کرنا گوارا نہ کریں تو وہاں تھانے کا جو ایس ایچ او ہوتا ہے وہ اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے:

Yes sir, what I can do for you?

لیکن ہمارے ہاں اور خاص طور پر ہمارے ملک میں ایک اس بات کی بڑی محرومی ہے کہ لوگوں کو ان کی عزّتِ نفس اور توقیر سے محروم رکھا گیا ہے اور ہماری سب سے بڑی کمزوری اور زبوں حالی کی وجہ یہ ہے۔ میں پہلے بھی کہتا ہوں اور اب اس کو دہراتا ہوں کہ 20 لاکھ کے قریب ایسے لوگ ہیں جو صاحبِ حیثیت ہیں، صاحبِ ارادہ ہیں اور جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ یہ اندازہ میرا اپنا ہے۔ تعداد میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ ان 20 لاکھ افراد میں ہم رائٹر، وکیل، تاجر، ڈاکٹر اور فیوڈل لارڈ بھی شامل ہیں۔ یہ ٹھیک ٹھاک چلتے چلے جا رہے ہیں ان کا باقی چودہ کروڑ عوام سے تعلق نہیں ہے۔ وہ باقی لوگوں کو اپنا ساتھی نہیں سمجھتے۔ آپ ان دوسرے لوگوں کو اس صورت میں بھی ساتھی سمجھ سکتے ہیں کہ انہیں ان کی عزّتِ نفس واپس لوٹا دیں۔ ایسے نہیں کہ "غریبی مکاؤ" کا ایک پروگرام شروع کریں یا اس نظریے کے قائل رہیں کہ جب تعلیم عام نہیں ہو گی اس وقت تک کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔

عزّتِ نفس کا حصول تو ہر شخص کا بنیادی حق ہے۔ بابے لوگوں کو بھی ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک بار ہمارے بابا جی نے کہا کہ جب اس کرہ ارض پر دوسرا آدمی پیدا ہو گیا تھا تو پہلے کا حق آدھا ہو گیا تھا جبکہ ہم کہتے ہیں کہ ہمارا حق تو پورے کا پورا ہے۔ یہ دوسرے تو ایسے ہی ہیں۔ انہیں چھوڑو دفع کرو۔

بعض اوقات بے خیالی میں ہم سے ایسی کوتاہی بھی ہو جاتی ہے کہ ہم حق رکھنے والوں کو تحریر و تقریر میں حق اس لیے نہیں لوٹا سکتے کہ یہ لوگ جاہل ہیں یا تعلیم یافتہ نہیں ہیں اور ہم کہتے ہیں کہ جب تک تعلیم عام نہیں ہو گی یہاں Democratic System ٹھیک نہیں ہو سکتا اور ہمارے اخبار والے عموماً اسے لکھ دیتے ہیں کہ جی ملک میں 85 فیصد جاہل لوگ رہتے ہیں۔ میں ان اخبار والوں سے درخواست کرتا ہوں کہ صاحب اتنے سخت لفظ استعمال نہ کیا کریں۔ آپ ان کو جاہل لکھتے ہو جو گندم اُگا کے بوریوں میں بھر کے آپ کے گھروں تک پہنچا دیتے ہیں۔ یہ وہ جاہل لوگ ہیں جو آپ کے لیے جوتے سی کر ڈبوں میں بند کر کے آپ کو پہنچاتے ہیں۔ آپ خدا کے واسطے ایسے ہی انہیں جاہل نہ کہیں۔ ہمارے بابے کہتے ہیں کہ عزّتِ نفس اس وقت تک عطا نہیں کی جا سکتی جب کہ عطا کرنے والا خود معزز نہ ہو۔ ہم جب تک اپنی نظروں میں خود محترم نہیں ٹھہریں گے اس وقت تک عزّتِ نفس لوٹانے کا کام نہیں کر سکیں گے۔ ہم نے ایک تحقیقی سروے میں اکیس بندوں سے دریافت کیا کہ وہ رشوت کیوں لیتے ہیں؟ ان لوگوں میں بڑے لوگ بھی تھے جو ایک لاکھ روپے کے قریب رشوت لیتے تھے۔ بہت بھلے آدمی تھے اور سوٹ پہنتے تھے اور ہر نماز کے وقت سوٹ ٹائی اتار کر شلوار قمیض پہن کر نماز ادا کرتے تھے۔ نماز کے بعد پھر سوٹ پہن

لیتے۔ میں نے ان سے ایک بار کہا کہ جی نماز سوٹ میں بھی ہو جاتی ہے تو کہنے لگے نہیں اس طرح برا لگتا ہے۔ ہمیں ان سے ایک مشکل سا کام تھا جو انہوں نے کر دیا۔ ان کے اسسٹنٹ نے مجھے کہا کہ "اشفاق صاحب ہم آپ کی بڑی "مانتا" کرتے ہیں اور ہمیں آپ سے بڑی محبت ہے آپ اس طرح کریں کہ ہمیں 75 ہزار دے دیں۔" میرے ساتھ میرا کزن تھا جس کا کام تھا اس نے انہیں تو وہ پیسے دے دیئے ہوں گے۔ جب میں اٹھ کر آنے لگا تو وہ صاحب جو سوٹ بدل کے نماز پڑھ کر پھر سوٹ پہن لیتے تھے انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔

میں نے کہا فرمایئے۔ تو وہ کہنے لگے کہ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ میری نمازوں اور داڑھی پر نہ جائیں اور میرے حصے کے پیسے الگ دیں۔

ان کے اس طرح ڈائریکٹ الفاظ کہنے سے مجھے تکلیف بھی ہوئی اسی لیے اس نے کہا کہ آپ محسوس نہ کرنا یہ تو ہمارا۔۔۔۔۔ ان اکیس لوگوں سے تحقیق کرنے کے بعد پتہ یہ چلا کہ سب سے پہلے رشوت لینے والا خود کو ایک بے عزت شخص خیال کرتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ "میں تو دو ٹکے کا آدمی ہوں۔ نہ میرے کوئی

آگے ہے نہ پیچھے ہے۔ وہ ایسا لاشعوری طور پر سمجھتا ہے۔ بابے کہتے ہیں کہ جب تک اپ اپنے آپ کو عزت عطا نہیں کریں گے اس وقت تک کام نہیں بنے گا۔"

لاہور میں اب جس جگہ واپڈا ہاؤس ہے جب یہ بلڈنگ نہیں تھی تو ایک زمانے میں اس جگہ ایک سپاہی کھڑا ہوتا تھا۔ اشارہ نہیں ہوتا تھا اور وہ ٹریفک کو کنٹرول کرتا تھا۔ اس کے ساتھ نیلی وردیوں والے خوبصورت اور چاک و چوبند آٹھ سات سکاؤٹس کھڑے ہوتے تھے۔ ایک سکاؤٹ نے سپاہی کو آ کے سیلوٹ کیا اور کہا کہ سر وہ شخص خلاف ورزی کر کے گیا ہے تو سپاہی نے کہا کہ یار جانے دو کوئی بات نہیں۔ پھر دوسرا اسکاؤٹ آیا اس نے کہا وہ موٹر سائیکل والا قانون کی خلاف ورزی کر کے گیا ہے تو تب بھی سپاہی نے کہا کہ یار پہلے گاڑی والے کو چھوڑ دیا ہے تو اس موٹر سائیکل والے کو بھی جانے دو۔

(اب میں وہاں کھڑا تماشہ دیکھ رہا ہوں) پھر جب تیسرا اسکاؤٹ کوئی شکایت لے کر آیا تو میں نے سپاہی سے آ کر کہا یار تُو تو با کمال اور چودھری قسم کا سارجنٹ ہے سب کو چھوڑ رہا ہے اور یہ ساری سکاؤٹ تمھیں سلوٹ مار رہے ہیں۔

وہ کہنے لگا کہ یہ سارے اپچی سن کالج کے لڑکے ہیں، ان کے گھر والے انہیں گاڑیوں پر چھوڑ گئے ہیں اور لعنت ہے کہ تین دن ہو گئے ہیں ایک پیسہ کسی سے

نہیں لے سکا۔ میں نے اس سے کہا کہ اس وجہ سے کہ یہ سارے آپ کے سر پر کھڑے ہیں۔ آپ پیسے لیں یہ بھلا آپ کو روکتے ہیں۔ تو کہنے لگا کہ نہیں سر اس وجہ سے نہیں کہ یہ میرے سر پر کھڑے ہیں۔

بات یہ ہے کہ یہ آ کر مجھے سلوٹ کرتے ہیں اور "سر" کہتے ہیں۔ کہتا ہوں اگر ایک بھی پیسہ لوں تو میں لعنتی ہوں کیونکہ ان کا سیلوٹ مجھے ایک معزز شخص بنا دیتا ہے اور معزز آدمی رشوت نہیں لیتا۔ ان نے کہا کہ اس کی بیوی رشوت کے پیسے نہ لانے کے باعث ناراض ہے اور یہ آٹھ دن سے اس کو سیلوٹ کیے جا رہے ہیں۔ وہ سپاہی کہنے لگا کہ سر میں سوکھی روٹی کھاؤں گا اور جب تک یہ مجھے سر کہتے ہیں اور سیلوٹ کرتے ہیں رشوت نہیں لوں گا۔

(حاضرینِ محفل میں سے ایک خاتون)

زندگی کے ہر شعبے میں چاہے وہ رشتہ ہے یا کاروبار یا دوستی ہے اس میں عزّتِ نفس درکار ہے۔ میں ایک عورت ہونے کی حیثیت سے گھر کی مثال دوں گی اور گھر کے ماحول کی عکاسی کروں گی کہ میاں بیوی، ماں بیٹی یا بہن بھائی کو ایک دوسرے کی عزّتِ نفس کا خیال رکھنا چاہیے۔

اشفاق احمد: جی بڑی اچھی بات ہے اور ہم بھی یہ بات کر رہے ہیں کہ جو جو بھی رشتے ہیں وہ عزت مانگتے ہیں لیکن عزّتِ نفس پر ہماری توجہ اس لیے نہیں ہے کہ ہم نے خود اپنی ذات کو عزت عطا نہیں کی ہوئی اور ہم سے ایسے فعل سرزد ہو جاتے ہیں اس لیے ہم دوسرے کو عزت نہیں دے سکتے۔ یہاں پر آ کر رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔

آپ کو یاد ہو گا جب شارجہ میں میانداد نے چھکا لگایا تھا۔ میں شادمان کے علاقے میں جا رہا تھا کہ میری گاڑی میں خرابی پیدا ہو گئی۔ میں نے نیچے اتر کر دیکھا تو اس کو ٹھیک کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ ایک خاتون گھر سے باہر آئیں۔ انہوں نے آ کر دیکھا اور پھر کہا کہ یہ آپ سے ٹھیک نہیں ہو گی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں کہیں جلدی جانا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا کہ آپ گاڑی کو یہاں چھوڑ دیں۔ میرا بیٹا آٹو انجنیئر ہے وہ اسے دیکھ لے گا۔ میں بلاتی ہوں۔ اس لڑکے نے آ کر کہا کہ انکل آپ جا کر اندر بیٹھیں میں دیکھتا ہوں اور وہ کام کرنے لگا۔ میں ان کے گھر جا کر بیٹھ گیا۔ وہاں ٹی وی لگا ہوا تھا۔ اس دوران میں میانداد آیا، اس نے چھکا لگایا اور پاکستان جیت گیا۔ اس وقت پوری قوم ٹی وی اور ریڈیو سیٹوں سے چمٹی ہوئی تھی۔ اس لڑکے کی ماں نے مجھے آ کر کہا کہ گاڑی ٹھیک ہو گئی۔ میں نے اس لڑکے سے آ کر کہا کہ یار تم نے میچ نہیں دیکھا۔

وہ کہنے لگا کوئی بات نہیں۔ آپ نے دیکھ لیا تو میں دیکھ لیا۔ آپ کی دقت ختم ہو گئی۔

خواتین وحضرات! اس نے یہ چھوٹی سی بات کہہ کر مجھے خرید لیا۔ بظاہر یہ ایک چھوٹی سے بات ہے لیکن اس نے مجھے ایسی چیز عطا کی جس کا میں آج تک دینے دار ہوں۔

ہم اپنی والدہ کو "پھر نتو" کہتے تھے۔ وہ آزاد منش خاتون تھیں اور عموماً اپنے کمرے میں نہیں رہتی تھیں بس اِدھر اُدھر پھرتی رہتی تھیں۔ اتنی پڑھی لکھی بھی نہیں تھیں۔ میرے بڑے بھائی انہیں کہتے تھے کہ "ان کو ہم گھر والوں نے آوارہ گردی کے جرم میں پکڑنا ہے۔"

جب بھی دیکھیں کمرے کا چکر لگا کے باورچی خانے میں پہنچی ہوتیں۔ انہیں جہاں بھی چھوڑ کر آتے تھوڑی دیر کے بعد وہ کچن میں "کڑھم" کر کے موجود ہوتیں۔ ایک بار دوپہر کے وقت وہ باورچی خانے میں کھڑی تھیں اور سب سوئے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا جی کیا کر رہی ہیں تو وہ کہنے لگیں کہ بندر والا مداری آیا تھا وہ بھوکا تھا اس کے لیے پکوڑے تل رہی ہوں۔ میری اماں کا سارا سینٹر باورچی خانہ تھا وہ بھی کہتیں کہ میری زندگی کا مرکز ہی یہ ہے اور مجھے

لوگوں کو کچھ عطا کر کے خوشی ہوتی ہے۔ میں اب سوچتا ہوں کہ انہوں نے خود کو ایک عزت عطا کر رکھی تھی۔ اس زمانے کی شاید ساری عورتیں اس نظریے کی قائل تھیں۔ یہ تو اب عورتوں کو سمجھایا گیا ہے کہ آپ بینکنگ کریں، باہر نکل کر لوگوں کی خدمت کریں، شاید مردوں کو بینکنگ نہیں آتی خیر یہ ایک الگ کہانی ہے۔ اگر آپ اپنی زندگی کو کبھی غور سے دیکھیں اور چھوٹی چھوٹی کے ساتھ زندگی کے واقعات چنتے رہیں تو آپ کو بے شمار چیزیں ایسی نظر آئیں گی جو ایسے ہی آپ کی نگاہ سے اوجھل ہو گئی ہیں لیکن وہ بڑی قیمتی چیزیں ہیں۔ خیر گلی میں میرا ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ اس کے دو کمرے تھے۔ ہم کبھی کبھی وہاں جاتے تھے۔ جب کبھی وہاں جاتے تو آتے وقت اس کی دیکھ بھال غلام قادر کو سونپ دیتے۔ وہ وہاں ڈاکخانے میں ملازم بھی تھا۔ میری بیوی نے چابیاں دیتے ہوئے اسے کہا" غلام قادر سردیاں آنے سے پہلے یا سردیاں آنے کے بعد چیزیں گھر سے باہر نکال کر انہیں دھوپ لگالینا۔" اس نے کہا کہ "بہت اچھا جی۔"

غلام قادر نے وہ چابی لے کر ایک دوسری چابی بانو قدسیہ کو دے دی تو اس نے کہا یہ کیا ہے۔ وہ کہنے لگا کہ جی یہ میرے گھر کی چابی ہے۔ جب آپ نے اپنے گھر کی چابی مجھے دی ہے تو میرا فرض بنتا ہے کہ میں اپنے گھر کی چابی آپ کو دے

دوں۔ کوئی فرق نہ رہے۔ آپ مجھ پر اعتماد کریں اور میں نہ کروں کہ کیسے ممکن ہے۔ میری بیوی اس کی بات سن کر حیران رہ گئی۔

حضرات یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو اللہ نے ایسی عزت عطا کی ہوتی ہے کہ وہ عزت سے محروم نہیں ہوتے اور کہیں سے چھینا جھپٹی کر کے اکٹھی نہیں کرتے۔ میں ایک لکھنے والا ہوں۔ مجھے جگہ جگہ سے عزت ٹٹولنے، حاصل کرنے کی عادت ہے۔ پیسے کا لالچ سب سے بری بات ہے۔ لیکن جو دولت مند شخص ہوتا ہے، وہ کسی بھی وقت چیک بھر کے پیسہ منگوا سکتا ہے۔ جب میری لکھنے والے کی، دیگر ڈرامہ کرنے والے، ایکٹر، گانے بجانے والے یا کسی اور آرٹسٹ کا مسئلہ یہ ہے کہ اس کی ساری رسیاں لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ اس کے پاس اپنی چیک بک نہیں ہوتی اس لیے وہ تڑپتا رہتا ہے اور آواز دیتا رہتا ہے کہ لوگو! خدا کے واسطے رسی سنبھال کے رکھنا۔ اگر تم نے رسی چھوڑ دی تو میں پھر مر گیا۔ اس کو یہ مصیبت پڑی ہوتی ہے اس لیے اس مشکل سے نکلنے کے لیے جب تک اس غلام قادر جیسی طبیعت نہیں ہو گی بات نہیں بنے گی۔ چیلسی یا لندن کا وہ لارڈ بننا ضروری ہے جو دوسروں کو بھی اتنی ہی عزت دینا چاہتا ہے اور لارڈ ان ماجھے گاموں کو بھی عزت دیتے ہیں جتنی وہ خود رکھتے ہیں۔

(حاضرین میں سے ایک صاحب بات آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں)

کسی کو عزت دینی ہو تو شہر کی چابی پیش کی جاتی ہے۔ یہ عزت دینے کی ایک Symbol ہے۔

اشفاق احمد:۔ بہت خوب۔ بالکل ٹھیک ہے۔

ہمارے بچپن کے زمانے کی بات ہے۔ ہمارے ماسٹر ڈُولر صاحب ہوتے تھے۔ وہ فرانس سے آئے تھے اور انہوں نے وہاں سے آ کر سکول کھولا تھا۔ اس کی بیوی فوت ہو چکی تھی۔ ایک بیٹی تھی جو بڑی اچھی خوش شکل تھی اور ساڑھی پہنتی تھی۔ انہوں نے سکول کے پاس ایک خوبصورت سی گھاس پھونس کی "جھگی" (کٹیا) ڈالی ہوئی تھی۔ ان کی ایک گائے تھی۔ ہم جتنے بھی چھوٹے چھوٹے ٹینے سے جو اسٹوڈنٹ تھے۔ بہت سارے بچے ان کے پاس آتے تھے۔ وہ ہمیں گانے بھی سناتے تھے۔ ایک مرتبہ دِلّی میں ایک بہت بڑا اسکول کھلا جس کا پرنسپل بھی انگریز ہی مقرر کیا گیا۔ اس پرنسپل کو آب و ہوا راس نہ آئی تو وہ چلا گیا۔ پھر دوسرا منگوایا گیا وہ بھی بیمار ہو گیا اور اسے پیچش لگ گئے۔ کسی نے وائسرائے کو رائے دی کہ آپ اگر ان (ڈُولر صاحب) کو بلا لیں تو وہ سکول چلا سکتے ہیں۔ اس

طرح ہمارے سکول میں ایک انگریز آ گیا اور اس نے آ کر ماسٹر صاحب سے پوچھا کہ:

What about joining that school?

ماسٹر صاحب نے کہا کہ But why ۔

اس طرح جھگڑا ہو گیا۔ ہم اپنے چھپروں کے نیچے کلاسوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کی بیٹی بھی وہاں آ گئی۔ اس انگریز نے ماسٹر صاحب سے کہا کہ

We will give you more money.

بحر کیف آخر ماسٹر صاحب نے اس سے کہا کہ میں تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہوں لیکن

If you expand my stomach accordingly.

(پہلے میرا معدہ کھینچ کر اتنا بڑا کر دو کہ اس میں ڈھیر سارے پیسے سما جائیں جن کی تم آفر کر رہے ہو۔)

ماسٹر صاحب نے اس سے کہا کہ میں ان بچوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ میں گاؤں گاؤں اور گھر گھر جا کر ان بچوں کو اکٹھا کر کے لایا ہوں اور اب میں ان کو ایک دم کیسے چھوڑ کر چلا جاؤں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔

وہاں ایک گارڈر کو بجا کر اور ٹن ٹن کر کے ہمارے آنے اور جانے کی گھنٹی بجائی جاتی تھی لیکن جب تین دفعہ وہ گھنٹی بجتی تو وہ ڈُولر صاحب کی آمد سے پہلے بجتی تھی۔ جب وہ گھنٹی تین بار بجی تو ہم پریشان ہو گئے اور بھاگ کر باہر آ گئے اور کھڑے ہو گئے۔ ڈُولر صاحب سب بچوں کو مخاطب کر کے کہنے لگے کہ ”بندہ نوازو تم کو پتہ ہے کہ میں بندہ ہوں اور آپ بندہ نواز ہیں۔“ ہم نے کہا کہ ہاں جی (حالانکہ ہمیں کیا پتہ تھا کہ یہ بندہ نوازی کیا ہے)۔

انہوں نے پھر باآوازِ بلند کہا کہ میں تمہارا خادم ہوں۔ ایک ظالم اور خونخوار آدمی آیا تھا جو مجھے تم سے چھین کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ وہ تقریر کرتے ہوئے رو بھی رہے تھے۔ ڈُولر صاحب نے کہا کہ اگر میں اپنی بیٹی کی بات مان کر یہاں سے چلا جاتا جو دِلّی جانے کی بڑی خواہش مند ہے تو نہ میں آپ سے مل سکتا نہ آپ مجھ سے مل سکتے۔ جب وہ رو رہے تھے اور ہمیں بہت پیارے تھے تو ہم بھی ان کی ٹانگوں سے چمٹ کر رونے لگے۔ ایک عجیب حال دوہائی وہاں مچ گئی۔ وہ

ایک باعزّت آدمی تھے۔ انہوں نے اپنی ذات کو عزت عطا کی ہوئی تھی حالانکہ اتنے بڑے مالی فائدے سے محروم رہے۔ وہ جب بھی دنیا سے گئے ہوں گے اس اعزاز کے ساتھ گئے ہوں گے جس کی لوگ تمنا کرتے ہیں۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

ذات کی تیل بدلی

پرسوں میرے ساتھ پھر وہی ہوا جو ایک برس اور تین ماہ پہلے ہوا تھا۔ یعنی میں اپنی گاڑی کا فلنگ اسٹیشن پر تیل بدلی کروانے گیا تو وہاں لڑکوں نے چیخ مار کر کہا کہ سر آپ وقت پر تیل نہیں بدلواتے۔ گاڑی تو اسی طرح چلتی رہتی ہے لیکن اس کا نقصان بہت ہوتا ہے لیکن آپ اس کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ میں نے کہا بھئی اس میں اکیلے میرا ہی قصور نہیں ہے۔ میرے ملک میں تیل کی بدلی کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ ہم پٹرول ڈالتے ہیں، گاڑی چلتی رہتی ہے اور ہم ایسے ہی اس سے کام لیتے رہتے ہیں۔ پھر اچانک خیال آتا ہے تو تیل بدلی کرواتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ گاڑی کا سارا تیل اتنا خراب ہو چکا ہے کہ اسے باہر نکالنا مشکل ہو گیا ہے۔

میں نے کہا کہ یار چلتی تو رہی ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ آپ تو سر پڑھے لکھے آدمی ہیں اور گاڑی کا وقت پر تیل بدلوانا بہت ضروری ہے۔ پچھلے سال بھی انہوں نے مجھ سے یہی بات کہی تھی اور مجھ سے بدستور یہ کوتاہی سرزد ہوتی رہی۔ جب وہ

لڑکے تیل تبدیل کر رہے تھے تو میں سوچنے لگا کہ میں باقی سارے کام وقت پر کرتا ہوں۔ بینک بیلنس چیک کرتا ہوں، یوٹیلٹی بِلز وقت پر ادا کرتا ہوں اور یہ ساری چیزیں میری زندگی اور وجود کے ساتھ لگی ہیں لیکن میں نے کبھی اپنے اندر کا تیل بدلی نہیں کیا۔ میری روح کو بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ اس میں بھی تبدیلی پیدا کی جائے لیکن اس بابت میں نے کبھی نہیں سوچا۔ میں یہ بات سوچ کر پریشان ہوتا رہا کہ کیا مجھ پر ایسا وقت آ سکتا ہے کہ میں دنیاداری کے اور سارے کام کرتا ہوا اور خوش اسلوبی سے ان کو نبھاتا ہوا اپنی روح کی طرف بھی متوجہ ہو کر اس کی صفائی اور پاکیزگی کا بندوبست کروں۔ میں نے ان کے گزشتہ سارے سالوں کا حساب لگایا لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ میری نیت تو شاید نیک تھی اور میں اچھا آدمی بھی تھا لیکن یہ کوتاہی میری زندگی کے ساتھ ساتھ چلتی آ رہی تھی اور میرا کوئی بس نہیں چلتا تھا۔ میرے ساتھ ایسی بے اختیاری وابستہ تھی کہ میں اس کو اپنی گرفت میں نہیں لا سکتا تھا۔ میرے خیال میں اپنی روح کے تیل کو تبدیل کرنے کی اپنے بدن کی صفائی سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ جس کی طرف آدمی کسی وجہ سے توجہ نہیں دے سکتا وہاں بھی ہمارا مزاج اپنی گاڑیوں سے سلوک کی طرح سے ہی ہے۔ جیسا کہ ہم اپنی گاڑیوں میں پٹرول ڈال کے تو چلتے رہتے ہیں لیکن پٹرول سے مفید تر تیل بدلی کا کام ہم نہیں کرتے تا کہ گاڑی کا

انجن محفوظ رہے۔ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ وہاں سوچتے سوچتے اور بیٹھے بیٹھے مجھے خیال آیا کہ کچھ لوگ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں جن کی توجہ اپنی تیل بدلی کی طرف زیادہ ہوتی ہے اور وہ انسانیت کے گروہ میں زیادہ خوبصورت بن کر ابھرتے ہیں اور لوگوں کی مزاج کے لیے کچھ کہے بولے بغیر بہت سارے کام کر دیتے ہیں۔ اللہ نے پتہ نہیں ان کو کس طرح ایسا ملکہ دیا ہوتا ہے۔

بڑے سالوں کی بات ہے جب 53-1952ء میں بہت بڑا Flood آیا تھا اس وقت ابھی لاہور کو سیلاب سے بچانے والی فصیل بھی نہیں بنی تھی جسے آپ بند کہتے ہیں۔ اس وقت لوگ اپنے گھر بار چھوڑ کر ایسی ایسی جگہوں پر جا بیٹھے تھے جہاں زندگی بسر کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ہم اپنے طور پر یہ سوچ کر وہاں گئے کہ شاید وہاں ہمارا جانا مفید ہو یا پھر تجسس میں بطور صحافی ہم کچھ دوست وہاں گئے تو وہاں ایک بوڑھی مائی دو تین ٹین کے ڈبے رکھ کر بیٹھی تھی اس کے پاس ایک دیگچی تھی اور یوں لگتا تھا کہ اس نے کل شام وہاں چولہا بھی جلایا ہے اور اس سے کچھ پکایا بھی ہے۔ اس کو کوئی آگے پیچھے نہیں تھا۔ وہاں ان خیموں میں لوگ دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ہمارے ساتھ آئے ہوئے ممتاز مفتی نے اسے دیکھ کر کہا کہ یار اس کی حالت تو بہت ناگفتہ اور خراب ہے۔ میں نے کہا کہ ظاہر ہے اور بھی بہت سے لوگ اس کے ساتھ ہیں۔ اس خراب حالت میں اس کے چہرے پر

ایک عجیب طرح کا اطمینان و سکون تھا۔ وہ بڑی تشفی کے ساتھ بیٹھی تھی اور اس کے چہرے پر کوئی شکایت نہیں تھی۔ ممتاز مفتی نے اس سے کہا کہ "بی بی اگر تم کو دو سو روپے مل جائیں (دو سو کا سن کر اس کی آنکھیں روشن ہوئیں) تو پھر تُو ان کا کیا کرے گی۔"

کہنے لگی "بھا جی لوگ بڑے غریب نیں میں اونہاں وچ ونڈ دیاں گی۔"

اب اتنے برس کے بعد مجھے اس مائی کا چہرہ بھی یاد آگیا اور میں نے سوچا کہ اس نے اپنی روح کی تیل بدلی بڑے وقت پر کی تھی اور اس کی شخصیت و فردیت اور برتری وہاں گئے ہوئے ہم سارے دانشوروں، رائٹروں اور صحافیوں سے زیادہ اور بڑے درجے پر تھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ پچھلے سال اور اس سال کے درمیان مجھ میں ایک صلاحیت البتہ پیدا ہو گئی ہے اور وہ بھی کچھ اچھی صلاحیت نہیں ہے۔ اس میں تھوڑی سی کمینگی کا عنصر شامل ہے۔

وہ صلاحیت یہ ہے کہ میں اپنے مدمقابل جب کسی نئے آدمی کو دیکھتا ہوں تو مجھے اتنا ضرور پتا چل جاتا ہے کہ باوصف اس کے یہ شخص بڑی مضبوطی اور تیز

رفتاری کے ساتھ اپنی زندگی کا سفر کر رہا ہے لیکن اس کا تیل اندر سے بہت گندہ ہے۔ کچھ لوگ زندگی میں ایسے بھی ملتے ہیں اور وہ ہر روز ملتے ہیں جنہوں نے کسی وجہ سے سارے کام کرتے ہوئے اس کر طرف بھی توجہ مرکوز رکھی کہ میری روح کے اندر اور میری کارکردگی کے اندر کسی قسم کی آلائش نہ آنے پائے۔ جب میں روم میں تھا تو وہاں کے ایک بڑے اخبار کے مالک جس کے وہ مینجنگ ایڈیٹر بھی تھے انہوں نے اپنے جرنلسٹوں کو دعوت دی۔ انہوں نے مجھے بھی مدعو کیا۔ گو میں کوئی بڑا کام کا رائٹر بھی نہیں تھا۔ وہ بڑی عظیم الشان دعوت تھی۔ وہاں بڑا پُر تکلف اہتمام کیا گیا تھا۔ جب ہم کھانا وانا کھا چکے تو کچھ صحافیوں نے اس اخبار کے مالک سے فرمائش کی کہ آپ اپنا گھر ہمیں دکھائیں۔ کیونکہ ہم نے سنا ہے کہ آپ کا گھر بہت خوبصورت ہے۔ ہم اسے اندر سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ضرور دیکھئے اور آیئے۔ ہم نے ٹکڑیوں کی شکل میں اس کے گھر کا اندر سے نظارہ کیا۔ بڑا خوبصورت تھا۔ اس گھر کے جو بڑے بڑے ڈیکوریشن والے اور مجسموں سے بھرے کمرے تھے اور ان میں خوبصورت پینٹنگز بھی لگی ہوئی تھیں۔ ایک بڑے خوبصورت کمرے کے بارے میں ہم نے ان سے پوچھا کہ یہ کس کا کمرہ ہے۔ وہ کہنے لگے کہ میرے ڈرائیور کا کمرہ ہے۔ ہم بڑے حیران ہوئے۔ ہم نے دوسرے کمرے کے بارے پوچھا جو پہلے سے بھی

اچھا تھا تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ باورچی کا کمرہ ہے۔ اس طرح ایک سے ایک اعلیٰ اور بڑھ کر کمرے دیکھے جو سارے گھر کے ملازموں کے تھے۔ پھر ہم نے وہاں ایک چھوٹا سا کمرہ دیکھا جس میں ٹیلیفون، ایک میز تھا جو کوئی پانچ آٹھ فٹ کا ہو گا۔ اس میں ایک بیڈ لگا تھا جو فولڈ بھی ہو جاتا ہے۔ ہمارے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ "یہ میرا کمرہ ہے۔"

ہم نے کہا کہ سر آپ نے نوکروں کے لیے تو اعلیٰ درجے کے کمرے بنائے ہیں اور اپنے لیے یہ ہے۔ یہ کیا ماجرا ہے؟

وہ کہنے لگے کہ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میری ماں روم کے ایک بہت بڑے لارڈ کے گھر میں باورچن تھی اور انہیں جو کمرہ ملا ہوا تھا وہ بڑا تنگ تھا۔ اس کمرے میں ہم اپنی ماں کے ساتھ تین بہن بھائی بھی رہتے تھے۔ جب میں نے گھر بنایا تو میں نے کہا کہ ملازموں کے کمرے بڑے خوبصورت اور Well Decorated ہونے چاہئیں اور میں تو ہوں ہی ایک بڑا آدمی اس لیے مجھے کسی بڑے کمرے کیا کیا ضرورت ہے۔ ہم اس کو دیکھ کر اور اس کی بات سن کر ششدر رہ گئے کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں۔

اس کے ملازم بڑے نخریلے اور مزے کرنے والے تھے۔ میں اس اخبار کے مالک کی خوبی اب محسوس کرتا ہوں کہ انہوں نے بھی اپنی ساری توجہ اپنی زندگی کو چلانے کے لیے اپنے پٹرول پر نہیں دی تھی بلکہ اس تیل پر دی تھی جو تبدیل کر کے انسانی زندگی کو سہولت کے ساتھ آگے لے جاتا ہے۔ ہم سے یہ کوتاہی عموماً ہوتی رہتی ہے۔ ہم بھی اپنی زندگیوں کو کم از کم ایک دفعہ تو اس انداز سے چلائیں جس طرح سے سائنس کہتی ہے یا میکینکل کو سمجھنے والے کہتے ہیں کہ آپ کے انجن اور مشین کو اتنے گھنٹوں یا دنوں کے بعد تیل بدلی کی ضرورت ہے اور وہ پٹرول سے بھی زیادہ اہم ہے۔ ہم اپنے وجود کو اس طور سے چلائیں۔ کچھ لوگ جن سے میری فطرت بھی ملتی ہے اور میں ان کو آسانی سے پہچانتا ہوں کہ ان کی طبیعت کے اندر تیل بدلی والی خاصیت شاید ہوتی تو ہے لیکن کم ہوتی ہے۔ آپ کو زندگی میں بڑے بڑے امیر لوگ ملیں گے چاہے آپ کل سے اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیں۔ وہ زندگی میں بڑے کامیاب ہوں گے اور بڑے اونچے عہدوں پر فائز ہوں گے لیکن زندگی کے میدان میں اور جو انسانیت کے کھیل کا میدان ہے اس میں وہ کمزور ہوں گے۔ کہیں نہ کہیں آکر ان کا انسانی رشتہ گھٹن کا شکار ہوتا ہے۔ جیسا کہ گاڑی کے اندر Fresh Oil نہ ڈالا جائے تو وہ گھٹن کے ساتھ چلتی ہے اور ایک ماہر ڈرائیور بیٹھتے ہی بتا دیتا ہے کہ اس کے تیل کی تبدیلی نہیں ہوئی

حالانکہ وہ دوڑ رہی ہوتی ہے لیکن جونہی اس کے تیل کی تبدیلی ہوتی ہے تو وہی ماہر ڈرائیور کہتا ہے کہ سر اب یہ زیادہ رواں چل رہی ہے۔ لگتا ہے پرسوں ہی تیل تبدیل کیا ہے۔ زندگی کا معاملہ بھی بالکل اسی طرح سے ہی ہے۔ میں اپنے بچوں اور پوتوں پر یہ توجہ دے رہا ہوں کہ میں ان کو ایم کام کرا دوں یا فلاں ڈگری دلوا دوں اور لائق بنا دوں اور کہیں فٹ کرا دوں۔ یہ زندگی کی کامیابی نہیں ہے۔ زندگی میں کامیاب ہونے کا سارا تعلق ہم نے اکنامکس سے وابستہ کر لیا ہے۔ ہمارے ایک دوست ہیں۔ اچھے آدمی ہیں لیکن طبیعت کے ذرا سخت ہیں (اور اب میں اس پروگرام کے بعد ڈائریکٹ انہیں کچھ کہنے کے یہی کہوں گا کہ جناب آپ اپنا "تیل بدلی" کرا لیں۔ اس پروگرام کے بعد کئی لوگ آپ سے ملیں گے گو وہ اچھے ہوں گے اور اگر آپ کسی سے تھوڑے بے تکلف ہوں گے تو اپنے کسی دوست سے یہ ضرور کہیں گے کہ یار "تیل بدلی" کروا لیں یا تمہارا تیل بدلی ہونے والا ہے۔)

وہ ایک شام اخبار پڑھ رہے تھے تو تھانے سے ٹیلیفون آیا اور کسی نے کہا کہ سر ہم نے آپ سے استفسار کرنا ہے۔ کہنے لگے ہاں جی فرمایئے۔ اس نے کہا کہ آپ کی بیگم صاحبہ گاڑی لے کر جا رہی تھیں۔ انہوں نے گاڑی کی کسی اور گاڑی کے ساتھ ٹکر مار دی ہے۔ کوئی خاص نقصان نہیں ہوا اور انہوں نے (بیگم صاحبہ)

اس امر کا اعتراف کر لیاہے کہ یہ ٹکر میری غلطی سے ہوئی تھی۔ اس شخص کی فون پر بات سن کر میرا دوست بولا کہ اگر اس خاتون نے اعتراف کر لیاہے تو وہ میری بیوی نہیں ہو سکتی کیونکہ اس نے آج تک اپنی کسی غلطی کا اعتراف نہیں کیا اور وہ یہ کہہ کر دوبارہ اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ اس فون کرنے والے نے کہا کہ جی وہ اپنا نام شائستہ بتاتی ہیں تو صاحب نے کہا کہ اس نام کی کئی خواتین ہیں۔ وہ میری بیوی ہو ہی نہیں سکتی۔

یہ تیل بدلی والی بات ان پر بھی صادق آتی ہے اور یہ ایک سخت تر مثال ہے۔ جب میں ایک پسماندہ سے گاؤں کے ایک سکول میں کچی میں داخل کرایا گیا تو وہاں ایک بابا دال چپاتی ہوا کرتے تھے۔ اس کے پاس سرخ گاڑی تھی۔ وہ لمبا سا جبہ پہن کے رکھتے تھے اور یو۔ پی کے کسی علاقے سے آئے تھے۔ جب بھی ہم گلی میں باہر نکلتے اور ان کی رینج میں آتے تو وہ بابا دال چپاتی آگے بڑھ کر ہم کو پکڑ لیتا۔ ہم چھوٹے ہوتے تھے اور ڈر سے ہم چیخیں مارنے لگتے تھے اور روتے تھے لیکن وہ بابا ایک ہی بات کہتے تھے کہ ”جا تو آگے اور دیکھ تماشا ابھی اللہ کا فضل تجھے پکڑ لے گا اور دال چپاتی تیرے پیٹ میں ہے۔“

ہمیں لگتا تھا کہ اللہ کا فضل بڑا خوف ناک ہوتا ہے لیکن وہ ہمیں ہمیشہ یہی کہتے۔ جب میری ماں مجھے قاعدہ دے کر سکول بھیجتی تو میں کہتا کہ "وہاں باہر بابا دال چپاتی ہو گا وہ مجھے پکڑ کر اللہ کے فضل کے حوالے کر دے گا۔"

جب میں بڑا ہوا تو عید کا ایک دن تھا۔ ہم جب نماز پڑھ کے مسجد سے باہر نکل رہے تھے تو میرے والد صاحب جو کہ قصبے میں بڑے معزز تھے انہوں نے بابا دال چپاتی کی جوتیاں اٹھا کر پہننے کے لیے سیدھی کیں تو وہ کہنے لگے کہ ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر صاحب یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ رہنے دیں میں ایسے ہی پہن لوں گا۔ میرے اباجی کہنے لگے کہ مجھے یہ سعادت حاصل ہونے دیں کہ میں آپ کی جوتیاں سیدھی کروں۔ وہ بابا کہنے لگے ڈاکٹر صاحب آپ مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ میں بڑا حیران ہوا کہ اباجی ایک معمولی سے آدمی کو اتنا بڑا امان سّمان دے رہے ہیں اور آخر کیوں؟

میرے اباجی کہنے لگے کہ آپ ہم سب مسلمانوں کے لیے فخر کا باعث ہیں۔

تو وہ بابا دال چپاتی کہنے لگے کہ میں ایک اچھا انسان تو ضرور ہو سکتا ہوں لیکن اچھا مسلمان ہونے کا فاصلہ ابھی بہت طویل ہے۔ اچھا مسلمان ہونا بہت مشکل ہے۔

خواتین و حضرات! آپ کو کچھ لوگ ایسے بھی ملیں گے جو اتنے زیادہ سخت طبیعت کے تو نہیں ہوں گے لیکن ان میں کچھ عجیب سا بیلنس ہو گا۔ ہمیں اپنے دل کے اندر کوئی خباثت یا غلاظت نہیں پالنی چاہیے۔ گزشتہ سال بڑی بارشیں ہوئی تھیں اور شدید بارش میں ہم جمعہ پڑھنے گئے تو نوجوان سے مولوی صاحب خطبہ دے رہے تھے۔ خطبہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ دیکھیں کیا اللہ کی رحمت ہے اور اس کی کیا مہربانی ہے اور کیسی خوبصورت اور دلفریب موسلادھار بارش ہو رہی ہے اور ہم اندر بیٹھے ہوئے اللہ کے لطف و کرم سے فیض اٹھا رہے ہیں اور جو لوگ گاڑیوں پر جمعہ پڑھنے آئے ہیں ان کی گاڑیاں مفت میں دھل رہی ہیں۔

یہ بڑی باریک سی بات تھی اور اس سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ابھی ایک ماہ کے اندر اندر مولوی صاحب کو اپنی تیل بدلی کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ ہم ان کو ابھی پوری کی پوری داد نہیں دے سکتے۔ میں آپ سے جاتے جاتے یہ درخواست ضرور کروں گا کہ آپ اپنی موٹر کی تیل بدلی بھی وقت پر کروائیں اور اپنی روح اور ذات کی تیل بدلی بھی وقت پر کریں ورنہ وقت بہت کم رہ جائے گا۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

رہبانیت سے انسانوں کی بستی تک

ہم سب کی طرف سے آپ کی خدمت میں سلام پہنچے۔ ہمیں دوسروں کے مقابلے میں ہدایات، احکامات، اشارات اور Instructions ذرا مختلف قسم کی دی گئی ہیں۔ دوسرے مذاہب، امتوں اور قوموں کے لیے ذرا مختلف پروگرام ہے اور ہمارے لیے ان سے کچھ علیحٰدہ حکم ہے۔ مثال کے طور پر ہندوؤں میں چار طریقوں سے زندگی کے مختلف حصوں کو الگ الگ کرکے دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ پہلے حصے کو "بال آشرم" کہتے ہیں۔ یہ وہ عرصہ ہے جب آدمی چھوٹا یا بال (بچہ) ہوتا ہے۔ تب وہ کھیلتا ہے، کھاتا اور پڑھتا ہے اور آگے بڑھتا ہے۔ اس کے بعد اس کا "گرہست آشرم" آتا ہے۔ گرہست میں وہ شادی کرتا ہے اور تب وہ پچیس برس کا ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ دنیا کے میدان میں پوری توانائی کے ساتھ داخل ہو جاتا ہے۔ تیسرے نمبر پر آدمی کا "وان پرست آشرم" شروع ہوتا ہے۔ اس آشرم میں ایک شخص دنیا داری کا کام کرتے ہوئے بھی اس سے اجتناب برتتا ہے۔ دنیا کا کاروبار، دکان چھوڑ کر وہ گھر آ جاتا

ہے لیکن اس کے باوجود وہ دنیاداری سے مکمل طور پر غیر متعلق نہیں ہوتا بلکہ تھوڑا سا تعلق رکھتا ہے۔ اپنے بچے کو دکان یا کاروبار پر بھیج دیتا ہے اور وہ بچہ اس کے نائب کے طور پر کام کرتا ہے اور اس کا کام صرف اتنا ہی ہے کہ وہ گھر بیٹھے بیٹھے بچے کو Instruct کرتا رہتا ہے اور اشارے دیتا رہتا ہے کہ یہ کام کرنا ہے، یہ نہیں کرنا اور خود دفتر یا کام پر نہیں جاتا۔ آخر کے چوتھے آشرم یعنی 75 سال کی عمر کو جب انسان پہنچ جاتا ہے تو اس درجے کو "سنیاس آشرم" کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دنیا چھوڑ کے اور اپنی رسی اور لوٹا لے کر وہ "بنداس" پہ چلا جاتا ہے۔ گو وہ عملی طور پر باہر جائے نہ جائے لیکن اس کا دنیا سے کوئی دخل نہیں رہ جاتا۔ میں آپ کو تفصیل سے اس لیے بتا رہا ہوں کہ آگے چل کر اس موضوع پر ہم بات کریں گے۔ ہندوؤں کی طرح سے جین مذہب ہے۔ یہ ہندوؤں سے بالکل مختلف ہے۔ آپ نے ایسے ہی ہمارے لاہور کے جین مندر کو پہنچائی گئی حالانکہ اس کا ہندو مذہب سے کوئی تعلق نہیں (بابری مسجد کی شہادت کے سانحہ کے وقت مشتعل ہجوم نے لاہور کے جین مندر کی بھی توڑ پھوڑ کی تھی۔)

اسی طرح سے بدھ مذہب ہے وہ اپنے بھکشو تیار کرتا ہے۔ اسی طرح عیسائی کہتے ہیں کہ پادری بنو، دنیا سے ناتا چھوڑ دیں۔ عورتوں سے کہتے ہیں نن بن جائیں،

شادی نہ کرو۔ ان مذاہب کا کہنا ہے کہ آپ ترکِ دنیا کر کے زندگی بسر کرو۔ ہمارے ہاں اس سے مختلف ہے کہ آپ کو دنیا بھی ساتھ لے کے چلنی ہے اور دین بھی ساتھ ہی لیکر آنا ہے۔ خاصا مشکل کام ہے کہ دین کو بھی پورے کا پورا سنبھالنا ہے اور دنیا کو بھی سہارا دینا ہے اور اس صورتحال سے بھاگ نہیں اور سنیاس اختیار نہیں کرنا ہے۔ تارکِ دنیا یا راہب نہیں بننا ہے۔ راہب وہ ہوتے تھے جو پہاڑوں کی گفاؤں اور ریت کے ٹیلوں یا پھر جنگلوں میں جا کر بیٹھتے تھے۔ کسی کو ملتے نہیں تھے اور اللہ اللہ کرتے رہتے تھے۔ ہم کو یہ حکم ہے کہ دنیا میں رہیں اور اللہ کے ساتھ رشتہ بھی مضبوط رکھیں اور اس کے لیے کہیں چل کر جانے کی یا سفر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہمارے بابے کہتے ہیں کہ اللہ تک پہنچنے کے لیے کسی سفر کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ سفر کے لیے باہر نکلنا پڑتا ہے لیکن یہ سفر ایسا ہے کہ اس کے لیے کہیں جانا نہیں ہے بس اپنی شہ رگ تک پہنچنا ہے۔ جہاں پر اللہ تشریف فرما ہیں اور سب کا اللہ اس مقام پر موجود ہے۔
ایک بار ہمارے باباجی کے ڈیرے پر ایک آدمی آیا۔ وہ کچھ عجیب طرح کا ضدی یا لڑائی کرنے والا آدمی تھا اور سچی بات تو یہ ہے ”اللہ مجھے معاف کرے“ اس کی شکل بھی کچھ اتنی اچھی نہیں تھی۔ جیسا کہ آدمی اس شخص کے پہلے ہی بہت سارے نمبر کاٹ لیتا ہے جس کی شکل و صورت اچھی نہ ہو اور اس سے متعصب

ہو جاتا ہے۔ اس لیے میں اس کے ساتھ ذرا سختی کے ساتھ پیش آیا۔ اس نے کچھ خراب سے بات کی تھی تو میں اس سے کہنے لگا کہ تجھے یہ کس نے کہا فلاں فلاں۔۔۔ بابا جی نے کہا کہ آپ اس کو کچھ نہیں کہہ سکتے۔ میں نے کہا کہ کیوں؟ وہ کہنے لگے اس طرح تو آپ اللہ کو جھڑکیاں دے رہے ہیں۔ میں نے کہا جی نعوذ باللہ وہ کیسے؟

بابا جی کہنے لگے کہ اللہ تو اس کے شہ رگ کے پاس ہے۔ وہاں تو اللہ میاں کرسی ڈال کر بیٹھے ہیں اور تم اس کے ساتھ زیادتی کر رہے ہو۔ تمہیں اس کا احترام کرنا پڑے گا۔ یعنی جس بندے کی بھی شہ رگ کے پاس اللہ موجود ہے اس کا احترام کرنا آپ کا فرض ہے۔

اب اس دن سے مجھے ایسی مصیبت پڑی ہے کہ ہمارے گھر میں جو مائی جھاڑو دینے آتی ہے، وہ بہت تنگ کرتی ہے۔ میری کتابیں اٹھا کر کبھی ادھر پھینک دیتی ہے۔ اب میں اس سے غصے بھی ہونا چاہتا ہوں لیکن کچھ کہتا نہیں ہوں۔ بانو قدسیہ کہتی ہے کہ آپ اسے جھڑک دیا کریں۔ میں اس سے کہتا ہوں کہ نہیں اس کے پاس تو اللہ ہے میں اس کو کیسے کچھ کہوں۔ مجھے اس دنیا سے مصیبت جاں

پڑی ہوتی ہے۔ تارکِ دنیا ہو کر اللہ کو یاد نہیں کرنا بلکہ اللہ کو ساتھ رکھ کے یاد کرنا ہے۔

پیارے بچو!

حیرانی کی بات یہ ہے کہ ہمارے سامنے ہماری زندگیوں میں اور ہمارے ہی ملک میں تقریباً سارے کے سارے لوگ تارک دنیا ہو کر سنیاسی اور راہب ہو کر بیٹھے ہیں۔ آپ حیران ہوں گے یہ بابا کیسی بات کر رہا ہے۔ ہمارے ابا جی، ماموں، تائے سارے گھر آتے ہیں اور فیکٹری چلاتے ہیں، کام کرتے ہیں، یہ کیسے راہب ہو گئے۔ میں نے لوگوں کو غور سے دیکھا ہے اور ان پر غور کیا ہے کہ یہ راہب لوگ اور اب تو ہم سارے ہی تقریباً تقریباً راہب بن چکے ہیں۔ یہ بڑے بڑے شہروں میں بھی رہتے ہیں اور وہ کاروبار زندگی بھی کرتے ہیں اور اس کے باوصف کہ یہ اتنے سیانے اور سمجھدار ہیں۔ سارے رہبانیت کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ راہب لوگ ہیں۔ راہب لوگ وہ ہوتے ہیں جو اپنے لوگوں سے تعلق توڑ کر، بستی چھوڑ کر کسی اور جگہ پر جا بیٹھیں اور کسی سے تعلق نہ رکھیں۔ یہ اس کی چھوٹی تعریف ہے۔ اب آپ کبھی اسلام آباد تشریف لے جائیں، وہ بڑا اچھا خوبصورت اور پیارا شہر ہے۔ وہاں جتنے بھی

لوگ ہیں وہ سارے کے سارے راہب ہیں۔ کسی بھی سیکرٹیریٹ کے کسی بھی دفتر میں چلے جائیں آپ کسی کو آسانی سے نہیں مل سکتے، سب راہب بنے بیٹھے ہیں۔ راہب سے ملنا اس لیے مشکل ہوتا ہے کہ وہ اپنی گفا میں بیٹھا ہوتا ہے۔ کسی سے ملتا ہی نہیں ہے۔ میں ایک ڈپٹی سیکرٹری کے دفتر میں بیٹھا تھا کہ وہاں ایک آدمی آ گیا۔ وہ ڈپٹی سیکرٹری صاحب اسے دیکھ کر گھبرا گئے۔ حیرت اور گھبراہٹ سے اس سے کہنے لگے ہاں جی آپ کیسے یہاں آئے؟

اس نے کہا کہ جی میں بڑے دروازے سے آیا ہوں۔

انہوں نے کہا کہ بڑے دروازے سے تو آئے ہو لیکن آپ کو آنے کس نے دیا؟

اس نے کہا کہ جی وہاں پر جو دربان ہے اس نے مجھ سے کہا کہ آپ آج نہیں کل چلے جانا۔ یہ سن کر میں گھر چلا گیا۔ میں آج آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

وہ پوچھنے لگے کہ اپ اوپر کیسے آئے؟

وہ شخص کہنے لگا کہ جی میں سیڑھیاں چڑھ کر آیا ہوں۔ میں نے لفٹ والے سے کہا تھا کہ مجھے اوپر لے جا لیکن اس نے کہا کہ یہ افسروں کی لفٹ ہے۔ میں نے کہا

کہ یہ دوسری لفٹ ہے اس سے بھیج دو۔ تب اس نے کہا کہ یہ ڈپٹی سیکرٹری کی لفٹ ہے۔ میں نے کہا کہ یہ تیسری۔۔۔۔

اس نے کہا یہ سیکرٹری صاحب کے لیے ہے اور اس لفٹ والے نے مجھ سے کہا کہ اگر آپ نے اوپر جانا ہی ہے تو آپ سیڑھیاں چڑھ کر چلے جائیں اور میں سیڑھیاں چڑھتا چڑھتا آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

ڈپٹی سیکرٹری صاحب نے کہا کہ آپ کو کیا کام ہے۔

اس نے جواب دیا کہ مجھے فلاں فلاں کام ہے تو انہوں نے کہا کہ اس کام کے لیے آپ کو خط لکھنا چاہیے تھا۔

اس شخص نے کہا کہ جی میں نے لکھا تھا۔

تب انہوں نے کہا کہ مجھے نہیں ملا۔

اس بے چارے شخص نے کہا کہ نہیں جی وہ آپ کو پہنچ جانا چاہیے تھا کیونکہ میں نے اسے رجسٹری میں ارسال کیا تھا۔

اس پر ڈپٹی سیکرٹری صاحب نے کہا کہ اگر تم نے وہ بذریعہ رجسٹری بھیجا تھا تو تمہیں پہلے ڈاکخانے سے اس کی تصدیق کرنی چاہیے تھی کہ کیا وہ ٹھیک طرح سے ڈلیور ہو گئی ہے کہ نہیں ہوئی۔

اس نے کہا کہ میں جنابِ عالی ڈاکخانے سے تحقیق کر چکنے کے بعد ہی حاضر ہوا ہوں۔ وہ ٹھیک ڈلیور ہو گئی ہے اور چودہ تاریخ کو آپ کے دفتر میں پہنچ گئی ہے۔ صاحب نے کہا کہ پھر آپ کو فون کرنا چاہیے تھا۔ آپ یہاں کیوں آ گئے۔ وہ افسر تارکِ دنیا تھا۔ راہب بن چکا تھا جو اس شخص سے اس انداز میں مخاطب ہو رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ میں ایسے ہیں لوگوں سے نہیں ملتا۔ ڈپٹی سیکرٹری صاحب کی یہ باتیں سن کر وہ شخص شرمندہ اور پریشان ہو کر واپس سیڑھیاں اتر گیا اور جانے سے پہلے کہنے لگا اچھا جی میں پھر کسی کو لاؤں گا یا کوئی زور ڈالوں گا کیونکہ اس گفا (غار) میں جو شخص بیٹھا ہے وہ میری بات نہیں سنتا۔ وہ تو اللہ سے لو لگا کے بیٹھا ہے۔ یہ تو ہمارے ملک کے بندے کی بات تھی۔ باہر کے ملکوں کے لوگ جو ہمارے ملک میں تجارت کرنا چاہتے ہیں، فیکٹریاں یا کارخانے لگانا چاہتے ہیں اور انہیں ون ونڈو سسٹم کا یقین دلایا گیا ہے۔ ون ونڈو سسٹم کا مطلب یہ ہے کہ آپ ایک ہی کھڑکی پر آئیں۔ اپنا مدعا بیان کریں، اپنی فزیبلٹی رپورٹ وہاں پیش

کریں تو وہ ایک ہی ونڈو والا بابو، صاحب یا ڈپٹی سیکرٹری کہے گا کہ جی آپ کاہنہ کا چھا یا پتوکی جہاں آپ چاہتے ہیں فیکٹری لگا سکتے ہیں۔

اب باہر والے پریشان ہو کر کہتے ہیں کہ یہاں ون ونڈو تو کیا کوئی ونڈو ہے ہی نہیں۔ ہم آدمی تلاش کرتے پھرتے ہیں، ہمیں یہاں کوئی آدمی ہی نہیں ملتا۔ یہاں تو رہبانیت ہے۔ سارے راہب لوگ رہتے ہیں اور ان سے ملنا بہت مشکل ہے۔ اب اس سارے عمل میں آپ کا لوگوں سے تعلق کس طرح ٹوٹتا ہے۔ یہ ایک غور طلب بات ہے۔ گھروں میں بھی بعض اوقات ایسا ہوتا ہے۔ ہمیں پتہ نہیں چلتا۔ ہم میں سے کئی لوگوں کا گھروں میں بھی رویہ بالکل راہبوں جیسا ہوتا ہے۔ ایک دفعہ ہم بیٹھے تھے، میرا ایک کزن جو میرا ہم عمر ہی ہے، اس کا نام اکرام ہے۔ وہ اپنے پہلے بچے کی پیدائش کا ذکر کر رہا تھا۔ وہ پتوکی میں بڑے زمیندار ہیں۔ وہاں ان کی زمینیں ہیں۔ وہ بتانے لگے کہ جب ان کے بچے کی پیدائش کا وقت آیا تو تب شام یا رات کا وقت تھا اور وہ تھوڑے پریشان ہوئے۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ گاڑی نکالیں ہمیں لاہور جانا چاہیے اور آدھی رات کو لاہور پہنچ گئے۔ ہم سب گھر کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں میری چھوٹی بہن بھی موجود تھی اس نے کہا کہ اکرام بھائی اگر خدانخواستہ رات کو سفر کے دوران کوئی پیچیدگی ہو جاتی تب آپ کیا کرتے تو وہ کہنے لگے اگر کوئی پیچیدگی پیدا ہو جاتی

تو میں فوراًریحانہ (بیوی) کو ڈرائیونگ سیٹ سے اٹھا کر پیچھے لٹا دیتا اور خود گاڑی چلانے لگ جاتا۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ اس نے ساری رات ڈرائیونگ بھی اپنی بیوی سے ہی کرائی ہے اور خود مزے سے لیٹے رہے ہیں۔ یہ گھروں کے راہب ہوتے ہیں جن کا آپ کو پتہ نہیں چلتا۔ آپ نے گھروں میں اپنے بھائی، بڑوں کو دیکھا ہو گا کہ وہ کسی کام میں دخل ہی نہیں دیتے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید دخل نہ دینے سے کچھ فائدہ پہنچتا ہے حالانکہ اس سے ہرگز ہرگز کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ حیرانی کی بات یہ بھی ہے کہ ہمارے ملک میں جتنے بھی تاجر اور دکاندار ہیں وہ بھی تمام کے تمام رہبانیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان کو سوائے اپنی ذات کے اور اپنی زندگی کے اور کسی چیز سے کوئی تعلق یا سروکار نہیں ہے۔ مزے سے تجارت کر رہے ہیں۔ ان کی چھوٹی سے دنیا ہے اور وہ اپنی اسی تجارت کے اندر گھومن گھیری انداز سے چکر کاٹ رہے ہیں۔ باہر لوگ کیسے آباد ہیں۔ ان کی کیسی مشکلات ہیں ان کی کیا کرنا چاہیے وہ اس بارے بالکل کچھ نہیں جانتے۔ وہ سارے کے سارے اپنی اپنی غاروں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ میرے حساب سے ٹک ٹک کر کے تسبیح پھیرنے والے دنیا سے لاتعلق لوگ ہیں۔ ان کا اپنی ہی ذات سے واسطہ ہے۔ ہمارے کیا تقاضے ہیں۔ ہم ان سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ ہم سے بات نہیں کرنا چاہتے۔ ہمارے لاہور میں ایک بڑا برانڈتھ روڈ ہے۔

وہاں ماشاء اللہ بڑے امیر لوگ رہتے ہیں۔ کراچی میں بڑے امیر ترین لوگ ہیں۔ فیصل آباد کی سوتر منڈی دنیا کی امیر ترین علاقہ ہے لیکن جتنے بھی لوگ وہاں بیٹھے ہیں، ہیں تو وہ ہمارے درمیان اور رہتے بھی اسی دنیا میں ہیں، گفتگو ہماری جیسی کرتے ہیں، کھانا بھی ہمارے جیسا کھاتے ہیں لیکن وہ ہمارے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ جب ہم پلٹ کر اپنے اس دکھ کا اظہار اپنی ذات سے کرتے ہیں تو پتہ یہ چلتا ہے کہ ہم بھی ایسے ناقد ہیں کہ بس تنقید کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں اور ہم بھی ان دوسرے راہبوں ہی کی طرح سے ہیں۔ ہمیں بھی کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ہم بھی راہب لوگ ہیں۔ کس کو ہماری ضرورت ہے، ہم کس کی کس طرح سے مدد کر سکتے ہیں، ہمارے ملک کے کسی باشندے کو کیا تکلیف ہے ہمیں معلوم نہیں۔ ہم بھی بھائی اکرام جیسے ہی ہیں اور سوچتے ہیں کہ اگر تکلیف ہو گی تو میں موٹر چلالوں گا ورنہ بیوی گاڑی چلاتی رہے۔

ہمارا ضمیر بھی اسی طرح سے ہو گیا ہے۔ یہ کوئی ایسی خوشگوار بات نہیں ہے۔ لیکن وہ حکم جو ہمیں دیا گیا ہے کہ ہم دنیا کے ساتھ ساتھ دین بھی رکھیں وہ شاید ہم نے اپنی کوشش کے باوجود سارے کا سارا اپنی دنیا کے اندر اس طریقے سے ڈال دیا ہے کہ ہم ان لوگوں سے بھی زیادہ لاتعلق ہو گئے ہیں جو لوگ رہبانیت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ لوگ آپ سے، ہم سے بار بار پوچھتے ہیں استحکام

پاکستان کی بھی بات ہوتی ہے، ہمارے معاشرے کو مضبوطی عطا کرنے کی بھی بات ہوتی ہے اور ارادے باندھے جاتے ہیں۔ یہاں پر بسنے والے گروہ انسانی کو بھی تنگڑا کرنے کی بات کی جاتی ہے لیکن ہم سب کچھ کیسے کریں۔ ہم کس طرح سے ایسے ہو جائیں کہ ہمارا یہ علم عمل کی صورت اختیار کر جائے اور ہم رہبانیت سے نکل کر اس حکم میں داخل ہو جائیں جس کا ہمیں بڑی شدت اور زور سے آرڈر دیا گیا ہے۔ میں تو کسی نتیجہ پر پہنچ نہیں سکا۔ میں سمجھتا ہوں کہ غرض مندی اور اپنی ذات کے بارے ہی میں سوچتے رہنا ہمارا وطیرہ ہو گیا ہے اور ضرورت سے زیادہ ہو گیا ہے۔ میں اس موقع پر باہر کے ملکوں کی مثال نہیں دینا چاہتا کیونکہ میں وہ دیا نہیں کرتا لیکن جب آپ اپنے ارد گرد دیکھتے ہیں تو آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ دوسرے گروہ انسانی وہ اس اعتبار سے بہت بہتر زندگی بسر کر رہے ہیں جس اعتبار سے ہمیں کرنی چاہیے تھی اور ہمیں کرنے پڑے گی۔ آپ ماشاء اللہ ذہین اور پڑھنے لکھنے والے بچے ہیں، آپ اسے سوچ کر میرے کسی اگلے پروگرام میں اس بارے میرے رہنمائی ضرور کیجیے گا کہ ہم ذاتی غرض مندی سے کیسے نکلیں؟

اور ہمیں کب اور کیسے محسوس ہونے لگے کہ ہمارے ارد گرد بازاروں میں کچھ اور لوگ بھی بستے ہیں اور ان کی احترام کیا جانا چاہیے۔ جب ہم اپنے بچپن میں ولائتی اُستادوں سے پڑھتے تھے تو اس بات پر بڑا زور دیا کرتے تھے:

You have not to forget the words thank you and I am sorry.

اب پتہ چلتا ہے کہ ان الفاظ کی ادائیگی سے ایک رشتہ قائم ہوتا ہے۔ ہماری ٹریفک کی ہی مثال لے لیجیے لیکن کسی پر کیا الزام دیں اپنی ذات کے اندر ہی جھانک کر دیکھیں۔ اب مجھے بھی کئی ٹیلیفون آئیں گے کہ اب تو آپ بھی راہب نہ بنیں میرا یہ کام کروا دیں اور میں اس سے پلٹ کے یہ نہیں پوچھ سکوں گا کہ کیا آپ نے کسی اور کا کام کر دیا ہے۔ آپ کو یاد ہے میں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ " دتے وچوں دینا اے" یہ بڑی دیر کی بات ہے تو مجھے لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ مجھے جی ہزار روپیہ دے دیں کوئی پانچ ہزار مانگنے لگ گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ نے بھی " دتے وچوں دینا اے" اس طرح کی پیاری سی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔

آج تھوڑا سا بوجھ میں نے آپ کی طبیعتوں پر ڈال دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ضرور اس کا کوئی حل نکالیں گے اور میری رہنمائی ضرور کریں گے اور میں آپ کی شکر گزاری کے ساتھ اگلے پروگرام میں ایک ایک کا نام لے کر یہ بتاؤں گا کہ آپ نے کیا رائے دی۔

اللہ آپ سب کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین۔

اللہ حافظ۔

Salute to Non-Degree Technologists

آپ سب کو اہلِ زاویہ کی طرف سے سلام پہنچے۔ ہم اس پروگرام کے شروع ہونے سے پہلے تعلیم اور علم کی بات کر رہے تھے، علم ایک ایسا موضوع ہے جس پر آپ صدیاں بھی لگا دیں تو ختم نہ ہو کیونکہ یہ موضوع بڑی دیر سے چلتا آرہا ہے کہ علم کیا ہے؟ اور اسے کیسے منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اب جو موضوع دنیا کے سامنے ہے وہ یہ ہے کہ کیا علم کے ساتھ Ethics and Morality یا اخلاقیات کو بھی لیا جانا چاہیے یا کہ خالی ٹیکنالوجی اور سائنس پڑھا دینی چاہیے۔ ابھی تک دنیا نے اس حوالے سے کوئی خاص اور حتمی فیصلہ نہیں کیا۔ ہم مشرق والوں نے ایک زمانے میں یہ فیصلہ کیا تھا اور دوسرے علم کے ساتھ اخلاقیات کی تعلیم رومی رحمۃ اللہ اور سعدی رحمۃ اللہ پڑھاتے رہے ہیں اور اخلاقیات پر مبنی کتابیں کورس میں ہوتی تھیں لیکن اب کہا جاتا ہے کہ اب اس کی چنداں

ضرورت نہیں ہے۔ آدمی کو ایک Given Specific Discipline of Knowledge میں ایک دیئے گئے موضوع پر اپنی Specialisation کرنی چاہیے اور اس کے بعد اسے چھوڑ دینا چاہیے۔ اکثر آپ بڑے پیشہ ور لوگوں کی شکایت کرتے ہیں جن میں ڈاکٹرز، انجینئرز، بیوروکریٹس شامل ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ ہم فلاں افسر یا ڈاکٹر کے پاس گئے تھے لیکن انہوں نے ہم پر کوئی توجہ ہی نہیں دی۔ بس وہ اپنی بات کرتے رہے جبکہ ہم چاہتے تھے کہ وہ ہمارے ساتھ ویسا سلوک کریں جیسا انسان انسانوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ اب ڈاکٹر صاحب کے پاس یہ جواز ہے کہ ہم اس علم کو جانتے ہیں جس کی آپ کے بدن کو ضرورت ہے۔ جس علم کی آپ کی روح اور جذبات و احساسات کو ضرورت ہے۔ وہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ وہ آپ کسی اور جگہ سے جا کر لیں پھر آپ جگہ جگہ مارے مارے پھرتے ہیں۔ پرانے زمانے میں جب علم اتنا عام نہیں تھا تو جس بابے کے پاس علم ہوتا تھا اس کے پاس شفقت بھی ہوتی تھی، محبت بھی ہوتی تھی، آپ کے مشکل سوالوں کے جواب بھی ہوتے تھے اور اگر جواب نہیں آتا تھا تو اس کے پاس وہ تھپکی ہوتی تھی جس سے سارے دکھ اور درد دور ہو جاتے تھے لیکن اب اس طرح سے نہیں ہوتا۔ میں بھی دیکھتا ہوں اور آپ بھی دیکھتے ہوں گے کہ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کی بڑی توقیر کرتے ہیں۔ یہ ایک

اچھی بات ہے۔ وہ ممالک جو اس میدان میں پیچھے ہیں مشکل میں مبتلا ہیں اور اس مشکل سے نکلنا چاہتے ہیں لیکن میں نے اس بات کا جائزہ لیا ہے اور اسے قریب سے دیکھا ہے کہ ہم Technologist یا پیشہ ور لوگوں کو اس محبت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے جس محبت کے انداز سے ہم ان کے بارے میں انگریزی اور اردو کے اخبارات میں مضمون لکھتے ہیں۔ میرے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا۔ گوجرانوالہ کے پاس ایک قصبہ کامونکی ہے اس کے پہلو میں جاتے ہوئے میں نے دیکھا کہ پانی سے بھرے ہوئے کھیتوں کے اندر گھٹنے گھٹنے پانی میں لڑکیاں دھان کی پنیری لگا رہی تھیں جسے "لابیں" لگانا کہتے ہیں۔ وہ آٹھ دس لڑکیاں ایک سیدھی قطار میں پنیری کا پودا لگا رہی تھیں حالانکہ ان کے پاس کوئی فٹا یا ڈوری باندھی ہوئی نہیں تھی لیکن وہ نہایت خوبصورت انداز میں بالکل سیدھی قطار میں پنیری لگاتیں اور پھر ڈیڑھ فٹ پیچھے ہٹ جاتیں اور تقریباً ڈیڑھ فٹ پیچھے ہٹ کے ویسی ہی ایک اور قطار میں وہ پنیری یا دھان کا پودا لگاتیں۔ یہ میرے لیے ایک نئی چیز تھی اور میں وہاں کھڑا ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔

ایک لڑکی نے کہا باباجی آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟

میں نے کہا کہ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم ایک سیدھی لائن میں ایک دی ہوئی یا باریک Given Space کو کس طرح سے Follow کرتی ہو؟ اس نے کہا کہ یہ تو ہمارا صدیوں کا کھیل ہے۔ ہماری نانی، دادی اور ماں یہ کام ہی کرتی آئی ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ تو ٹھیک ہے کہ آپ کے وجود کے کمپیوٹر میں چِپ لگا ہوا ہے کہ کس طرح سے کام کرنا ہے لیکن میں تخیل کا آدمی ہوں۔ مجھے دل کے اندر اس تخیل کو آگے بڑھا کر داد تو دینے دو۔ اس نے کہا کہ بابا جی آپ کی بڑی ہی مہربانی۔ میں ان کا کام دیکھتا رہا اور ان سے پوچھتا رہا کہ تم کو اس کام کے کتنے پیسے ملتے ہیں۔ انہوں نے وہ بھی بتایا اور یہ بھی بتایا کہ پانی میں مسلسل کھڑے رہنے سے ان کے پاؤں کو کتنی تکلیف ہوتی ہے اور شلواروں کے پائینچے پھٹ جاتے ہیں۔ جب میں بچوں سے کہتا ہوں کہ ان لڑکیوں کا کام بھی ایک علم ہے تو یہ ناراض ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ تو ان پڑھ لڑکیاں ہیں وہ علم پھر کیسے ہو سکتا ہے؟ علم تو صرف ان لڑکیوں اور خواتین کے پاس ہے جو کالج یا یونیورسٹی سے حاصل کرتی ہیں۔

چرخہ کاتنے والی مائی کا کام تو علم نہیں ہے حالانکہ وہ تند بھی نکالتی ہے، کپڑا بھی بنا کے دے دیتی ہے اور ہم کھیس اور رضائی بھی اس کے ہاتھ کے کاتے ہوئے سوت کی لیتے ہیں لیکن ہم اسے Technologist ماننے کے لیے تیار نہیں

ہوتے۔ ان لڑکیوں کو کام کرتے دیکھ کر اور واپس آ کر میں نے اپنے شہر کے لوگوں کا جائزہ لینا شروع کیا تو محسوس کیا کہ یہ بڑا ہی خوش نصیب ملک ہے اور یہ ملک Technologists سے بھرا ہوا ہے۔ سڑک کنارے ایسے ایسے کمال کے ذہین موٹر مکینک بیٹھے ہیں جو آپ کو ایک اعلیٰ درجے کی امپورٹڈ موٹر کو خراب ہونے کی صورت میں آسانی سے ٹھیک کر کے دے دیتے ہیں۔ میں نے اپنی ایک کمیٹی اور پڑھے لکھے لوگوں کے آگے ایک درخواست پیش کی کہ ان Technologist کو بڑے خوبصورت سرٹیفیکیٹس چھاپ کر دیتے ہیں اور ان پر ہم سب دستخط کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم سڑک کنارے بیٹھے ہوئے لوگوں کو بھی سندیں دیں۔

لیکن اس کمیٹی نے میری اس بات کو اچھا نہ سمجھا اور ان پر ناگوار گزرا اور کہنے لگے آپ بھی کیا فضول بات کرتے ہیں۔ وہاں ایک بڑے صاحب تھے جو جج بھی رہ چکے ہیں اور آپ سارے انہیں جانتے ہیں انہوں نے کہا اشفاق صاحب اگر انہیں کچھ دینا بھی ہوا تو کیا آپ ان ٹیسٹ لیں گے۔ میں نے کہا کہ آپ اپنی بیالیس لاکھ کی گاڑی بغیر ٹیسٹ لیے ان کو دے آتے ہیں اور کہتے ہیں "بھا صدیق اسے ٹھیک کر دینا" اور وہ کہتا ہے کہ جی اسے ٹھیک کرنے میں تین دن سے کم نہیں لگیں گے۔ اس کی خرابی بڑی پیچیدہ ہے (میں بھا صدیق کی وہ بات

سن رہا تھا) اس نے مزید کہا کہ جی اگر جاپان والے آئیں تو انہیں ہم سے ضرور ملوانا۔ انہوں نے اس گاڑی میں ایک بنیادی غلطی کی ہے اور اگر وہ فلاں جگہ پر آدھے انچ کی جھری دے دیں اور ایک قابلہ ادھر لگا دیں تو یہ خرابی اس میں پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ میں نے کمیٹی والے صاحبان سے کہا کہ آپ ان ہنر مندوں کو مجھے سلام کر لینے دیں۔ پھر میں نے ان بڑے لوگوں سے ڈرتے ڈرتے کہا کہ بہت لائق لڑکیاں ہیں جنہوں نے ایگر یکلچر میں ”لابیں“ لگانے میں ایم ایس سی کر رکھی ہے کیا انہیں سر ٹیفیکیٹ دے دیں تو جواب ملا۔

” دفع کریں جی۔“

اب ان کے خیال میں ان کے پاس کوئی علم سرے سے ہے ہی نہیں۔ علم تو ان کے خیال میں وہ ہے جس پر وہ ٹھپّہ لگا دیں اور یونیورسٹی اس ٹھپے کی تصدیق کر دے۔ ہماری اس کمیٹی میں ایک ہارٹ سرجن بھی تھے۔ وہ کہنے لگے کہ اشفاق صاحب آپ نے جو سرٹیفکیٹ چھپوایا ہے ایسا تو میرے پاس بھی نہیں اور یہ تو اس سے خوبصورت ہے جو میں نے ایف آر سی کرنے پر ایڈنبرا سے لیا تھا۔ کیا آپ یہ سرٹیفکیٹ ایسے ہی دے دیں گے اور یہ کس کو دیں گے۔؟

میں نے کہا، میں یہ سرٹیفکیٹ اس ویلڈر کو دوں گا جو آپ کے ہسپتال کے باہر بیٹھا ویلڈنگ کرتا تھا۔ وہ کہنے لگے آپ اسے کیوں دیں گے؟

میں نے کہا ڈاکٹر صاحب میں آپ کو اس کی ویلڈنگ گن لے دیتا ہوں اور آپ سے کہتا ہوں کہ پیتل اور تانبے کا ٹانکا لگا دیں لیکن آپ ایسا نہیں کر پائیں گے۔ جس طرح وہ آپ کا کام نہیں کر سکتا اس طرح آپ اس کا ہنر نہیں جانتے۔ آپ ڈاکٹر صاحب مجھے ان بے ڈگریوں کے پیارے ہنر مندوں کو اتنی تو عزت دینے دیجیے جتنی آپ کو مل رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ اس خیال کو چھوڑ دیں۔ ویسے ہم ان لوگوں کی عزت کرنے کے لیے لکھتے اور چھاپتے رہیں گے۔ اس سے خواتین و حضرات میرے دل میں یہ خیال آیا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہم ان لوگوں کو ان کی عزّتِ نفس لوٹانا ہی نہیں چاہتے۔ آرٹسٹ، موچی، نائی ہر ایک انسان کی عزت ہوتی ہے اور دوسری اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ پاکستانی ہے اور مجھے اس کو اتنی عزت تو دینی چاہیے جتنی میں باہر سے آئے ہوئے گورے کو دیتا ہوں۔ ہمارے مزاج اتنے کیوں بگڑے، ہمارے معاشرے میں عزت نہ دینے کا رجحان کیسے آیا، ہمارے سکول اور درس گاہیں اخلاقیات کی تعلیم کیوں نہیں دیتی ہیں۔ یہ بات سمجھ نہیں سکا ہوں۔ میں ایک چھوٹے اور عاجز لکھاری کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ میرے ملک کے چودہ

کروڑ آدمی روٹی کپڑے اور مکان کی تلاش میں اتنے پریشان نہیں جتنے وہ عزت
کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ وہ سارے کے سارے کیس ایسے
کندھے کی تلاش میں ہیں جہاں وہ سر رکھ کر رو سکیں اور اپنا دکھ بیان کر سکیں
لیکن انہیں اس بھرے پرے اور طاقتور ملک میں کندھا نہیں ملتا اور بدقسمتی سے
ہم انہیں وہ مقام نہیں دے سکتے ہیں جو ہم بیرونِ ملک جاتے ہی وہاں کے
ڈرائیوروں اور قلیوں کو سر سر کہہ کر دیتے ہیں۔ جب میں ان خیالات کی
مصیبت میں مبتلا تھا تو میرے پاس ایک بابا ابراہیم آیا وہ ضلع شیخوپورہ کا رہنے والا
تھا۔ اس نے مجھے آ کے کہا" میں نے تمہارا بڑا نام سنا ہے اور تم بڑے اچھے حلیم
طبیعت کے انسان ہو۔ میں ریڈیو اور ٹی وی سے تلاش کرتا ہوا تمہارے پاس پہنچا
ہوں۔ تم مجھے پڑھنا سکھا دو۔" میں نے کہا" بابا تم اس عمر میں پڑھ کر کیا کرو
گے ؟" اس نے کہا کہ میری اس وقت عمر 78 سال ہے۔ میں بارہ سال کا تھا جب
میرا باپ مجھے چاول کی پنیری لگانے کھیت میں لے آیا۔ میں اس وقت سے لے
کر اب تک دھان اُگا تا رہا ہوں۔ اب اللہ نے مجھے بارہ سال بعد خوشیاں دی ہیں
اور میرے بیٹے کے ہاں بیٹا اور بیٹی پیدا ہوئی ہے۔ وہ دونوں بچے اب سکول جاتے
ہیں۔ صبح سویرے اٹھ کر جب چولہے پر میں گڑ کی چائے بنا رہا ہوتا ہوں تو وہ
دونوں پڑھ رہے ہوتے ہیں اور اندر سے ان دونوں کی جو آواز آ رہی ہوتی ہے وہ

مجھے بڑی اچھی لگتی ہے۔ وہ پڑھتے ہوئے جب یہ کہتے ہیں کہ "میں پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنوں گا۔ ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔ ان پڑھ آدمی ڈھور ڈنگر (جانوروں) سے بدتر ہوتا ہے اس لیے علم حاصل کرنا چاہیے۔"

تو میں یہ سن کر باہر بیٹھ کر روتا ہوں کہ میں ڈھور ڈنگر ہوں اور میں ملک کی خدمت نہیں کر سکوں گا، میں اس لیے پڑھنا چاہتا ہوں کہ میں ملک کی خدمت کرنا چاہتا ہوں اور میں مرنے سے پہلے پہلے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا بابا، تو تو ساٹھ برس ہم کو چاول کھلاتا رہا ہے، تیرے سے زیادہ خدمت تو کسی اور نے نہیں کی۔ وہ کہنے لگا کہ کتاب میں یہ لکھا ہے کہ "پڑھ لکھ کر ملک کی خدمت کروں گا۔" لیکن میں پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ اب مجھے کسی نے بتایا ہے کہ تو لاہور میں اشفاق احمد کے پاس چلا جا، وہ تمہیں پڑھا دے گا اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ لاہور شہر میں بوڑھوں کو پڑھانے کا بھی انتظام ہے اور اگر مجھے الف ب والا کچا قاعدہ آ گیا تو میرا بیڑا پار ہے۔ اللہ مجھے شاباش کہے گا اور کہے گا کہ تو ملک و قوم کی خدمت کر آیا ہے۔ اب میں شرمندہ بیٹھا اس کی باتیں سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یا اللہ ہم جو ان لوگوں کے بارے اُوٹ پٹانگ بول جاتے ہیں اس کا تو بابے کو علم ہی نہیں۔ جب میں نے اس بابے سے چاول کھلانے والی خدمت کا کہا تو وہ کہنے لگا نہیں اس کے تو میں پیسے لیتا رہا ہوں۔ میں نے کہا بابا جو کام ہم کرتے ہیں

ہم بھی اس کے پیسے لیتے ہیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ ہم پڑھے لکھے لوگ مفت میں ہی بغیر تنخواہ، پنشن کے قوم کی خدمت کرتے ہیں۔

اب وہ میری جان کے پیچھے پڑ گیا اور اٹھے نا۔ میں نے اس سے جان چھڑانے کے لیے کہا کہ بابا تو کوئی ایسا کام جانتا ہے جو گاؤں میں لوگ کیا کرتے ہیں۔

کہنے لگا مثلاً کیا کام؟

میں نے کہا کہ گاؤں میں جب کسی لڑکی کی بارات آتی ہے تو لوگ بارات کی خدمت کرنے کے لیے بھاگے پھرتے ہیں اور مفت میں کام کرتے ہیں کیا تو ایسا کر سکتا ہے؟ کہنے لگا نہیں۔

میں نے کہا کہ جب گاؤں میں کوئی ڈھگی وچھی (بیل گائے) بیمار ہو جاتی ہے تو اس کا تمہیں کوئی علاج آتا ہے جیسا کہ اپھارے میں کاڑھا دیا جاتا ہے۔ کہنے لگا نہیں میں کوئی نسخہ نہیں جانتا۔ اب میں اس سے جان چھڑانے کے لیے اسے گھیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کہنے لگا کہ مجھے دوسرے گاؤں والے گھوڑی پر بٹھا کے لے جاتے ہیں اور اپنی فصل دکھاتے ہیں تو میں انہیں بتاتا ہوں کہ یہ جو بارہ پودے سر چھینک کے

کھڑے ہیں یہ بچ جائیں گے اور وہ جو سینہ تانے کھڑے ہوئے ہیں مر جائیں گے اور انہیں فصل کی اچھائی اور کمزوری بابت بتاتا ہوں۔

میں نے اس سے کہا بابا تو تو ایگریکلچر کا پی ایچ ڈی ہے "اوہ ظالما تو نے اب اور پڑھ کے کیا لینا ہے۔"

کہنے لگا نہیں مجھے داخل کرا دیں کیونکہ کتاب میں یہ ہی لکھا ہے کہ ان پڑھ ڈھور ڈنگر ہیں۔

اب دیکھئے وہ بابا پاکستان اور جاپان دونوں کو چاول کھلا رہا ہے اور بہت بڑا Technologist ہے لیکن ہمارے ہاں کیا اور کہاں خرابی ہے کہ ہم اپنے ٹیکنالوجسٹ کو ٹیکنالوجسٹ نہیں سمجھتے۔ صرف انہی کو ٹیکنالوجسٹ گردانتے ہیں جن کے اوپر ایک ڈگری لگا دی گئی ہے۔ اگر یہ خلیج اسی طرح سے رہی تو پھر ہماری طاقت ایسے ہی کم ہوتی رہے گی جتنی کی ایک چھوٹے سے دس بارہ لاکھ کے نفوس والے مقروض ملک کی ہوتی ہے جسے علم ہی نہیں ہوتا کہ ملک کدھر جا رہا ہے۔ جو ملک سارے گروہ کو ساتھ لے کر چلتے ہیں وہ آگے نکل جاتے ہیں۔ امیری غریبی سارے ملکوں میں ہے اور یہ رہے گی لیکن گروہوں کو ساتھ لے کر چلنے والے ملک کی ضلع کچہری میں ایک غریب آدمی کی اتنی ہی عزت ہے

جتنی امیر آدمی کی ہے۔ جب ہم نے پاکستان بنایا تھا اور میں اس وقت بی-اے کر چکا تھا تو آزادی کے تحریک میں جب ہم مختلف دیہاتوں میں تقریریں کرنے جاتے تھے تو یہ ہی کہتے تھے کہ جب پاکستان بنے گا تو تم دیکھو گے کہ تمہیں عزت دی جائے گی۔ وہ دودھ کی نہریں نہیں ہوں گی لیکن تمہیں عزت میسر آئے گی۔ وہ لوگ ہم سے ہاتھ اٹھا کے پوچھتے تھے کہ کیسے عزت ہو گی۔ میں انہیں کہتا کہ یہ غلامی کی جگہ ہے اور انگریز تمہارا حاکم ہے لیکن جب پاکستان بنے گا تو ضلع کچہری میں تم سے کوئی بے ادبی یا بدتمیزی سے پیش نہیں آئے گا اور تمہیں وہاں ''پھجا ولد لبھا حاضر ہو'' کی آواز نہیں لگے گی بلکہ وہاں کرسیاں لگی ہوئی ہوں گی۔ آپ کو نائب کورٹ آ کے سلام کرے گا اور کہے گا ''تشریف لایئے آپ کی باری ہے۔'' وہ بے چارے اس دھوکے میں آ گئے اور عزت کی خاطر چل پڑتے اور نعرے مارتے اور وہاں سکھ ہندو ''جھگ'' کی طرح بیٹھ جاتے تھے کہ یہ وعدہ جو ان سے کیا جا رہا ہے یہ پورا ہی ہو گا اس لیے لوگ ان کے نعرے لگا رہے ہیں۔ خواتین و حضرات میں ان کو عزّتِ نفس دیئے جانے کے خواب دکھا کر ایسے ہی گناہ کر تا رہا ہوں۔ اب میں عمر کے آخری حصے میں ہوں اور وہ لوگ جن سے ہم وعدہ کرتے تھے وہ عارف والا اور خانیوال میں آباد ہیں

اور میری طرح عمر رسیدہ ہو گئے ہیں لیکن میں انہیں ان کی عزّتِ نفس لوٹا یا دلوا نہیں سکا اور اب کچھ ہونا بہت مشکل ہے۔

میں اپنے چھوٹوں اور ساتھیوں سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ خُدارا انہیں کچھ نہ دیں، انہیں دولت نہیں چاہیے انہیں صرف ان کی عزّتِ نفس لوٹا دیں پھر دیکھیں یہ کیسے شیر وں کی طرح کام کرتے ہیں اور جس کی ہمیں اور آپ کو آرزو ہے۔ یہ آپ کو بدلے میں دیں گے لیکن ابھی تک یہ کام رکا ہوا ہے اور مجھے ساتھ ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ "اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" اگر مجھے کہیں سے اس بات کی تھوڑی سی بھی بھنک پڑتی رہے کہ انہیں عزّتِ نفس لوٹا دی جائے گی تو مجھے حوصلہ ہو گا اور شاید اس بھنک کی وجہ سے صبر کا دامن میرے ہاتھ میں ہی رہے۔ یہ عزّتِ نفس لوٹانے سے ہمارے پلے سے تو کچھ نہیں جائے گا۔ کسی کو کوئی پیسہ دھیلا نہیں دینا بس عزت دینی ہے، احترام اور تکریم دینی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ سے آج یہ جو بات ڈائریکٹ ہوئی ہے اس کا کچھ نہ کچھ مثبت اثر ضرور ہو گا۔ کیونکہ آپ کے چہرے بتا رہے ہیں کہ آپ اس دلیل کو تسلیم کرتے ہیں۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

آمین۔

اللہ حافظ۔

تھری پیس میں ملبوس بابے اور چغلی میٹنگ

میں اکثر اس پروگرام میں اور کبھی کبھی اس پروگرام سے ماورا دوسرے موقعوں یا پروگراموں میں بابوں کا ذکر کرتا رہتا ہوں اور ڈیروں کی بابت عموماً باتیں کرتا ہوں جس کے باعث عموماً راہ چلتے ہوئے اور دیگر کئی جگہوں پر سب لوگ مجھے روک کر پوچھتے ہیں کہ آپ کے بابے کیا ہوتے ہیں اور ان میں ایسی کون سے صفت ہوتی ہے جو آپ ان سے اس قدر مرعوب ہیں اور ان ہی کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں حالانکہ آپ بڑے پڑھے لکھے آدمی ہیں اور یہاں کے ہی نہیں ولایت سے بھی پڑھ کر آئے ہیں۔ وہاں پڑھاتے بھی رہے ہیں۔ آپ ہمیں بھی بتایئے کہ ان بابوں میں کون سی ایسی خوبی ہوتی ہے جو آپ کو متاثر کرتی ہے۔ میں ان سے یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر آپ کبھی ان سے ملیں یا ان سے In contact آئیں تو پھر آپ کو پتہ چلے کہ یہ کس حد تک ہم عام لوگوں سے

مختلف ہوتے ہیں۔ بابوں سے میری مراد یہ نہیں کہ ایک آدمی جس نے سبز رنگ کا لباس پہنا ہوا ہو۔ اس کے سر کے لمبے بال یا اس نے لمبی "لٹیں رکھی ہوئی ہوں، گلے میں تسبیحات اور منکوں کی مالائیں ڈالی ہوئی ہوں ضروری نہیں وہ بابا ہی ہو۔ بہر حال کچھ بابے ایسے روپ میں بھی ہوتے ہیں لیکن اکثر بابے جو اب آپ کی زندگی میں آپ کے قریب سے اور گرد و پیش سے گزر جاتے ہیں وہ تھری پیس سوٹ زیبِ تن کرتے ہیں، سرخ رنگ کی ٹائی لگاتے ہیں اور ان کی اس سرخ ٹائی میں سونے کی پن لگی ہوتی ہے لیکن آپ کو اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ شخص جو میرے اس قدر قریب بیٹھا ہے یا میرے اس قدر قریب سے اٹھ کر گیا ہے، اس کے اندر وہ ایسی کونسی بات تھی جسے میں پکڑ نہیں سکا اور میں اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ یہ بڑا مشکل کام ہے۔ خواتین و حضرات فائدہ اٹھانے کے لیے اپنے وجود کا ایسا ریڈیو سیٹ بنانا پڑتا ہے جس پر تمام اسٹیشن آسانی سے پکڑے جا سکیں۔ میں ایک سنگل بینڈ کا ریڈیو ہوں۔ میرے اوپر صرف لاہور ہی سنائی دیتا ہے۔ لیکن میرے کمرے میں دنیا بھر کی آوازیں اکٹھی ہوتی ہیں اگر میرا Receiving Centre اچھا ہو گا تو میں دوسری چیزیں بھی بڑی آسانی کے ساتھ پکڑ لوں گا لیکن اگر وہی Dull تو پھر مشکل ہے۔ اب اس Dullness کو دور کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی ایسے

لوگوں سے ملتا رہے جن کے اندر آپ کو اپنے سے مختلف کوئی چیز نظر آئے چاہے وہ کسی بھی طرح کی اچھی چیز ہو۔ مغرب والے اس طرح کے رویے کا اظہار کرتے ہیں ۔ وہ بڑے متجسس قسم کے لوگ ہیں۔ انہیں جونہی کوئی ذرا مختلف، ذرا عام حالات سے ہٹ کر انہیں کوئی کردار ملا وہ رک کر اسے دیکھتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے ؟ اس کی تحقیق کرتے ہیں۔ بد قسمتی سے ہمارے ہاں ایک بات طے شدہ ہے کہ اگر ہم نے کسی کو غلط کہہ دیا تو وہ غلط ہو گیا۔ آدمی کسی غلط شخص کے اندر یہ دیکھتا ہی نہیں کہ شاید اس میں بھی کوئی اچھی بات ہو۔ جسے اپنی طرف سے غلط یا خراب قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس میں سے اچھائی تراشنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی جاتی۔ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ بابوں کے پاس عجیب و غریب جذبہ ہوتا ہے وہ ہم میں نہیں ہے۔ وہ جذبہ انسانوں سے محبت کرنے کا جذبہ ہے۔ ہم کتابی طور پر تو کہہ لیتے ہیں کہ جناب ہم محبت کرتے ہیں یا ہم یہ ذکر کرتے ہیں کہ ہمیں ان سے بڑی محبت ہو گئی ہے لیکن محبت کے اندر داخل ہو کر اس کو اپنی ذات پر وارد کرنا یہ ایک مشکل اور مختلف کام ہے جس طرح بارش کا ذکر اور بارش کے اندر بھیگ جانا دو مختلف عمل ہیں۔ بارش کا ذکر کرنے سے جس طرح آدمی بھیگتا نہیں ہے۔ بابے محبت کے عمل میں اس آسانی سے داخل ہو جاتے ہیں کہ ہم جیسے لوگ حسرت سے دیکھتے رہ جاتے

ہیں اور ہمیں تا دمِ مرگ یہ حسرت ہی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ ایک نہایت بے ہودہ اور غیر توجہ طلب انسان کے اندر سے بھی کوئی ایسی چیز تلاش کر لیتے ہیں جو اس کی خوبی ہوتی ہے اور وہ اس کی خوبی کو ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ ہم سے وہ چادر نہیں اٹھائی جاتی جو بابے اٹھا لیتے ہیں۔ ہم سے ان کی طرح وہ چھپا ہوا حصہ اجاگر نہیں ہو پاتا۔ ہماری ٹریننگ کچھ اس طرح کی ہے کہ ہم جب بھی کسی شخص سے ملتے ہیں ہم اس شخص کی اچھائیوں پر نظر نہیں کرتے۔ صرف اس کی برائیاں ہی ہمیں نظر آتی ہیں۔ شاید ہماری تربیت ہی کچھ اس طرح سے ہوتی ہے۔ مجھے ایک بہت پرانا لطیفہ یاد آ رہا ہے جو آپ کو بھی سناتا ہوں۔ ایک میراثی تھا جو بڑا بزرگ آدمی تھا لیکن اس سے اس کی بیوی بڑی تنگ تھی اور اسے طعنے دیتی رہتی تھی کہ تو اپنی شکل دیکھ، تو کیسے بزرگ ہو سکتا ہے۔ وہ بے چارہ بھی بڑا پریشان تھا۔ ایک دن مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد وہ بیٹھا دعا مانگ رہا تھا تو اس کی بیوی نے اسے آ کر "ٹھڈا" (ٹھوکر) مارا اور کہا کہ تو ادھر بیٹھا دعائیں مانگ رہا ہے، اٹھ کر کوئی کام وام کرو۔ بیوی کی اس حرکت سے اسے جلال آ گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا، ہوا میں ابھرا، آسمانوں میں چھا گیا اور اس نے آسمان کے تین چار بڑے بڑے چکر لگائے۔ اس کی بیوی نیچے کھڑی اسے دیکھتی رہی اور دل میں سوچتی رہی کہ یہ کوئی اللہ کا بڑا پیارا ہے۔ وہ میراثی جب

نیچے اتر آیا تو اس نے بیوی سے کہا دیکھا تو نے ہمارا کمال۔ اس کی بیوی کہنے لگی کون سا کمال؟ کہنے لگی وہ اللہ کا کوئی پاکیزہ بندہ تھا۔

وہ کہنے لگا "اوہ میں سی۔"

تو وہ پھر کہنے لگی اچھا!

" ایسے لئی ٹیڈھا ٹیڈھا اڈ رہیا سی۔" (اسی لیے ٹیڑھے ٹیڑھے اڑ رہے تھے۔)

یہ بڑی پرانی بات ہے لیکن اب ہم جب بھی کسی بندے سے ملتے ہیں، ہمیں اس میں سے ٹیڑھ نظر آتی ہے۔ جب ٹیڑھ ہمیں نظر آتی ہے تو پھر ہماری زندگی میں، ہماری ذات اور ہمارے وجود میں بھی ایک ٹیڑھ پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ٹیڑھ نکلتی نہیں ہے اس لیے اللہ نے ہم پر خاص مہربانی فرما کر ہمیں غیبت سے منع فرمایا ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جس کا ہمیں پتہ نہیں چلتا۔ کافی عرصے کی بات ہے کہ ہم کسی بابے کی ذکر کی محفل میں داخل ہوئے تا کہ اپنی ٹریننگ کی جائے۔

انہوں نے کہا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ انسان کے وجود کے اندر ایک ایسا عضو ہے جو اگر خراب ہو جائے تو سارے کا سارا بندہ خراب ہو جاتا ہے اور وہ عضو دل ہے۔ اس طرح سے ہم اور آپ لوگوں کے دل

خراب ہو گئے ہیں اور ان کے اوپر "راکھ" جم گئی ہے جیسے پرانی دیگچی جس میں چائے پکاتے ہیں وہ اندر اور باہر سے ہو جاتی ہے بالکل اس طرح سے ہمارے دل ہو گئے ہیں اور ہم اللہ کے ذکر سے اس کو صاف کرتے ہیں اور اس کو "مانجا" لگاتے ہیں اور اللہ ہو کے ذکر سے اس زنگ اور کائی لگے دل کو صاف کرتے ہیں اور یہ خرابی بے شمار گناہ کرنے کہ وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ آپ یقین کیجیے گا کہ جب میں اس محفل میں تھا اور میں اس میں شامل ہونے والا تھا تو میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ میں تو ایک اچھا نیک سا نوجوان ہوں اور میں نے کوئی خاص گناہ نہیں کیا تو میرا دل کیسے کالا ہو گیا اور میں اس کو "مانجا" لگاؤں۔ یہ ایک خیال سا میرے ذہن میں آ گیا اور کافی دیر تک میں سوچتا رہا۔ محفلِ ذکر سے قبل وہ بابا جی کہنے لگے کہ بیشتر اس کے کہ ہم محفل شروع کریں شاید بہت سارے اصحاب یہ سوچتے ہیں کہ وہ تو اچھے ہیں۔ انہوں نے تو کوئی گناہ نہیں کیا۔ تو پھر کیسے ہمارا دل کالا ہو گیا۔ کوئی بڑا گناہ نہیں کیا۔ کوئی چوری چاری نہیں کی۔ کسی کے گھر پر قبضہ نہیں کیا۔

بابا جی کہنے لگے کہ ایسا سوچنے والوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ بہت بڑے گناہوں میں سے ایک بہت بڑا گناہ غیبت ہے۔

خواتین و حضرات! اب غیبت تو ہم سارے ہی کرتے ہیں۔ اس کے بغیر ہم کھانا نہیں کھاتے۔ ہمارے گھر میں ہماری بہوئیں کہتی ہیں کہ ماموں اب ہمارا غیبت کا ٹائم ہو گیا ہے۔ دس بجے ان کی "چغلی میٹنگ" ہوتی ہے۔ وہ ہر بار ایک دوسرے کے گھر میں جاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اس بار ہم نے چغلی میٹنگ رضیہ کے گھر میں رکھی ہے اور دس بجے سے لے کر بارہ بجے تک وہ چغلی کرتی ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ تم اتنی زیادہ چغلی کیوں کرتی ہو۔ وہ کہتی ہیں کہ ساری دنیا میں اور پورا کرہ ارض پر چغلی ہوتی ہے۔ جتنے بھی اخبارات چھپتے ہیں وہ سارا چغلیوں سے ہی بھرا ہوتا ہے۔ جو بھی کالم چھپتے ہیں ان میں لوگوں کی خرابیاں ہی بیان کی ہوئی ہوتی ہیں۔ کِسی کی اچھائیاں تو نہیں ہوتیں ان میں اور فلاں بُرا فلاں بُرا کی گردان بھی ہوتی ہے اور اس سے ہم نے سبق لے کر یہ کام سیکھا ہے۔ ہم نے بابا جی کے ہاں ذکر کی محفل میں شرمندگی سے ذکر شروع کیا کہ واقعی ہم چغلی تو بہت زیادہ کرتے ہیں اور روز کرتے ہیں۔ چغلی اس لیے کرنی پڑتی ہے کہ اپنی ذات میں چونکہ کوئی صفت یا خوبی نہیں ہوتی یا کم ہوتی ہے اور ہم دوسرے کو نیچے دھکیل کے اور ڈبو کے اپنے آپ کو اوپر اچھالتے ہیں۔ ہم نے بابا جی سے کہا کہ جی آپ کیسے خوبی تلاش کر لیتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر آپ کیس شخص کے اندر داخل ہوں اور اس کے متعلق صاحب حال ہوں تو پھر آپ کو آسانی ہو گی اور

آپ بھی اس بات یا خوبی کو پکڑ لیں گے جس کو ہم پکڑ لیتے ہیں۔ مائیکل اینجلو ایک بہت بڑا مجسمہ ساز تھا۔ اس نے بہت خوبصورت مجسمے بنائے۔ اس نے حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کے بہت سے مجسمے بنائے۔ اس کا بنایا ہوا ڈیوڈ کا اٹھارہ فٹ اونچا مجسمہ فلورنس میں بھی ہے جسے ساری دنیا دیکھنے جاتی ہے۔ اسے ہم نے بھی دیکھا۔

کسی نے اس سے پوچھا کہ مائیکل یہ بتاؤ کہ تم کس طرح سے یہ مجسمہ بناتے ہو۔ ایسا خوبصورت مجسمہ کیسے بنا لیتے ہو؟ یہ تو انسانی کمال کا ایک آخری حصہ ہے۔ اس نے کہا کہ میں تو مجسمہ نہیں بناتا اور نہ ہی مجھے بنانا آتا ہے۔ میں سنگِ مرمر کا ایک بڑا ٹکڑا کہیں پڑا ہوا دیکھتا ہوں اور مجھے اس میں "ڈیوڈ" نظر آنے لگتا ہے اور میں چھینی، ہتھوڑی لے کر اس پتھر میں سے ڈیوڈ کے ساتھ پتھر کا فضول حصہ اتار دیتا ہوں اور اندر سے ڈیوڈ (حضرت داؤد) نکل آتے ہیں۔ میں کچھ نہیں کرتا۔ مجھے تو ڈیوڈ صاف نظر آ رہے ہوتے ہیں۔ میں بس ان کے ساتھ غیر ضروری پتھر اتار دیتا ہوں۔ اس طرح سے یہ بابے جو ہیں یہ انسان کی غیر ضروری چیزیں اتار دیتے ہیں اور نیچے سے بڑا پاکیزہ، اچھا اور خوبصورت سا انسان نکال کے اپنے سامنے بٹھا لیتے ہیں اور پھر اس کو اپنی توجہ کے ساتھ وہ سب کچھ

عطا کر دیتے ہیں بشرطیکہ وہ شخص اس کا آرزو مند ہو اور صبر والا ہو۔ لیکن جو آرزو مند ہو وہ صابر بھی ہونا چاہیے۔ جیسے خداوند کریم فرماتا ہے کہ:

انااللہ مع الصابرین۔

(بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔)

اگر کسی نے اللہ کو پانا ہو تو وہ صبر کرنے لگ جائے تو اس کا کام بن جاتا ہے جبکہ لوگ اس کے لیے ورد، وظیفے کرتے ہیں۔ ناک رگڑتے ہیں لیکن اللہ کو صبر کرنے والے پا لیتے ہیں۔ میں شاید اسی محفل میں پہلے بھی یہ بات بتائی ہے کہ میر ایک تائی تھیں۔ وہ تیلن تھی۔ اس کا شوہر فوت ہو گیا۔ وہ تائی بے چاری کولہو پیلتی تھی۔ نہایت پاکیزہ عورت تھی۔ وہ اٹھارہ سال کی عمر میں بیوہ ہوئی لیکن اس نے شادی نہیں کی۔ جب میں اس سے ملا تو تائی کی عمر کوئی ساٹھ برس کے قریب تھی۔ اس کے پاس ایک بڑی خوبصورت "رنگیل پیڑھی" تھی، وہ اسے ہر وقت اپنی بغل میں رکھتی تھی جب بیل کے پیچھے چل رہی ہوتی تو تب بھی وہ اس کے ساتھ ہی ہوتی تھی۔ وہ ساگ بہت اچھا پکاتی تھی اور میں سرسوں کا ساگ بڑے شوق سے کھاتا تھا۔ وہ مجھے گھر سے بلا کے لاتی تھی کہ آ کے ساگ کھا لے میں نے تیرے لیے پکایا ہے۔ ایک دن میں ساگ کھانے اس کے گھر گیا۔ جب بیٹھ

کر کھانے لگا تو میرے پاس وہ "پیڑھی" پڑی تھی میں نے اس پر بیٹھنا چاہا تو وہ کہنے لگی "ناں ناں پُتر ایس تے نئیں بیٹھنا" میں نے کہا کیوں اس پر کیوں نہیں بیٹھنا۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ زیادہ خوبصورت ہے۔ میں نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ اس پر کیوں نہیں بیٹھنا۔ کیا میں تیرا پیارا بیٹا نہیں۔

کہنے لگی تو میرا بہت پیارا بیٹا ہے۔ تو مجھے سارے گاؤں سے پیارا ہے لیکن تو اس پر نہیں بیٹھ سکتا۔

کہنے لگی بیٹا جب تیرا تایا فوت ہوا تو مسجد کے مولوی صاحب نے مجھ سے کہا کہ " بی بی تیرے اوپر بہت بڑا حادثہ گزرا ہے لیکن تو اپنی زندگی کو سونا بھی بنا سکتی ہے۔ یہ تجھے اللہ نے عجیب طرح کا چانس دیا ہے۔ تو اگر صبر اختیار کرے گی تو اللہ تیرے ہر وقت ساتھ ہو گا کیونکہ یہ قرآن میں ہے کہ " اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے" تائی کہنے لگی کہ میں نے پھر صبر کر لیا۔ جب کئی سال گزر گئے تو ایک دن مجھے خیال آیا کہ اللہ تو ہر وقت میرے پاس ہوتا ہے اور اس کے بیٹھنے کے لیے ایک اچھی سی کرسی چاہیے کہ نہیں؟ تو میں نے "رنگیل پیڑھی" بنوائی اور اس کو قرینے اور خوبصورتی سے بنوایا۔ اب میں اس کو ہر وقت اپنے پاس رکھتی ہوں اور جب بھی اللہ کو بیٹھنا ہوتا ہے میں اسے اس پر بٹھا لیتی ہوں۔

میں کپڑے دھوتی ہوں، اپنا کام کرتی ہوں، روٹیاں ساگ پکاتی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میرا اور اللہ کا تعلق ہے اور وہ صبر کی وجہ سے میرے ساتھ ہے۔ خواتین و حضرات ایسے لوگوں کا تعلق بھی بڑا گہرا ہوتا ہے۔ ایسے لوگ جنہوں نے اس بات کو یہاں تک محسوس کیا۔ وہ قرآن میں کہی بات کو دل سے مان گئے وہ خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں۔ ہم جیسے لوگ "ٹامک ٹوئیاں" مارتے ہیں اور ہمارا رخ اللہ کے فضل سے سیدھے راستے ہی کی طرف ہے۔ ہم سے کچھ کوتاہیاں ایسی ضرور ہو جاتی ہیں جو ہمارے کیے کرائے پر "کُوچی" پھیر دیتی ہیں۔ جس سے ہمارا بدن، روح، دل خراب ہو جاتا ہے۔

مجھے ابھی تھوڑی دیر پہلے اعظم خورشید کہہ رہے تھے کہ ہمارے ہاں نفرت کی فضا پیدا ہو گئی ہے۔ یہ نفرت کی فضا کس وجہ سے پیدا ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے معاشرے میں مختلف گروہِ انسانی وہ نفرت میں مبتلا ہیں۔ اس کی کئی وجوہات ہیں، ایک یہ کہ ہم اس علاقے کے رہنے والے ہیں اور ہم ان لوگوں سے ہٹ کے مسلمان ہوئے ہیں جو انسانوں کو پسند نہیں کرتے۔ وہ لوگ برہمن تھے۔ ہم ایک اعتبار سے Convert ہیں۔ ہمارے اندر وہ پہلی سی کچھ کچھ چیز چلی آرہی ہے کہ ہم کو ایسا آدمی جو خدانخواستہ چھوٹے درجے پر ہو وہ اچھا نہیں لگتا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں جاتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ گورے کو

کالے پر اور کالے کو گورے پر فوقیت نہیں ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ہاں اگر تم فوقیت کا کوئی راستہ جاننا ہی چاہتے ہو تو وہ تمہیں تقویٰ میں ملے گی اور تقویٰ ایسی چیز ہے جس میں آپ جتنے نیچے ہوتے جائیں اتنے ہی اوپر ہوتے چلے جائیں گے کیونکہ تقویٰ میں عاجزی ضروری ہے۔ باباجی ہم سے یہی دریافت کرتے رہے کہ لوگوں سے محبت کیسے کرنی ہے کیونکہ لوگوں کی خدمت کر کے اور انہیں انسان مان کے ہی کسی منزل پر پہنچ سکتے ہیں۔ اگر خدمت نہ بھی کریں یہ مانیں تو سہی کہ یہ بھی انسان ہیں۔ ہمارے باباجی کے ڈیرے کے پاس ایک بابا لہنا جھاڑو دیا کرتا تھا وہ جب بھی آتا تھا تو باباجی اس کی اتنی عزت کرتے کہ کھڑے ہو جاتے۔

میں نے کہا کہ جی یہ تو جمعدار ہے چھوڑیں۔ وہ کہتے تھے نہیں نہیں یہ بڑا باعزّت آدمی ہے۔ ہم کو کھانے میں وہاں دال ملتی تھی لیکن جب وہ آتا تھے تو پیڑھی کے نیچے سے مکھن بھی نکل آتا تھا، چٹنی بھی نکل آتی تھی، کاٹا ہوا پیاز، کھیرے بھی نکل آتے اور یہ ساری چیزیں لہنا صاحب کو ملتی تھیں۔ میں نے کہا کہ جی بتائیں ہم تو ایم-اے پاس کر کے آئے ہیں اور پڑھے لکھے لوگ ہیں اور آپ ساری چیزیں اس کو دے دیتے ہیں۔

باباجی کہنے لگے کہ حکیم کو پتہ ہوتا ہے کہ مریض کو کیسی غذا دینی ہے۔ آپ اپنی شکلیں دیکھو اور شکر کرو کہ تم کو کھانے میں دال روٹی مل جاتی ہے۔ خواتین و حضرات یہ ڈیرے بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ میں بات کر رہا تھا کہ کسی آدمی کے اندر سارے خرابیاں دیکھ کے ٹیڑھا ٹیڑھا چلنا دیکھ کے، اس کا لنگڑا پن دیکھ کے اس کے اندر ایسی چیز کو تلاش کرنا کہ یہ اس کی خوبی ہے جو کسی وجہ سے اس پر بھی نہیں کھل سکی اور ایسے شخص کے ساتھ محبت کرتے چلے جانا آپ کے دل کو روشنی عطا کرتا ہے اور اس کو بغیر کسی ورد کے صاف بھی کرتا ہے۔ دل کو صاف کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہی ہے کہ آپ لوگوں کے ساتھ محبت کریں، چلیں محبت کرنا مشکل کام ہے آپ انسان کو انسان تسلیم کر لیں۔ گو مجھ سے اسّی برس کی عمر تک پہنچ جانے کے باوجود یہ نہیں ہو سکا کہ میں جو یہ مخالف ہے اس کی شہ رگ کے قریب بھی اللہ موجود ہے اور کم سے کم درجے کے آدمی کے پاس بھی اللہ ہے۔ ہمیں تو اس کی عزت کرنی ہے۔ ولایت کے لوگوں کے بارے میں جو ہم تاثر رکھتے ہیں کہ وہ لوگوں سے اچھا سلوک کرتے ہیں میں ان کے بارے میں بھی یہ کہا کرتا ہوں کہ وہ اخلاق نہیں ہے جس کا اللہ تقاضا کرتا ہے۔ ان کے پاس اخلاق کا عکس ہے۔ اصلی اخلاق نہیں ہے۔ اگر ان کے پاس اصلی اخلاق ہوتا تو وہ افغانستان پر ایسی بمباری نہ کرتے۔ بغیر کسی جواز اور دلیل کے

انہوں نے ایسا کیا۔ وہ بھی اصلی اخلاق سے محروم ہیں لیکن آپ کے اور میرے دلوں پر ان کا بڑا دبدبہ ہے کہ جی وہ جو وعدہ کرتے ہیں یا سودا کرتے ہیں پورا کرتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ہمیں ان سے بازی لے جانی ہے کیونکہ ہمیں اللہ کی طرف سے ایسی رحمت عطا کی گئی ہے جو ان لوگوں کو عطا نہیں کی گئی۔

مسلمان ساری دنیا میں اتنے ذلیل وخوار کیوں ہیں؟ کیوں اتنی مشکل میں پڑے ہوئے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ پوری کائنات میں جو مسلم امہ ہے وہ دوسروں کے مقابلے میں برتر ہے۔ اگر برتر چیز کو ناپاکی کا ذرا سا بھی چھینٹا لگ جائے تو وہ برتر نہیں رہتی۔ غلیظ چیز کو جس طرح کا بھی گند لگ جائے وہ اس کا کوئی نقصان نہیں کرتی۔ آپ انسانیت کی دستار ہیں۔ آپ کے اوپر اگر گوبر کا ذرا سا چھینٹا لگ گیا تو یہ دستار اتار کے پھینکنی پڑتی ہے۔ یہ اہم ذمہ داری ہم پر عائد ہے کہ ہم نے اپنی دستار کو کیسے سنبھال کے رکھنا ہے اور اپنی دستار کو اچھی طرح سے اور سنبھال کر رکھنے کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ ہم اپنے بھائی، انسان اور آدمی کے ساتھ اپنا برتاؤ اور سلوک اچھا رکھیں اور اس کے ساتھ ساتھ چغلی میٹنگیں بند کریں۔ انشاء اللہ ہم اپنی اس کوتاہی کو ختم کر کے دم لیں گے اور اس جانب توجہ دیتے رہیں گے اور دلاتے رہیں گے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

آمین۔

اللہ حافظ۔

Mind Over the Matter

یہ ذہن کا بازار بھی عجیب منڈی ہے جس میں کبھی کوئی چھٹی نہیں ہوتی۔ دن کو ذہن کام جاری رکھتا ہے اور رات کو سو جانے پر خوابوں کی صورت میں اپنے عمل میں مصروف رہتا ہے اور اس میں ایک دلچسپ اور نہایت عجیب بات یہ ہے کہ اس منڈی میں باہر کے تاجر بھی آتے رہتے ہیں۔ کچھ قافلے سمر قند و بخارا سے، کچھ گلف اور ولایت سے آتے جاتے اور شامل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ عمل رکنے اور ختم ہونے کو نہیں آتا اور اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ کچھ ایسے لوگ بھی آ کر ذہنی و فکری عمل میں شامل ہو جاتے ہیں جن کی بہت سی چیزیں مُستعار بھی لینی پڑتی ہیں اور انہیں اپنانا بھی پڑتا ہے اور کچھ ایسے سوالات ذہن میں گھر کر لیتے ہیں جن سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتی ہے اور کچھ کو تو زندگی میں باقاعدہ شامل کرنا پڑ جاتا ہے مثلاً خدا کے بارے میں بہت سوال کیے جاتے ہیں اور پوچھا جاتا ہے کہ خدا کیوں ہے؟ کیسے ہے؟ کس طرح سے ہو سکتا ہے؟ کیونکہ ہم اسے

اپنے حواس خمسہ سے جان نہیں سکتے۔ ایسے اور کئی طرح کے سوال آپ کے خیال میں اترتے ہوں گے۔

لوگ تین چار قسم کے سوال بہت پوچھتے ہیں ایک یہ کہ ایک بچہ جو ایک خاص گھرانے میں اور خاص مذہبی خیالات رکھنے والے گھرانے میں پیدا ہوا لا محالہ طور پر اس کا مذہب بھی وہی ہو گا جو اس کے والدین کا ہے۔ اس بچے میں تبدیلی لانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے اور اس کو بڑی شاہراہ پر کیسے لایا جائے جس کی ہم ترجمانی کرتے ہیں۔ یہ سوال بھی عموماً پوچھا جاتا ہے کہ کئی ایسے غیر مسلم جنہوں نے بڑے نیکی کے کام کیے تو کیا یہ لوگ بہشت میں نہیں جائیں گے جس طرح گنگا رام نے اور گلاب دیوی نے ہسپتال بنوائے تھے۔ اس پر ہم کسی اور پروگرام میں بات کریں گے۔ اس طرح ذہن کی منڈی میں ہر طرح کا سودا چلتا رہتا ہے اور جب خدا کی ذات کا سوال آتا ہے تو پھر کافی مشکل پڑتی ہے۔ ہمارے یہاں بھی اس معاملے پر چند روز قبل بڑے پڑھے لکھے، جید اور سیانے یہ بات کرتے رہے اور ہم بھی سنتے رہے اور اس میں شامل بھی ہوتے رہے۔ خواتین و حضرات نتیجہ یہاں تک پہنچا کہ مرئی (دیکھی جانے والی) چیز زیادہ طاقتور ہوتی ہے یا غیر مرئی زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ سامنے نظر آنے والی چیز تو طاقتور ہے ہی تو کیا جو چیز نظر نہیں آتی وہ بھی طاقتور ہو سکتی ہے؟ اور اگر ان

دونوں کا تقابل کیا جائے تو کونسی چیز زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ یہ نہایت اچھا بہت ہی حیران کن اور توجہ طلب سوال تھا۔ آپ بھی یہ سن کر حیران ہوں گے کہ جتنی بھی غیر مرئی Invisible چیزیں ہیں وہ بڑی طاقتور ہوتی ہیں اور نظر میں آنے والی چیزوں سے زیادہ فوقیت اور تقویت رکھتی ہیں۔ ہوا نظر نہیں آتی لیکن ہوا کے دونوں روپ چاہے وہ آکسیجن کی شکل میں ہوں یا کاربن ڈائی آکسائیڈ کی شکل میں ہوں، زندگی عطا کرنے والے ہیں اور ہمارے ایک سانس کے بالکل قریب ہی دوسرا سانس کھڑا ہوتا ہے اور موجود ہوتا ہے اور دنیا کی قیمتی ترین شے آکسیجن ہمیں مفتا مفت ملتی ہے اور کسی غریب یا امیر میں تمیز کیے بغیر ملتی ہے، فرض کیجیے کہ اگر خدانخواستہ زندگی کا یہ قیمتی ترین سرمایہ ہمیں دکان سے جا کے لینا پڑتا تو کیا سماں ہوتا۔ صبح ہر کوئی اپنا اپنا ڈبہ لیے آکسیجن بھروانے نکلا ہوتا۔ پھر دفتر، سکول یا کالج جانے کی بات کرتا۔ ہم تو چھوٹے کام نہیں کر سکتے، ایسی صورتحال اور جانوروں، جانداروں اور انسانوں کی دھکم پیل اور بھیڑ میں سب چکرا کر مر جاتے۔ ہوا اپنے دونوں روپوں میں نظر نہیں آتی لیکن اتنی طاقتور ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو ہماری زندگی ہی ختم ہو جائے۔ چرند پرند شجر و حجر بھی ختم ہو جائیں۔ ایسے ہی آپ غور کریں تو ایسی نوعیت کی اور بھی کئی چیزیں موجود ہیں لیکن اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اگر آپ کھڑے ہوں اور کسی بلڈنگ یا

پلازے سے کوئی پتھر ٹوٹ کر آپ کے سر پہ لگے تو آپ کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے۔ ابھی پچھلے دنوں زلزلے نے کیا تباہی مچائی ہے، کتنے ہی لوگوں کا جانی نقصان ہو گیا۔ اس طرح سب سے سخت اور طاقتور چیز تو پتھر ہے لیکن آپ ہوا کو طاقتور گردان رہے ہیں حالانکہ نظر میں آنے والی چیز زیادہ طاقتور ہے لیکن ہم اس بات پر توجہ نہیں دیتے اور نہیں دے رہے کہ یہ پتھر، پہاڑ، چٹانیں اور زلزلے سے گرنے والے بھاری بھرکم گارڈر، ستون اور مینار جو کئی زندگیاں ختم کر دیتے ہیں اگر کششِ ثقل یا Gravity نہ ہو یہ ہماری کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور کششِ ثقل ایسی چیز ہے جو نظر نہیں آتی۔ فرض کیجیے کہ زمین میں کشش نہ ہو تو اوپر سے کتنا ہی بڑا پتھر کیوں نہ گرے وہ تو بس ڈانس کرتا ہوا ہی رہ جائے گا اور اگر آپ اس کو تھپڑ ماریں گے تو وہ ڈانس کرتا ہوا دوسری سمت چلا جائے گا کیونکہ اس میں تو کوئی جان بھی نہیں ہو گی۔ امریکہ نے افغانستان میں ڈیزی کٹر بموں کے ساتھ جتنی بمباری کی ہے اور 52بی طیاروں سے جو بڑے بڑے بم گرائے ہیں یہ سب کششِ ثقل کی بدولت ہی ممکن ہوا ہے۔ اگر زمین میں کشش نہ ہوتی تو اس وقت افغانستان کے بچے ان بموں سے فٹ بال کھیل رہے ہوتے۔ اس سے ثابت یہ ہوا کہ غیر مرئی چیز زیادہ طاقتور ہوتی ہے اور اس کی طاقت کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہوتا ہے۔ آپ روشنی کو دیکھیں یہ نظر نہیں آتی۔ یہ ہر چیز

کو منوّر ضرور کرتی ہے لیکن نظر نہیں آتی۔ بلب سے نکلنے والی روشنی اور مجھ تک پہنچنے والی روشنی یا فرش کے اوپر ہالہ بنانے والی روشنی کے درمیان جو روشنی کا سفر ہے وہ نظر نہ آنے والا ہے۔ آپ یہ سن کر بھی حیران ہوں گے کہ سورج جو اس قدر روشن سیّارہ ہے اور ہماری زندگیوں کا دارومدار اس پر ہے وہ ساری روشنی جو سورج ہمیں عطا کرتا ہے اور جو زمین پر پڑتی ہے اگر ہم سورج اور زمین کے درمیان سفر کریں اور اس حد کو عبور کر جائیں جہاں سے روشنی Reflect نہیں ہوتی تو آپ یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ سورج اور زمین کے درمیان اتنا اندھیرا ہے جس کا آپ اندازہ نہیں لگا سکتے بالکل Pitch Darkness ہے۔ جب روشنی پڑنے کے بعد منعکس ہوتی ہے تو ہم تک پہنچتی ہے۔ وہ روشنی جو ہم کو دکھائی نہیں دیتی، محسوس نہیں ہوتی جس کو ہم چھو نہیں سکتے وہ طاقت رکھتی ہے۔ اسی طرح سے گرمی کو لے لیجیئے۔ گرمی یا حدت بھی نظر نہیں آتی۔ اس کا کوئی بت نہیں، وجود یا نقشہ نہیں ہے لیکن یہ گرمی اور Heat ہے جو آپ کے کھیتوں کو پکار رہی ہے۔ پھولوں، پھلوں اور پودوں کی نشوونما کر رہی ہے لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ یہ حدت میں نے آتی ہوئی دیکھی اور چونسے آم پر پڑتی ہوئی دیکھی اور اس آم کو پکتے ہوئے دیکھا ایسے ہو نہیں سکتا۔ یہ بات ایسے ہی ہے جیسے کہ "Mind Over The Matter" کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔

ذہن کی جو ایک منڈی لگی ہے اس کی طاقت آپ کے اچھے، توانا اور خوبصورت وجود پر شدت سے حاوی ہے۔ ذہن میں غصہ، غم، چالاکی، نفرت، شدت اور خوف جو ہیں یہ ساری چیزیں بھی Invisible ہیں۔ یہ نظر نہیں آسکتیں اور نظر نہ آنے والی چیزوں نے آپ کی، میری اور ہم سب کی زندگی کا احاطہ کر رکھا ہے اور ہم کو بری طرح سے جکڑ رکھا ہے کہ ہم اس کے سامنے بے بس ہیں۔ اگر مجھے غصہ نظر آتا، نفرت کہیں سے بھی دکھائی دے جاتی تو میں اسے چھوڑ دیتا۔ اگر نفرت کی تصویر کھینچی جا سکتی تو پتہ چلتا کہ یہ کتنی بدشکل چیز ہے۔ اس کے کئی پاؤں ہوتے، گندی سی ہوتی۔ آدھی بلی اور آدھے چوہے کی صورت والی ہوتی۔ لیکن اسے ہم دیکھ یا چھو نہیں سکتے لیکن ہمارے دیکھے جانے والے وجود پر ان چیزوں کا قبضہ ہے۔ اب آپ اس بات پر تڑپتے پھرتے ہیں کہ خدا کے واسطے ہماری نفرتیں ختم ہوں، ہمارے ملک میں وہ سہولتیں آئیں جن کا اللہ سے وعدہ کیا گیا تھا کہ ہم اپنے لوگوں میں آسانیاں تقسیم کریں گے۔ وہ وعدہ پورا کرنے خدا کرے وقت آئے لیکن وہ ہماری یہ خواہش پوری اس لیے نہیں ہوتی کہ غیر مرئی چیزوں نے ہمیں پکڑ اور جکڑ رکھا ہے۔ جب آپ اپنے گھر والوں، دوستوں یا دشمنوں کے ساتھ لڑتے ہیں تو آپ اپنا غصہ یا نفرت کسی جسم رکھنے والی چیز کو صورت میں دکھا نہیں سکتے، محسوس کروا سکتے ہیں۔ آپ عموماً ایسی خبریں اخبار

میں پڑھتے ہوں گے کہ چچی کو آشنائی کے شبہ میں ٹوکے کے وار سے ہلاک کر دیا۔ ایک بندہ گھر آیا اس نے اپنے بچوں کو بھی مار دیا۔ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ مائنڈ اس پر اتنی شدت سے حملہ آور ہو رہا ہے کہ اسے اور کچھ سوجھ ہی نہیں رہا ہے اور وہ ذہن کے قبضے سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ نظر میں نہ آنے والی چیزوں نے، مجھ نظر میں آنے والے کو اور میرے ارد گرد جو دنیا آباد ہے، جو بڑی خوبصورت دنیا ہے اس پر تسلط جمار کھا ہے اور کسی کو ملنے نہیں دیتیں۔ اس نظر نہ آنے والی چیز جسے سائنسدان " Mind Over The Matter" کہتے ہیں اس نے میرے وجود پر قبضہ جمار کھا ہے۔

اخبار میں ہم اس طرح کے جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا خبریں پڑھتے ہیں۔ ان میں کوئی ٹھوس بات نہیں ہوتی۔ بس ذہن میں پیدا ہونے والی بات کی کارستانی ہوتی ہے اور ہم یہ شک یا خیال قائم کر لیتے ہیں۔ کہ یہ خرابی فلاں گروہ نے کی ہو گی اور ہم بغیر کسی دلیل، منطق یا Reason کے بمباری شروع کر دیتے ہیں جیسے افغانستان پر کی گئی۔ یہ کام ان پڑھ نہیں کرتے بلکہ پڑھے لکھے اور بہت زیادہ پڑھے لکھے لوگ کرتے ہیں۔ ایسا انفرادی طور پر بھی ہوتا ہے اور اجتماعی طور پر بھی ہوتا ہے۔ انبیا جو ہم کو تعلیم دیتے رہے یہ ایسی بات کی تعلیم دیتے رہے کہ اے اللہ کے بندو خدا کے واسطے اس پیغام کی طرف رجوع کرو جو تمہیں

غیر مرئی خدا نے دیا ہے۔ خواتین و حضرات خدا کی ذات سے زیادہ غیر مرئی چیز تو اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ حواسِ خمسہ سے بہت باہر ہے اور بہت دور ہے لیکن اگر غیر مرئی چیزیں ہی طاقتور ہو سکتی ہیں تو اللہ جس میں Invisible ہے وہ تو پھر سب سے زیادہ طاقتور ہوا نا اور وہ سب سے زیادہ طاقتور ہے بھی۔ لوگ کئی دفعہ اس بات میں الجھ جاتے ہیں کہ کیونکہ ہمیں خدا نظر نہیں آتا ہے تو اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ پرسوں اس بات پر جھگڑا بھی ہو رہا تھا اور میں ان سے بار بار یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ مت کہیے کہ چونکہ خدا ہمیں نظر نہیں آ رہا ہے، کشش ثقل دکھائی نہیں پڑ رہی ہے اور ہوا نظر نہیں آ رہی ہے تو اس کا پھر سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ آپ کے حواسِ خمسہ بہت محدود ہیں لیکن انسانی زندگیوں میں ایسے بھی بے شمار وقت آئے جب انسان پرسکون ہو کر مراقبے اور Meditation میں بیٹھا اور پھر وہ اپنے حواسِ خمسہ سے الگ ہو کر ایک اور دنیا میں داخل ہوا تو پھر اس کا کنکشن ان چیزوں سے ہوا جو غیر مرئی چیزوں کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ میں نے سنا ہے بحر الکاہل میں بہت جزیرے ہیں جہاں سے کرکٹ کھیلنے والے بھی آتے ہیں۔ ہاں یاد آیا کرکٹر لارا کے ملک ویسٹ انڈیز کے قریب ایک جزیرہ ہے۔ اس جزیرے پر لوگوں نے بڑی چاہت کے ساتھ ایک عبادت کدہ بنایا جس میں دنیا کی دھاتوں کو ملا کر ایسی گھنٹیاں بنائیں جو

نہایت سریلی اور دلکش آوازیں پیدا کرتی تھیں اور دور دور سے لوگ آکر اس عبادت کدے میں پرستش کیا کرتے تھے چاہے ان کا کسی بھی مذہب سے تعلق کیوں نہ ہوتا۔ لوگ اس سرمدی باجے کی آوازوں میں اپنے اللہ کو یاد کرتے تھے۔ پھر سنتے ہیں کہ وہ جزیرہ آہستہ آہستہ غرقِ آب ہو گیا لیکن اس کی خوبصورت گھنٹیوں کی آواز لوگوں کو سنائی دیتی بھی۔ چند سال بیشتر فرانس کا ایک صحافی اس جزیرے کی کھوج میں نکلا اور اس جزیرے کو جغرافیائی طور پر تلاش کرنے کے بعد وہاں ان گھنٹیوں کو سننے کی کوشش کرتا رہا جو پانی کے نیچے اتر چکا تھا کیونکہ لوگ کہتے تھے کہ اگر کوئی صاحبِ گوش ہو تو اسے ان گھنٹیوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ وہ صحافی لکھتا ہے کہ میں بڑی دیر تک بیٹھا رہا۔ کئی دن اور ہفتے وہاں گزارے لیکن مجھے سوائے سمندر کی آوازوں کے اور شور کے اور سمندری بگلوں کی آوازوں کے اور کچھ سنائی نہ دیا۔ اس نے سوچا کہ یہ شاید پرانی کہانیوں میں سے ایک کہانی ہے چنانچہ وہ جانے سے بیشتر آخری بار اس مقام کو سلام کرنے کی غرض سے گیا۔ وہ وہاں بیٹھا اور اس نے افسوس کا اظہار کیا کہ میں اتنی دور، ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے یہاں آیا اور اتنے دن یہاں گزارے لیکن وہ گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا جس کی آرزو لے کر وہ چلا تھا۔ وہ انتہائی دکھ کی کیفیت میں وہاں بیٹھا رہا۔ وہ کہتا ہے کہ میں وہاں مایوسی کی حالت میں لیٹ گیا اور

اس نے اپنے پاؤں گھٹنوں تک ریت میں دبا لیے تو اسے گھنٹیوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ ایسی آواز جو اس نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور وہ صدائیں اور ہوائیں جو پہلے اسے سنائی دے رہی تھیں ایک دم سے خاموش ہو گئیں اور ان گھنٹیوں کی آوازیں صاف سنائی دینے لگیں۔ وہ نظر نہ آنے والی آوازیں پانی کے اندر سے آنے لگیں۔ وہ صحافی کہتا ہے کہ جتنی دیر میرا دل چاہا میں وہ سریلی اور مدھر آوازیں سنتا رہا اور میں اب اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر صدیوں پہلے ڈوبے ہوئے عبادت کدے کی گھنٹیوں کی آواز سننی ہے تو سمندر کا شور سننا ہو گا اور اگر اپنے اللہ سے ملنا ہے تو اس کی مخلوق کو سننا ہو گا۔ یہی ایک راستہ ہے کیونکہ اللہ نظر نہ آنے والا ہے جبکہ اس کی مخلوق نظر آنے والی ہے۔ اگر آپ اس کی مخلوق کے ساتھ رابطہ قائم کریں گے تو بڑی آسانی کے ساتھ وہ سڑک مل جائے گی جو گھنٹیوں والے عبادت کدے سے ہو کر ذاتِ خداوندی تک پہنچتی ہے۔ آج ہماری گفتگو میں یہ بات معلوم ہوئی کہ نظر نہ آنے والی چیز، نظر آنے والی چیز سے زیادہ طاقتور اور قوی ہوتی ہے اور یہ نظر نہ آنے والی ساری صفات ہمارے گوشت پوست کے انسان پر اور ہماری زندگی پر کس طرح سے حاوی ہیں اسے ہم تنہا بیٹھ کر بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں اور ان چیزوں نے ہمیں

اذیت میں ڈال رکھا ہے اور یہ ہماری اچھی سی زندگی کا "ماسٹر" بن کر بیٹھی ہوتی ہیں۔

میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین۔

اللہ حافظ

من کی آلودگی

آج سے چند روز بیشتر ہم Pollution کی بات کر رہے تھے اور ہمارا کہنا تھا کہ ساری دنیا آلودگی میں مستغرق ہے اور یہ آلودگی نہ صرف انسانی زندگی بلکہ شجر و حجر اور حیوانات کو بھی کھائے چلی جارہی ہے۔ اس کے دور رس نقصانات ہیں اور اس کے خاتمے کی طرف خصوصی توجہ دی جانی چاہیے۔

جب ہم اس گفتگو میں بحیثیت ایک قاری یا ناظر کے شریک تھے تو مجھے خیال آیا کہ انسانی زندگی میں دو متوازی لہریں ایک ساتھ چلتی ہیں۔ ایک تو ہماری اپنی زندگی ہوتی ہے۔ اور ایک زندگی کا نامعلوم حصہ ہوتا ہے۔ اس حصے کو ہم گو جانتے نہیں ہیں لیکن محسوس ضرور کرتے ہیں۔ یہ حصہ ہماری زندگی کی اس لہر کے بالکل ساتھ ساتھ چل رہا ہوتا ہے جو اس دنیا سے تعلق رکھتی ہے۔ اس وقت مجھے اپنے بابوں کا خیال آیا جن کا میں اکثر ذکر کرتا رہتا ہوں کہ وہ بابے Pollution کے بارے میں خاصے محتاط ہوتے ہیں اور انہیں اس بات کی بڑی فکر رہتی ہے کہ کسی بھی صورت میں آلودگی نہ ہونے پائے اور وہ اس حوالے سے خاص اہتمام کرتے۔ یہ International

Pollution Campaign سے پہلے کی بات ہے جب ڈیروں پر ایک ایسا وقت بھی آتا تھا کہ ڈیرے کا بابا اور اس کے خلیفے آلودگی کے خلاف اپنے آپ کو باقاعدہ اور بطورِ خاص اہتمام میں مصروف رکھتے اور آنے جانے والوں کو اس آلودگی بابت آگاہ کرتے تھے جو انسان کی اندرونی زندگی سے تعلق رکھتی ہے۔ ان بابوں کا باہر کی Pollution سے زیادہ تعلق نہیں ہوتا۔ ان بابوں کا خیال ہے کہ جب تک انسان کے اندر کی آلودگی دور نہیں ہوگی باہر کی آلودگی سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل ہے۔ جب تک انسان کے اندر کی معیشت ٹھیک نہیں ہوگی چاہے باہر سے جتنے بھی قرضے لیتے رہیں باہر کی معاشی حالت درست نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اندر کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ ان بابوں کا یہ خیال تھا جو بڑا جائز خیال تھا کہ ہماری بہت سی بیماریاں ہماری اندرونی آلودگی سے پیدا ہوتی ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ دل کے قریب ایک بہت بڑا طاقچہ ہے اور اس طاقچے کے اندر بہت گہرے گہرے دراز ہیں۔ ان درازوں کو نکال کر اوندھا کر کے صاف کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ان عرصہ دراز سے جالے لگے ہوئے ہیں۔ تو کہیں چوہے کی مینگنیاں پڑی ہیں اور طرح کی خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ آپ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے دل کے والو (Volve) بند ہو رہے ہیں اور ظاہر کی زندگی میں یہی تصور ابھرتا ہے۔ دل کی نالیاں بند ہو جانے کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ اس کے اردوگرد آلودگی جمع ہو چکی ہوتی ہے اور خطرناک حد تک جمع ہو جاتی ہے اور انسان کو اس کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ انسان

خود کو چنگا بھلا اور ٹھیک ٹھاک خیال کرتا ہے لیکن دل کے قریب آلودگی بڑھتی چلی جاتی ہے۔

خواتین و حضرات! دل کی آلودگی جاننے کے لیے تو ایک اور طرح سے جھانکنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں نگاہ ڈالنے کے لیے ایک زاویہ نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان بابوں کا خیال ہے کہ نفرت کی وجہ سے ہیپاٹائٹس بی پھیلتی ہے۔ اس بیماری کا سبب شدید نفرت ہے۔ پہلے یہ بیماری اتنی زیادہ نہیں تھی ایک وہ زمانہ تھا جب پاکستان نیا نیا بنا تھا اور ہم اس وقت نوجوان تھے۔ ہم تب خوشی کے ساتھ گھومتے پھرتے تھے اور جب ہمیں کوئی کار بڑی خوب صورت لگتی تو اس کو ہاتھ لگاتے تھے اور بڑے خوش ہوتے تھے۔ ہم نے مال روڈ پر کتنی ہی خوب صورت کاروں کو ہاتھ لگایا۔ ہمیں تب یہ معلوم بھی نہ تھا کہ Jealous بھی ہوا جاتا ہے۔ اب برداشت نہیں ہوتا۔ اب یہ کیفیت ہے کہ اب والد بیٹے اور بیٹا والد سے حسد کرتا ہے۔ رستم سہراب کی طاقت شہرت اور اس کی ناموری سے حاسد ہوتا تھا اور دونوں کا آپس میں ٹکراؤ بھی ہوتا تھا اور سہراب اپنے سگے بیٹے رستم کو قتل بھی کرتا ہے۔ آدمی کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ اس کی شدید نفرت خود اسے ہی کھائے جارہی ہوتی ہے۔ گو اس نے اوپر عجیب طرح کا خول بدنیتی سے نہیں چڑھایا ہوتا ہے بلکہ معاشرتی تقاضوں کی بدولت ہی ایک خول اس پر چڑھ جاتا ہے۔ بہت بڑے آرٹسٹ خدا بخشے زوبی ہوتے تھے۔

ان سے ایک دفعہ ایک بلوچ جاگیر دار نے تصویر بنوائی۔ جب ان جاگیر دار صاحب کی خدمت میں وہ تصویر پیش کی گئی تو انہوں نے کہا کہ اس میں تو میری شکل ہی نہیں ملتی۔ یہ تصویر میری لگتی ہی نہیں ہے۔ وہاں ان کے جو پندرہ بیس حواری بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے بھی کہا کہ "جی سائیں یہ شکل تو آپ سے ملتی ہی نہیں ہے۔" اب وہ آرٹسٹ بڑے شرمندہ ہوئے اور ان کی طبیعت پر بڑا بوجھ پڑا۔ وہ تصویر واپس لے آئے۔ کراچی میں ان دنوں ان کے فن پاروں کی نمائش ہوئی تو انہوں نے اس نمائش میں اسی تصویر کے نیچے جاگیر دار کا نام مٹا کر "چور" لکھ دیا۔ اب ان صاحب کو بھی اس بات کی خبر پہنچی وہ اپنا موزر یا تلوار لے کر وہاں سے بھاگے اور انہوں نے بھی آکر وہ تصویر دیکھ جس کے نیچے "چور" لکھا ہوا تھا۔ وہ پھر سخت لہجے میں آرٹسٹ سے گویا ہوئے اور کہا کہ تمہیں ایسی حرکت کرنے کی جرات کیسے ہوئی۔ آرٹسٹ نے کہا کہ "یہ آپ کی تصویر نہیں ہے اور آپ نے خود ہی کہا تھا کہ میری اس تصویر سے شکل نہیں ملتی اور آپ کے حواریوں نے بھی یہی کہا تھا کہ حضور یہ آپ کی تصویر نہیں ہے۔ آپ نہ میرے اوپر کوئی کلیم کر سکتے ہیں اور نہ کوئی مقدمہ کر سکتے ہیں۔ جاگیر دار صاحب کہنے لگے کہ پکڑو پیسے اور یہ تصویر میرے حوالے کرو اور بتیس ہزار روپے دے کر بغل میں اپنی تصویر مار کر چلے گئے۔"

خواتین و حضرات! انسان کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ چور ہے یا سعد ہے۔ نیک ہے یا بد ہے۔ وہ چاہے جتنی بھی کوشش کرنے اس پر اپنی اصلیت ظاہر نہیں ہوتی کیونکہ اس کے پاس مراقبے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ اپنے آپ کو Face کرنے کے بعد ہی خوبیاں عیاں ہوں گی اور انسان اپنی خرابیاں دور کر سکے گا۔ جب آپ کو پتہ چلتا ہے کہ میرے چہرے پر ایک پھنسی ہو گئی ہے تو وہ آپ کو ڈسٹرب کرتی ہے لیکن جب وجود کے اندر، روح کے اندر کوئی بیماری آ جاتی ہے تو پھر اس کا علم نہیں ہوتا۔ ہماری آپا صالح کہا کرتی تھیں (خدا بخشے انہیں) کہ اشفاق اللہ نے یہ جو کائنات بنائی ہے اس میں ہر طرح انسان ہیں۔ جھوٹے، بے ایمان، دغاباز، سچے، چور، معصوم، نیک بھولے صوفی درویش مکار ہر طرح کے انسان پائے جاتے ہیں اور پھر وہ لمبی فہرست گنوا کر کہتیں کہ خدا کا شکر ہے کہ ان تمام انسانوں میں سے نہیں ہوں۔ خواتین و حضرات انہیں یہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ انہوں نے جتنی قسمیں گنوائی ہیں وہ ان میں سے باہر جا ہی نہیں سکتیں۔ ہمارے بابے ایک بات پر بڑا زور دیا کرتے تھے۔ ان کا فرمان تھا کہ آپ نے دل کے دراز کے مختلف کونوں میں جو گلدستے پھینکے ہوئے ہیں، جو عقیدت کے گلدستے میں انہیں نکال کر باہر پھینکو کیونکہ ان کی بدبو بڑی شدید ہوتی ہے۔ آپ لوگوں کو پتہ ہے کہ جب گلدستہ پانی میں کافی دیر تک پڑا رہ تو پھر اس کے اندر سے بدبُو پیدا ہو جاتی ہے اور وہ بدبُو سنبھالی نہیں جاتی ہے۔

بابے کہتے تھے کہ ان بوسیدہ گُلدستوں کو نکال کے پھینکنا بہت ضروری ہے۔ اب ہم ان سے جھگڑا کرتے کہ باباجی عقیدت کے گُلدستوں کو کیسے اور کیونکر دل سے باہر نکال پھینکا جائے۔ انہوں نے کہا کہ دیکھو جن گُلدستوں کو تروتازہ رہنا چاہیے تھا وہ آپ کے وجود کے اندر پڑے ہوئے تروتازہ نہیں رہے ہیں اور پڑے پڑے بدبودار ہوگئے ہیں۔ وہ اس قدر بدبودار ہوگئے ہیں لیکن زیادہ دیر پڑے رہنے کے باعث آپ کو ان گُلدستوں یا بدبُو سے محبت اور عقیدت ہوگئی ہے اور آپ انہیں باہر پھینکتے ہیں۔ جوں جوں آپ کی بیرونی زندگی میں Mouth Washes بنتے جائیں گے اور غرارے کرنے کی جتنی بھی دوائیں بنتی جائیں گی یہ اندر کی بدبُو کو ختم نہیں کرسکتیں۔ اب کئی ملٹی نیشنل کمپنیاں منہ میں خوشبو پیدا کرنے کے لیے ادویات بنا کر ہمیں دے رہی ہیں اور کروڑوں روپے اکٹھے کررہی ہیں لیکن ان ادویات کے استعمال کے باوجود اندر سے بدبُو کے ایسے ''بھبکے'' اور ''بھبھاکے'' نکلتے ہیں کہ یہ چیزیں اسے کنٹرول ہی نہیں کرسکتیں، حالانکہ خدا نے انسانی جسم بہترین ساخت پر بنایا ہے۔ یہ نہا دھو کر صاف ہوکر اچھا ہوجاتا ہے لیکن اب اندر کی بدبُو نہیں جاتی ہے۔ ہم باباجی سے پوچھتے کہ جناب یہ کس قسم کی عقیدت کا گلدستہ ہے۔ فرمانے لگے کہ مثال کے طور پر تم نے ایک گلدستہ بڑا سجایا ہوا تھا۔ اور اس گلدستے کا نام ''مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں'' رکھا ہوا تھا۔ اب وہ گل سڑ گیا ہے، آپ نے اس بات کو تسلیم نہیں کیا کہ مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ بلکہ اسے صرف دکھانے کے لیے گلدستے کے طور پر رکھا تھا اور اسے

ایسے ہی رکھ کر گلنے سڑنے دیا ہے۔ آپ نے ایک گلدستہ ”لوگوں کے ساتھ اچھی بات کرو“ بھی رکھا تھا۔ اب وہ بھی پڑا پڑا بدبودار ہو گیا ہے۔ آپ نے عدل وانصاف کے گلدستے کو بھی خراب کر دیا ہے۔ انسان نے عدل سے منہ موڑ لیا ہے حالانکہ انسان اور خاص کر مسلمانوں کے سارے نظام کی عدل پر بنیاد ہے۔ ہمیں ہر جگہ عدل کا حکم ہے۔ آپ کسی کی شکل سے نفرت کرتے ہوئے کسی کو انصاف کی فراہمی روکنے کے مجاز نہیں ہیں۔ اسلام کہتا ہے کہ تم کسی سے محبت نہ کرو۔ اس پر کوئی مواخذہ نہیں لیکن بے انصافی اور عدل نہ کرنے پر مواخذہ لازم ہے۔ ان گُلدستوں کو تر و تازہ کرنے کے لیے باقاعدہ ایک عمل کرنا پڑتا تھا اور باباجی کے پاس بہت دیر تک رہنا پڑتا تھا۔ کچھ راتیں بسر کرنا پڑتی تھیں۔ کچھ ایسے محلول بھی پینے پڑتے تھے۔ آپ کو بتاؤں کہ گاؤزبان اور ایک الائچی اس وقت کھانے کو دی جاتی جب نماز تہجد کا وقت شروع ہوتا اور اس کا ایک مفرح قسم کا قہوہ پینے کو ملتا۔ ہمیں ڈیرے پر ایک خوشبودار دوا اسطخدوس کی چائے پلائی جاتی۔ اس کو دماغ کے جالے صاف کرنے والی دوا کہا جاتا تھا۔ سیانوں کا کہنا ہے کہ میوزک کی دھن بنانا سب سے مشکل کام ہے۔ اس میں سب سے مشکل بات یہ ہے کہ یہ ہمارے ہاں لکھا بھی نہیں جاتا۔ میں نے ایک چھوٹے درجے کا رائٹر ہوں جو بھی لکھتا ہوں پڑھ سکتا ہوں اور اسے بار بار پڑھ سکتا ہوں لیکن دھن بنانے والا میری طرح پچھلی دھن کو کاغذ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ بات رہنی ضروری ہوتی ہے کہ وہ کہاں سے چلا تھا اور اسے

پہلی دھن کو دوسری تیسری یا آخری کے ساتھ کس طرح سے جوڑنا ہے۔ ویسے تو اللہ نے آپ کو بہت اچھا اور خوب صورت ذہن دیا ہے۔ اس میں آلودگی نہیں ہے لیکن اگر آپ کا دل چاہے کہ آپ اندر کی صفائی کریں اور اس عمل میں سے گزریں تو آپ کا ایک بہت بڑی مشکل پیش آئے گی اور آپ کو لگے لگا کہ صفائی ہو رہی ہے لیکن ایسا نہیں ہو رہا ہو گا بلکہ صفائی عمل میں ذرا سی کوتاہی سے اس میں اور آلودگی شامل ہو جائے گی۔

انسانی زندگی میں عجیب عجیب طرح کی کمزوریاں آتی ہیں اور آدمی ان میں پھنسا رہتا ہے اور جب وہ اپنی اندرونی طہارت چاہتا بھی ہے اور پاکیزگی کا آرزو مند بھی ہوتا ہے۔ تو بھی اس سے کوئی نہ کوئی ایسی کوتاہی سرزد ہو جاتی ہے کہ وہ بجائے صفائی کے مزید زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں اور میرا پیغام All Over the World کے لیے ہے کہ جب تک اندر کی صفائی نہیں ہو گی اس وقت تک باہر کی آلودگی دور نہیں ہو سکتی ہے۔ آپ روز شکایت کرتے ہیں اور آپ آئے روز Letter to the Editor لکھتے ہیں کہ جی دیکھیں ہمارے گھر کے آگے گندگی پڑی ہوئی ہے یا ہمارے محلے میں گندگی ہے اور دل سے یہ آپ کی آرزو نہیں ہوتی کہ صفائی ہو۔ آپ نے اپنے اندر ابھی تک یہ طے ہی نہیں کیا کہ آپ نے اب صفائی کرنی ہے۔ یہ بات اس وقت طے ہو گی جب آپ کو پاکیزگی اور صفائی سے محبت ہو گی اور

آپ نقلی خوشبوؤں کے سہارے زندگی بسر کرنے کی بجائے اندر کی آلودگی ختم کر دینے کا نہ سوچیں۔ آپ نے بہت سنا ہو گا کہ پاکیزہ لوگوں کے بدن کی خوشبو ایسی مفرح اور مسحور کن ہوتی ہے کہ ان کے قریب بیٹھنے سے بہت ساری آلودگیاں دور ہو جاتی ہیں چاہے انہوں نے کوئی خوشبو عطر نہ لگایا ہو۔

آپ بابوں کا طریقہ کار اختیار کریں یا نہ کریں یہ آپ کی اپنی مرضی ہے لیکن انہوں نے روح کی صفائی کے لیے جو ترکیبیں بنائی ہوئی ہیں ان کو آپ اپنا سکتے ہیں اور ان کو اپنائے جانے کے بعد لوگوں کو بڑی آسانیاں عطا کی جا سکتی ہیں اور پی ٹی وی کی طرف سے ہر ہفتے ایک ہی دعا ہوتی ہے کہ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

ان پڑھ سقراط

میں کب سے آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں اور آپ کے ارشاد کے مطابق وہی گن گاتا رہا ہوں جن کی آپ کو ضرورت تھی۔ آج میں آپ سے ایک اجازت مانگنے کی جرات کر رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ مجھے اس بات کی اجازت دیجیے کہ میں دبی زبان کی بجائے اونچی آواز میں کہ کہہ سکوں کہ جو انسان ان پڑھ ہوتا ہے اس کے پاس بھی اچھا اور ہائیپو تھیلمس دماغ ہوتا ہے۔ وہ بھی سوچ سکتا ہے، وہ بھی سوچتا ہے۔ وہ بھی فاضل ہوتا ہے اور ہنر مند ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں اور خاص طور پر ہمارے علاقے میں یہ بات بہت عام ہو گئی ہے کہ صرف پڑھا لکھا آدمی ہی لائق ہوتا ہے اور جو "پینڈو" آدمی ہے اور انگوٹھا چھاپ ہے اس کو اللہ نے دانش ہی نہیں دی ہے۔ اس سوچ نے ہماری زندگیوں میں ایک بہت بڑا رخنہ پیدا کر دیا ہے اور ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے ہیں۔ ہمیں سیاسی، سماجی اور نفسیاتی طور پر بڑی شدت کا نقصان پہنچ رہا ہے جبکہ دوسرے ملکوں والے اپنی اجتماعی زندگی میں اس نقصان کے متاثرہ نہیں ہیں۔ ہماری چودہ

کروڑ کی اتنی بڑی کمیونٹی ہے۔ اس کو ہم نے ایک طرف رکھا ہوا ہے اور میں آپ اور ہم سب جو سمجھدار لوگ ہیں جن کی تعداد زیادہ سے زیادہ دو لاکھ بنتی ہے ہم نے سارا حساب و کتاب سنبھال کے رکھا ہوا ہے اس اصل میں ہم ہی اس ملک کے آقا اور حکمران بنے بیٹھے ہیں۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں اور دست بستہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ لوگ بھی ہمارے ساتھی ہیں۔ پنکچر لگانے والا، سائن بورڈ لگانے والا، بڑھئی، ترکھان بھی اپنے اندر ایک ہنر رکھتا ہے۔ اگر ہم اس کو سلام نہ کر سکیں تو کم از کم ان کے لیے دل میں یہ احترام تو رکھیں کہ یہ ویلڈر جس نے کالے رنگ کی عینک پہن رکھی ہے اور ٹانکا لگا رہا ہے وہ بھی تقریباً اتنا ہی علم رکھتا ہے جتنا ہارٹ سرجن یا بائی پاس کرنے والے کا علم ہوتا ہے لیکن ہم نے ایسے ہنر مندوں کو ایک طرف رکھا ہوا ہے۔

میں 1971ء کے انتخابات میں ایک جگہ پر ریٹرننگ آفیسر تھا۔ ہم جلدی جلدی ووٹ ڈلوا رہے تھے وہاں ایک بابا آیا جس نے ریڑھی بنوائی ہوئی تھی۔ وہ معذور تھا اور اس ریڑھی کے ذریعے حرکت کرتا تھا۔ وہ آ کے کہنے لگا کہ جی میں ”تلوار نوں ووٹ پانا اے۔“

میں نے کہا کہ بابا جی بسم اللہ تو جہاں کہے گا مہر لگا دیں گے لیکن رش زیادہ ہے تھوڑا انتظار کر لو لیکن اس نے کہا کہ نہیں جی میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ وہاں میرے اسسٹنٹ کہنے لگے کہ جی اس کا ابھی ووٹ دلوا دیں۔ میں نے اسکی خوشنودی کے لیے کہا کہ بابا آپ کے ریڑھی بڑے کمال کی ہے یہ تو نے کہاں سے لی۔

کہنے لگا یہ میں نے خود بنائی ہے۔ پہلے جو بنائی تھی اس کو میں نے بچوں والی سائیکل کے پہیے لگائے تو وہ پکے پر خوب دوڑتی لیکن کچے میں وہ پھنس جاتی تھی۔ پھر میں نے لکڑی کے موٹے پہیے لگائے تو وہ کچے میں اچھے چلتے تھے اور پکے میں یا سڑک پر بہت شور مچاتے تھے پھر میں نے بیرنگ لگا دیئے۔ بس ہر ہفتے مٹی کا تیل ڈال کر صاف کرنے پڑتے ہیں۔ (دیکھئے کہ وہ بابا چٹا ان پڑھ تھا) میں نے اس سے کہا کہ بابا یہ تو نے کیسے بنائی۔ وہ کہنے لگا کہ جی میں نے سوچ سوچ کے بنالی۔

میں نے جب اس سے بار بار پوچھا کہ کیا تو نے یہ خود ہی بغیر کسی کی مدد کے بنالی تو وہ بابا کہنے لگا "بابا جی تہانوں میرے تے شک کیوں ہو رہیا اے، ویکھو نہ جی اگر بندہ پڑھیا لکھیا نہ ہووے تے فیر دماغ توں ای کم لینا پیندا اے نا۔"

اس واقعہ کے بعد میں دیکھتا کہ لوگ کیسی کیسی مہارتیں رکھتے ہیں اور عام بغیر ڈگری ہنر مند کتنے ذہین ہیں۔ میں نے نوٹ کیا کہ ان عام ہنر مندوں کا اندازِ فکر بھی برٹنڈر رسل یا سقراط ہی کی طرح کا ہوتا ہے اور یہ کسی آئن سٹائن سے کم نہیں ہیں۔ یہ بھی انگوٹھا چھاپ ہوتے ہیں اور نئ سے نئ ایجادیں کر ڈالتے ہیں۔ یہ زیادہ الفاظ نہیں جانتے ہوں گے لیکن ان کا دماغ عام پڑھے لکھے دماغوں کی طرح سے ہی کام کرتا ہے۔

ایک قصبہ موڑ کھنڈا ہے۔ وہ بڑا پیارا علاقہ ہے۔ اس میں کافی جھگڑے وگڑے اور لڑائیاں بھی ہوتی ہیں، وہاں ایک کسان تھا اور اس کا بیٹا میرا واقف تھا۔ وہ ایم بی بی ایس کا طالب علم تھا اور فائنل ائیر میں تھا۔ گاؤں میں اس کا باپ حقہ پی رہا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ اشفاق صاحب میرے بیٹے کو علم دیں جی۔ میں نے کہا کہ کیوں کیا ہوا۔ بہت اچھا علم حاصل کر رہا ہے۔ اس سے اعلیٰ علم تو اور کوئی ہوتا ہی نہیں۔

وہ اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے کہنے لگا کہ تو اشفاق صاحب کو بتا۔

وہ لڑکا کہنے لگا کہ جی میں ہارٹ سپیشلسٹ بننا چاہتا ہوں۔

اس کا باپ پھر کہنے لگا کہ ” بے وقوف ایک بندے وچ اک دل ہوندا اے، اوہندا علاج کر کے انہوں ٹور دیں گا فیر کسے آونائیں، تو دنداں دا علم پڑھ۔ بتی ہوندے نیں کدے نہ کدے کوئی نہ کوئی تے خراب ہوئے گا۔ ایس طرح بتی واری اک بندہ تیرے کول آئے گا۔“

خواتین و حضرات! سقراط کسی سکول سے باقاعدہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ کسی کالج، سکول یا یونیورسٹی کا اس نے منہ نہیں دیکھا تھا۔ آپ کے حساب سے جو ان پڑھ لوگ ہیں وہ Experiment بھی کرتے ہیں۔ ایک حیران کن بات ہے اور آپ یقین نہیں کریں گے۔ میں جہاں جمعہ پڑھنے جاتا ہوں وہاں ایک مولوی صاحب ہیں۔ اب جو مولوی صاحب ہوتے ہیں ان کی اپنی ایک سوچ ہوتی ہے۔ انہیں سمجھنے کے لیے کسی اور طرح سے دیکھنا پڑتا ہے اور جب آپ ان کی سوچ کو سمجھ جائیں تو پھر آپ کو ان سے علم ملنے لگتا ہے۔

وہ نماز سے پہلے تمام صفوں کے درمیان ایک چار کونوں والا کپڑا پھراتے ہیں جس میں لوگ حسبِ توفیق یا حسبِ تمنا کچھ پیسے ڈال دیتے ہیں۔ اس مرتبہ بڑی عید سے پہلے جو جمعہ تھا اس میں بھی وہ چوخانوں والا کپڑا پھرایا گیا اور جو اعلان کیا وہ سن کر میں حیران رہ گیا۔ وہ اس طرح سے تھا دوحہ قطر سے کوئی صاحب آئے

تھے۔ انہوں نے مجھے پانچ ہزار روپے دیئے ہیں۔ میں نے وہ پیسے دو تین دن رکھے اور پھر میں نے اس روپوں کو سو سو اور پچاس پچاس کے نوٹوں میں Convert کروایا جنہیں اب میں یہاں لے آیا ہوں جو اس چو کونوں والے کپڑے میں ہیں۔ عید قریب ہے ہم سارے کے سارے لوگ صاحبِ حیثیت نہیں ہیں اور جس بھائی کو بھی ضرورت ہو وہ اس کپڑے میں سے اپنی مرضی کے مطابق نکال لے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم پڑھتے ہیں کہ "دس دنیا ستر آخرت۔"

آخر دینے سے کچھ فائدہ ہی ہوتا ہے جا! شاید وہ یہ ٹیسٹ کرنا چاہتا تھا کہ یہ بات جو لکھی ہوئی ہے یہ واقعی درست ہے یا پھر ایسے ہی چلتی چلی آرہی ہے۔ میں نے دیکھا کہ اس کپڑے میں سے کچھ لوگوں نے روپے لیے۔ ایک نے پچاس کا نوٹ لیا۔ ایک اور شخص نے سو کا نوٹ لیا۔ کچھ ڈالنے والوں نے اس کپڑے میں اپنی طرف سے بھی نوٹ ڈالے۔ اگلے دن میں مولوی صاحب سے ملا اور ان سے کہا کہ گزشتہ روز آپ کا عجیب و غریب تجربہ تھا۔ ہم نے تو ایسا آج تک دیکھا نہ سنا۔ تو وہ کہنے لگا کہ جناب جب میں نے آخر میں اس رومال یا کپڑے کو کھول کر دیکھا اور گنا تو پونے چھ ہزار روپے تھے۔ اب یہ بات میرے جیسے "پڑھے لکھے" آدمی کے ذہن میں یا "دانش مند" آدمی کے ذہن میں نہیں آئی۔ ایک ان پڑھ کبھی

کبھی ایسے ماحول یا تجربے سے گزرتا ہے اور پھر ایک ایسا نتیجہ اخذ کرتا ہے جو مجھ کتاب والے کو کبھی نہیں ملا۔

لاہور اور شیخوپورہ روڈ پر کئی ایک کارخانے ہیں۔ ایک بار مجھے وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ جب میں وہاں کام کر کے فارغ ہونے کے بعد لوٹا اور گاڑی سٹارٹ کرنے لگے تو وہ سٹارٹ نہ ہو۔ خیر میں نے ڈرائیور سے کہا کہ تم اپنی Effort جاری رکھو مجھے جلدی واپس جانا ہے لہٰذا میں بس پر چلا جاتا ہوں تم بعد میں آجانا۔ جب میں بس میں بیٹھا تو اور وہاں سواریاں بھی تھیں۔ ایک نیند میں ڈوبا ہوا نوجوان بھی تھا جس کی گودی میں ایک خالی پنجرہ تھا جیسے کبوتر یا طوطے کا پنجرہ ہوتا ہے۔ وہ نوجوان اس پنجرے پر دونوں ہاتھ رکھے اونگھ رہا تھا۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو میرے اندر کا تجسس جاگا اور میں نے اس سے بات کرنا چاہی۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ خالی پنجرہ تم گود میں رکھ کے بیٹھے ہو۔ وہ کہنے لگا کہ سر یہ پنجرہ کبھی خالی ہوتا ہے اور کبھی کبھی بھرا ہوا بھی ہوتا ہے۔ وہ کہنے لگا کہ اس میں میرا کبوتر ہوتا ہے جو اس وقت اپنی ڈیوٹی پر گیا ہوا ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ یہاں کھاد فیکٹری میں خرادیہ ہے اور ویلڈنگ کا کام بھی جانتا ہے اور چھوٹا موٹا الیکٹریشن کا کام بھی سمجھتا ہے۔ اس نے کہا کہ مجھے ہر روز اوور ٹائم لگانا پڑتا ہے اور میں پانچ بجے چھٹی کے وقت پھر گھر نہیں جا سکتا اور گھر پر فون ہے نہیں جس پر بتا سکوں

کہ لیٹ آؤں گا لہٰذا میں نے اپنا یہ کبوتر پالا ہوا ہے۔ اس کو میں ساتھ لے آتا ہوں۔ جس دن میں نے اوور ٹائم لگانا ہوتا ہے اس دن میں اور میرا کبوتر اکٹھے رہتے ہیں اور میری بیوی کو پتہ چل جاتا ہے کہ ہم آج رات گھر نہیں آئیں گے لیکن جس دن اوور ٹائم نہیں لگانا ہوتا تو میں کبوتر چھوڑ دیتا ہوں۔ وہ پھڑ پھڑاتا ہوا اڑتا ہے اور سیدھا میری بیوی کے جھولی میں جا پڑتا ہے اور وہ قاصد کا کام کرتا ہے اور اسے پتہ چل جاتا ہے کہ آج اس کے خاوند نے گھر آنا ہے اور وہ کھانے پینے کا اہتمام کر دیتی ہے اور اس نے جو بھی مٹر قیمہ بنانا ہوتا ہے تیار کر دیتی ہے اور آج بھی کبوتر اپنی ڈیوٹی پر ہے۔ وہ کہنے لگا کہ صاحب میں پڑھا لکھا تو ہوں نہیں۔ میری چھوٹی سی عقل ہے۔ وہ میرا کبوتر گھر پہنچ چکا ہو گا۔ خواتین و حضرات پہلے تو مجھے اس پر بڑا تعجب ہوا کہ اس نے یہ بات سوچی کیسے؟

سوچی جانے والی بات کے حوالے سے حفیظ کا ایک بڑا کمال کا شعر ہے:

لب پہ آتی ہے بات دل سے 'حفیظ'

دل میں جانے کہاں سے آتی ہے

دل میں بات اس منبع سے آتی ہے جہاں سے سب کو علم عطا ہوتا ہے۔ یہ ان لوگوں کو بھی عطا ہوتا ہے جن کے پاس یونیورسٹی کی ڈگری نہیں ہوتی لیکن خدا کی طرف سے حصے کے مطابق ان کو علم عطا ہوتا رہتا ہے۔ وہ پنجرے والا کسی کے پیچھے نہیں گیا، کسی کا محتاج نہیں، کسی کی منت سماجت نہیں کی لیکن اس نے اپنی سوچ سے کبوتر کو پڑھایا، سمجھایا اور قاصد کا کام لیا۔

میرے پاس ولایت اور یہاں کی بے شمار ڈگریاں ہیں لیکن اس سب علم اور ڈگریوں کے باوصف میرے پاس وہ کچھ نہیں ہے جو ایک پینیڈو مالی کے پاس ہوتا ہے۔ یہ اللہ کی عطا ہے۔ بڑی دیر کی بات ہے ہم سمن آباد میں رہتے تھے۔ میرا پہلا بچہ جو نہایت ہی پیارا ہوتا ہے وہ میری گود میں تھا۔ وہاں ایک ڈونگی گراؤنڈ ہے جہاں پاس ہی صوفی غلام مصطفیٰ تبسم رہا کرتے تھے۔ میں اس گراؤنڈ میں بیٹھا تھا اور مالی لوگ کچھ کام کر رہے تھے۔ ایک مالی میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ ماشاء اللہ بہت پیارا بچہ ہے۔ اللہ اس کی عمر دراز کرے۔ وہ کہنے لگا کہ جی میرا چھوٹے سے جو بڑا بیٹا ہے وہ بھی تقریباً ایسا ہی ہے۔ میں نے کہا ماشاء اللہ اس حساب سے تو ہم قریبی رشتہ دار ہوئے۔ وہ کہنے لگا کہ میرے آٹھ بچے ہیں۔ میں اس زمانے میں ریڈیو میں ملازم تھا اور ہم فیملی پلاننگ کے حوالے سے پروگرام کرتے تھے۔ جب اس نے آٹھ بچوں کا ذکر کیا تو میں نے کہا کہ اللہ ان

سب کو سلامت رکھے لیکن میں اپنی محبت آٹھ بچوں میں تقسیم کرنے پر تیار نہیں ہوں۔ وہ مسکرایا اور میری طرف چہرہ کر کے کہنے لگا" صاحب جی محبّت تقسیم نہیں کیا کرتے۔ محبت کو ضرب دیا کرتے ہیں۔"

وہ بالکل ان پڑھ آدمی تھا اور اس کی جب سے کہی ہوئی بات اب تک میرے دل میں ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ واقعی یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی کے پاس کی ہنر یا عقل کی ڈگری ہو۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ سوچ و فکر کا ڈپلومہ حاصل کیا جائے۔

ہم نے تعلیم یافتہ اور ان پڑھ کے الگ الگ درجے بنا لیے ہیں اب بد قسمتی سے تعلیم میں بھی مسئلے پیدا ہو گئے ہیں اور تعلیم یافتہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ کا چکر شروع ہو گیا ہے۔ ایک بڑے اور ایک کمتر سکول کی باتیں ہونے لگی ہیں۔ پچھلے دنوں ایک مہندی کا پروگرام تھا میں بھی وہاں تھا۔ تو لڑکیاں ناچتی واچتی رہیں اور سخت ہنگامہ رہا۔ وہاں پانچ چھ لڑکیاں تھیں۔ وہ میرے ساتھ بات کرنے لگیں۔

انہیں آرزو تھی مجھ سے بات کرنے کی۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو میرے پاس آ گئیں۔ جب وہ مجھ سے بات کر رہی تھیں تو میرے پوتی چیل کی طرح میرے

اوپر جھپٹی اور کہا کہ دادا یہ آپ کن سے باتیں کر رہے ہیں یہ تو اُردُو میڈیم کی لڑکیاں ہیں۔ یعنی یہ بات ہمارے بچوں کے اندر بھی آگئی ہے۔

اس بار عید پر میری بیوی نے ہمارے گوالے بشیر کو جو طبیعت کا بڑا سخت ہے اس سے کہا کہ ایک سیر دودھ زیادہ دے دو۔ اس نے کہا "اچھا آپا جی"۔ ساتھ والوں نے بھی ایسے ہی زیادہ دودھ لیا اور ساتھ ساتھ کئی گھروں کو ان کی مرضی کے مطابق زیادہ دودھ دیا۔ میری بیوی نے اس سے بڑی شکایت کی اور اس سے کہا کہ بشیرے خدا کا خوف کرو اور کچھ شرم کرو تمہارا بڑا نام اور شہرت اچھی ہے اور تم اس محلے میں کب سے دودھ دے رہے ہو۔ اس مرتبہ تم ہم کو عید پر پانی والا دودھ دے گئے۔

اس نے جواب دیا "آپا جی بات یہ ہے کہ عید کے قریب سب لوگ جب مجھ سے ایک ایک سیر زیادہ دودھ مانگیں گے تو میں ایک دن کے لیے نئی بھینس تو خرید نہیں سکتا۔ پھر ایسا ہی دودھ دوں گا۔" اب میری بیوی کے پاس اس کو دینے کے لیے کوئی جواب نہیں تھا۔ میری آپ کی خدمت میں یہ درخواست ہی ہے اور ایک عرض ہی ہے کہ خدا کے واسطے ہم 20 لاکھ پڑھے لکھے لوگ دوسرے 14 کروڑ کو بھی اہمیت اور احترام دیں۔ انہیں اچھوت نہ سمجھیں اور

ان سب کو اپنے ساتھ ملا لیں۔ انہیں مال میں سے حصہ نہ بٹائیں۔ رشتہ داری قائم نہ کریں لیکن انہیں پیار محبت اور عزت ضرور دے دیں۔ اگر ہم ان کو اپنے قریب رکھیں گے اور اس حکم کا پاس کریں کہ کسی گورے کو کالے اور کالے کو گورے اور عربی کو عجمی پر کائی فوقیت نہیں ہے اور تم میں سے بڑا وہ ہے جو تقویٰ میں سب سے بڑا ہے۔ اگر اس فرمان پر عمل کریں تو یہ ان پڑھ سقراط اور آئن سٹائن ہمارے لیے ہی آسانیوں کا باعث بنیں گے اور ہمیں ویسے ہی عزت لوٹائیں گے جیسی ہم ان سے کریں گے۔ عجز و انکساری گو ایک مشکل بات ہے لیکن یہ تقویٰ کے حصول کے لیے ضروری ہے۔ ہمارے ہاں جتنے "اکھان" (ضرب الامثال) ہیں یہ سب ان پڑھ لوگوں نے اپنے تجربات سے بنائی ہیں کہ:

مر جاویں گا بھائیا کھوتیا

اے ساوے ہیٹھ کھلوتیا

اے آوانئیوں ملکنا

تے تونئیوں چھُٹنا

یہ ایک سوچ کی بات ہے ایسے ہی نہیں باہر آ جاتیں۔ یہ دانش کی اور فلسفیوں کی باتیں ہیں۔ آج کے بعد سے آپ ان فلسفیوں کو جن کے پیشے بہت چھوٹے ہیں۔ کوئی کوچوان ہے، کوئی حجام ہے، کوئی موچی ہے لیکن ان کے پاس ان کا ہنر ہے۔ ان کا بھی علم ہے اور یہ عزت کے جائز طور پر مانگنے والے ہیں اور ہم ایمانداری کے ساتھ انہیں ان کی عزت نہیں دے رہے۔ امید ہے کہ آپ میری درخواست پر ضرور توجہ فرمائیں گے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین۔

اللہ حافظ۔

بونگیاں ماریں، خوش رہیں

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ سب کو سلام پہنچے۔ آج کے اس ”زاویے“ میں میرا کچھ سنجیدہ انداز اختیار کرنے کو جی نہیں چاہتا بلکہ آج کچھ ہلکی پھلکی سی باتیں ہونی چاہئیں اور میں سمجھتا ہوں کہ زندگی ہلکی پھلکی باتوں سے ہی عبارت ہے۔ ہم اس پروگرام کے شروع ہونے سے پہلے کچھ سنجیدہ اور گھمبیر قسم کی باتیں کر رہے تھے اور میرے ذہن میں یہ لہر بار بار اٹھ رہی تھی کہ پاکستان کے اندر ہماری بہت سے مشکل منازل موجود ہیں جن میں بہت بڑا ہاتھ ان اونچے پہاڑوں کا بھی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال مہربانی سے ہم کو عطا کیے ہیں۔ دنیا کا سب سے اونچا پہاڑ کے-ٹو پاکستان میں ہے۔ میں اسے سب سے اونچا یوں کہوں گا کہ بہت سے جغرافیہ دان اور ہئیت دان یہ کہتے ہیں کہ ہمالیہ کی چوٹی اتنی اونچی نہیں ہے جتنی کہ کے-ٹو کی ہے۔ یہ ہمالیہ سے دو فٹ یا دو فٹ کچھ انچ اونچا ہے۔ کے-ٹو کی چوٹی ہمارے پاس ہے، نانگا پربت کی چوٹی ہمارے پاس ہے، راکاپوشی کی چوٹی کے ہم مالک ہیں۔ مجھے بھی آپ کی طرح ان چوٹیوں سے بڑی محبت

ہے۔ اوپری منزل یا ان چوٹیوں پر پہنچنے کے لیے جب انسان رختِ سفر باندھتا ہے تو وہ صرف ایک ہی ذریعہ استعمال نہیں کرتا۔ پہلے انسان جیپ کے ذریعے پہاڑ کے دامن تک پہنچتا ہے پھر آپ کو ٹٹو یا خچر کی ضرورت محسوس ہو گی۔ اس کے بعد ایک مقام ایسا آ جائے گا کہ راستہ دشوار گزار ہو جائے گا اور پیدل چلنا پڑے گا۔ پھر ایک ایسی جگہ آئے گی جب آپ کو رسوں کا استعمال کرنا پڑے گا۔ تب کہیں جا کر آپ اوپر اپنی منزل تک پہنچ جائیں گے۔ زندگی میں صحتِ جسمانی اور صحتِ روحانی کر برقرار رکھنے کے لیے انسان ایک ہی طریقہ علاج نہیں اپنا سکتا ہے بلکہ اسے مختلف طریقے اور ذرائع استعمال کرتا پڑتے ہیں۔ ایلوپیتھک علاج ہے، حکمت ہے، ہومیو پیتھک کا طریقہ ہے اس کے علاوہ چائنیز کا طریقہ علاج ہے جس میں وہ صبح سویرے اٹھ کر قدرت سے کرنٹ حاصل کرتے ہیں۔ ہم نے چائنہ میں دیکھا کہ وہ صبح باہر کھڑے ہو کر ہاتھ ہلاتے رہتے ہیں اور قدرتی انرجی اپنے اندر سمیٹتے رہتے ہیں اور اپنی بیٹری چارج کرتے ہیں۔ اس قسم کی باتیں اور چیزیں ہمارے ہاں ہمارے بزرگوں، بڑوں اور بابوں نے بھی سوچی ہیں اور ان کی ان باتوں کو جو میرے جیسا آدمی چوری چوری سنتا اور سیکھتا رہا، ان میں سے ایک طریقہ علاج یہ بھی ہے کہ وہ روحانی ادویات کا استعمال رکھتے ہیں۔ خواتین و حضرات، یہ روحانی ادویات کہیں فروخت نہیں ہوتیں۔ کوئی ایسا بازار

یا مرکز نہیں ہے جہاں سے جا کر ڈاکٹری نسخہ کی طرح ادویات خرید سکیں۔ نہ تو یہ گولیوں کی شکل میں ہوتی ہیں نہ یہ ٹنکچر ہوتی ہیں نہ ان کی ڈرپ لگ سکتی ہے اور نہ ہی یہ ٹیکوں کی صورت میں دستیاب ہوتی ہیں۔ یہ تو کچھ ایسی چیزیں ہیں جن کا کچھ نہ ہونا سا بھی ہونے کی طرح سے ہے۔ میری اور آپ کی زندگی کا سارا دارومدار یہی ہے کہ کوشش اور جدوجہد کرنی ہے اور یہی ہمیں پڑھایا اور سکھایا گیا ہے۔ لیکن چینی فلسفہ تاؤ کے ماننے والے کہتے ہیں کہ ٹھوس اور نظر میں آنے والی چیز اور جو بظاہر آپ کو مفید نظر آئے وہ درحقیقت مفید نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر آپ لاہور سے اسلام آباد جانا چاہتے ہیں۔ آپ اپنی کار نکالتے ہیں اور اسے سڑک پر تیزی سے بھگاتے ہیں۔ آپ کی یہ کوشش اور تیز بھگانا ایک ساکن چیز سے وابستہ ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ تیزی سے گھومتا ہوا پہیہ ایک نہایت ساکن دھرے کے اوپر کام کرتا ہے۔ اگر وہ دھرا ساکن نہ رہے اور وہ بھی گھومنے لگ جائے تو پھر بات نہیں بنے گی۔ اس کوشش اور جدوجہد میں تیزی سے مصروف پہیے کے پیچھے مکمل سکون ہے۔ اور خاموشی و استقامت اور حرکت سے مکمل گریز ہے۔ مجھ سے اور آپ سے یہ کوتاہی ہو جاتی ہے کہ ہم تیز چلنے کے چکر میں پیچھے اپنی روح کی خاموشی اور سکون کو توڑ دیتے ہیں۔ ہمارے سیاستدان بھی چلو بھاگو دوڑو کی رٹ لگاتے ہیں اور ”آوے ای آوے اور جاوے

ای جاوے" کے نعرے لگاتے ہیں۔ زندگی اللہ کی بنائی ہوئی ہے اور اس نے زندگی میں حسن رکھا ہے۔ میرے سامنے پڑی چائے کی پیالی کے درو دیوار اس کا کنڈا یہ مفید نہیں ہے بلکہ اس کا خلا مفید ہے۔ ہم پیالی کے کنارے پر چائے رکھ کے نہیں پی سکتے۔ اس لیے خلا کی اہمیت اس کی نظر آنے والی بیرونی خوبصورتی سے زیادہ ہے۔ ہم جس گھر میں رہتے ہیں وہ گھر کے خلا کے اندر رہتے ہیں۔ کیڑے مکوڑوں کی طرح دیوار میں گھس کر نہیں رہتے۔ دیواریں کسی کام نہیں آتیں بلکہ خلا کام آتا ہے۔ آپ زندگی کے ساتھ شدت کے ساتھ نہ چمٹ جایا کریں اور ہر مفید نظر آنے والی چیز کو بالکل ہی مفید نہ سمجھ لیا کریں۔ میں روحانی دوا کی بات کر رہا تھا جو عام کسی طبیب کے ہاں نہیں ملتی یا کسی ملٹی نیشنل لیبارٹری میں تیار نہیں ہوتی۔ یہ دوائیں آپ کو خود بنانا پڑتی ہیں اور ان دواؤں کے ساتھ ایسے ہی چلنا پڑتا ہے جیسے بے خیالی میں آپ کسی کھلے راستے سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان روحانی ادویات کا نسخہ بھی کسی جگہ سے لکھا ہوا نہیں ملتا ہے۔ یہ آپ کو اپنی ذات کے ساتھ بیٹھ کر اور خود کو ایک طبیعت کے سامنے دوزانوں ہو کر بیٹھنے کے انداز میں پوچھنا پڑتا ہے کہ بابا جی یہ میری خرابی ہے اور یہ میرے الجھن ہے اور پھر آپ ہی کے اندر کا وجود با طبیب بتائے گا کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔ جب

آپ خود اپنی ذات سے خامیاں خوبیاں پوچھنے اور سوال وجواب کرنے بیٹھ جاتے ہیں تو مسئلے حل ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

ہمارے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ڈیپریشن کے مرض سے پریشان ہیں۔ کروڑوں روپے کی ادویات سے ڈیپریشن ختم کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں اور یہ مرض ایسا ہے کہ خوفناک شکل اختیار کرتا جارہا ہے اور اچھوت کی بیماری لگتا ہے۔ ہمارے بابے جن کا میں ذکر کرتا ہوں وہ بھی اس Stress یا ڈیپریشن کے مرض کا علاج ڈھونڈنے میں لگے ہوئے ہیں تاکہ لوگوں کو اس موذی مرض سے نجات دلائی جائے۔ پرسوں ہی جب میں نے باباجی کے سامنے اپنی یہ مشکل پیش کی تو انہوں نے کہا کہ کیا آپ ڈیپریشن کے مریض کو اس بات پر مائل کرسکتے ہیں کہ وہ دن میں ایک آدھ دفعہ "بونگیاں" مار لیا کرے۔ یعنی ایسی باتیں کریں جن کا مطلب اور معانی کچھ نہ ہو۔ جب ہم بچپن میں گاؤں میں رہتے تھے اور جوہڑ کے کنارے جاتے تھے اور اس وقت میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا اس وقت بھی پاپ میوزک آج کل کے پاپ میوزک سے بہت تیز تھا اور ہم پاپ میوزک یا گانے کے انداز میں یہ تیز تیز گاتے تھے:

مور پاوے پیل

سپ جاوے کُھڈ نوں

بگلا بھگت چک لیاوے ڈڈ نوں

تے ڈڈاں دیاں لکھیاں نوں کون موڑ دا

(مور ناچتا ہے جبکہ سانپ اپنے سوراخ یا گڑھے میں جاتا ہے۔ بگلا مینڈک کو خوراک کے لیے اچک کر لے آتا ہے اور اس طرح سب اپنی اپنی فطرت پر قائم ہیں اور مینڈک کی قسمت کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے)۔ ہم کو زمانے نے اس قدر سنجیدہ اور سخت کر دیا ہے کہ ہم بونگی مارنے سے بھی قاصر ہیں۔ ہمیں اس قدر تشنّج میں مبتلا کر دیا ہے کہ ہم بونگی بھی نہیں مار سکتے باقی امور تو دور کی بات ہیں۔ آپ خود اندازہ لگا کر دیکھیں آپ کو چوبیس گھنٹوں میں کوئی وقت ایسا نہیں ملے گا جب آپ نے بونگی مارنے کی کوشش کی ہو۔ لطیفہ اور بات ہے۔ وہ باقاعدہ سوچ سمجھ کر موقع کی مناسبت سے سنایا جاتا ہے جبکہ بونگی کسی وقت بھی ماری جا سکتی ہے۔ روحانی ادویات اس وقت بننی شروع ہوتی ہیں جب آپ کے اندر معصومیت کا ایک ہلکا سا نقطہ موجود ہوتا ہے۔ یہ عام سی چیز ہے چاہے سوچ کر یا زور لگا کر ہی لائی جائے خوبصورت ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

بہتر ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل

لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

عقل کو رسیوں سے جکڑنا نہیں اچھا جب تک عقل کو تھوڑا آزاد کرنا نہیں سیکھیں گے۔ ہماری کیفیت رہی ہے جیسی گزشتہ 53 برسوں میں رہی ہے (یہ پروگرام سن 2000 میں نشر ہوا تھا)، صوفیائے کرام اور بزرگ کہتے ہیں کہ جب انسان آخرت میں پہنچے گا اور اس وقت ایک لمبی قطار لگی ہو گی۔ اللہ تعالیٰ وہاں موجود ہوں گے وہ آدمی سے کہے گا کہ "اے بندے میں نے تجھے معصومیت دے کر دنیا میں بھیجا تھا وہ واپس دے دے اور جنت میں داخل ہو جا۔"

جس طرح گیٹ پاس ہوتے ہیں اللہ یہ بات ہر شخص سے پوچھے گا لیکن ہم کہیں گے کہ یا اللہ ہم نے تو ایم-اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی بڑی مشکل سے کیا ہے لیکن ہمارے پاس وہ معصومیت نہیں ہے لیکن خواتین و حضرات، روحانی دوا میں معصومیت وہ اجزائے ترکیبی یا نسخہ ہے جس کا گھوٹا لگے کا تو روحانی دوا تیار ہو گی اور اس نسخے میں بس تھوڑی سی معصومیت درکار ہے۔ اس دوائی کو بنانے کے لیے ڈبے، بوتلیں وغیرہ نہیں چاہئیں بلکہ جب آپ روحانی دوا بنائیں تو سب سے پہلے ایک تھیلی بنائیں جس طرح جب ہم بُڈھے لوگ سفر کرتے ہیں تو دواؤں کی ایک

تھیلی اپنے پاس رکھتے ہیں۔ بہت سی ہوائی کمپنیاں ایس ہیں جن کے ٹکٹ پر لکھا ہوتا ہے کہ Check your passport your visa and their validity and your medicine bag آپ کو بھی ایک تھیلی تیار کرنی پڑے گی جس کے اندر تین نیلے منکے یا جو بھی آپ کی پسند کا رنگ ہے اس کے منکے اور اعلیٰ درجے کی کوڈیاں، ایک تتلی کا پر، اگر تتلی نہ ملے تو کالے کیکر کا پھل، کوئی چھوٹی سی آپ کی پسند کی تصویر، چھوٹے سائز میں سورۃ رحمٰن اور اس کے اندر ایک کم از کم 31 دانوں یا منکوں والی تسبیح ہونی چاہیے۔ اس تھیلی میں ایک لیمن ڈراپ ہونا چاہیے۔ اس تھیلی میں ایک سیٹی اور ایک پرانا بلب بھی رکھیں۔ پھر آپ لوٹ کر معصومیت کی طرف آئیں گے۔ یہ میری پسند کی چیزوں پر مبنی تھیلی ہے۔ آپ اپنی پسند پر مبنی چیزیں اپنی تھیلی میں رکھ سکتے ہیں۔ اس پر کوئی پابندی نہیں ہے لیکن یہ تھیلی ہونی ضرور چاہیے کیونکہ ہم معصومیت سے اتنے دور نکل گئے ہیں اور اس قدر سمجھدار ہو گئے ہیں اور چالاک ہو گئے ہیں کہ اللہ نے جو نعمت ہمیں دے کر پیدا کیا تھا اس سے آج تک فائدہ اٹھا ہی نہیں سکے۔ خداوند تعالیٰ نے کہا تھا کہ "میں تمہارا ذمہ دار ہوں رزق میں دوں گا۔ عزت و شہرت تمہیں میں دوں گا اور اولاد سے نوازوں گا" لیکن ہم کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو خود بڑے عقلمند آدمی ہیں۔ یہ ساری چیزیں ہم اپنی عقلمندی سے پا سکتے

ہیں اور اسی زعم میں تشنّج کی زندگی میں مبتلا ہیں۔ میرا چھوٹا پوتا اویس سکول میں پڑھتا ہے۔ وہ ایک دن سکول سے آیا تو بڑا پریشان تھا اور گھبرایا ہوا بھی تھا۔ اس نے اپنی ماں سے کہا کہ "ماما آج سکول میں کھیلتے ہوئے میری قمیص کا بٹن ٹوٹ گیا ہے۔ میں اپنا بٹن تو تلاش کر لیا لیکن مجھے وہ دھاگہ نہیں ملا جس سے یہ لگا ہوا تھا۔"

اب آپ اندازہ کریں کہ ہم اپنے بچوں کو کس انتہا درجے کی اور پریشان کن ذمہ داری سکھا رہے ہیں۔ میں نے اسے گود میں اٹھالیا اور کہا کہ بیٹا بٹن جب گرتا ہے تو اس کے ساتھ دھاگہ نہیں گرتا۔ اس کی ماں ہنسنے لگی کہ دیکھو کتنا بیوقوف ہے۔ میں نے کہا۔ یہ کتنا بے وقوف نہیں بلکہ کتنا معصوم ہے۔ ہم کتنا بھی بچوں کو سکھا لیں لیکن ان سے قدرتی معصومیت تو جاتے جاتے ہی جائے گی۔ خواتین و حضرات اس معصومیت کو ہمیں واپس لانا ہے۔ جب تک ہمیں وہ واپس نہیں ملے گی ہم اپنا علاج نہیں کر پائیں گے۔ آپ نے جو تھیلی بنائی ہے اسے آپ نے ہفتے میں دو تین مرتبہ کھول کر بھی دیکھنا ہے۔ اگر اسے نہیں دیکھیں گے تو آپ کی مشکلات دور نہیں ہوں گی۔ یہ معصومیت کی تھیلی آپ کو سکون فراہم کرے گی۔ آپ کی معصومیت لوٹائے گی۔ اونچی منزل تک پہنچنے کے لیے رسی درکار ہوتی ہے۔ صرف پیدل چل کر ماؤنٹ ایورسٹ سر نہیں کیا جا سکتا۔ میرے خالہ

زاد بھائی کی بیٹی جو میری بھتیجی بھی لگتی ہے اس کی شادی تھی اور رخصتی کے وقت ہماری وہ بیٹی سب سے مل رہی تھی اور وہ اپنے باپ سے بھی بڑی محبت سے جپھی ڈال کے ملی۔ پھر اس نے اپنے پرس سے کچھ نکال لیا اور وہ نکالی ہوئی پڑیا سی اپنے والد کو دے دی۔ اس کے بعد جب وہ مجھے ملنے لگی تو میں نے کہا بیٹا وہ تو نے پرس سے نکال کر اپنے باپ کو کیا دیا ہے۔

وہ کہنے لگی تایا کچھ نہیں تھا۔

میں نے کہا کہ میرے آنکھوں نے کچھ دیکھا ہے۔

وہ کہنے لگی کہ تایا جان میں نے ابو کا کریڈٹ کارڈ انہیں واپس کیا تھا کیونکہ اب میں نے ایک اُلّو اور پکڑ لیا ہے۔ اس کے پاس بھی کریڈٹ کارڈ ہو گا۔ مجھے اس کا وہ انداز اور معصومیت بڑی پسند آئی۔ اگر میرے جیسا لالچی ہوتا تو کہتا کہ ایک یہ بھی رکھ لیتا ہوں ایک دوسرا ہو گا۔ ابو نے کیا کہنا ہے۔ میں اپنے اور آپ کے لیے یہ تجویز کروں گا کہ ڈیپریشن کے مرض کی کسی اور طرح سے گردن ناپی جا سکتی ہے۔ سوائے اس کے کہ آپ اس کی آنکھ میں آنکھ ڈال کے دو عدد بونگیاں نہ ماریں۔ ان بونگیوں سے ڈیپریشن دور بھاگتا ہے۔ سنجیدگی کو اگر گلے کا ہار بنائیں گے تو جان نہیں چھوٹے گی۔ ہم اس آرزو کے ساتھ کہ ساری دنیا اور بالخصوص

میرے ملک کے لوگوں کو اللہ آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ

آٹوگراف

میں اب جب کبھی اپنے بالا خانے کی کھڑکی کھول کے دیکھتا ہوں تو میرے سامنے ایک لمبی گلی ہوتی ہے جو بالکل سنسان اور ویران ہوتی ہے۔ جب میں اسے دور تک دیکھتا ہوں تو لے دے کے ایک ہی خیال میرے ذہن میں رہتا ہے کہ یہاں وہ شخص رہتا ہے جس نے 1982ء میں میرے ساتھ یہ زیادتی کی تھی کہ اس کے سامنے وہ شخص رہائش پذیر ہے جو 1971ء میں میرے ساتھ قطع تعلق کر کے اپنے گھر بیٹھ گیا اور اس کے بعد سے ہم نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی۔ سارے محلے میں سارے رشتے کچھ اسی طرح کے ہو چکے ہیں اور با وصف اس کے کہ کہیں کہیں ہم ایک دوسرے سے سلام و دعا بھی کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے احوال بھی دریافت کرتے ہیں لیکن اندر سے ہم بالکل کٹ چکے ہیں اور ہمارے اندر جو انسانی رشتے تھے وہ بہت دور چلے گئے ہیں۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کچھ لوگوں کو فیل ہونے کا بڑا شوق ہوتا ہے اور وہ ساری زندگی Failure میں گزار دیتے ہیں۔ ان کا تعلق ہی ناکامی سے ہوتا ہے۔ انہیں اندر ہی اندر یہ خدشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں میں کامیاب نہ ہو جاؤں۔ خدانخواستہ ایسا نہ ہو کہ میں کامیاب زندگی بسر کرنے لگوں اور ایک اچھا

Relaxed اور پر سکون شخص بن کر اس معاشرے کو کچھ عطا کر کے پھر یہاں سے جاؤں۔ ان لوگوں میں میں بھی شامل ہوں۔ یہ سارے الزام اور Blames جو مجھ کو میری زندگی میں لوگوں کی طرف سے ملتے رہے ہیں میں انہیں اکٹھا کر کے گلدستے کی طرح باندھ کے ان کی Catalogue کر کے اپنی کاپی یا ڈبے کے اندر ایسے ہی محفوظ کر تا رہتا ہوں جیسے لڑکیاں اپنے البم سجاتی ہیں۔ گو اب ان کے البموں میں بھی پہلے سی تصویریں نہیں رہی ہیں بلکہ ان کے دل کے البموں میں بھی وہ سارے کے سارے دکھ ایسے ہی ہیں کہ فلاں شخص نے مجھے طعنہ دیا اور فلاں شخص نے مجھے فلاں کہا اور میں نے اسے نوٹ کر کے دل کی ڈائری میں درج کر لیا۔ یہ چیز کچھ اس شدت کے ساتھ عام ہو گئی ہے کہ اس کا نکالنا Psychiatrist اور سائیکی سمجھنے کے ماہر افراد اور ڈاکٹروں کے لیے اور ان کے ساتھ ساتھ پیروں فقیروں کے لیے بھی مشکل ہو گیا ہے۔

جب ہم ایسے مسائل لے کر جگہ بہ جگہ مارے مارے پھرتے ہیں کہ ہمارے ذہن مین کنکھجورے کی طرح چمٹا اور جما ہوا خیال کیسے نکالا جائے اور اس سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ اس حوالے سے ہمارے بابے ایک ہی بات کرتے ہیں کہ اس کے لیے مراقبے کر بڑی سخت ضرورت ہے۔ جب تک آپ شام کے وقت مغرب کے بعد کسی تنہائی کے ماحول میں اپنی ذات کا مطالعہ نہیں کریں گے

تب تک آپ پر یہ حقیقت آشکار نہیں ہو گی کہ میرا رویہ ناکامی کی طرف کیوں بڑھ رہا ہے۔ میں اس کی طرف کیوں رجوع کر رہا ہوں حالانکہ مجھے تو زندگی میں کامیاب ہونے کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور میں ایک کامیاب زندگی کا پیغام لیکر آپ کے پاس آیا ہوں لیکن پریشانی کا معاملہ یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات کا مطالعہ نہیں کر سکتا اور ساری زندگی دوسروں کے ساتھ جھگڑتا چلا جاتا ہے حالانکہ اس کو اللہ تعالیٰ نے ایک اعلیٰ درجے کا کمپیوٹر دیا ہوا ہے جو اس کی اپنی ذات ہے اور وہ اس کمپیوٹر کو آپریٹ بھی کر سکتا ہے اور سکرین کے اوپر ساری تصویر آسکتی ہے کہ خطا اور خامی کس کی ہے لیکن ہم اس کمپیوٹر کو جو ہمارے اندر فٹ ہے اسے Operate کرنا نہیں جانتے ہیں۔ جانتے اس لیے نہیں ہیں کہ کسی نے ہمیں تلاوتِ وجود کا فن نہیں سکھایا۔ آپ کا وجود بھی کتاب ہی کی مانند ہے۔ اس کی تلاوت کیے بغیر آپ پر راز اور حقائق نہیں کھلیں گے اور آپ اس کے برعکس سیدھے سبھاؤ اس سمت میں چلتے جاتے ہیں کہ گویا اس شخص نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا تھا تو میں اب اس کے ساتھ یہ سلوک کروں گا جبکہ دونوں کا سلوک اپنے اپنے مقام پر اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ اس بات کو جانچا اور چھانٹا جائے کہ کہاں میری غلطی ہے اور کہاں اس کی غلطی ہے اور جہاں پر اپنی غلطی

نکلے وہاں بھی میں اپنی غلطی کا سہارا لے کر اور خود کو ہی غلط قرار دے کر اس کی طرف رجوع کروں۔

جب ہم لاہور سمن آباد میں رہتے تھے اس وقت سمن آباد ایک چھوٹی سے بستی ہوتا تھا اب تو ماشاء اللہ بہت بڑی ہو گئی ہے۔ وہاں میرے چچا کا سامنے والے گھر سے بڑا جھگڑا تھا۔ اس گھر میں ایک صاحب اور میرے چچا اکٹھے ہی مسجد نماز پڑھنے جاتے تھے لیکن وہ ایک دوسرے سے بولتے نہیں تھے۔ میں چچا سے کئی بار کہتا تھا کہ آپ بزرگ ہیں ان سے کوئی کلام کریں تو وہ کہتے "یار لعنت بھیجو تم نے اس کی شکل دیکھی ہے وہ ہے ہی منحوس اور اس کا گھر دیکھو۔ بالکل ٹیڑھا ٹیڑھا سا ہے۔ جب اس کا گھر ہی سیدھا نہیں ہے تو یہ کیسے ٹھیک شخص ہو گا۔"

میں ان سے کہتا تھا کہ نہیں چچا آپ کی طبیعت میں غصہ ہے اس لیے آپ کو ایسا لگتا ہے۔ خواتین و حضرات آپ بھی اپنی ذات پر نظر دوڑا کر دیکھیں۔ آپ کو بھی اس طرح کے ہزار قصے ملیں گے جو آپ کے ذات سے وابستہ ہوں گے۔

ایک روز وہ صاحب جن سے ہمارے چچا کی لڑائی تھی وہ ایک تحریر لے کر چچا کے پاس آ گئے۔ وہ عربی کی تحریر تھی۔ انہوں نے چچا سے جو کچھ کچھ عربی جانتے تھے ان سے کہا کہ خان صاحب آپ ذرا دیکھ لیں کہ یہ کیا لکھا ہے۔ چچا نے عجیب

ناگواری سے "پھوں پھوں" کر کے وہ کاغذ ان صاحب کے ہاتھ سے لیا اور دیکھ کر کہنے لگے کہ مجھے تو اس میں ایسی کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔ اس صاحب نے پھر کہا کہ خان صاحب میں آپ سے "اِس" فقرے کے معانی پوچھنا چاہتا ہوں۔ چچا کہنے لگے کہ میرے پاس اس وقت عینک نہیں ہے، نہیں تو میں آپ کو ضرور بتا دیتا۔ تب ان صاحب نے اپنی عینک آگے بڑھا دی (ہم بڈھوں کی عینک کا نمبر تقریباً ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔)

چچا وہ عینک لگا کر پڑھنے لگے اور سر اٹھا کر ان صاحب کو دیکھا اور مخاطب کر کے کہنے لگے کہ شیخ صاحب آپ کا گھر بہت خوبصورت ہے، تو انہوں نے کہا جی آپ کی بڑی مہربانی۔ چچا نے پھر اس سے کہا کہ اب تو آپ کا چہرہ بھی اچھا ہو گیا تو انہوں (شیخ صاحب) نے کہا کہ ہاں جی میں دو سال بیمار رہا ہوں۔ میں وہاں بیٹھا تھا۔ میں نے کہا چچا جی یہ ساری شیخ صاحب کی عینک کی برکت ہے۔ جب آپ نے ان کی عینک پہنی ہے تو آپ کو ان کا گھر بہت پیارا لگنے لگا ہے اور ان کی شخصیت بھی اچھی لگنے لگی ہے۔ آپ نے کبھی ان کو ان کی عینک سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس طرح ہم نے اپنے ساتھیوں کو کبھی ان کی عینک اور زاویے سے دیکھا ہی نہیں۔ پھر ہم ان کی مشکلات کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ ہمارے ملک میں خاص طور پر لوگوں کے درمیان کدورتیں کچھ اس انداز میں بڑھ رہی ہیں کہ وہ حقیقت میں

نفرتوں یا کدورتوں کا درجہ رکھتی نہیں ہیں۔ بس ایک بات دل میں بیٹھ گئی اور ہم اس پر ایمان لے آئے اور اسی لکیر کو پیٹنا شروع کر دیا۔ میں خاص طور پر بچیوں میں یہ بات آج کل بڑی نوٹ کرتا ہوں کہ ان میں یہ بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے اور ان کے دل میں یہ بات Feed ہو گئی ہے کہ ساس تو ایک واہیات سی چیز ہوتی ہے۔ یہ تو اچھی ہوتی ہی نہیں ہے اور جب یہ تہہ کر لیا جائے کہ بس ساس نے تو ایسے ہی ہونا ہے اب میں نے تو ایم-اے کر رکھا ہے۔ میں Educated ہوں، میں غلط ہو ہی نہیں سکتا یا سکتی۔ اگر ایک پڑھا لکھا شخص یا لڑکی یہ سوچ بھی کہ میں مثال کے طور پر اپنی ساس کو دوسرے زاویے سے ڈیل کر کے ماحول بہتر بنا سکتا ہوں لیکن یہ ہم سے بالکل نہیں ہوتا اور وہ ڈگریاں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں جیسے جاہل ساس کرتی ہے اس کو ویسا ہی جواب ملتا ہے۔

ایک بار جب میری نواسی کے لیے رشتے کی بات چلی تو وہ مجھ سے کہنے لگی کہ نانا جب لڑکا دیکھنے جائیں تو آپ ضرور جائیں ایک تو آپ میرے خفیہ ایجنٹ ہیں اور دوسرا مجھے ابو امی اور بہنوں پر اعتبار نہیں ہے اور آپ صرف یہ بات ہی نوٹ کرنا کہ میرا جو ہونے والا شوہر ہے یا جس سے میر بات طے پا رہی ہے اس "بد بخت" کی کتنی بہنیں ہیں۔ آپ مجھے میری نندوں کے بارے میں بتانا۔ یعنی ابھی کوئی بات نہیں ہوئی اس نے کسی کو نہیں دیکھا لیکن تعداد کے اعتبار سے ہی وہ

بے چاری اتنی پریشان ہو رہی تھی اور وہ کہہ رہی تھی کہ اگر وہ زیادہ ہوئیں تو میں نے وہاں شادی نہیں کرنی۔ میں نے اسے آ کر بتایا کہ بھئی وہ پانچ ہیں۔ تین کی شادی ہو گئی اور ابھی دو کی نہیں ہوئی تو اس نے کہا" دفع دور میں نے وہاں شادی نہیں کرنی۔"

آپ اکثر دیکھتے ہوں گے کہ یہ جو مسلکی اور دینی جھگڑے ہوتے ہیں، فسادات ہوئے ہیں اس میں مسلک کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ کوئی بھی مسلک جھگڑے کا درس نہیں یا ترغیب دیتا لیکن چونکہ الزام دھر دیا جاتا ہے اس لیے اس الزام کو سہارنا یوں مشکل ہو جاتا ہے کہ الزام دھرنے والا کبھی بھی اس بات کی طرف توجہ نہیں دیتا کہ وہ جو یہ الزام دھر رہا ہے شاید وہ خود بھی اسی الزام کا مارا ہوا ہے اور وہی خرابی اس میں بھی موجود ہے۔ بہت دیر کی بات ہے میری ابھی شادی نہیں ہوئی تھی اور میں نوجوان تھا۔ ایک دفعہ ہم لاہور سے براستہ جی ٹی روڈ پنڈی جا رہے تھے۔ دوپہر کو ہم نے گجرات میں کھانا وانا کھایا۔ ہم جب کھانا کھا کے چل پڑے تو تھوڑی دور جا کر میری والدہ کو خیال آیا کہ میری عینک تو وہیں رہ گئی ہے اور انہوں نے "اقبال، اقبال" کہا (وہ میرے بڑے بھائی کا نام ہے)۔ ابا جی نے کہا کہ سب عورتوں کا یہی حال ہے۔ ان کو کبھی وقت پر کوئی چیز یاد نہیں رہتی۔ انہیں اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ سفر کر رہی ہیں اور دھیان رکھنا ہے۔

بھائی نے کہا کوئی بات نہیں ہم راؤنڈ ٹرن لیتے ہیں اور عینک لے لیتے ہیں۔ ابھی کون سا زیادہ دور گئے ہیں البتہ ہم دوبارہ وہاں پہنچ گئے جہاں سے کھانا کھایا تھا۔ جب ہم عینک لے کر چلنے لگے تو ابا جی نے کہا کہ لو اگر ہم یہاں آ ہی گئے ہیں تو میں اپنا مفلر بھی دیکھ لوں جو میں یہاں غسل خانے میں بھول آیا تھا۔ اب وہ اماں کی سرزنش تو کر رہے تھے لیکن انہیں اپنی غلطی نظر نہیں آ رہی تھی۔

خواتین و حضرات، انسانی زندگی میں ہم اکثر ایسی حرکتیں کر دیتے ہیں اور ہمارے اندر وہ وسعت قلبی پیدا نہیں ہوتی جو ہماری تربیت کا ایک خاصا ہے۔ یہ تو انفرادی مشکلات ہیں لیکن بعض اوقات خاندانوں کے اندر بھی Blame کی کیفیت چلتی چلی جاتی ہے۔ آپ کا کسی اس خاندان کے ساتھ تعلق نہیں ہوتا جس سے آپ کے دادا لڑے تھے۔ نئی نسلیں آ جاتی ہیں لیکن آپ کو حکم دے دیا جاتا ہے کہ خبردار اس خاندان سے بات نہیں کرنی اور وہ کام چلا آتا ہے۔ بھئی کیوں بات نہیں کرنی۔ وہ ماضی کی بات تھی گئی آئی ہوئی۔ آپ اپنی سیاسی پارٹیوں میں دیکھیں ان میں کسی دانش اور منطقی بات پر کوئی اختلاف نہیں ہوتا لیکن کہا جاتا ہے کہ نہیں جی بس وہ اس سائیڈ پر اور میں اس سائیڈ پر ہوں اور وہ پارٹی ہی پھٹ پھٹ کے بیچ میں سے کچھ اور نکلتی ہے اور اسی وجہ سے ہماری

جمہوریت کا اونٹ کسی کروٹ بیٹھتا نہیں ہے اور ہم اس Tradition کو لے کر بس چلے آتے ہیں۔

میں نے ایک قصہ ایسا بھی سنا جب میں حضرت مائل رحمتہ اللہ جو بڑے صوفی بزرگ تھے۔ وہ مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد ذکر جہری کیا کرتے۔ جب وہ اونچی آواز میں ذکر کرتے تھے تو ان کی بلی جو ڈیرے پر رہتی تھی وہ آ کے صفوں کو کھدیڑنا شروع کر دیتی تھی اور شور مچاتی تھی۔ آپ نے حکم دیا کہ جب ذکر شروع ہو تو اس بلی کو رسی ڈال کے باندھ دیا جائے کیونکہ یہ شرارتیں کرتی ہے۔ ان کے خادمین نماز کے فوراً بعد بلی کو رسی ڈال کے ایک کھونٹی کے ساتھ باندھ دیتے تھے اور ذکر چلتا رہتا تھا۔ بعد ازاں اس بلی کو آزاد کر دیا جاتا تھا۔ جب حضرت مائل فوت ہو گئے اور ان کی جگہ جو بھی گدی نشین یا خلیفہ ہوئے انہوں نے بھی ذکر کرانا شروع کر دیا اور بلی کو بدستور باندھا جاتا رہا۔ ایک ایسا وقت بھی آیا کہ وہ بلی فوت ہو گئی۔ ڈیرے پر بھی یہ صلاح مشورہ ہوا کہ ایک نئی بلی خریدی جائے اور ایک نئی رسی لی جائے اور اسے بھی عین ذکر کے وقت باندھ دیا جائے چنانچہ ایک نئی بلی اور رسی خریدی گئی اور اسے بھی اس طرح سے باندھا جانے لگا۔ پچھلی بلی پر جو الزام تھا وہ نئی بلی پر بھی اسی طرح عائد کر دیا گیا حالانکہ پہلے والی بلی مر کھپ چکی تھی۔ تاریخ دان لکھتے ہیں کہ اس آرڈر یا اس انداز کا جو

حضرت مائل نے شروع کیا تھا اس میں یہ شرط ہے کہ ذکر جہری اس وقت شروع کیا جائے جب کہ ایک بلی موجود ہو اور اس کو اُسی سے باندھا جائے۔ یہ انسانی زندگی میں بھی ایسی ہی رسی سے باندھی ہوئی ایک بلی ہے جو ہماری معاشرتی زندگی میں بھی داخل ہو چکی ہے اور وہ رسم چلتی چلی آتی ہے اور ہم اس کدورت کو ختم کرنے کی بجائے جو آپ کی ایک کھڑکی کھولنے سے شروع ہوتی ہے آپ طرح طرح کی اور کھڑکیاں کھولتے چلے جاتے ہیں، اسی لیے میں عرض کیا کرتا ہوں کہ یہ بابوں کے ڈیرے ہوتے تھے جہاں بیٹھ کر ایسی ہی مشکلوں اور چیزوں کے علاج کرتے تھے۔ نہ تو وہ ڈاکٹر ہوتے تھے نہ وہ کوئی بڑے عالم دین ہوتے تھے نہ ہی بڑے ناصح ہوتے تھے وہ کچھ ایسی محبت کی پڑیا بندے کو عطا کرتے تھے جو نفسیاتی مشکلات اور ڈیپریشن کا کاٹ کرتی تھی اور اس سے انسان کی طبیعت اور روح سے بوجھ ختم ہو جاتا تھا۔ آپ سارے صوفیا کی تاریخ دیکھ کر بتائیں کہ انہوں نے لوگوں کو کس کس طرح سے ٹھیک کیا اور راحت دی۔ ان کے علاج میں مذہب کی بھی تمیز نہیں ہوتی تھی۔ وہ تمام بندوں کو اپنے قریب لے آتے تھے۔ میں سوچتا ہوں کہ بندے کی اکثر یہ آرزو رہتی ہے اور میری بھی ایسی یہ تمنا ہوتی ہے اور میں نوجوانوں کی طرح اس عمر میں اپنی آٹوگراف بک لے کر گھومتا ہوں اور ایسے لوگوں کے آٹوگراف حاصل کرنا چاہتا ہوں جو آسائش اور

آسانی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ کچھ لوگوں کو اداکاروں یا گانے والوں کے آٹوگراف لینے کا شوق ہوتا ہے۔ میں ایسے لوگوں کے آٹوگراف لینے کا خواہشمند ہوں جن پر دنیا کے جھمیلوں کا تشنّج یا بوجھ نہیں ہے۔ میرے پاس جتنے بھی کاغذ ہیں اس میں دستخط تو کم لوگوں کے ہیں جب کہ انگوٹھے زیادہ لوگوں نے لگائے ہیں۔ کسی لکڑہارے کا انگوٹھا ہے، کسی ترکھان کا ہے، کسی قصائی کا ہے اور دیگر سخت سخت پیشے والوں کے انگوٹھے بھی ہیں۔ ابھی تازہ تازہ میں نے جو انگوٹھا لگوایا ہے وہ میں نے لاہور سے قصور کے راستے کے درمیان میں آنے والے چھوٹے سے شہر یا منڈی مصطفیٰ آباد للیانی سے لگوایا ہے۔ میرے منجھلے بیٹے کو پرندوں کا بڑا شوق ہے۔ اس نے گھر میں پرندوں کے دانا کھانے کے ایسے ڈبے لگا رکھے ہیں جن میں Automatically دانے ایک ایک کر کے گرتے رہتے ہیں اور پرندے شوق سے آ کے کھاتے رہتے ہیں۔ جب ہم قصور سے لاہور آ رہے تھے تو اس نے للیانی میں ایک دکان دیکھی جس میں پانچ پانچ کلو کے تھیلے پڑے ہوئے تھے جن میں باجرہ اور ٹوٹا چاول وغیرہ بھرے ہوئے تھے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ ابو یہ پرندوں کے لیے بہت اچھا دانا ہے۔ میرا بیٹا اس دکان سے چاول اور باجرہ لینے گیا تو اس نے پوچھا کہ آپ کو یہ دانے کس مقصد کے لیے چاہئیں تو میرے بیٹے نے اس بتایا کہ پرندوں کو ڈالنے

کے لیے۔ اس پر اس دکاندار نے کہا کہ آپ کنگنی بھی ضرور لیجیے کیونکہ کچھ خوش الحان پرندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو باجری نہیں کھا سکتے بلکہ کنگنی کھاتے ہیں۔ وہ بھی پھر کنگنی کھانے آپ کے پاس آیا کریں گے۔ اس نے کہا کہ بسم اللہ کنگنی ضرور دے دیں اور اس رہنمائی کا میں آپ کا عمر بھر شکر گزار رہوں گا۔ وہ چیزیں لے کر جب اس نے پرس نکالنے کی کوشش کی تو نہ ملا۔ جیبوں، گاڑی، آس پاس ہر جگہ دیکھا لیکن وہ نہ ملا تب وہ تینوں تھیلے گاڑی سے واپس اٹھا کر دکاندار کے پاس گیا اور کہا میں معافی چاہتا ہوں میں تو اپنا بٹوہ ہی بھول گیا ہوں۔

اس دکاندار نے کہا کہ "صاحب آپ کمال کرتے ہیں یہ لے جائیں پیسے آ جائیں گے۔"

میرے بیٹے نے کہا کہ آپ تو مجھے جانتے نہیں ہیں!

وہ دکاندار بولا کہ میں تو آپ کو جانتا ہوں۔

وہ کیسے میرے بیٹے نے کہا۔

دکاندار گویا ہوا "صاحب جو شخص پرندوں کو دانا ڈالتا ہے وہ بے ایمان نہیں ہو سکتا۔"

میں نے جھٹ سے اپنی آٹو گراف بک نکالی اور اس کا انگوٹھا لگوا لیا۔ ایسے ہی میرے پاس کئی لوگوں کے دستخط اور انگوٹھے موجود ہیں۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور ان لوگوں کی طرح جن کے میرے پاس آٹو گراف موجود ہیں۔ ان کی طرح آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

”چاہیے“ کا روگ

میں آپ کو اکثر ایسی باتیں بھی بتاتا رہتا ہوں جو آپ کے مطالعے، مشاہدے یا نظر سے کم ہی گزری ہوں گی۔ ایک زمانے میں تو ہمارے ہاں بہت سی درگاہیں اور ”زاویے“ ہوتے تھے جہاں بزرگ بیٹھ کر اپنے طرز کی تعلیم دیتے تھے لیکن آہستہ آہستہ یہ سلسلہ کم ہونے لگا۔ یہ کمی کس وجہ سے ہوئی میں اس حوالے سے آپ کی خدمت میں درست طور پر عرض نہیں کر سکتا۔ وہ درگاہیں، زاویے اور وہ بزرگ یوں مفید تھے کہ وہ اپنی تمام تر کوتاہیوں اور کمیوں کے باوصف لوگوں کو ایسی تسلی اور تشفی عطا کرتے تھے جو آج کے دور کا مہنگے سے مہنگا Psychoanalyst یا Psychiatrist نہیں دے سکتا۔ خدا جانے ان کے پاس ایسا کون سا علم ہوتا تھا۔ ان کا کندھے پر ہاتھ رکھ دینا یا تشفی کے دو الفاظ کہہ دینے سے بڑے سے بڑا بوجھ آسانی سے ہٹ جاتا تھا۔ ہمارے بابا جی جن کے پاس ہم لاہور میں جایا کرتے تھے ان کی کئی عجیب باتیں ایسی ہوتی تھیں جو ہماری دانست سے ٹکرا جاتی تھیں اور وہ پورے طور پر ہماری گرفت میں نہیں آتی تھیں

کیونکہ ہم ایک اور طرح کا علم پڑھے ہوئے تھے۔ ہمارا علم سکولوں، کالجوں اور ولایت کا تھا اور اس نصاب میں وہ بابوں کی باتیں ہوتی نہیں تھیں۔ ایک روز انہوں نے فرمایا کہ دنیا کی سب سے بری، تکلیف دہ اور گندی بیماری "چاہیے کا روگ" ہے۔ ان کی یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ آخر "چاہیے کا روگ" کیا ہے۔ یہ بات یہاں سے چلی جب میں ڈیرے کے غسل خانے کے اس دروازے کو ٹھیک کر لینا چاہیے کی بات کی جس کا ایک دروازہ قبضہ ڈھیلا ہونے کے باعث ایک طرف جھکا ہوا تھا۔ میری اس بات کے جواب میں بابا جی نے فرمایا کہ چاہیے کا ایک روگ ہوتا ہے جو کمزور قوموں کو لگ جاتا ہے اور وہ ہمیشہ یہی ذکر کرتے رہتے ہیں کہ "یہ ہونا چاہیے" "وہ ہونا چاہیے۔" ہمارے ایک دوست صفدر میر تھے جو اب فوت ہو چکے ہیں وہ انگریزی کے Columnist تھے۔ انہوں نے بابا جی سے یہ بات سن کر ایک کالم Should Syndrome یعنی Should کی بیماری لکھا تھا۔ آپ نے اکثر دیکھا ہو گا کہ اخباروں میں چھپتا ہے کہ ہمیں اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھنا چاہیے۔ ہمارے کئی لیڈر بھی تقریروں میں کہتے ہیں کہ ہمیں ایسا کرنا چاہیے یا ویسا کرنا چاہیے۔ ہمیں آبادی میں کمی کرنی چاہیے وغیرہ وغیرہ۔

خواتین وحضرات اس طرح کی باتیں چاہیے کے چکر میں آ کر ہی ختم ہو جاتی ہیں اور ان کا عملی اور تعمیری پہلو سامنے نہیں آتا۔ جب میں نے غسل خانے کے دروازے کی بات کی تو انہوں نے کہا کہ ایسے نہیں بولا کرتے اور ڈیروں پر ایسا نہیں کہا کرتے ہیں۔ بس دروازوں کو اپنی مرضی کے مطابق ٹھیک کر دیا کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ چاہے آپ غلط کرتے لیکن چاہیے کہنا درست نہیں۔

میں نے کہا بابا جی اس میں آخر اتنی کیا خرابی ہے۔ کہنے لگے کہ چاہیے کا لفظ سارے زمان و مکان پر حاوی ہے۔ اس لیے برا ہے۔ اس کا نہ ماضی سے تعلق ظاہر ہوتا ہے نہ حال یا مستقبل کے ساتھ تعلق بنتا ہے بلکہ یہ ہر جگہ گھس جاتا ہے۔ اس لیے اس کا لیول دیمک کا ہے اور یہ دیمک کی طرح سارے ارادوں کو چاٹ جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ وہ کیسے۔ انہوں نے جواب دیا کہ جب آپ اکثر ماضی کو استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمیں مشرقی پاکستان کے ساتھ ایسا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہمیں بجلی بنانے کے لیے ایک اور ڈیم بنانا چاہیے تھا۔ یہ ساری باتیں ماضی کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں جن کو ہم بدل نہیں سکتے پھر یہی بدبخت چاہیے حال کے ساتھ آ جاتا ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ ہمیں زیادہ سے زیادہ انگلش میڈیم سکول بنا دینے چاہئیں، ہمیں جدیدیت اختیار کرنا چاہیے اس طرح کی بے شمار باتیں ہیں اور بھی بہت سے چاہیے ہیں۔ پھر یہ لفظ چاہیے

مستقبل کی طرف چلا جاتا ہے اور یہ لفظ حال، ماضی اور مستقبل کے درمیان گھومتا رہتا ہے اور کسی بات کو تقویت عطا نہیں کرتا اور بد قسمتی سے جو کمزور قومیں ہوتی ہیں وہ "چاہیے" ہی کا ذکر کرتی رہتی ہیں اور وہ صوبوں کے درمیان مفاہمت پیدا کرنی چاہیے، نیک بن جانا چاہیے پر اصرار کرتی رہتی ہیں اور "چاہیے" استعمال کر کے آرام سے اپنا فرض ادا کر کے سوئی رہتی ہیں اور خود کو بری الذّمہ خیال کرتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ جی یہ تو روحانی قسم کا ڈیرہ ہے یہاں پر تو دینی باتیں ہوتی ہیں لیکن آپ نے جو بات کی ہے یہ تو "ماؤزے تنگ" کی بات سے بہت ملتی ہے۔1966ء میں مجھے ایک Silly School Girl کی طرح ماؤزے تنگ (چینی رہنما) کو دیکھنے کا بڑا شوق تھا حالانکہ میں اس وقت بڑی عمر کا تھا۔ میں ان دنوں سفر کرتا ہوا چائنہ پہنچا۔ مجھے وہاں چین والے کہیں کہ جناب ماؤزے تنگ کو تو کوئی بھی نہیں مل سکتا۔ میں نے کہا کہ میں نے بس یہاں بیٹھے رہنا ہے اور انہیں مل کر جانا ہے۔ آپ نے وہ فقیرنی دیکھی ہو گی جو آپ کے پیسے دینے سے انکار کے باوجود موٹر کے ساتھ لگ کر بیٹھی رہتی ہے۔ میں بھی چین والوں سے ایسے ہی کرتا رہا اور وہ بڑے زچ ہوئے ان دنوں ان کا Cultural Revolution چل رہا تھا اور انہوں نے مجھ سے جان چھڑانے کے لیے وعدہ کیا آپ کو چار منٹ کے لیے ملوا دیں گے۔ میں بڑا خوش ہوا کہ چار

منٹ نصیب ہو گئے لیکن آنجہانی ماؤزے تنگ کی یہ بڑی مہربانی تھی کہ وہ مجھے گیارہ منٹ کے لیے ملے تھے۔ اس ملاقات میں بھی یہ "چاہیے" کا ذکر آیا لیکن وہ کچھ اور انداز میں تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ نے دیکھتے دیکھتے اتنی ترقی کر لی ہے اور ہم تو آپ سے ایک سال پہلے آزاد ہوئے ہیں لیکن مشکلات سے نہیں نکل سکے۔ آخر آپ نے کیا کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ جب ہمارے ذہن میں کوئی پراجیکٹ یا خیال آتا ہے یا یہ ذہن میں آتا ہے کہ "ہمیں یہ کرنا چاہیے" تو اس خیال کے فوراً بعد ہم اس فریم ورک کو لانگ مارچ میں شامل کر دیتے ہیں۔ اس کا ذکر بند کر دیتے ہیں اور اسے مکمل کرنے کے فکر میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان دنوں چین میں ایک "خوفناک چاہیے" آیا ہوا تھا۔ ماؤزے تنگ کہہ رہا تھا کہ پانچ ہزار سال قبل ہمارے سنیاسی، جوگی جو "آکو پنکچر" کا طریقہ علاج اختیار کرتے تھے اسے ڈھونڈنا چاہیے جبکہ اس وقت کے ماڈرن ڈاکٹر ان کی اس بات سے ناراض تھے کہ یہ کیا فضول بات کر رہے ہیں۔ وہ سنیاسی تو نالائق لوگ تھے، سوئیاں لگاتے تھے، تکلیف دیتے تھے لیکن ماؤزے تنگ نے کہا کہ چلو اس طریقہ کو لانگ مارچ میں لے آتے ہیں اور ڈھونڈتے ہیں۔ جب میں نے ڈیرے پر یہ بات کی تو ہمارے بابا جی نے بھی بتایا کہ ہمارے ہاں بھی ایک رسم تھی جس میں لوگ فسد کھلواتے تھے جس میں جسم کے مختلف حصوں پر کٹ دے کر فساد

والا یا خراب خون نکال دیا جاتا تھا اور مریض کو آرام آ جاتا تھا۔ مرزا اسد خان غالب بھی بڑی باقاعدگی سے فسد کھلواتے تھے۔ اس زمانے کے فسد کھولنے والوں کو معلوم ہوتا تھا کہ کتنا کٹ دینا ہے اور کتنا خون بہانا ہے اور کب اسے بند کر دینا ہے۔ بہار کے موسم میں یہ علاج کیا جاتا تھا اور مرد عورتیں دونوں فسد کھلواتے تھے۔ جب بلڈ پریشر نامی مرض کا کوئی نام بھی نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ فسد کے ذریعے خون کے دباؤ کو نارمل رکھتے تھے۔ جب میں نے ماؤزے تنگ کی آکوپنکچر والی بات کی تو بابا جی نے کہا کہ آپ تو پڑھے لکھے آدمی ہیں، آپ فسد کھولنے والے تلاش کریں۔

خواتین و حضرات آپ نے سنا ہو گا کہ لوگ فساد والا خون ختم کرنے کے لیے جونکیں بھی لگواتے تھے۔ اب امریکا میں بھی جونکیں لگنا شروع ہو گئی ہیں۔ اب چونکہ بابا جی کا حکم تھا تو میں تلاش کرتے کرتے، یہاں وہاں پوچھتے اور تحقیق کرتے پتہ چلا کہ فسد کھولنے والوں کا ایک گھرانہ کوئٹہ میں آیا ہے۔ میں کوئٹہ گیا اور اس گھرانے میں پہنچا تو وہاں نوجوان بڑے اچھے تھے۔ وہ مجھے بڑی محبت سے ملے۔ وہ کہنے لگے کہ جی ہم اب یہ کام نہیں کرتے اور اب ہم نے لیمن ڈراپس یعنی کھٹی میٹھی گولیاں بناتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے باپ دادا نے تو کچھ خاص کمایا نہیں لہذا ہم نے لیمن ڈراپس تیار کرنے والی مشینیں لگا لی ہیں کیونکہ

اس میں زیادہ پیسہ ہے اور اب ہمارا کمائی کا یہ ذریعہ ہے۔ بابا جی کہا کرتے تھے کہ تم چاہیے کے چکر میں نہ آنا بلکہ کچھ کر ڈالنا وگرنہ تم چاہیے چاہیے ہی میں ڈوب جاؤ گے اور چاہیے کا سمندر بہت گہرا ہوتا ہے۔ تھوڑے دن ہوئے میں سبزی منڈی گیا تو دو سائیکل سوار نوجوان میرے پاس سے بڑی تیزی کے ساتھ گزرے۔ اتنی تیزی سے گزرے کہ مجھے اچانک گاڑی کے بریک لگانا پڑے۔ اچانک بریک لگانے سے میرے پیچھے والی گاڑی میری گاڑی کے ساتھ آ کر ٹھک سے لگی۔ ہم نے اپنی گاڑیاں ایک طرف کھڑی کر لیں تاکہ دیکھ سکیں کہ کچھ زیادہ نقصان تو نہیں ہوا ہے۔ میں نے ٹکر مارے والے صاحب سے کہا کہ معافی چاہتا ہوں کہ مجھے سخت بریک لگانا پڑے اور اس نے کہا کہ الحمد للہ آپ کا کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ وہ بالکل چوراہا تھا۔ میں ان صاحب سے کہا کہ یہاں پر ایک بتی ہونی چاہیے یا کم از کم ایک ٹریفک والا تو ضرور ہونا چاہیے۔ وہ صاحب کہنے لگے کہ یہ سب غلط بات ہے۔ کچھ بھی نہیں ہونا چاہیے۔ پہلے ان دونوں لڑکوں کو سزا ملنی چاہیے اور میں ان کو پکڑ کر سزا دوں گا۔ میں نے کہا کہ وہ تو اب کہیں کے کہیں نکل گئے ہوں گے لیکن وہ صاحب کہنے لگے کہ میں ان کو ضرور پکڑوں گا۔ اگر اب نہ پکڑ سکا تو شام کو یہ گھر تو آئیں گے ہی نا، اس وقت سزا دوں گا۔ میں نے کہا جناب وہ کیسے۔ وہ کہنے لگے کہ یہ دونوں میرے بیٹے ہیں۔

خواتین وحضرات، چاہیے زندگی میں بہت جگہ ہم پر دباؤ ڈالتا ہے۔ ہمارے جہلم کے علاقے میں روس سے بڑی تعداد میں مُرغابیاں آتی ہیں اور ہم وہاں شکار کھیلنے جاتے تھے۔ جہلم میں لوگوں کی بڑی زمینیں نہیں ہیں۔ چھوٹے چھوٹے زمیندار ہوتے ہیں اس لیے انہیں ٹریکٹر کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ ہم جس شخص کے گھر میں ٹھہرے وہ چاہ رہا تھا کہ میں ٹریکٹر خریدوں۔ وہ گاؤں کا سردار تھا جبکہ اس کی بیوی جو سمجھدار اور پڑھی لکھی تھی، وہ ٹریکٹر خریدنے کے خلاف تھی اور اس کا کہنا تھا کہ ٹریکٹر کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ رقبہ ہی اتنا زیادہ نہیں ہے جس کے لیے ٹریکٹر کی ضرورت ہو لیکن اس شخص نے کہا کہ میرا شوق ہے اور میں نے ٹریکٹر ضرور لینا ہے۔ اس وجہ سے ان دونوں میاں بیوی کے درمیان ایک چپقلش سی تھی۔ اس کی بیوی نے کہا کہ ہمارے پاس دھنی کے بیلوں (اعلیٰ نسل کے بیلوں کی ایک قسم) کی ایک جوڑی ہے وہ خوب ہل چلاتے ہیں اور میں ٹریکٹر نہیں آنے دوں گی لیکن وہ شخص بضد تھا۔ جب بات ذرا سی اونچی ہو گئی تو اس نے بیوی سے کہا کہ میں تمہیں اس لیے گھر نہیں لایا کہ "مجھے تم چاہیے تھی" یا مجھے تمہاری ضرورت تھی بلکہ مجھے تم سے محبت تھی تمہیں اس لیے گھر لایا ہوں اور اسی طرح مجھے ٹریکٹر سے محبت ہے لہٰذا اگلے دن بیگم صاحبہ خود شوروم گئیں اور ٹریکٹر بک کروایا اور گُڑ کے چاول پکا کر سارے گاؤں میں

تقسیم کیے اس لیے کہ چاہیے اور محبت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ میرا ایک بھانجا تھا جب وہ انکم ٹیکس آفیسر ہوا تو اس کی تعیناتی ملتان میں ہوئی۔ اس کی بیوی اور میری بہو جو بڑی پیاری ہے میں ایک بار اس کے پاس ملتان گیا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ وہ میری بہو کا کہیں جانے کا پروگرام تھا تو ان نے کہا کہ ماموں مجھے تو جانا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ خوشی سے جاؤ ہم خود ہی پکائیں گے اور مرضی کے بنائے ہوئے کھانے کھائیں گے۔ ان سے جاتے ہوئے اپنے شوہر سے کہا کہ میں نے وہ تمام کام کاغذ پر لکھ کر لگا دیئے ہیں جو آپ نے میری غیر موجودگی میں کرنے ہیں اور دیکھو تم سُست آدمی ہو، کوتاہی نہ کرنا۔ ان کاموں میں دودھ کے پیسے، دین بھائی درزی کے پیسوں کی ادائیگی بھی شامل تھی اس کے علاوہ پودوں کی صفائی، اخبار والے کا بل اور دیگر کئی چیزیں لکھی ہوئی تھیں آخر میں اس نے لکھا تھا کہ "مجھ کو بھولنا نہیں مجھ سے محبت کرتے رہنا ہے" وہ 15 دن کے لیے میکے (ساہیوال) جارہی تھی۔ جب وہ میکے سے لوٹ کر آئی تو تب بھی میں وہیں تھا اس نے آتے ہی لکھے ہوئے کاموں کو دیکھا جن پر اس کے شوہر نے ٹک کیا ہوا تھا لیکن آخری بات ٹک نہیں تھی۔ اس پر وہ چیخنے پیٹنے اور چلانے لگی کہ تم نے مجھے یاد کیوں نہیں رکھا۔ تمہیں میری کوئی پرواہ نہیں ہے۔ اب وہ (اس کا شوہر) کافی دیر اسے سنتا رہا پھر بولا بیوی میری اچھی بیوی تمہیں یاد رکھنا اور محبت

کرنا تو عمر بھر کا سودا ہے یہ کیسے ٹک ہو سکتا ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں محبت تو میں نے کرنی ہی جانی ہے۔ تم مجھے ٹِک کرا کے اسے بند کرانا چاہتی ہو۔ یہ سن کر وہ اپنے شوہر کو جپھی ڈال کے اس کے ساتھ لٹک گئی اور کہنے لگی نہیں نہیں اسے ٹک نہیں کرنا ہے ایسے ہی رہنے دیں۔ اس طرح اس کے شوہر نے چاہیے والا کام بند کر دیا تھا۔ ایسے نہیں کیا کہ اس کام کو بھی ٹک کر دینا چاہیے۔ ہمارے بابا کہتے ہیں کہ جونہی آپ چاہیے کے چکر میں آتے ہیں آپ کے کندھوں اور ذہن سے سارا بوجھ اتر جاتا ہے اور انسان سوچتا ہے کہ اب اس چاہیے میں سارے لوگ شامل ہو گئے ہیں۔ میں بری الذّمہ ہو گیا۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ ہم پاکستانیوں کو ایک دوسرے سے مل جل کر رہنا چاہیے۔ ہم میں محبت ہونی چاہیے۔ لیکن صرف چاہیے پر بات چھوڑ دینے سے بات نہیں بنتی اور یہ Should Syndrome ہماری معاشرتی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔

خواتین و حضرات، جس طرح بڑے لوگ چاہیے کی بجائے عمل پر توجہ دیتے ہیں اور جیسے کوزہ گر اپنی تھوڑی سی مٹی پر دباؤ ڈال کر نہایت خوبصورت برتن میں ڈھال لیتا ہے ویسے ہی ایک اعلیٰ درجے کا کوزہ بنانے کی ضرورت ہے لیکن ہمارے پاس وہ چاہیے خوبصورت کوزے کی بجائے مٹی کا ایک "تھوبہ" ہی رہ جاتا ہے اور ہم اس چاہیے کو کوئی شکل نہیں دے پاتے ہیں۔ وہ بڑی خوش نصیب

قومیں ہیں جو یہ بات جان جاتے ہیں کہ اس چاہیے میں صرف باقی لوگ ہی نہیں میں بھی شامل ہوں اور میں اپنی حد تک اپنی ذمہ داری ضرور پوری کروں گا اور خواتین و حضرات بابوں کے علم کی طرف تھی متوجہ رہا کرو ان کی باتیں گوہر نایاب ہوتی ہیں جو کتابوں سے نہیں ملتیں۔ عمل کرنے سے بات بنتی ہے۔ اس سے علم پھوٹنے لگتا ہے۔ آپ عمل کے اندر اس طرح داخل ہوا کریں جیسے ایک سائنس دان لیبارٹری میں کھڑا ہو کر محنت کرتا ہے اور یہ کرنا چاہیے وہ کرنا چاہیے پر ہی نہیں رہتا بلکہ عمل کی صورت میں تجربات کرتا ہے۔ اس طرح سے علم عطا ہوتا ہے ورنہ ہم آپ دیئے ہوئے علم پر گزارا اور چاہیے چاہیے کی گردان ہی الاپتے رہیں گے اور مانگے کے علم پر ہی رہیں گے۔ علم سیکھنے کا اچھا اور آسان طریقہ یہ ہے جو احکامات دیئے جائیں چاہے وہ دینی ہوں، حکومتی یا معاشرتی ہوں۔ آپ لال بتی پر کھڑے ہونے یا رکنے سے اس بات پر انکار نہیں کر سکتے کہ پہلے اس سرخ بتی کو نیلی کریں پھر رکیں گے۔ آپ کو سرخ بتی کے فوائد کا تو کھڑے ہونے کا ہی پتہ چلے گا، گزر جانے سے تو نقصان ہی ہو گا۔ میں اب آپ سے اجازت چاہوں گا اور جاتے جاتے آپ سے عرض کروں گا کہ آپ کا علم جسے Wisdom of the East کہتے ہیں اس دانشِ مشرق جو انبیا کا علم ہے اس کی طرف تھی توجہ دیں۔

میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین۔

اللہ حافظ۔

چلاس کی محبتیں

جوں جوں وقت گزرتا جارہا ہے پچھلی باتیں بڑی شدت، صفائی اور جزویات کے ساتھ یاد آتی چلی جارہی ہیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ ان میں کوئی ایسی ناخوشگوار بات نہیں ہے صرف اس بات کا ان یادوں میں ضرور احساس پایا جاتا ہے کہ وہ لوگ اور وہ زمانے جس میں شفقت و محبت اور انس زیادہ تھا وہ کہاں چلے گئے اور ہم اس قدر کیوں مصروف ہو گئے۔ اس میں ہماری کوئی خرابی نہیں ہے بلکہ سارا چکر مصروفیات کا ہے اور ہماری مصروفیات کا عالم ایسا ہے کہ ہم ان شفقتوں سے کٹ گئے جو محبتیں خدا نے ہمیں عطا کی تھیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ شفیق قلوب جو ہیں انہوں نے کتاب سے پڑھ کر شفقت حاصل نہیں کی تھی یا کسی سے سیکھ کر محبت کا علم نہیں پایا تھا بلکہ اللہ نے وہ دل ہی ایسے پیدا کیے تھے کہ ان کے اندر محبت و شفقت بھری ہوئی تھی اور وہ جو بھی کام کرتے تھے ان میں لوگوں کے لیے بے شمار آسانیاں ہوتی تھیں۔ بہت دیر کی بات ہے ہماری ایک سوسائٹی تھی جو کافی دیر تک چلتی رہی اس کا نام ''چھڈ یار'' تھا۔ اس میں ہم سات ممبر تھے۔

پہلے میں شامل افراد صرف ریڈیو سے متعلق تھے پھر ٹیلیویژن سے بھی آ کر شامل ہو گئے۔ اس سوسائٹی کے چیئر مین ممتاز مفتی تھے جبکہ ہمارے لیڈر عمر بقری تھے۔ اس چھوٹی سی انجمن کا نام ہم نے ''چھڈ یار'' یہ سوچ کر رکھا کہ دفعہ کرو دنیا کے جھگڑے جیہڑے، چھڈ یار ان کو اور اٹھ کھڑا ہو، نکل پڑ کیونکہ یہ تو ساتھ ہی چمٹے رہیں گے۔ چنانچہ ایک تاریخ مقرر کر دی جاتی تھی اور اس میں چھڈ یار کا لیڈر اعلان کر دیتا تھا کہ ''چھڈ یار'' نے ۱۳ تاریخ کو ''اٹھ یار'' میں تبدیل ہو جانا ہے۔ اس مقرر کردہ تاریخ کو ہم اپنے سلیپنگ بیگ اور اپنے ساتھ مکھن، سیب اور ڈبل روٹی وغیرہ لے کر نکل پڑتے تھے اور ہماری منزل ناردرن ایریاز یعنی شمالی علاقہ جات ہوتا تھا۔ وہ دنیا کا خوب صورت ترین علاقہ ہے۔ یہ بات میں اس لیے نہیں کہتا کہ میں پاکستانی ہوں بلکہ اس سے زیادہ خوب صورت علاقے میں نے امریکہ اور انگلستان میں بھی نہیں دیکھے۔ خدا نے جانے کس طرح سے ان حسین وادیوں کو ترتیب دیا اور بنایا ہے۔ ایک طرف راکاپوشی پہاڑ سینہ تانے کھڑا نظر آتا ہے تو دوسری طرف ناگا پربت کھڑا ہے۔

ایک بار جب ہم علاقے میں گئے اور ایک جگہ چائے پینے کے لیے رکے تو وہاں اڑھائی سو جرمن مرد، عورتیں اور ان کے بچے چارپائیاں کرائے پر لے کر بیٹھے ہوئے تھے اور کسی سے بات نہیں کرتے تھے۔ وہاں اس بس اڈے پر لوگوں

نے بتایا کہ یہ ناگاپربت دیکھنے آئے ہیں۔ناگاپربت کا حسن لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا ہے۔ وہ جرمن سیاح تین روز سے چارپائیاں کرایہ پر لیے بیٹھے تھے اور اپنے سامنے ناگاپربت کو مسلسل دیکھ رہے تھے۔ نہ کھانا کھایا، نہ لیٹے بس چائے کی ایک ایک پیالی اور خدا کی عظیم قدرت کا نظارہ کرتے رہے۔ ہم وہاں یہ ضرور سوچتے تھے کہ خدا ہمیں بھی یہ توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنی چیزوں کو پسند کر سکیں اور ان کے قریب آ سکیں۔ ہم شاہراہ ریشم پر چل رہے تھے اور ہمیں شام پانچ چھ بجے کے قریب چلاس پہنچنا تھا۔ چلاس پہاڑی علاقہ ہے اور کافی اونچائی پر ہے۔ یہ خوب صورت علاقہ ہے اور اس کے پہاڑوں کے شگافوں میں ایک سیاہ رنگ کی دوائی (سلاجیت) پیدا ہوتی ہے وہ بہت قیمتی ہوتی ہے۔ ہمارے لیڈر نے وہاں رکنے کا بندوبست کیا تھا اور وہاں ایک سکول ماسٹر کے گھر پر ہمارے ٹھہرنے کا انتظام تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو شام پانچ کی بجائے ہمیں رات کے دس بج گئے۔ اس دیر کی بابت ہم سب نے فیصلہ کیا کہ اتنی رات کو کسی گھر جانا برا لگتا ہے چنانچہ ایک صاف سے پہاڑ پر جس پر ایک عدد سرکاری بتی بھی لگی تھی ہم اپنے بستر کھول کر اس بتی کے نیچے بیٹھ گئے۔ بڑی مزیدار ہوا چل رہی تھی۔ وہاں قریب ہی پانی کا ایک نل تھا جو کسی بہت ہی خوشگوار چشمے کے ساتھ وابستہ تھا۔ ہم وہاں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک بہت خوفناک طوفان چلنے لگا۔ تیز ہوا کے

اس طوفان سے عجیب طرح کا ڈر لگ رہا تھا۔ اس تیز ہوا کے سبب ریت بھی اڑنے لگی۔ جن لوگوں نے چلاس دیکھا ہے انہیں پتہ ہو گا کہ وہاں اگر تقریباً دو کلو میٹر کا فاصلہ طے کریں تو ریگستان شروع ہو جاتا ہے اور پہاڑوں پر چلتے ہوئے اچانک حد نگاہ تک ریت دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس تیز طوفان کے ساتھ ہی تیز بارش بھی ہونے لگی اور اولے بھی پڑنے لگے۔ ہمارے پاس Protection کے لیے کوئی چیز یا جگہ نہ تھی۔ اس موقع پر ہمارے لیڈر عمر بقری مرحوم نے کہا کہ ماسٹر صاحب کے گھر چلنا چاہیے۔ خیر ہم نے اس اندھیرے اور طوفان میں آخر کار گھر تلاش کر ہی لیا۔ جب وہاں پہنچے تو ماسٹر صاحب پریشان کھڑے تھے اور ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ کسی کے سوئم پر گئے تھے لیکن اپنی بیوی کو اشارہ دے کر گئے تھے کہ میرے دوست آئیں گے۔ ان ماسٹر صاحب کی بیوی بھی ایک سکول ٹیچر تھی۔ جب ہم وہاں بیٹھے باتیں واتیں کر رہے تھے تو وہاں اس سخت بادو باراں میں ایک دس بارہ برس کا لڑکا جس کا نام جس عبدالمجید تھا وہ اپنی بیساکھی ٹیکتا ہوا آیا۔ وہ بے چارہ ٹانگ سے معذور تھا۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا تو استانی صاحبہ نے دروازہ کھولا اور اس نے کہا کہ میرے ابا جی نے کہا ہے کہ ماسٹر صاحب آج قریب کے گاؤں میں گئے ہوئے ہیں اور تو آپا جی کی خبر لیکر آ کہ وہ ٹھیک ٹھاک ہیں کہ نہیں انہیں

کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔ اس دوران بارش مزید تیز ہونے لگی اور ژالہ باری بھی تیز ہو گئی۔ وہ لڑکا ڈر گیا اور کہنے لگا کہ آپا جی آپ کو ڈر لگتا ہے تو میں درمیان میں حماقت یا اپنے علم کا اظہار کرنے کے لیے بول پڑا کہ اس میں ڈرنے والی کیا بات ہے؟ یہ تو موسم ہے لیکن آپا جی کہنے لگیں کہ ہاں مجھے ڈر لگتا ہے اور بالکل ایسے ہی ڈرتی ہوں جیسے تم ڈرتے ہو لیکن جب مرد گھر میں ہوں تو پھر مجھے ڈر نہیں لگتا (اس زمانے میں شاید تحریک نسواں نہیں چلی تھی اور مرد عورتوں میں کافی اچھے تعلقات تھے) مجھے ان کی بات سن کر شرمندگی کا احساس ہوا کہ یا اللہ میں نے یہ کیا بات کر دی۔ میں اب محسوس کرتا ہوں کہ اس آپا جی نے اتنی سی بات کر کے اس معذور لڑکے کو ایک پوری شخصیت عطا کر دی تھی اور وہ تگڑا ہو کے کہنے لگا اچھا جی میں اب جاتا ہوں اور اپنے ابا جی کو جا کے بتاتا ہوں کہ وہ خیریت سے ہیں۔

خواتین و حضرات! جی چاہتا ہے کہ کاش میرا دل بھی ایک دن یا ایک ہفتے کے لیے ویسا ہو جائے جیسا آپا جی کا تھا لیکن ہوتا نہیں ہے۔ میں زور لگا کر زبردستی شرافت اختیار کر سکتا ہوں لیکن جو پیدائش اور جبلی شرافت میرے پاس نہیں ہے۔ جب ہم اگلے دن سفر کر رہے تھے تو میں اپنے بچپن کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جب میں پانچ چھ برس کا تھا۔ اس وقت میری ماں نے اپنی سہیلیوں کی

دعوت کی تھی۔ یہ غالباً ۱۹۳۰ء کی بات ہے۔ میری ماں نے اپنی سہیلیوں کے لیے مراد آباد کے برتنوں میں کھانا لگایا۔ پھول وغیرہ بھی لگائے۔ جب میں نے اپنی ماں کا اتنا اہتمام دیکھا تو میں نے سوچا کہ مجھے بھی اس میں حصہ بٹانا چاہیے۔ میرے پاس ایک طوطا تھا جس طرح کا سڑکوں پر نجومیوں نے کارڈ نکالنے کے لیے رکھا ہوتا ہے۔ اس کا رنگ اصلی طوطے کا تھا لیکن وہ گتے کا بنا ہوا تھا اور اس کے اندر لکڑی کا برادہ بھرا ہوا تھا۔ وہ طوطا دو آنے کا ملتا تھا اور اس کے ساتھ ربڑ کا دھاگہ بندھا ہوا ہوتا تھا۔ میں نے وہ طوطا لا کر وہاں رکھ دیا جہاں ماں نے تزئین و آرائش کی ہوئی تھی اور جہاں کھانے کا انتظام تھا اگر شاید آج کی سمجھدار ماں ہوتی تو اس بھدے سے طوطے کو اٹھا کر پھینک دیتی اور کہتی کہ تم کیا بدتمیزی کر رہے ہو لیکن وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی۔ وہ صرف ماں تھی اسے مامتا کے سوا اور کچھ نہیں آتا تھا۔ اس نے ایک رکابی کو اوندھا کر کے اس کے اوپر طوطا رکھ دیا اور جب ان کی سہیلیاں آئیں تو وہ انہیں بتانے لگیں کہ بھئی یہ طوطا اشفاق کا ہے جو اس خوبصورتی میں اضافہ کرنے کے لیے رکھا ہوا ہے۔ ان کی سہیلیوں نے بھی اس کی تعریف کی۔ اتنے برس گزر جانے کے بعد مجھے خیال آتا ہے کہ وہ Gracious Hearted شفیق دل ان لوگوں کو کیسے مل جاتے

تھے۔ میری یہ بڑی حسرت ہے کہ ایسا دل چاہے چند روز کے لیے ہی سہی مجھے بھی مل جائے۔

جب میں اٹلی میں تھا تو میرے ایک دوست بالدی کا بھتیجا تھا اسے کچھ Tonsillitis کی مشکل آئی اور اس کا ایک پیچیدہ سا آپریشن تھا۔ اسے ہم ہاسپٹل لے گئے۔ میرے ان کے ساتھ فیملی فرینڈ شپ اور گہرے تعلقات تھے وہ لڑکا بھی کہنے لگا کہ یہ (اشفاق احمد) بھی ساتھ جائیں۔ اس لڑکے کے پاس ایک بھالو تھا وہ اس اس نے ساتھ پکڑا ہوا تھا۔ اس کا باپ کہنے لگا کہ یہ اس بھالو کو چھوڑتا نہیں ہے۔ میں کسی طریقے سے اس کو اس سے الگ کرتا ہوں۔ وہ کوشش کرتا رہا لیکن اس نے اسے نہ چھوڑا۔ خواتین و حضرات اس لڑکے کا بھالو کانا تھا۔ ایک آنکھ کا بٹن کہیں گر گیا ہو گا۔ جب اس کو آپریشن کے لیے ٹیبل پر لٹایا گیا تو نرس نے اس سے کہا کہ یہ بھالو مجھے دے دو لیکن اس نے دینے سے انکار کر دیا۔ اب Anaesthetist بھی پریشان کھڑے تھے کہ سرجن آ گیا۔ اس نے دیکھتے ہی صورتحال کو بھانپ لیا اور کہا کہ اچھا اتنا خوب صورت بھالو بھی ہے۔ نرس نے کہا کہ سر یہ اس بھالو کو چھوٹ نہیں رہا ہے۔ تو سرجن نے کہا کہ نہیں نہیں یہ اس کے ساتھ ہی رہے گا۔ ابھی تو اس بھالو کی آنکھ کا آپریشن بھی ہونا ہے۔ یہ سن کر اس لڑکے کا دل خوشی سے معمور ہو گیا۔ جب اس لڑکے کا

آپریشن جاری تھا تو ایک شخص کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ اس بھالو کی جو ایک آنکھ نہیں ہے اسے ابھی بازار سے لگوایا جائے۔ (یہ معمولی باتیں ہوتی ہیں لیکن ان کے اثرات دیر پا اور مستحکم اور گہرے ہوتے ہیں) ایک طرف اس بچے کا آپریشن ہو تا رہا تو دوسری طرف اس کے محبوب بھالو کی آنکھ ڈلوائی گئی اور بچے کے ہوش میں آنے سے پہلے اسے وہیں رکھ دیا گیا جہاں سے اٹھوایا تھا اور اس نئی آنکھ پر ایک خوب صورت پٹی بھی باندھ دی گئی۔ وہ اس خوب صورتی سے باندھی گئی تھی کہ میں نے اپنی زندگی میں کسی Living انسان کو بندھی ہوئی نہیں دیکھی۔ جب وہ بچہ ہوش میں آیا تو اس پٹی کو دیکھ کر کہنے لگا کہ اس بھالو کو کیا کیا ہے؟ اسے پٹی کیوں بندھی ہے؟

وہ سٹاف کہنے لگا کہ اس کی آنکھ کا آپریشن کیا ہے جو کامیاب ہوا ہے۔ اس پٹی کو دو دن نہیں کھولنا۔ وہ خوش خوش بھالو کو لے کر چلا گیا۔ اس سرجن کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے آج بھی ہے۔ اس کا لمبا سا قد تھا اور اس کے اندر شفقت اور Greatness اور محبت و پیار ایسی بھری ہوئی تھی جو کہیں سے ملتی ہی نہیں ہے۔ مجھے اس تناظر میں اور بھی باتیں یاد آرہی ہیں۔

ماڈل ٹاؤن لاہور میں ایک بڑا گول چکر ہے وہاں ایک بڈھا بابا ایک نیم کے پیڑ کے نیچے ٹھیلا لگاتا ہے۔ اس کے ساتھ اس کا ایک بیٹا ہوتا ہے جو اس کی مدد کرتا ہے۔ میری چھوٹی آپا ایک روز مجھے کہنے لگیں کہ میں ذرا اس ٹھیلے سے سبزی لے لوں۔ اس بُڈھے بابے کے لڑکے نے آپا کو کچھ گوبھی، بینگن اور کچھ ٹماٹر بڑی احتیاط کے ساتھ دیئے اور آپا کی پسند اور کہنے کے مطابق الگ الگ لفافوں میں ڈال کے وہ رکھتا رہا۔ اب وہ لڑکا آپا جی کے پرس کی جانب دیکھ رہا تھا کہ وہ اسے پیسے دیں گی۔ لیکن آپا ایک چکر کاٹ کے اس لڑکے کے باپ کی طرف چلی گئیں گو یہ ایک معمولی اور عام سی بات تھی لیکن لڑکے کے چہرے کے تاثرات کیا تھے یہ آپ بخوبی جان سکتے ہیں اور کوئی بھی صاحبِ دل جان سکتا ہے۔ کہ اس بچے کے دل پر کیا بیتی ہو گی کیونکہ جس نے سروس کی تھی اس پر بھی اعتماد کیا جانا چاہیے تھا۔ اس بات کا میرے دل پر بڑا بوجھ تھا لیکن میں اس لڑکے سے زیادتی کو Compensate کیسے کر سکتا تھا۔ ایک دن میں اپنی بڑی آپا کے ساتھ گاڑی میں جا رہا تھا۔ یہ اس واقعہ سے تین چار ماہ بعد کی بات ہے۔ آپا نے اسی ٹھیلے کو دیکھ کر کہا کہ "رکو اس ٹھیلے والے کے پاس تو کتنی اچھی اسٹرابری اور شہتوت ہیں وہ لے لیتے ہیں۔ آپا نے ٹھیلے والے سے کہا کالے شہتوت ذرا کھٹے ہوتے ہیں، اس لڑکے نے کہا کہ نہیں جی یہ بہت میٹھے ہیں۔ وہ شہتوت بھی آپا نے لیے، آپا

نے وہ ساری چیزیں پنے بہرے پن کے باوجود اچھے انداز میں لے لیں اور اسے پچاس روپے کا ایک نوٹ دیااور ساتھ پوچھا کہ کتنے روپے ہوئے۔ اس نے اونچی آواز میں چیخ کر کہا کہ اٹھارہ روپے اور کچھ پیسے ہوئے ہیں اور بڑی آپا نے اس لڑکے کو ہی پیسے دے دیئے کیونکہ اس نے ہی سروس کی تھی۔ اس لڑکے نے فٹا فٹ ٹھیلے پر سے رکھی بوری کا پہلو اٹھایااور بقایاریز گاری نکال کر آپا کو دے دی۔ میں یہاں پھر دل کی اور دل میں پنہاں شفقت کے اس خانے کی بات کرتا ہوں جو خانہ کسی کسی کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے آپا اسے کہنے لگیں کاکا تونے تو کمال کر دیا۔ فوراً حساب کر کے پیسے دیئے مجھے تو کافی وقت لگ جاتا تو بڑے کمال کا بچہ ہے۔ یہ تونے کہاں سے سیکھا تو اس نے کہا کہ جی ہمارا تو یہ روز کا کام ہے۔ ابا سے سیکھا ہے۔

خواتین و حضرات! بظاہر یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جو نصیب والوں کو ملتی ہیں ایسے لوگ اب جگہ جگہ مل جاتے ہیں لیکن ہماری مصروفیات کا یہ عالم ہے اور ہمارے اوپر بوجھ اتنے پڑ گئے ہیں کہ ہم اگر چاہیں تب بھی اپنے دل کے اس پنہاں خانے اور دل کے بٹوے کو کھول کر اس میں جھانک نہیں سکتے لیکن اب وہ کھلتا نہیں ہے اور اب جب ہمارا تعلق شمالی علاقہ جات سے ٹوٹ چکا ہے اور ہماری کمپنی یاحلقہ احباب کے بہت سے لوگ اس دنیا سے رحلت کر چکے ہیں اور اب ہم

دو تین باقی رہ گئے ہیں (یہ پروگرام اشفاق احمد کے انتقال کے کچھ سال پہلے ریکارڈ کیا گیا تھا) اور ہم بھی اکیلے اکیلے ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ باتیں یاد آتی ہیں اور چلاس بھی یاد آتا ہے۔ میں چلاس کے لوگوں کو مبارکباد دیتا ہوں اور ان کے لیے بڑی دعا کرتا ہوں۔ چلاس والوں نے ہمیں بڑی خوشیاں دی ہیں۔ بہت اچھے موسم عطا کیے ہیں۔ جب بھی اس علاقے سے گزرے اس نے بڑی محبتیں عطا کیں۔ اس رشتے سے چلتے ہوئے، اس پیچھے آتے ہوئے اور اس نیم کے درخت تک پہنچتے ہوئے جہاں وہ بابا ٹھیلے والا اور اس کا بیٹا اب بھی ریڑھی لگا کر کھڑے ہوتے ہیں۔ یقیناً اب وہاں شفقت کا مظاہرہ کرنے والے لوگ آتے ہوں گے لیکن دل میں کچھ خوف سا سمٹ کے آتا ہے کہ شاید اب ایسے لوگ کم ہوتے جا رہے ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین۔ اللہ حافظ۔

تسلیم و رضا کے بندے

انسان عجیب عجیب قسم کی مشکلات میں مبتلا رہتا ہے اور اسے اس مشکلات کا کوئی مناسب حل سوجھتا نہیں ہے۔ کوئی شخص اگر اپنے قد اور سوچ سے بڑی بات کرنے لگا جائے تو وہ پھر بری طرح سے پھنس جاتا ہے۔ مجھ سے لوگ آ کر پوچھتے ہیں کہ آخر ”خوش کیسے رہا جائے“ اور سکونِ قلب کے لیے کونسا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اب ظاہر ہے کہ میرے پاس کوئی طب یا ہومیو پیتھک کی دوا تو نہیں ہے جو میں انہیں دے کر کہوں کہ اس کی چند خوراکیں کھاؤ تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے پاس تو تجربات و مشاہدات ہی ہیں جن کی بنا پر میں ان سے کچھ کہہ سکتا ہوں گو تمام کے تمام واقعات مجھے پر گزرے نہیں ہیں۔ لیکن میں ان شاہد ضرور ہوں۔ خواتین و حضرات خوش رہنے کے لیے ایک مشکل سا طریقہ یہ ہے کہ دوسروں کو اپنی خوشی میں شریک کیا جائے۔ اب یہ بڑا مشکل کام ہے لیکن سائنس کے فارمولے کی طرح کہ پانی یا لیکوڈ اپنی سطح ہموار رکھتا ہے اس طرح کی کوئی بات خوشی کے حصول کے لیے دستیاب کرنا مشکل ہے بلکہ خوشی

کے حصول کے لیے دوسروں کو شریک کرنا پڑتا ہے وگرنہ آپ خوش نہیں رہ سکتے۔ اگر خوش قسمتی کے ساتھ کوئی ایسی کیفیت اگر حاصل ہو جائے کہ آدمی کے پاس اتنا علم نہ ہو جتنا علم وہ ساری زندگی اکٹھا کرتا رہتا ہے اور انسان میں معصومیت کی وہ لہر باقی ہو جو اسے اللہ نے عطا کر کے دنیا میں بھیجا ہے اس کیفیت یا صورت میں تو آسانی میسر آسکتی ہے۔ اس طرح کا آدمی اپنے ارد گرد کو دیکھ کر بھی پریشان نہیں ہوتا بلکہ خوش رہتا ہے۔ آپ دیکھتے ہوں گے کہ درختوں کو قادر مطلق نے جس طرح کا پیدا کر دیا وہ وہاں ہی کھڑے ہیں۔ ایک درخت کبھی دوسرے درخت سے حاسد نہیں ہوتا۔ کبھی درخت یہ نہیں کہتا کہ ہمیں تو جی آم کا درخت بنا دیا اور لوگ ہمیں کھا کھا کر موجیں کر رہے ہیں اور ہمیں نوچ نوچ کر ٹوکریاں بھر کر لے جا رہے ہیں۔ کاش خدا نے ہمیں شہتوت کا درخت بنایا ہوتا اور مجھ پر رنگ برنگے شہتوت لگتے۔

خواتین و حضرات! انسان ہمیشہ اپنی قسمت پر شاکی رہتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ مجھے ایسا ہونا چاہیے تھا، کوئی کہتا ہے مجھے ویسا ہونا چاہیے تھا لیکن درخت ایسا شکوہ نہیں کرتا۔ کبھی درختوں نے یہ شکایت نہیں کی کہ جناب جب سے پیدا ہوئے ہیں وہیں گڑے ہوئے ہیں۔ نہ کہیں سیر کی ہے نہ گھوم پھر کے دیکھا ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ خوشی سے جھومتے رہتے ہیں اور آپ کو بھی خوشیاں عطا کرتے ہیں اور ہم

باغوں کی سیریں کرتے ہیں۔ ایسے ہی پرندے اور جانور ہیں کبھی کبھی شیر نے زیبرا بننے کی خواہش نہیں کی۔ یا کسی ہرن نے کبھی فاختہ بننے کا نہیں سوچا۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کو بنانے والا علیم مطلق بہتر سمجھتا ہے کہ ہمیں کیسا ہونا چاہیے۔ اگر میں اپنے آپ کو نہ بدلوں تو مجھے کہا جائے گا کہ اشفاق صاحب آپ اپنے Status کا خیال رکھیں۔ ہمارے ہاں اس قسم کی عجیب وغریب Terms بن چکی ہیں اور وہ انسان کو شرمندہ کرتی ہیں۔ ہمیں زندگی میں کبھی کبھی ایسا انسان ضرور مل جاتا ہے جس دیکھ کر حیرانی ضرور ہوتی ہے کہ یہ کیسا بادشاہ آدمی ہے؟ یہ مالی طور پر بھی کمزور ہے۔ علمی و عقلی اور نفسیاتی طور پر کمزور ہے لیکن یہ خوش ہے۔ ہمارے علاقے ماڈل ٹاؤن میں ایک ڈاکیا ہے جو بڑا اچھا ہے۔ اب تو شاید چلا گیا ہے۔ اس کا نام اللہ دتا ہے۔ اس جیسا خوش آدمی میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ اس کا عشق ڈاک اور ہر حال میں خط پہنچانا ہے۔ چاہے رات کے نو بج جائیں وہ خط پہنچا کر ہی جاتا ہے۔ وہاں علاقے میں کرنل صاحب کا ایک کتا تھا۔ اللہ دتا کو پتہ نہ چلا اور ایک روز اچانک اس کتے نے اس کی ٹانگ پر کاٹ لیا اور اس کی ایک بوٹی نکال لی۔ خیر وہ ٹانگ پر رومال باندھ کر خون میں لت پت ڈاکخانے آ گیا۔ اسے دیکھ کر پوسٹ ماسٹر صاحب بڑے پریشان ہوئے۔ اللہ دتا نے انہیں ساری بات سے آگاہ کیا۔ پوسٹ ماسٹر صاحب کہنے لگے کہ کیا تم نے

کچھ لگایا بھی کہ نہیں! وہ کہنے لگا نہیں جی بس بے چارہ پھیکا ہی کھا گیا۔ میں نے وہاں کچھ لگایا تو نہیں تھا۔ اب وہ ناداں سمجھ رہا تھا کہ آیا پوسٹ ماسٹر صاحب یہ کہہ رہے ہیں کہ اس نے ٹانگ پر کتے کے کاٹنے سے پہلے کچھ لگایا ہوا تھا کہ نہیں۔ ہم اسے بعد میں ہسپتال لے کر گئے اور اسے ٹیکے ویکے لگوائے۔ وہ بڑی دیر کی بات ہے لیکن وہ مجھے جب بھی یاد آتا ہے تو خیال آتا ہے کہ وہ کتنا عجیب و غریب آدمی تھا جو گھبراتا ہی نہیں تھا اور ایسے آدمی پر کبھی خواہش گھیرا نہیں ڈال سکتی۔ انسان جب بھی خوش رہنے کے لیے سوچتا ہے تو وہ خوشی کے ساتھ دولت کو ضرور وابستہ کرتا ہے اور وہ امارت کو مسرت سمجھ رہا ہوتا ہے۔ حالانکہ امارت تو خوف ہوتا ہے اور آدمی امیر دوسروں کو خوفزدہ کرنے کے لیے بننا چاہتا ہے۔ جب یہ باتیں ذہن کے پس منظر میں آتی ہیں تو پھر خوشی کا حصول ناممکن ہو جاتا ہے۔ ہم ایک بار ایک دفتر بنا رہے تھے اور مزدور کام میں لگے ہوئے تھے۔ وہاں ایک شاید سلطان نام کا لڑکا تھا وہ بہت اچھا اور ذہین آدمی تھا اور میں متجسس آدمی ہوں اور میرا خیال تھا کہ کام ذرا زیادہ ٹھیک ٹھاک انداز میں ہو۔ میں اس مزدور لڑکے کا کچھ گرویدہ تھا۔ اس میں کچھ ایسی باتیں تھیں جو بیان نہیں کی جا سکتیں۔ ہم دوسرے مزدوروں کو تیس روپے دیہاڑی دیتے تھے لیکن اسے چالیس روپے دیتے تھے۔ وہ چپس کی اتنی اچھی رگڑائی کرتا تھا کہ چپس پر کہیں اونچ نیچ

یادھاری نظر نہیں آتی تھی۔ وہ ایک دن دفتر نہ آیا تو میں نے ٹھیکیدار سے پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آیا۔ میں بھی دیگر افسر لوگوں کی طرح جس طرح سے ہم گھٹیا درجے کے ہوتے ہیں میں نے اس کا پتہ کرنے کا کہا۔ وہ اچھرہ کی کچی آبادی میں رہتا تھا۔ میں اپنے سیکرٹری کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر اسے لینے چلا گیا۔ بڑی مشکل سے ہم اس کا گھر ڈھونڈ کر جب وہاں گئے تو سیکرٹری نے سلطان کر کے آواز دی۔ اس نے کہا کہ کیا بات ہے؟

میرے سیکرٹری نے کہا کہ صاحب آئے ہیں۔ اس نے جواب دیا کیہڑا صاحب! سیکرٹری نے کہا کہ ڈائریکٹر صاحب۔ وہ جب باہر آیا تو مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا اور اس نے انتہائی خوشی کے ساتھ اندر آنے کو کہا۔ لیکن میں نے اس سے کہا کہ میں سخت ناراض ہوں اور میں تمہاری سرزنش کے لیے آیا ہوں۔ وہ کہنے لگا کہ سر میں بس آج آ نہیں سکا۔ ایک مشکل ہو گئی تھی۔

میں نے کہا کونسی مشکل۔ تم ہمیں بغیر بتائے گھر بیٹھے ہوئے ہو اور اس طرح سے میری بڑی توہین ہوئی ہے کہ تم نے اپنی مرضی سے چھٹی کر لی۔ وہ کہنے لگا کہ سر آپ برائے مہربانی اندر تو آئیں۔ وہ مجھے زبردستی اندر لے گیا۔ اس کی بیوی

چائے بنانے لگ گئی۔ میں نے اس سے کہا میں چائے نہیں پیئوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے چھٹی کیوں کی؟

وہ کہنے لگا کہ سر جب کل شام کو میں گھر آیا تو ٹین کے کنستر میں میں نے سورج مکھی کا ایک پودا لگایا ہوا تھا اور اس میں ڈوڈی کھل کے اتنا بڑا پھول بن گیا تھا کہ میں نے کھڑا کھڑا اسے دیکھتا رہا اور میری بیوی نے کہا کہ یہ پہلا پھول ہے جو ہمارے گھر میں کھلا ہے۔

وہ کہنے لگا کہ سر مجھے وہ پھول اتنا اچھا لگا کہ میں خوشی سے پاگل ہو رہا تھا اور جب ہم کھانا کھا چکنے کے بعد سونے لگے تو میری بیوی نے مجھے کہا کہ "سلطان کیا تمہیں معلوم ہے آج ہمارا کاکا چلنے لگا ہے اور اس نے آٹھ دس قدم اٹھائے ہیں۔" اس وقت کاکا سو چکا تھا لیکن جب میں صبح اٹھا تو میں نے اپنے بیٹے کو بھی جگایا اور ہم میاں بیوی دور بیٹھ گئے۔ ایک طرف سے میری بیوی کاکے کو چھوڑ دیتی۔ اور وہ ڈگمگاتا ہوا میری طرف چلتا ہوا آتا اور جب وہ مجھ تک پہنچتا تو میں اس کی ماں کی طرف اس کا منہ کر دیتا تو وہ ڈر مگ ڈگ مگ کرتا ماں تک پہنچتا اور ٹھاہ کر کے اس سے چمٹ جاتا۔ ہم بڑی دیر تک اپنے بیٹے کو دیکھتے رہے۔ وہ کہنے

لگا" سر اتنا اچھا پھول کھلا ہو اور بچے نے ایسا اچھا چلنا سیکھا ہو اور ایسا خوب صورت دن ہو تو اسے چالیس روپے میں تو نہیں بیچا جا سکتا نا!

سر آج کا دن میرا ہے۔ اب میں شرمندہ سا ہو کر واپس آ گیا۔

خواتین و حضرات! اگر انسان میں اتنی طاقت ہو اور وہ ایسی صلاحیت رکھتا ہو تو پھر وہ خوشیوں کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے لیکن اگر اس کی زندگی کی خوشیاں ایسی ہوں جیسی ہماری ہیں اور جن کے ہم قریب بھی نہیں پھٹک سکتے اور ٹین کے کنستر میں لگا پھول ہمیں کبھی نظر ہی نہیں آ سکتا ہے۔ ہمیں خوشیاں بانٹنا آتا ہی نہیں۔ ہم نے یہ فن سیکھا ہی نہیں ہے۔

شیئر کرنا ایک ایسا مشکل کام ہے کہ ہمیں یہ کسی سکول، کالج یا یونیورسٹی نے سکھایا نہیں ہے۔ ہمیں اپنی چیزیں سنبھال کر رکھنے کی ہی ہمیشہ تلقین کی گئی ہے۔ جب پاکستان نہیں بنا تھا اس وقت تو ہمارے ہندو دوست کھانا کھاتے ہوئے اوپر پردہ ڈال لیتے تھے کہ کہیں کوئی اور کھانا نہ مانگ لے اور شریک نہ ہو جائے۔ اب ہمارے ہاں بھی ایسا رواج پروان چڑھ گیا ہے اور ہمیں بھی چھپانا آ گیا ہے اور ہم شیئر کرنے سے گھبراتے ہیں۔ اور ہماری گردنوں پر یہی بوجھ و بال بنا ہوا ہے۔ میں اکثر چھوٹے بچوں، اپنے پوتوں پوتیوں اور نواسیوں سے کہتا ہوں کہ تمہارا

زیادہ قصور نہیں ہے۔ ہمارے سارے ہی علاقے پر تیزاب کی بارش ہو رہی ہے اور جب باہر نکلو گے تو اس کے چھینٹے پڑیں گے ہی اور آپ کو ڈپریشن کا شکار ہونا پڑے گا کیونکہ آپ اپنا آپ کھول نہیں سکتے ہیں۔ اللہ کہتا ہے کہ جس طرح کا میں نے تمہیں بنایا ہے تم ویسے ہی ٹھیک ہو۔ آپ اس ناک۔ آنکھ، کان اور بالوں کو دیکھ کر خدا کی تعریف کرو اور سبحان اللہ کہو پھر دیکھو کتنی نعمتیں آپ پر وارد ہوتی ہیں۔ جیسے جانوروں، درختوں اور پرندوں پر وارد ہوتی ہیں۔ آپ نے کبھی دیکھا کہ پرندہ کس قدر خوش نصیب ہے جو گاتے گاتے فوت ہو جاتا ہے۔ اس کی موت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ وہ ہم انسانوں کی طرح موت سے خوف زدہ ہو کر کئی دفعہ نہیں مرتا ہے۔ اسے فکرِ فردا نہیں ہوتی ہے۔ ہم فکرِ فردا کے عذاب میں مبتلا ہو کر مرتے جا رہے ہیں۔

بانو قدسیہ کی والدہ جو میری ساس تھیں وہ لمبے لمبے دوروں پر جایا کرتی تھیں۔ وہ اپنے ساتھ "کروشیا" ضرور رکھتی تھیں۔ (شاید ہمارے ان بچوں کو کروشیئے کا پتہ نہ ہو۔) وہ سفر میں اپنے ساتھ کروشیئے کے ساتھ کھٹا کھٹ بنتی جاتی ہوتی تھیں اور جب دورے سے لوٹ کر آتی تھیں تو ان کے پاس کچھ نہ کچھ بنا ہوا اور مکمل ہوا ہوتا تھا۔ جب کبھی ولایت کی خواتین آتی تھیں تو انہیں دیکھ کر بہت حیران ہوتی تھیں۔ ایک دفعہ ہم اسلام آباد جا رہے تھے تو انہوں نے اپنا کروشیا نکال لیا اور

کچھ بننے لگیں۔ ان کے ساتھ ایک خاتون بیٹھی تھیں۔ وہ انہیں بڑے غور سے دیکھنے لگیں۔ (ان دنوں فوکر کا زمانہ تھا) وہ خاتون کہنے لگیں کہ آپ نے تو بڑے کمال کا ڈیزائن بنایا ہے۔ یہ بہت خوب صورت ہے۔ وہ گلاس کے نیچے رکھنے والی کوئی چیز تھی۔ میری ساس اس خاتون کو کہنے لگی کہ یہ اب مکمل ہو گیا اور یہ اب تمہارا ہوا۔ اس نے بڑی مہربانی اور شکریے سے وصول کیا۔ جب میری ساس صاحبہ اس طرح کی کوئی دوسری چیز بنانے لگیں تو اس خاتون نے کہا کہ یہ تو میں حیدر کو دے دوں گی اور میں چاہتی ہوں کہ اس جیسا ایک اور میرے پاس بھی ہو۔ میری ساس کہنے لگی کہ وقت تھوڑا ہے اور یہ بن نہیں پائے گا۔ آپ مجھے اپنا ایڈریس دے دیں میں پہنچا دوں گی۔ لیکن انہوں نے بنانا شروع کر دیا۔ جب ہم پنڈی پہنچے تو اناؤنسمنٹ ہوئی کہ بہت دھند ہے جس کی وجہ سے لینڈنگ ممکن نہیں ہے لہٰذا اس جہاز کو پشاور لے جایا جا رہا ہے۔ اس سے میری ساس بڑی خوش ہوئی کہ اسے مزید وقت مل گیا ہے۔ جب پشاور لینڈ کرنے لگے تو پائلٹ کی آواز آئی کہ ہم یہاں لینڈ کرنے آئے تھے لیکن حیرانی کی بات ہے کہ اب یہاں کا موسم بھی پنڈی جیسا ہو گیا ہے۔ لہٰذا ہمیں واپس پنڈی جانا ہو گا کیونکہ اطلاع ملی ہے کہ وہاں کا موسم ٹھیک ہو گیا ہے۔ جب ہم پنڈی آئے تو وہ چیز تھوڑی سی رہ گئی اور مکمل نہیں ہوئی تھی۔ پائلٹ کی آواز پھر گونجی کہ ہم

لینڈنگ کرنے والے ہیں لیکن ایک دو چکر اور لگائیں گے تاکہ رن وے کا درست اندازہ ہو سکے۔ جب وہ چیز مکمل بن چکی اور دو چکر بھی مکمل ہو گئے تو جہاز میں موجود ایک فوجی نے تالی بجائی اور میری ساس کو مخاطب کرتے ہوئے بولا کہ "بیگم صاحبہ اب لینڈ کرنے کی کیا اجازت ہے۔" میری ساس نے کہا کہ ہاں اب ہے کیونکہ یہ بن چکا ہے۔

ہم نے اور آپ نے کبھی شیئر کرنے والا کام نہیں کیا ہے۔ ہم نے کبھی خوشیوں کو شیئر نہیں کیا۔ آپ ہمارے ٹی وی اسٹیشن کے سٹوڈیو میں داخل ہوتے ہیں تو آپ کو ایک کوری ڈور کے درمیان میں ایک حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہٰ وسلم کا ارشادِ گرامی لکھا ملے گا کہ "مسکراہٹ بھی ایک صدقہ جاریہ ہے۔" لیکن ہم نے اپنی مسکراہٹ پر بھی کنٹرول رکھا ہوا ہے کہ خبردار مُسکرانا نہیں۔ جب ہم کالج یونیورسٹی میں جاتے ہیں تو ہمارا منہ ایسے سوجا ہوتا ہے جیسے پتہ نہیں کیا غضب ہو گیا اور ہم کہتے ہیں کہ ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ ہم مسکراتے پھریں۔ ہمارا تو دین ہی سلامتی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جب ہم کسی کو السّلام و علیکم کہہ دیں تو پھر اس کا قتل نہیں کر سکتے۔

آپ کا اگر کسی کو قتل کرنے کا ارادہ ہو خدانخواستہ تو پھر السّلام و علیکم نہ کہنا(مسکراتے رہنا) کیونکہ آپ اس شخص پر پہلے سلامتی بھیج دیں گے تو اسے قتل کیسے کریں گے۔ جب تک آپ خوشیاں بانٹیں گے نہیں خوشیاں پا نہیں سکتے۔

(حاضرین محفل میں سے ایک صاحب بولتے ہیں) اشفاق صاحب ایک حوالے سے حالی کا ایک شعر ہے۔

پر طلب ہو کر مزے سے زندگی کرتے رہے

اس خاموشی نے ہمارا بوجھ ہلکا کر دیا

اشفاق صاحب: واہ واہ کیا بات ہے۔(ایک اور صاحب گویا ہوتے ہیں)۔

شیئر کرنے میں ہماری سوسائٹی میں ایک خوف بھی پایا جاتا ہے کہ کہیں ہم سے کوئی کچھ نہیں نہ لے۔

اشفاق احمد: تھوڑا نہیں بہت زیادہ خوف پایا جاتا ہے لیکن اگر سٹارٹ مسکراہٹوں سے لیا جائے چاہے وہ کروشیئے سے ہی کیوں نہ ہو تو وہ خوف ناک بات نہیں ہے۔ ہمارے بابا جی نور والے ایک دن کہنے لگے کہ اشفاق میاں تمہارے پاس جو لکھنے

والا پین ہے وہ کتنے کا ہے۔ میں نے کہا جناب جو میرے پاس ہے وہ ایک سو نوّے روپے کا ہے اور بہت اچھا ہے۔ وہ کہنے لگے جب بھی پین خریدیں سستا خریدیں۔

وہ پوچھنے لگے کہ سستا کتنے کا آتا ہے۔؟

میں نے کہا کہ وہ ایک روپے اسّی پیسے کا آتا ہے۔ (اس زمانے میں آتا تھا)۔ فرمانے لگے بس وہی لے لیا کرو۔ میں نے کہا کہ اتنا سستا پین خریدنا تو میری بڑی بے عزتی ہے۔ وہ کہنے لگے پتہ جب کبھی آپ ڈاکخانے جائیں اور کوئی آپ سے پین مانگ لے کہ مجھے پتہ لکھنا ہے اور وہ بھول کر اپنی جیب میں لگا کے چلا جائے تو آپ کو کوئی غم نہیں ہو گا اور آپ آرام سے سو جائیں گے لیکن اگر ایک سو نوّے روپے والا ہو گا تو آپ کو بڑا دکھ ہو گا۔ خواتین و حضرات اپنے دکھ اور کوتاہیوں دور کرنے کے لیے آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم تسلیم کرنے والوں میں ماننے والوں میں شامل ہو جائیں اور جس طرح خداوند تعالیٰ کہتا ہے کہ دین میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ میرا بڑا بیٹا کہتا ہے کہ ابو دین میں پورے کے پورے کس طرح داخل ہو جائیں تو میں اس کو کہتا ہوں کہ جس طرح سے ہم بورڈنگ کارڈ لے کر ائیرپورٹ میں داخل ہو جاتے ہیں اور پھر جہاز میں بیٹھ کر ہم

بے فکر ہو جاتے ہیں کہ یہ درست سمت میں ہی جائے گا اور ہمیں اس بات کی فکر لاحق نہیں ہوتی کہ جہاز کس طرف کو اڑا رہا ہے۔ کون اڑا رہا ہے بلکہ آپ آرام سے سیٹ پر بیٹھ جاتے ہیں اور آپ کو کوئی فکر فاقہ نہیں ہوتا ہے۔ آپ کو اپنے دین کا بورڈنگ کارڈ اپنے یقین کا بورڈنگ کارڈ ہمارے پاس ہونا چاہیے تو پھر ہی خوشیوں میں اور آسانیوں میں رہیں گے وگرنہ ہم دکھوں اور کشمکش کے اندر رہیں گے اور تسلیم نہ کرنے والا شخص نہ تو روحانیت میں داخل ہو سکتا ہے اور نہ ہی سائنس میں داخل ہو سکتا ہے۔ جو چاند کی سطح پر اترے تھے جب انہوں نے زمین کے حکم کے مطابق ورما چلایا تھا تو اس نے کہا کہ ورما ایک حد سے نیچے نہیں جا رہا۔ جگہ پتھریلی ہے لیکن نیچے سے حکم اوپر گیا کہ نہیں تمہیں اسی جگہ ورما چلانا ہے۔ وہ ماننے والوں میں سے تھا اور اس نے بات کو تسلیم کرتے ہوئے اسی جگہ ورما چلایا اور اس کے بالآخر وہ گوہر مقصود ہاتھ آ گیا جس کی انہیں تلاش تھی۔

خواتین و حضرات ماننے والا شخص اس زمین سے اٹھ کر افلاک تک پہنچ جاتا ہے اور وہ براق پر سوار ہو کر جوتوں سمیت اوپر پہنچ جاتا ہے اور جو نہ ماننے والا ہوتا ہے وہ بے چارہ ہمارے ساتھ یہیں گھومتا پھرتا رہ جاتا ہے۔ سائنسدان کہتے ہیں کہ جب ہم یہ مان لیتے ہیں کہ زمین میں کششِ ثقل ہے تو پھر ہم آگے چلتے ہیں اور ہمارا اگلا سفر شروع ہوتا ہے جبکہ نا ماننے سے مشکل پڑتی ہے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ۔

"بھائی والی" کا رشتہ

آج سے کئی ہفتے قبل میں نے اپنے بابا جی نور والے کا ایک واقعہ بیان کیا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ تو نے رکشہ والے کو کون سے پلے سے پیسے دیئے تھے۔ وہ "دتے میں سے ہی تو دیے تھے" اگر سوا چار روپے بنتے تھے تو پورے پانچ روپے ہی دے دیے ہوتے۔ ڈیرے پر جانے سے ہمارے دوست ابن انشاء بڑے ناراض ہوتے تھے۔ انہوں نے مجھے ناراض ہو کر کہا کہ "تو وہاں کیا کرنے جاتا ہے؟ یہ ڈیرے فضول جگہیں ہیں" لوگ وہاں بیٹھ کے روٹیاں کھاتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں اور پھر اٹھ کر چلے آتے ہیں انہیں وہاں سے کیا ملتا ہے؟ میں نے رکشہ والا واقعہ ابن انشاء کو بھی سنایا اور اس نے اپنے ذہن کے نہاں خانے میں یہ واقعہ ایسے نوٹ کر لیا کہ مجھے اس دن کے واقعہ سے وہ کچھ نہیں ملا جو اس نے حاصل کر لیا اور پھر وہ "دتے میں سے دیتا رہا" اور ابن انشاء کی زندگی میں ایک مقام ایسا بھی آیا کہ وہ دے دے کر تنگ آ گیا اور اس نے کہا کہ اب میں کسی کو ٹکا تو دور کی بات ٹکنی بھی نہیں دیتا کیونکہ اس طرح دتے میں سے دینے

سے میرے پاس اتنے پیسے آنے شروع ہو گئے ہیں کہ میں پیسے جمع کرانے کے لئے بینک کی سلیپیں بھی نہیں بھر سکتا(وہ بھی ہماری طرح سست آدمی تھا)اس نے کہا کہ میرے پاس اتنے پیسے آنے لگے کہ میرے لئے انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ ہمارے سارے ہی بابے ایسی باتیں سمجھاتے رہتے ہیں۔ جب ہم اپنے بابا جی کے پاس ڈیرے پر جاتے ہیں تو وہاں ایک چھوٹی سی رسم ہوتی ہے جس میں بابا جی ایک شخص کو دوسرے شخص کا شراکت دار یا شریک بھائی بنا دیتے ہیں جیسا کہ مدینہ شریف میں ہوا تھا۔ وہ بھی اسی واقعہ کی نقل کرتے ہوئے یا اس کی پیروی کرتے ہوئے ایک شخص کو کہتے ہیں کہ اب سے فلاں شخص تمہارا شریک بھائی ہے۔ کئی دفعہ وہ شریک بھائی پسند آتا ہے اور بعض اوقات پسند نہیں آتا لیکن بابا جی کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے با امر مجبوری شریک بھائی کو ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے۔ میں نے زندگی میں یہ بات محسوس کی ہے کہ نہ صرف انسانی زندگی شیئرنگ میں مصروف ہے بلکہ شجر حجر پہاڑ پتھر دریا بھی اس کائنات میں ایک دوسرے کے ساتھ شیئر کرتے ہوئے چلتے ہیں۔ شراکت کسی کو کچھ دینے سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ کسی کو پیسے یا مثال کے طور پر دس لاکھ کا چیک دے کر آپ تو آزاد ہو جاتے ہیں لیکن ایک آدمی کے ساتھ شیئر کرنا مشکل ہے۔ بہو کا اپنی ساس کے ساتھ شیئر کرنا یا شوہر کا بیوی کے ساتھ شیئرنگ کی زندگی زیادہ

کٹھن کام ہے۔ یہ باتیں ہمیں بابے لوگ یہ بتاتے تھے۔ ہمیں یہ باتیں کہیں کتابوں میں تو نظر نہیں آئیں۔ بابا جی فرمایا کرتے تھے کہ درخت بھی ہمارے ساتھ شیئر کرتے ہیں اور درختوں کو بھی اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ "میں مسمی درخت پیپل اشفاق احمد کے ساتھ شیئر کر رہا ہوں۔ یہ جتنی کاربن ڈائی آکسائیڈ چھوڑے گا میں اس کو خوش دلی سے قبول کروں گا اور میں اس کے جواب میں اس کے لئے آکسیجن فراہم کرتا رہوں گا۔ چاہے میں کہیں بھی رہوں یہ رشتہ قائم رہے گا۔

اس طرح بڑی بڑی چیزیں سورج چاند بھی شیئر کرنے والے ہیں۔ جب ہم اس وقت سٹوڈیو میں بیٹھے پروگرام کر رہے ہیں ہمارا کے-ٹو تقریباً ایک کروڑ ٹن برف کی پگڑی باندھ کر ہر وقت شیئرنگ کے لئے مستعد اور تیار ہے اور وہ سورج کو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ دو روشنی کی مزید کرنیں مجھ پر ڈال۔ جھنگ میں پانی کم ہو گیا ہے اور مجھے چناب میں پانی بھیجنا ہے۔ اس نے برف اپنے لئے اکٹھی نہیں کی یہ اس کا اپنا شوق نہیں ہے۔ اس کو تھوڑی زینت کا شوق تو ضرور ہے کہ لوگ میرا نام لیں اور میرے درشن کرنے کو یہاں آئیں لیکن اس کا باقی تمام کام دوسروں کی خدمت ہے۔ سورج اپنی گرمی کا کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا ہے۔ ایک

فلسفی نے بڑا خوبصورت فقرہ لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "بڑھاپے میں انسان کی کیفیت ایسے ہو جاتی ہے جیسے ڈوبتا ہو سورج"۔

خواتین و حضرات! ڈوبتے سورج کی روشنی صرف اپنے آپ کو دہکانے کے لئے درکار ہوتی ہے۔ لیکن سارا دن وہ اپنی روشنی دوسروں کو ہی عطا کرتا ہے اور اسے اس کا فائدہ نہیں ہوتا۔ اس طرح ہوائیں بادل سب شیئر کرنا جانتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے۔ ہمارے دوست قدرت اللہ شہاب کی والدہ "ماں جی" دوپہر کو کھانا کھا کے ایک خاص کونے میں ایک خاص چارپائی پر لیٹ جاتی تھیں اور انہوں نے ہلکا سا ایک کمبل اوڑھا ہوتا تھا۔ اس گھر کی بلی جو اپنا حق جانتی تھی جیسے ہی ماں جی سوتیں وہ بلی بھی چھلانگ لگا کر چارپائی پر چڑھ جاتی تھی اور پھر آہستگی کے ساتھ اپنے دونوں پنجے لگا کر ماں جی کو دھکیلتی تھی کہ مجھے بھی سونے کے لئے جگہ دو۔ وہ بڑا کمال کا سین ہوتا تھا اور اکثر شہاب مجھے کہتے تھے کہ جلدی آؤ، جلدی آؤ ماں جی اور بلی میں مقابلہ ہو رہا ہے اور ماں جی اسے "دفع ہو" یا ذرا سی کوئی بات کہہ کر اس کے لئے جگہ چھوڑتی جاتی تھیں کیونکہ وہ ایک ایسا رشتہ تھا شراکت کا کہ وہ بلی کو کوستے ہوئے آگے کھسکتی جاتی تھیں اور بلی اپنی پوری جگہ بنا کر نیم دراز ہو جاتی تھی۔ پیارے بچو! جب تک ہم انسانوں کے درمیاں شیئرنگ کا رشتہ قائم رہے گا یہ دنیا خوش اسلوبی سے چلتی رہے گی۔ لیکن جب شیئرنگ میں رخنہ

پڑنے لگتا ہے جیسا کہ ہمارے ہاں پڑ رہا ہے تو بے زاری بڑھ جاتی ہے اور اس طرح سے آدمیوں کو ایک دوسرے سے علیٰحدہ کیا جا رہا ہے اور "نکھیڑا" جا رہا ہے۔ یہ ایک خوفناک صورتحال ہے۔ ایک زمانے میں جب میں نے بی-اے کر لی تو میں نے بھی گھر والوں سے لڑائی کی کیونکہ جب بچہ سیانا ہو جاتا ہے تو وہ گھر والوں سے لڑتا ضرور ہے۔ سیانا ہونے کے بعد وہ سب سے پہلے تھرڈ ائیر میں کمیونسٹ بن جاتا ہے۔ دوسرا وہ گھر والوں سے ضرور لڑتا ہے۔ میں بھی کچھ ایسے ہی ناراض ہو کر گوجر خان چلا گیا۔ یہ میں آپ کو خفیہ بات بتا رہا ہوں۔ وہاں جا کر میں سکول ماسٹر لگ گیا۔ وہاں ایک بڑے اچھے آدمی ہوتے تھے ان کا تھوڑا سا تصوف کے ساتھ بھی لگاؤ تھا۔ ہم شام کو ان کی بیٹھک میں بیٹھتے تھے۔ وہاں اور بھی بہت سے لوگ آتے تھے اور باتیں بھی ہوتی تھیں۔ وہاں ایک آدمی نابی کمہار بھی آتا تھا۔ تھا تو وہ کمہار لیکن کوزہ گر کو خدا نے بڑی صلاحیتوں سے نوازا ہوتا ہے۔ اس کی سوچ بڑی عجیب ہوتی تھی۔ وہ ایک روز وہاں آیا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ صاحب جی، یہ جو زمین ہے اس کا وزن کتنا ہے؟ اس کا کام مٹی کا تھا تو ظاہر ہے اس کی دلچسپی مٹی میں زیادہ ہونی تھی۔ میں جسے اپنے علم پر بڑا ناز تھا، میں نے کہا کہ زمین کے بوجھ کے بارے میں تو میں نہیں جانتا لیکن میں تمہیں کہیں سے دیکھ کر ضرور بتاؤں گا۔ میں نے سکول کی لائبریری سے انفارمیشن اور

معلومات کی کتابیں نکال نکول اور جوڑ جاڑ کے دیکھا اور اس سے کہا کہ بھئی دیکھو زمین کا وزن سائنس کی رو سے اتنے ہزار اتنے لاکھ، اتنے کروڑ ٹن ہے۔ اسے ٹن کے بارے میں بھی بتایا کہ ایک ٹن ۲۸ من کا ہوتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے طرف سے اس قدر مشکل سوال حل کر دیے جانے کے باوجود بھی وہ مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ وہ مجھ سے پھر گویا ہوا اور اس نے مجھ سے یہ بات پوچھ کر مجھے حیران کر دیا یہ

"جی ایہہ وزن بندیاں سمیت اے کہ بندیوں بگیر "

اس وقت تو میں اس کی اس بات پر چڑا بھی کہ یہ کیسی بات کر رہا ہے لیکن آج میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہر چیز کی بندے کے ساتھ شراکت ہے۔ جب ہم سڑک پر گاڑی چلاتے ہیں تو دوسروں کو یکسر بھلا دیتے ہیں اور ہم کہتے ہیں کہ بس ہم ہی ہیں۔ میرا بھی یہی حال ہے۔ میں بھی کہتا ہوں کہ بس میں ہی ہوں اور "گلیاں ہون سنجیاں تے بس میرا مرزا یار پھرے" میں سمجھتا ہوں کہ مجھے کیا پروا ہے کہ میں لین کے اندر چلوں یا سڑک کو شیئر کروں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم میں شیئر کرنے کا رجحان ختم ہو چکا ہے اور جس قوم یا گروہ انسانی میں شیئرنگ کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے وہ سوسائیٹی غرق ہونے لگتی ہے۔ ڈوبنے لگتی ہے۔ ہم

شیئرنگ کے بغیر نہیں چل سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا نظام ہی ایسا بنایا ہے۔ آج سے تین چار سال پہلے میں امریکہ گیا۔ میرا بیٹا وہاں پروفیسر ہے۔ ہم اس کی یونیورسٹی سے واپس آرہے تھے تو ہماری گاڑی سے آگے ایک اور گاڑی جارہی تھی۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ میں نے اپنے بیٹے سے کہا کہ یار اس سے آگے نکلو۔ یہ تو بہت آہستہ جارہا ہے۔ کہتا اچھا ابو گزرتے ہیں اور وہ آگے نکلنے میں بہانے بازی کر رہا تھا۔ میں نے غصے سے کہا کہ تم اس کو ہارن دو اور اسے ایک طرف کر دو۔ وہ کہنے لگا کہ ابو اسے ہوٹ نہیں کر سکتے کیونکہ یہ عمر رسیدہ آدمی ہے جو گاڑی چلا رہا ہے۔ اگر میں ہارن دوں گا تو یہ گھبرا جائے گا اور کسی نقصان کا اندیشہ ہے۔ میں نے کہا دفع کریا اگر نقصان ہوتا ہے تو اس کا ہونا ہے ہمیں کیا؟ میرا بیٹا کہنے لگا کہ ابھی موڑ آجائے گا تو اس سے آگے نکل جائیں گے اور وہ ویسے یہ آہستہ آہستہ گاڑی چلاتا رہا۔ میں نے اس سے کہا کہ تم میری بات کیوں نہیں مانتے؟ وہ کہنے لگا کہ ابو بات یہ ہے کہ یہ میرا کولیگ ہے۔ میں نے کہا کہ اچھا کیا یہ تمہارے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھاتا ہے؟ اس نے جواب دیا نہیں۔ میں نے کہا کہ کیا یہ تمہارے ساتھ ایڈمنسٹریشن میں ہے؟ وہ کہنے لگا کہ نہیں۔ میں نے کہا پھر یہ تمہارا ساتھی کیسے ہو گیا؟ وہ کہنے لگا کہ یہ ابو He is my road fellow اور میں اسے گھبرانا پسند نہیں کرتا۔ میں نے کہا کہ لعنت! تمہیں

پڑھنے اس لئے بھیجا تھا کہ اس طرح کی فضول باتیں سیکھ لے۔ ادھر لاہور یا کراچی میں آ کے گاڑی چلا اور کھٹا کھٹ کسی کے بیچ میں مار۔ یہ تو نے کیا نئی اصطلاح "سڑک کا ساتھی" بنا رکھی ہے۔ یہ کوئی رشتہ وشتہ نہیں ہے۔

خواتین و حضرات! جب شیئر نگ کی تار ٹوٹتی ہے تو پھر اس قسم کی مشکلات پیدا ہوتی ہیں اور نواب دیں (نابی کمہار) جیسا کمہار پیدا ہوتا ہے تو وہ شیئر نگ کے رشتے کو جوڑتا ہے جیسے کہ وہ مٹی کو جوڑ کر کوزہ بناتا ہے بالکل اسی طرح سے ہے۔

میں عرض کر رہا تھا کہ کسی کو کچھ دے دینا تو بڑا ہی سہل کام ہے۔ شیئر کرنا مشکل کام ہے۔ میاں بیوی کا خاص طور پر شیئر نگ کا بہت عجیب رشتہ ہے۔ نہ بھی پسند ہو تو بھی تعلق رکھنا پڑتا ہے۔ قرآن پاک میں بھی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم کو اپنی بہت سی بیویاں ناپسند ہوں گی لیکن تم نے ان سے ساتھ رہنا ہے۔ جوڑنے والے اپنی جسمانی یا نفسیاتی تکلیف کے باوجود کیا کچھ حاصل کرتے ہوں گے اس کا اندازہ ہمیں نہیں ہے۔ لیکن ہمارے بابے کہتے ہیں کہ شیئر نگ کرنے سے آپ کو ایک عجیب طرح کی تقویت ملتی ہے۔ ایسی ہی تقویت جو آپ کو آکسیجن کی صورت میں درخت سے حاصل کرتے ہیں جس سے آپ توانا رہتے ہیں۔ اگر

آپ زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں شراکت اور "بھائی والی" کے اوپر غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ آپ کے اردگرد کس طرح سے شیئرنگ کا عمل جاری ہے۔ لیکن یہ عمل توجہ دینے سے نظر آتا ہے اور جس وقت اس عمل کو اپنی زندگی میں شامل نہ کر لیا جائے مشکل ہو جائے گی اور ہم اس مشکل میں سے گزر رہے ہیں اور ساری دنیا اس شیئرنگ سے نکل رہی ہے۔ میرے ایک دوست کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ اس کا نام صائمہ تھا۔ جب ہم سمن آباد میں رہتے تھے اس کی وہاں شادی ہو گئی پھر وہ سمن آباد سے شادی کے بعد لندن چلی گئے۔ اس کا خاوند انجنیئر تھا۔ وہ لندن سے پھر کینیڈا شفٹ ہو گئے۔ جب ان کے ماشاءاللہ دو تین خوبصورت سے بچے ہو گئے تو پھر صائمہ نے کہا کہ ہم کتنی دیر باہر رہیں گے اور اس کے بعد وہ واپس گھر لاہور آ ئے۔ پہلے تو وہ پوش ایریا ڈیفنس میں رہے پھر گلبرگ آئے اور آخر کار وہ سمن آباد میں ہی آ گئے حالانکہ یہ علاقہ ان کے مزاج کے مطابق نہیں تھا اور نہ ہی یہ علاقہ ان کے بودوباش کے لیول پر پورا اترتا تھا۔ ایک دن میں اپنے دوست اے حمید سے ملنے کے لئے جا رہا تھا تو وہ مجھے راستے میں مل گئی اور اس نے مجھے بتایا کہ انکل آج کل میں سمن آباد میں ہوں۔ میں نے کہا کہ تم نے علاقہ کیوں نہیں بدلا۔ وہ کہنے لگی کہ انکل ایک تو اس علاقے سے میری بچپن کی یادیں وابستہ ہیں اور یہاں سٹور بھی بڑا نزدیک ہے جو

چیز نہیں ہوتی وہ میں جھٹ سے لے آتی ہوں۔ میں نے کہا کہ سمن آباد میں ایسا کون سا اشیائے ضروریہ کا سٹور ہے جس سے ہر چیز دستیاب ہے۔ وہ کہنے لگی انکل بہت بڑا ہے اور نہایت اعلیٰ درجے کا ہے۔ میں نے کہا کہ میں نے تو نہیں دیکھا۔ کہنے لگی اماں کا گھر میرے گھر کے نزدیک ہی ہے جس چیز کی ضرورت پڑتی ہے وہاں سے جا کے لے آتی ہوں۔ اس سے اچھا سٹور تو مجھے ملا ہی نہیں۔ میں بڑی دیر اس سے باتیں کرتا رہا اور خوش ہوتا رہا۔ شیئرنگ اس طرح سے ہوتی ہے اور اس کی جڑیں کئی طرح سے ملی ہوتی ہیں۔ اب آپ کو ذات کے حوالے سے یہ فیصلہ خود کرنا ہے اور ایسا فیصلہ کرنے کے لئے ایک وقت ضرور مقرر کرنا پڑے گا جس میں آپ اپنے آپ کا احاطہ کریں۔ لوگوں نے مجھ سے مراقبہ کے حوالے سے پوچھا بھی ہے اور میں انشاء اللہ کسی اور پروگرام میں مراقبہ کی تمام اقسام عرض کروں گا اور وہ اقسام اکتسابی طور پر ہی ہوں گی کیونکہ میں خود تو اس کا ماہر نہیں ہوں۔ مراقبہ ایک خود احتسابی کا طریقہ ہی تو ہے۔ وگرنہ انسان لوگوں پر تنقید کرتا ہوا ہی اس جہان فانی سے گزر جاتا ہے۔ آپ کو شراکت کی ہلکی ہلکی لہریں نہ صرف اپنے علاقے، گھر یا ملک میں ملیں گی بلکہ آپ جہاں بھی چلے جائیں جہاں بھی انسان آباد ہیں اور جہاں بھی اللہ کے نظارے ہیں وہ نظارے اور فضائیں آپ کو اپنے ساتھ شیئر کرتی ہوئی ہی ملیں گی۔ آپ مری اور بھوربن

کیوں جاتے ہیں؟ وہ بھوربن آپ کا انتظار کر رہا ہوتا ہے کہ پلیز آجاؤ بڑی دیر ہو گئی ہے۔ میں آپ کے ساتھ کچھ شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ جب آپ وہاں سے ہو کر آتے ہیں تو آپ کو احساس ہوتا ہے کہ بھوربن میرے ساتھ کچھ شیئر کر رہا تھا کیونکہ آپ کا وہاں جانے کا پھر دل کرتا ہے۔ شراکت بڑی نعمت ہے جو قدرت کی طرف سے ہمیں عطا ہوتی ہے۔ جب میں اٹلی میں تھا، وہاں ایک اصول ہے کہ ہر سال ڈرائیونگ لائسنس کی جب تجدید کرائی جاتی ہے تو آپ کو ایک بار پھر ڈاکٹر کے حضور بینائی کے ٹیسٹ کرانے کے لئے پیش ہونا پڑتا ہے۔ میں بھی ڈاکٹر کے پاس گیا اور اس نے کہا کہ اوپر کی لائن سے پڑھتے ہوئے چھٹی لائن تک آؤ۔ آخری لائن بڑی باریک لکھی ہوئی تھی۔ میں نے پانچویں لائن تک تو کھٹا کھٹ پڑھ دیا لیکن جب چھٹی پر آیا تو رک گیا اور میں نے ڈاکٹر سے اطالوی زبان میں کہا کہ یہ مجھ سے نہیں پڑھی جاتی تو ڈاکٹر نے کہا کہ "پاس"۔ یہ پانچ لائن پڑھنے کا حکم ہے۔ یہ چھٹی تو میں تمہیں اپنی طرف سے کہہ رہا تھا۔ اب میں اس چھوٹے سے رشتے کو محبت کے رشتے کو کیا نام دوں۔ لیکن اس نے میرا دل پر باش کر دیا تھا اور اس کی معمولی سی محبت کی بات سے میرا دل خوشی سے بھر گیا تھا۔ مجھے یہ بات محسوس کر کے بھی بری خوشی ہوتی ہے کہ بہت سے لوگوں نے بہت کچھ جانتے ہوئے اور نہ جانتے ہوئے بھی ہمارے ساتھ شیئر کیا ہے اور میں

نے تو شیئرنگ کے فائدے بہت اٹھائے ہیں۔ میں یہ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس شیئرنگ سے میں نے کسی کو کیا دیا۔ البتہ یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس شیئرنگ کی بدولت بہت کچھ حاصل کیا۔

اللہ تعالیٰ آپ سب کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا اور شیئر کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ

"گھوڑا ڈاکٹر اور بلو نگڑا "

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ کی خدمت میں سلام پہنچے۔

ایک مرتبہ پھر اس ماحول میں پہنچ کر یقیناً آپ کو بھی ویسی ہی خوشی ہوئی ہو گی جیسی کہ مجھے اس وقت ہو رہی ہے۔ ایف-اے کے زمانے میں عام طور پر (یہ ہمارے زمانے کی بات ہے) اسٹوڈنٹس انگریز شاعر Oscar Wilde کی محبت میں بہت مبتلا ہوتے تھے۔ اب زمانہ آگے نکل گیا ہے۔ اب شاید اس کے نظموں پر اس قدر توجہ نہ دی جاتی ہو۔ جس طرح سے ہم اس کی محبت میں گرفتار تھے ویسے ہی ہماری رتی جناح (قائداعظم کی اہلیہ) جو ہم سے کافی چھوٹی تھیں وہ بھی Oscar Wlide کی محبت میں بہت بری طرح سے گرفتار تھیں اور اس کی نظمیں وہ قائداعظم کی زبانی سنا کرتی تھیں۔ ان دنوں قائداعظم بڑے مصروف ہوتے تھے اور ان پر بہت زیادہ بوجھ ہوا کرتا تھا اور وہ کام کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا لیکن وہ ایک ہی Request کرتی تھیں کہ "جناح مجھے اس کی ایک نظم اور سناؤ"۔ قائداعظم کا قد جیسا کہ آپ بھی جانتے ہیں کہ بہت خوبصورت تھا لیکن

آپ شاید اس بات سے واقف نہ ہوں کہ جب قائد اعظم لندن بیرسٹری پڑھنے کے لئے گئے تو وہاں ایک ایکٹر کی ضرورت کا اشتہار آیا۔ یہ اشتہار ایک Shakespearean Theatre Company کی طرف سے تھا۔ اب قائد اعظم کو بھی اپنی انگریزی دانی اور اپنی آواز پر ناز تھا اور وہ بھی وہاں چلے گئے۔ وہاں تمام امیدوار گورے تھے جو ستّر کے قریب تھے۔ قائد اعظم نے ایک مکالمہ پڑھ کر سنایا اور اتنے سارے امیدواروں میں جس کو چنا گیا وہ قائد اعظم ہی تھے۔ قائد اعظم اس انتخاب پر بہت خوش تھے اور وہ اپنا مستقبل ایک کامیاب اور نامور ایکٹر کا دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اس کمپنی کا ڈرامہ سائن کر لیا اور گھر آکر اپنے والد کے نام خط لکھا کہ "میں اتنے زیادہ لوگوں میں سے منتخب کر لیا گیا ہوں اور ایک انٹر نیشنل تھیٹریکل کمپنی میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا ہوں"۔ اب ان کے والد پونجا جناح پرانی وضع کے آدمی تھے۔ انہوں نے جوابی خط لکھا (اب مجھے یاد نہیں کہ وہ خط بذریعہ جہاز گیا یا تار کے ذریعے بھیجا گیا) اور اس میں کہا کہ تم کو جس کام کے لئے بھیجا گیا ہے تم اس کی طرف توجہ دو۔ یہ تم نے کیا نیا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔ "خبردار اگر تم نے اس طرح کی کسی سرگرمی میں حصہ لیا تو" اب اس زمانے کے بچے بھی بڑے نیک اور تابع فرمان ہوتے تھے اور خط ملتے ہی قائد اعظم کو فکر پڑ گئی اور اس کمپنی کے مالک سے کہا کہ سر میں بہت

شرمسار ہوں اور میں وعدہ کے مطابق پر فارم نہ کر پاؤں گا۔ انہوں نے پوچھا کہ آخر تمہیں ہوا کیا ہے؟ قائد اعظم نے کہا کہ سر میرے والد صاحب نے منع کیا ہے اور میرا اس طرح تھیٹر میں کام کرنا انہیں پسند نہیں ہے۔

کمپنی کے مالک نے کہ کہ تمہارے والد کو کیا اعتراض ہے۔ یہ تمہاری زندگی ہے اور تم جو چاہو پیشہ اختیار کر سکتے ہو۔

قائد اعظم نے کہا کہ Sir you do not understand ہماری زندگی میں والد بڑے اہم ہوتے ہیں اور میں معافی چاہتا ہوں۔

رتی قائد اعظم سے Oscar Wilde کی نظمیں ضرور سنا کرتی تھیں۔ یہ پروگرام شروع ہونے سے پہلے قبل مجھے آسکر وائلڈ کی نظم کا ایک مصرعہ یاد آم رہا تھا

Suffering is very long moment

You can not divide it by time

خواتین و حضرات! Suffering ایسی چیز ہے جو لمحاتی ہوتی ہے لیکن اسے تقسیم کرنے کے لئے چاہے کتنے ہی موسم گزر جائیں وہ کسی صورت تقسیم ہو نہیں پاتے

ہیں۔ پریشانی کا ایک چھوٹا سا لمحہ بھی طویل تر ہو جاتا ہے۔ انسانی زندگی میں بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی فرد یا گروہ انسانی Suffering کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج کل ہم پر بھی کچھ ایسی ہی کیفیت طاری ہو چکی ہے۔ ہم ایک بوجھ تلے دبے ہوتے ہیں اور ہمیں اس احساس ندامت نے دبا رکھا ہے جو کسی طرح سے ہمیں گھیر کر اپنے چنگل میں لے آیا ہے۔ یہ Painاور Sufferings دکھ والم تو انسانی زندگی کے ساتھ چلتے رہنا چاہیئے لیکن مایوسی اس کے قریب نہیں آنی چاہیئے۔ مجھے خوشی ہے کہ جب میں اپنے ملک کے دوسرے ساتھیوں کو دیکھتا ہوں تو ان میں آج کے Scenario میں دو چیزیں نظر آتی ہیں۔ یا تو انہیں غصہ آتا ہے اور یا انہیں اس بات کا دکھ ہے کہ ہم بھی کسی سے کم نہیں ہیں اور ہماری گردن پر ہاتھ رکھ کر زبردستی ہمارے سر کو نیچا کرنے کی کوشش کیوں کی جارہی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ خدا کے کرم و فضل سے لوگ اس قدر مایوسی کے عالم میں نہیں ہیں جیسا کہ ہمارا دشمن اندازہ کر رہا تھا۔

خواتین و حضرات! مایوس ہونے کی ضرورت نہیں لیکن دکھ تک جانے کا آپ کو حق حاصل ہے۔ میں جب سکول میں داخل ہوا تو مجھے جس مس کے حوالے کیا گیا وہ بڑی خوش اخلاق تھیں۔ نہایت خوش وضع اور لمبے قد کی شفیق سی استاد

تھیں۔ ہماری مائیں ماسیاں بڑی سخت ہوتی تھیں اور اس استاد کی طرف سے ہماری طرف جو شفقت کا لپکا آ رہا تھا وہ میرے لئے نیا تجربہ تھا۔ وہ ہمارے کھیلنے کے لئے آسائش کا سامان بھی مہیا کرتی تھیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس استاد کے لیے دل میں ایک ایسی محبت پیدا ہو گئی ہے جس کا توڑنا بڑا مشکل ہو گیا۔ ہمیں اماں کے پاس رہنا تکلیف دہ ہوتا تھا لیکن اس مس کے پاس زیادہ آسانی محسوس ہوتی تھی۔ خواتین و حضرات گو یہ ایک میری ذاتی سی بات ہے اور میں آپ کو اپنا دکھ بتاتا ہوں کہ ان کی اس سکول سے یا ٹرانسفر ہو گئی یا پھر انہوں نے خود ہی سکول چھوڑ دیا۔ بہر کیف وہ ہم سے جدا ہو گئیں۔ میں اب اس بڑھاپے میں پہنچ چکا ہوں، میں نے اب تک کی اپنی زندگی میں اتنا دکھ محسوس نہیں کیا جس قدر اس شفیق استاد کی جدائی سے مجھے ہوا۔ مجھے شاید یہ بات آپ کو بتانی چاہیئے یا نہیں کہ اس جدائی میں نہ کھانا اچھا لگتا تھا نہ پینا اچھا لگتا تھا اور نہ ہی زندہ رہنا اچھا لگتا تھا۔ مجھے زبردستی سکول بھیجا جاتا تھا اور میں اپنی اس ٹیچر کی یاد اور محبت میں اس قدر مبتلا ہو گیا تھا کہ میں عشق و محبت کے قصے پڑھتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ میں اس وقت گو بہت چھوٹا تھا لیکن لاشعور میں آخر کس طرح اتنا آگے بڑھ گیا تھا کہ میں اپنی اس استاد کو ایک بہت ہی ارفع اور اعلیٰ مخلوق سمجھ کر اس کی پرستش کرنے لگا تھا اور جدائی کا دکھ بہت گہرا محسوس کرتا تھا اور اس دکھ کے با

وصف میں مایوس نہیں تھا اور میرے دل کے کسی نہ کسی کونے کھدرے میں یہ بات ضرور تھی کہ میں ان سے ضرور ملوں گا اور پھر اپنا آپ اس شفیق استاد کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ وقت گزر گیا اور ان سے ملنے کا کوئی موقع ہاتھ نہ آیا۔ وہ جانے کہاں چلی گئیں لیکن دل میں ان کا دکھ بڑھتا رہا۔ میں نے پھر میٹرک کیا، ایف-اے، بی-اے کر چکنے کے بعد یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ بنا۔ ولایت چلا گیا اور وہاں جا کر پڑھاتا بھی رہا۔ لکھنے لکھانے کا کام بھی کرتا رہا۔ جب میں لوٹ کر آیا تو مجھے ایک خاتون ملیں۔ بہت سنجیدہ، سلیقہ شعار اور وہ بہت پڑھی لکھی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ میں کچھ لکھتی ہوں اور مجھے آپ کا سٹائل بہت پسند ہے اور میں چاہتی ہوں کہ آپ کی طرز کا لکھنا مجھے بھی آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ جی میں نے لکھنا کہیں سے سیکھا تو نہیں یہ آپ کی مہربانی ہے کہ آپ میرے بارے میں ایسا فرما رہی ہیں لیکن وہ محترمہ اصرار کرنے لگیں کہ آپ مجھے اصلاح ضرور دیں اور میرے تحریروں پر Comments ضرور دیں۔ ان سے جب دوسری ملاقات ہوئی تو یہ جان کر میرے دل کی کلی کھل اٹھی کہ وہ محترمہ میری وہ استاد تھیں جس کی جدائی کا دکھ میں اب تک دل میں لئے پھرتا تھا اور آج میں اپنی اس محبوب ٹیچر کا استاد بن گیا۔ میرے اس وقت مایوس نہ ہونے نے مجھے اتنا بڑا اسہارا دیا اور میں ایک امید پر زندہ رہا۔ میں جب بچپن کی بات کرتا

ہوں تو اگر آپ مجھے سچ بولنے کی اجازت دیں تو میں بتانا چاہوں گا کہ اس وقت دو مرتبہ مجھ پر مایوسی کا عالم بھی رہا۔ اتنا مایوس جس طرح ایک مرغے کی کلغی گر جائے تو وہ ہو جاتا ہے۔ میں بھی اس قدر شدید مایوسی میں رہا لیکن اس کے بعد میں نے خدا سے کہا کہ اب بس یہ مایوسی مجھے زندگی کے بقیہ حصے میں نہیں ستائے گی۔ میں سکول میں پکی یا پہلی جماعت میں تھا۔ میرے پاس سے ایک تانگہ گزرا۔ اس تانگے کا کوچوان کچھ ظالم تھا اور وہ گھوڑے کو چھانٹے مار کر چلاتا تھا۔ گرمیوں کا موسم تھا اور چھانٹے لگنے سے بیچارہ گھوڑا کچھ تڑپا اور بے ہوش ہو کر گر گیا۔ لوگوں نے جلدی سے گھوڑے کے بند اور راسیں کھول دیں اور لوگ اسے اٹھانے کی کوشش کرنے لگے لیکن وہ اٹھ نہ سکا۔ کسی نے کہا کہ گھوڑا ڈاکٹر کو بلاؤ۔ جب میں نے یہ بات سنی تو میں بہت خوش ہوا اور وہاں کھڑا ہو کر دیکھنے لگا اور گھوڑا ڈاکٹر کا انتظار کرنے لگا کہ گھوڑا ڈاکٹر آ کر کس طرح اس گھوڑے کو اٹھائے گا۔ اب میں نے گھر جاتا تھا اور بستہ میرے ہاتھ میں تھا۔ گھوڑا ڈاکٹر کے انتظار میں آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ پون گزر گیا اور پھر تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ایک تانگہ آ کر وہاں رکا جس میں سے ایک آدمی اترا جو اس گھوڑے کی طرف چلا۔ اب میں کسی گھوڑے نما ڈاکٹر کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن وہ تو بندہ ڈاکٹر نکلا اور میرے ایک گھنٹے کا انتظار سخت مایوسی میں تبدیل ہو گیا۔ میں واقعی اس وقت

یہی سمجھتا تھا کہ گھوڑوں کا علاج کرنے کے لئے گھوڑے ہوں گے اور کتوں کا علاج کرنے کے لئے کتے ہوں گے۔ میں وہ مایوسی آج تک نہیں بھول سکا۔ وہ مایوسی میرے دل ودماغ سے جاتی ہی نہیں ہے۔

دوسری بار جب میں سخت مایوس ہوا وہ واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ ہمارے سکول کے ہیڈ ماسٹر کے بیٹے کے پاس ایک بڑا خوبصورت بلونگڑا (بلی کا بچہ) تھا۔ اسے دیکھ کر میرے دل میں بھی یہ آرزو پیدا ہوئی کہ میرے پاس بھی ایسا ہی کوئی بلونگڑا ہو۔ میں نے اپنے ابا جی سے کہا کہ آپ مجھے بھی بلونگڑا لا دیں۔ ابا جی کہنے لگے کہ چھوڑو یار، وہ تو بڑی فضول چیز ہے۔ تجھے ہم اس سے بھی اچھی چیز لے دیں گے۔ میں نے کہا کہ نہیں ابا جی میں تو بلونگڑا ہی لوں گا۔ ان دنوں میری ہمشیرہ کے ہاں بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ ابا جی نے کہا کہ اشفاق تمہیں ایک ایسی پیاری چیز ملے گی جسے تم اٹھا بھی سکو گے۔ وہ تمہیں پنجہ بھی نہیں مارے گی۔

میں نے کہا کہ مجھے اس سے اور اچھی چیز کیا چاہیئے؟ خواتین و حضرات! مجھے ابا جی اٹھا کے اور بڑی محبت کے ساتھ جھولا جھلاتے ہوئے صبح ہمشیرہ کی طرف لے گئے۔ میں نے دیکھا کہ میری ہمشیرہ سر پر رومال باندھے لیٹی ہوئی تھیں اور ان کے پہلو میں ایک چھوٹا سا اور پیارا سا بچہ پڑا تھا۔ میرے ابا جی نے وہ بچہ اٹھا کر

مجھے کہا لو دیکھو۔ میں نے جب اسے دیکھا تو اس کا رنگ سرخ تھا۔ اس کے آنکھیں اور منہ ناک بند تھا۔ میں اسے تھوڑی دیر تو دیکھتا رہا اور میں نے پھر روتے ہوئے ابا جی سے کہا کہ نہیں ابا جی مجھے بلونگڑا ہی لے دیں۔ وہ دن بھی میری مایوسی کا دن تھا جو میں آج تک نہیں بھولا۔ اس کے بعد میں نے اپنے اللہ سے کہا کہ میں مایوس نہیں ہوں گا اور خدا کا شکر ہے کہ اب مجھ پر جو بھی کیفیت گزرے میں کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ یہ بھی خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم سب تکلیف میں ضرور ہوتے ہیں، دکھ میں مبتلا ضرور ہو سکتے ہیں لیکن ہم مایوسی کی راہ پر نہیں چلتے اور یہ ہمارے دین نے ہمیں سکھلایا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہماری ساخت ان لوگوں سے مختلف ہے جو ہمارے پڑوس میں آباد ہیں۔ جن سے ہم نے یہ ملک پاکستان لیا ہے۔ آپ نے کیکر کر درخت تو دیکھا ہی ہو گا اس کی جو "مڈھ" ہوتی ہے جہاں کیکر کی شاخیں آکر گرتی ہیں۔ خواتین و حضرات، سوکھا ہوا کیکر کا درخت اور اس کی سوکھی ہوئی کیکر کی "مڈھی" پھاڑنا بہت مشکل ہوتی ہے۔ بڑے سے بڑا لکڑہارا بھی اسے آسانی سے نہیں چیر سکتا۔ اس مقصد کے لئے خاص قسم کے کلہاڑے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں یہ واچ کرتا رہا ہوں کہ خاص قسم کے کلہاڑے والے لکڑہارے جب اس پر کلہاڑے کی سو ضربیں لگاتے ہیں لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوتی کیونکہ مڈھی میں تنے ایک خاص

انداز میں ایک دوسرے کو جکڑے ہوئے ہوتے ہیں اور یہ میرا مشاہدہ ہے کہ جب اس مڈھی پر 101 ویں ضرب پڑتی ہے تو وہ مڈھی چر جاتی ہے۔ پھر اس پر کسی سخت ضرب کی ضرورت ہی نہیں ہوتی وہ Continuous Effort اور اس مسلسل کوشش کے پیچھے ایک جذبہ کارفرما ہوتا ہے جو اس سخت قسم کی مڈھی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ انسان کو کسی دکھ، تکلیف یا درد میں مایوس نہیں ہونا چاہیئے اور ہمیں خداوند تعالیٰ نے بھی یہی فرمایا ہے کہ تم ہرگز ہرگز مایوسی میں داخل نہ ہونا۔ لیکن چونکہ شیطان سے میری دوستی پرانی ہے اور روز اس سے میرا ملنا ہوتا۔ وہ مجھے کہتا ہے کہ دیکھو اشفاق احمد تیرا یہ کام نہیں ہوا۔ تو تو کہتا تھا کہ میں یہ وظیفہ یا کام کروں گا تو خدا میرا فلاں کام کر دے گا لیکن اللہ نے تیرا وہ کام کیا نہیں ہے۔ میں دکھی ہو کر اس سے کہتا ہوں کہ کام تو میرا نہیں ہوا، دعا تو میری قبول نہیں ہوئی لیکن سر میں آپ کی ڈی میں شامل نہیں ہوں گا۔ آپ مجھے مایوس کرنا چاہتے ہیں لیکن میں مایوس ہونے والوں میں سے نہیں ہوں۔ چاہے آپ جو مرضی کر لو۔ اب تک تو اس کے ساتھ یہ تعلق اور رشتہ قائم ہے کہ وہ مایوس کرنے کی پے در پے کوششیں کر رہا ہے اور میں مایوس نہیں ہو رہا۔ آپ زندگی میں جب بھی دیکھیں گے آپ محسوس کریں گے کہ شیطان اور کچھ نہیں کرتا صرف آپ کو مایوس کر دے گا کہ دیکھو تم نے اتنا کچھ کیا لیکن

کچھ نہیں ہوا۔ لیکن جناب شیطان صاحب میں دکھی ہو سکتا ہوں، رنجیدہ ہو سکتا ہوں، مایوس نہیں ہو سکتا اور یہ مجھ پر اللہ کی بڑی مہربانی اور خاص عنایت ہے کہ بچپن کے دو واقعات کے سوا کبھی مایوس نہیں ہوا۔ میں آپ سے بھی یہی توقع رکھتا ہوں اور یقین کرتا ہوں کہ آپ مایوسی کے گھیرے میں کبھی مت آیئے گا کیونکہ آپ اگر کبھی جہلم کے پاس شیر شاہ سوری کے قلعے کے قریب گرو بالا ناتھ کے ٹیلے پر گئے ہوں وہاں چڑھائی چڑھ کر جانا پڑتا ہے اور وہاں جانے والے لوگ تو تانگے پر سوار بیٹھے رہتے ہیں لیکن کوچوان اتر کر گھوڑے کے ساتھ چلنے لگتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ نہ اتریں اور گھوڑے کو اس بات کی تشفی نہ ہو کہ میرا مالک بھی میرے ساتھ ہے تو وہ گھوڑا کبھی اونچائی پر نہ چڑھ سکے۔ آپ لوگوں کی اس محبت کا شکریہ کہ آپ یہاں تشریف لائے اور آپ نے میری بات سنی۔ اب میں اور آپ آج کے بعد کسی معاملے میں بھی مایوسی کے اندر داخل نہیں ہوں گے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ

”لڑن رات ہو و چھڑن رات نہ ہو“

باوجود اس کے ہر روز ابر چھایا رہتا ہے لیکن بارش نہیں ہوتی۔ بارش کی آرزو ہم ہر روز کرتے ہیں لیکن یہ ہو نہیں پاتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو بہت کم کم۔ بارش اور جاندار کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے کہ سب جاندار پانی سے پیدا ہوئے، کچھ ایسے جو پیٹ کے بل چلتے ہیں، کچھ ایسے جو دو ٹانگوں کے ہیں اور کچھ ایسے جو چوپائے ہیں۔ خواتین و حضرات پانی سے ہی یہ ساری آبادیاں قائم ہوئیں اور علیم مطلق بہتر جانتا ہے کہ کب بارش کرنی ہے اور کب روکنی ہے لیکن ہم لالچی بندے ہیں ہم اپنے مقصد کو دیکھتے ہیں اور بارش کے لئے آرزو مند ہیں۔ ایک مرتبہ میں بذریعہ ریل کار لاہور سے پنڈی جا رہا تھا۔ اس وقت بارش ہو چکنے کے بعد دھوپ نکل آئی تھی لیکن ریل کار کے شیشے کے اوپر بے شمار بڑے بڑے بارش کے قطرے موجود تھے اور گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی ہوئی تھی اور میں ان خوبصورت قطروں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ایک قطرہ اپنی جگہ سے پھسلا درمیان میں آکر کھڑا ہو گیا پھر ایک اور قطرہ ایک اور جانب

سے آیا اور اس قطرے کے ساتھ شامل ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر کو رُکے اور پھر اس قطرے میں سے ایک قطرہ علیٰحدہ ہو کر شمال کی طرف چلا گیا۔ ایک جنوب کی سمت چلا گیا اور میں انہیں بڑی دیر تلک دیکھتا رہا کہ اس میں سے وہ کون ہے ؟ اور وہ دوسرا کون ہے ؟ یعنی میں ان قطروں میں سے پہلے اور بعد میں آنے والے قطروں میں تمیز کرنے سے قاصر تھا۔ اس طرح انسان بھی اپنوں سے ملنے کی آرزو کرتا رہتا ہے۔ کسی نہ کسی صورت اس کا تعلق لوگوں سے ہو جبکہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ پیسوں سے ہیں۔ ان کے پاس زیادہ دولت ہو وہ خیال کرتے ہیں کہ شاید زیادہ دوست ہونے سے ہمیں زیادہ آسانیاں ملیں گی اس لئے میرے اور آپ کے درمیان دولت حائل ہو گئی ہے جس نے ہمارے درمیان ایک خلیج بنا دی ہے۔ ہم بڑی کوشش اور ہمت کے باوصف ایک دوسرے سے اس طرح نہیں مل سکتے جیسے بے غرض اور بے لوث انداز میں بارش کا ایک قطرہ شیشے پر سے پھسلتا ہوا دوسرے سے جا ملتا ہے اور پھر اس سے جدا ہو جاتا ہے اور پتہ ہیں نہیں چلتا کہ کون کون تھا؟ اور کیا کیا تھا؟

اس معاملے میں ہم انسان قطروں سے پیچھے ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے ملنے کی بجائے پیسوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ یہ دور ہی مادی آ گیا ہے بلکہ انسان کے بل ہی اتنے بڑھ گئے ہیں کہ وہ انہیں Pay ہی نہیں کر

سکتا اور ان بلوں کے چنگل سے نکل ہی نہیں پاتا اور یہ بل ہماری ناجائز ضرورتوں کے باعث بڑھ گئے ہیں۔ آپ اندازہ کریں کہ میرے تنخواہ یا آمدن کا ساٹھ سے باسٹھ فیصد حصہ ان چیزوں پر خرچ ہو رہا ہے جو 1960 میں ہوتی ہی نہیں تھیں اور حیرانی کی بات یہ ہے کہ میں 1960 میں بھی زندہ تھا اور میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ ان سب چیزوں کے بغیر میں سن ساٹھ میں حیات تھا۔ اس وقت شیمپو کا تصور نہیں تھا اور ہم لال صابن سے نہایا کرتے تھے۔ اب شیمپو خریدنے کے چکر میں گھر کا بجٹ ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔ اس وقت فوٹو سٹیٹ نام کی کوئی مصیبت نہیں تھی اس وقت صرف لاہور کے اندر پونے دو کروڑ کے قریب فوٹو مشینیں ہیں اور ایک اندازے کے مطابق دس سے بارہ لاکھ کی فوٹو کاپیاں روز ہوتی ہیں۔ (اشفاق احمد کا یہ پروگرام 2003 میں نشر ہوا تھا اور یہ اندازہ اس وقت کا ہے) سکول کے بچے پہلے ہاتھ سے کام کرتے تھے اور اب فوٹو کاپیاں کراتے ہیں۔ عدالتوں میں جس کاغذ کی ضرورت نہیں بھی ہوتی اس کی بھی کاپیاں کرانے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ یہ اضافی بوجھ ہم پر پڑا ہے۔ آج سے چند سال پہلے موبائل فون کا کوئی چکر نہیں تھا اب ہر کوئی کانوں کو لگے پھرتا ہے۔ زندگی ان کے بغیر بھی چل رہی تھی اور بڑی اچھی چل رہی تھی۔ یہ دباؤ ہیں جو انسان کے اوپر پڑا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ آدمی کبھی بھی پیسے کے بل پر چل کر دوسرے آدمی سے

نہیں مل سکتا ہے۔ ہم انسانوں سے حسد بھی کرتے ہیں، غصہ بھی رکھتے ہیں اور غیبت بھی کرتے ہیں لیکن آدمی کا آدمی سے ملنے کو دل بھی ضرور کرتا ہے اور انسان انسان سے ملے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔ کتاب لکھ دینے سے یا دانشور بن جانے سے انسان مکمل نہیں ہوتا۔ ایک آدمی بیچارہ تھا۔ سکول ٹیچر ہی ہو گا۔ اس نے بیوی سے کھانا مانگا۔ آگے سے انکار ہوا تو اس نے سوچا کہ چلو پیر صاحب سے مل آتے ہیں۔ تانگے والے سے کہا کہ پیسے نہیں، لے چل لیکن اس نے بھی کہا کہ پیدل چلو۔ اس نے بھی خیال کیا کہ میل ڈیڑھ میل کا راستہ ہے پیدل طے کر لیتے ہیں۔ وہ کافی راستہ طے کر کے دریا کنارے گیا تو وہاں پر بھی پیسے طلب کئے گئے کہ گزرنا ہے تو پیسوں کی ادائیگی کرو۔ اب اس غریب نے اپنی دھوتی سر پر لپیٹی اور دریا میں چھلانگ لگا دی اور تیرتا ہوا دریا کراس کر گیا اور چلتا چلتا پیر صاحب کے حضور پہنچا۔ پیر صاحب اعلیٰ درجے کے ریشمی بستر پر تکیہ لگائے مزے سے بیٹھے تھے اور ان کے ارد گرد پھلوں کے ٹوکرے رکھے ہوئے تھے اور مٹھائیاں اور دیگر نعمتوں کے انبار لگے پڑے تھے۔ پیر صاحب مرید کو دیکھ کر خوش ہوئے اور ابھی وہ بے چارہ بھوکا پیاسا گرتا پڑتا پیر صاحب کو درست طرح سے سلام بھی نہیں کر سکا تھا کہ پیر صاحب نے اپنی ٹانگ آگے کر دی کہ

اس کو دابو۔ وہ مرید تھوڑی دیر ٹانگ دباتا رہا تو پیر صاحب کہنے لگے کہ واہ بھی واہ۔ ہم دونوں کو کتنا ثواب ہو رہا ہے۔

اس نے کہا کہ پیر صاحب خدا کا خوف کریں مجھے تو ثواب ہو رہا ہے آپ کو کدھر سے ہو رہا ہے۔ پیر صاحب نے ناگواری سے ٹانگ پیچھے کھینچی اور کہنے لگے "لے کلا ہی ثواب لئی جا"۔(لو اب تم اکیلے ہی ثواب لیتے رہو)۔

اس طرح آدمی کو آدمی کی ضرورت رہتی ہے چاہے وہ کسی بھی مقام پر ہو وہ انسان کو تلاش کرتا ہے۔

میری بھانجی کی ایک بیٹی ہے جسے پیار سے ببلی کہتے ہیں۔ وہ ساہیوال میں رہتی ہے۔ میری دوسری بھانجی کی بیٹی ٹینا اور ببلی بڑی گہری سہیلیاں ہیں۔ وہ ہم عمر ہیں۔ ٹینا لاہور میں رہتی ہے۔ کبھی کسی بیاہ شادی کے موقع پر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ساہیوال جانا پڑتا ہے اس طرح ٹینا ایک بار جب ساہیوال گئی تو وہ دونوں ایک ہی بستر میں لیٹی ہوئی تھیں کہ آدھی رات کے وقت ٹینا کے رونے کی آواز آئی۔ ببلی کی ماں نے اس سے پوچھا کہ ٹینا کیا بات ہے۔

ٹینا روتے ہوئے کہنے لگی کہ ببلی مجھے مونگ پھلی نہیں دیتی۔ اس کی ماں نے کہا کہ ببلی کے پاس تو مونگ پھلی نہیں ہے۔

ٹینا روتے ہوئے کہنے لگی کہ خالہ یہ کہتی ہے کہ جب بھی میرے پاس مونگ پھلی ہوئی، میں تمہیں نہیں دوں گی۔ وہ رو رہی تھی لیکن ببلی کے بستر سے نہیں نکل رہی تھی کیونکہ نہ ہونے کے تعلق کو بھی انسان کھینچ کے اپنی ذات کے ساتھ شامل کر لیتا ہے۔ لیکن اب بد قسمتی سے ہم نے تعلق کا باعث ڈھیر ساری دولت کو سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ یہ جو خاندانی نظام آہستہ آہستہ ٹوٹ رہے ہیں اور لوگ ایک دوسرے سے بے خبر، بے سدھ زندگی گزارنے کو ترجیح دے رہے ہیں اس کی وجہ روپے پیسے کی بہتات ہے۔ اس پیسے نے نزدیکی کی بجائے دوریاں پیدا کر دی ہیں۔ جب میری آپا زبیدہ حیات تھیں تو جہلم میں ان کے پاس ایک ٹی وی سیٹ تھا۔ ان کے گھر ایک ادھیڑ عمر شخص پیچ کس پلاس لے کر ان کا ٹی وی ٹھیک کر رہا تھا۔ وہ روز ٹی وی ٹھیک کرنے آتا۔ صبح صبح آ جاتا، دوپہر اور شام کا کھانا کھا کر چلا جاتا۔ میں بھی وہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ میں دو تین چار دن دیکھتا رہا اور جب میں نے دیکھا کہ ساتویں دن وہ ایک نئی ٹیوب لے کر آیا۔ اس نے کہا کہ آپا جی اس ٹیلیویژن کی ٹیوب خراب ہو گئی ہے اسے یہ لگانے آیا ہوں۔ انہوں نے بھی کہا کہ ٹھیک ہے لگا دو۔ اس نے وہ ٹیوب لگا دی تو وہ بلیک اینڈ وائٹ ٹیلیویژن

چلنے لگا۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے آپا زبیدہ سے کہا کہ آپا یہ جو سات دن کوشش میں لگا رہا اور آپ نے اسے کوشش کرنے دی اور اگر اس کی ٹیوب ہی بدلنی تھی تو پہلے دن ہی بدل دی ہوتی۔ وہ کہنے لگی کہ نہیں اگر ایسا ہو جاتا تو پھر وہ بیچارہ اتنے دن کس سے ملتا؟ اس کا بھی اتنے دل لگا رہا اور ہمارے گھر میں بھی رونق لگی رہی ہے۔

خواتین و حضرات! اب بندہ بندے سے ملنا پسند نہیں کرتا۔ اس کا وہ پہلے سا رشتہ نہیں رہا ہے اور اب یہ تعلق اور رشتے ایک خواب بن چکے ہیں۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ڈھیر سارے ڈالر آ جانے سے آپ Rich ہو جائیں گے۔ ہر گز ایسا نہیں ہو گا۔ آپ کے پاس پیسہ تو ہو گا لیکن آپ کی محرومیاں بڑھتی چلی جائیں گی۔ اس کا سد باب ابھی سے کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر آپ آج اپنے بھائی بندوں سے دور ہوتے گئے اور ہمارے درمیان رخنہ آتا گیا تو خلیج بڑھ جائے گی اور دو طرح کے تعلیمی نصاب نے بھی ہمارے درمیان لکیر کھینچ دی ہے۔

اب آرٹ اور کلچر کے مظاہر اور شواہد میں بھی فرق ڈالا جا رہا ہے۔ بہاولپور میں ایک سکول ٹیچر حبیب اللہ صاحب تھے۔ وہاں ایک کرم الٰہی صاحب بھی تھے وہ بھی استاد تھے۔ وہ ایک ساتھ کافی عرصہ اکٹھے پڑھاتے رہے اور ریٹائرمنٹ کے

بعد جدا ہو گئے۔ ان میں بڑا پیار تھا۔ کرم الٰہی صاحب لاہور آ گئے جبکہ حبیب اللہ صاحب بہاولپور میں ہی رہے۔ ایک دفعہ حبیب اللہ صاحب بہاولپور سے ملتان گئے۔ ملتان بہاولپور سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ وہاں اپنا کام کرنے کے بعد رات کو بس پکڑ کر ساہیوال پہنچ گئے۔ ساہیوال بس سٹینڈ سے یکّہ لے کر کرم الٰہی صاحب کے گھر گاؤں گ-ب یا ای-بی جو بھی تھا وہاں چلے گئے اور اپنے یار قدیم کے گھر پر دستک دی۔ حبیب اللہ صاحب کہنے لگے کہ میں چائے تو لاری اڈے سے ہی پی آیا ہوں۔ چلیں اکٹھے چل کے نماز پڑھتے ہیں۔ (اس وقت فجر کی اذان ہو رہی تھی)۔ انہوں نے کہا کہ ملتان آیا ہوں۔ ساہیوال قریب ہی ہے چلو کرم الٰہی سے مل آتا ہوں۔ خواتین و حضرات بہاولپور سے ملتان اتنا سفر نہیں ہے جتنا ملتان سے ساہیوال ہے لیکن وہ اس سفر کو بھی "قریب ہی" کا نام دے رہے تھے۔ انہوں نے اپنے یار عزیز سے کہا کہ تم سے ملنا تھا مل لیا۔ تمہیں دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی اور اکٹھے فجر پڑھ لی اور اب میں چلتا ہوں۔ کرم الٰہی صاحب نے بھی کہا کہ بسم اللہ آپ کے دیدار سے دل خوش ہو گیا۔

خواتین و حضرات! ہم ایسے نہیں کر سکتے ہیں۔ ہمارے ملک میں ایک ایسا بے چارہ شہر بھی ہے جہاں بڑے پھول اور باغ ہیں۔ وہ بڑا خوبصورت بھی ہے لیکن وہاں کوئی بھی کسی سے ملنے نہیں جاتا۔ بلکہ کام کی غرض ہی انسان کو وہاں لے

جاتی ہے۔ وہ شہر اسلام آباد ہے۔ میں یہ کہتے ہوئے معافی چاہتا ہوں کہ میں بھی وہاں جب گیا ہوں کسی نہ کسی کام کے سلسلے میں گیا ہوں اور کام ہو چکنے کے فوراً بعد وہاں سے لوٹ آیا ہوں۔ مجھے اس بات کی وجہ سے اسلام آباد پر پیار بھی آتا ہے۔ وہاں میرے بہت پیارے دوست بھی رہتے ہیں جن میں نادر، عمار اور فراز بھی ہے لیکن وہاں جانا صرف کام کی غرض سے ہی ہوتا ہے۔

جوں جوں انسان کے درمیان فاصلے ہوتے جاتے ہیں اور نظر نہ آنے والی دراڑیں پڑتی جاتی ہیں۔ انسان بیچارہ ان فاصلوں کو پیسوں کی کمی سے جوڑ رہا ہے اور اس نے سارا زور معاشی پوزیشن بہتر کرنے پر لگا رکھا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر معاشی صورتحال اچھی ہو گئی اور انسانوں کا منہ ایک دوسرے کے مخالف رہا تو پھر ان پیسوں، ڈالروں کا آخر کیا فائدہ ہو گا؟ اس لئے ہمیں اپنے اپنے طور پر سوچنا پڑے گا کہ چاہے ایک دوسرے سے لڑائی ہوتی رہے لیکن وچھوڑا تو نہ ہو جس طرح پنجابی کا ایک محاورہ ہے کہ "لڑن رات ہو پر وچھڑن رات نہ ہو"۔

جب ہم کالج میں پڑھتے تھے تو ہم سینما دیکھنے جایا کرتے تھے۔ عام طور پر گھر والے ہمارا سینما جانا پسند نہیں کرتے تھے لیکن ہم چلے جایا کرتے تھے۔ ان دنوں سینما کی ٹکٹ خریدنے کے لئے لکشمی چوک میں ایک قطار لگتی تھی۔ ایک دفعہ

ہم قطار میں کھڑے تھے اور قطار بہت لمبی تھی۔ اس قطار میں ایک ایک بڑی داڑھی والا آدمی بھی کھڑا تھا۔ اس نے پرانی سی واسکٹ پہنی ہوئی تھی اور اس کی ہئیت کچھ اچھی نہ تھی۔ نوجوان جو اس شخص کو اور اس جیسے دیگر لوگوں کو پسند نہیں کرتے ویسا ہی ایک نوجوان وہاں تھا۔ اس نے اس شخص سے کہا "بابا جی تسی فلم ویکھنی اے"

اس نے جواب نہیں دیا تو نوجوان نے غصے سے کہا کہ پھر تم قطار میں کیوں پھنسے کھڑے ہوئے۔ وہ کہنے لگا "جی میں بندیاں دے کول ہونا چاہناں واں مینوں کوئی نیڑے نئیں آن دیندا"۔

اس شخص نے کہا کہ میں اس غرض سے ہر روز لائن میں آ کے کھڑا ہو جاتا ہوں اور اس طرح میرے ہر طرف آدمی ہی آدمی ہوتے ہیں حالانکہ میں نے نہ کبھی فلم دیکھی ہے اور نہ ہی دیکھنی ہے۔

ایسے ترسے ہوئے لوگ بھی ہیں اور اس قسم کے بے شمار لوگ ہمارے ارد گرد ہیں جن کو انسانی کندھے کی ضرورت ہے لیکن بیچارے انسان کا المیہ یہ ہے کہ وہ ایسے ہی گھبرایا رہتا ہے۔ مجھے وہ بابا اب بھی یاد ہے جو ایک دن اپنی بوڑھی بیوی کو مرجا مرجا کہے جا رہا تھا۔ میں وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس سے پوچھا کہ بابا آخر

قصہ کیا ہے۔ تو وہ کہنے لگا کہ یہ دوائی نہیں کھاتی اور اگر اس نے دوائی نہ کھائی تو مر جائے گی۔ میں نے وہ دوائی دیکھی تو وہ عام سی ملٹی وٹامن کی گولیاں تھیں۔ کسی خاص بیماری کی بھی نہیں تھیں۔ میں نے کہا بابا تو نوے سال کا ہے اور یہ اسی سال کی بڑھیا۔ اب تو اسے مرنے دے تو نے اس کا کیا کرنا ہے۔ تو وہ بابا کہنے لگا صاحب جی اس کی بڑی ضرورت ہے۔ یہ اینٹیں پاتھنے والوں کی بیٹی ہے اور روڑے اکٹھے کرنے والوں کی اولاد ہے۔

وہ کہنے لگا کہ صاحب جی "ایس دی بڑی لوڑ اے۔ جدوں میں سویرے سے شام تیکر کنکر روڑے روڑے ہو جاتا ہوں تو چونکہ اس کو روڑے اکٹھے کرن دا ول آوندا اے اور ایہہ میرے روڑے کنکر اکٹھے کر کر مینوں فیر زندہ کر دیتی ہے۔"

خواتین و حضرات ایسے لوگ آپ کے شہر میں ابھی بھی موجود ہیں جو اس لئے قریب قریب بیٹھے ہیں جو دوسروں کو بکھرنے سے بچا لیتے ہیں۔

میرے اپنی ذاتی آرزو ہے کہ پیسہ واقعی ضروری چیز ہے لیکن انسان کا احترام زیادہ لازمی ہے۔ اس سے آپ کو زیادہ خوشی، محبت، حدت اور Love عطا کر سکتا ہے جو آپ کو زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ میری دعا اور آرزو ہے کہ

ہم سب انسانوں کے قریب آئیں اور ان کو سمجھنے کی کوشش کریں چاہے وہ بلی اور ٹینا کی لڑائی کی صورت میں یا گورنمنٹ کالج کے عقب میں رہنے والے اس بُڈھے بابے کی طرح جو اپنی بوڑھی بیوی سے لڑ رہا تھا اور اس کی لڑائی میں بے پناہ محبت پنہاں تھی اور وہ ایک دوسرے کے لئے زندہ رہنا چاہتے تھے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ

توکّل

ہم سب کی طرف سے اہل زاویہ کو سلام پہنچے۔ اس میز پر ہم گزشتہ کئی ماہ اور ہفتوں سے پروگرام کر رہے ہیں۔ اس میز پر کچھ کھانے پینے کی اشیاء ہوتی ہیں۔ ابھی ایک لمحہ قبل میں حاضرین سے درخواست کر رہا تھا کہ یہ آپ کے لیے ہیں اور آپ انہیں بڑے شوق سے استعمال کر سکتے ہیں لیکن ہم زندگی میں اتنے سیانے محتاط، عقل مند اور اتنے "ڈراکل" ہو گئے ہیں کہ ہم سمجھتے ہیں کہ شاید اس میں کوئی کوتاہی یا غلطی ہو جائے گی اور جب میں اس بات کو ذرا وسیع کر کے دیکھتا ہوں اور اپنی زندگی کا جائزہ لیتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ ہم صرف احتیاط کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں اور جب اس کو ذرا اور وسیع تر دائرے میں میں پھیلاتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ میں اور میرے معاشرے کے لوگ سارے کے سارے ضرورت سے زیادہ خوفزدہ ہو گئے ہیں اور انہیں ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں ہم سے کوئی کوتاہی نہ ہو جائے۔ ہم آج کل نقصان کی طرف مائل ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتے اسی لیے اگر ہم کو کوہ پیمائی کرنا پڑے۔ ہمالیہ کی چوٹی سر

کرنی پڑے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ تو بڑا "رسکی" کام ہے۔ رسک کا ہے کو لینا، بہتر یہی ہے کہ آرام سے رہیں اور چار پیسے بنانے کے لیے کوئی پروگرام بنائیں۔ چار پیسے بنانا اور اپنی مالی زندگی کو مزید مستحکم کرنا کچھ ضرورت سے زیادہ ہو گیا ہے۔ ہم تعلیم اس لیے حاصل کرتے ہیں کہ یہ ہم کو فائدہ دے گی یا ہم اس سے پیسے حاصل کریں گے اور تعلیم کا تعلق ہم نوکری کے ساتھ جوڑتے ہیں حالانکہ علم اور نوکری کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر ایمانداری کے ساتھ دیکھا جائے تو پتہ یہ چلتا ہے کہ علم حاصل کرنا تو ایک اندر کی خوب صورتی ہے۔ جیسے آپ باہر کی خوب صورتی کے لیے پاؤڈر لگاتے ہیں اور میک اپ کرتے ہیں۔ لڑکیاں لپ اسٹک اور کاجل لگاتی ہیں اسی طرح انسان اپنی روح کو بالیدگی عطا کرنے کے لیے علم حاصل کرتا ہے۔ لیکن ہم نے علم کو نوکری سے وابستہ کر دیا ہے۔ آئے روز اخباروں میں چھپتا ہے کہ جی تین ہزار نوجوان ایم-بی-اے ہو گئے ہیں انہیں نوکری نہیں ملتی۔ ایک زمانے میں میں یہ بات سمجھنے میں پھنس گیا کہ صاحبِ علم کون لوگ ہوتے ہیں اور یہ بات میری سمجھ اور گرفت میں نہیں آتی تھی۔ میں یونیورسٹی میں دوستوں اور پروفیسروں سے اس بابت پوچھا لیکن کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا۔ پھر میں نے ولایت والوں سے خط و کتابت میں پوچھنا شروع کیا اور ان سے پوچھا کہ

Who is Educated Person in the Real Sense of its ۔ Term

ان کی طرف سے موصول ہونے والے جواب بھی ایسے نہیں تھے جن سے میں مطمئن ہو جاتا۔ میرے پاس لوگوں کے اس بابت جوابات کی ایک موٹی فائل اکٹھی ہو گئی۔ ایک دن میں نے اپنے بابا جی کے پاس ڈیرے پر گیا۔ اس دن ڈیرے پر گاجر گوشت پکا ہوا تھا۔ مجھے کہنے لگے کہ کھاؤ۔ میں نے کھانا کھایا اور وہ فائل ایک طرف رکھ دی۔ گرمیوں کے دن تھے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ اشفاق میاں یہ کیا ہے۔ میں نے بتایا یہ فائل ہے۔

کہنے لگے یہ تو بڑی موٹی ہے اور اس میں کاغذات کیا ہیں۔ میں نے کہا کہ جی یہ آپ کے کام کے نہیں ہیں۔ یہ انگریزی میں ہیں۔

وہ دیکھ کر کہنے لگے کہ اس میں تو چٹھیاں بھی ہیں۔ ان پر ٹکٹ بھی لگے ہوئے ہیں اور ان پر تو بڑے پیسے لگے ہوئے ہو گے۔

مجھ سے فرمانے لگے کہ تو باہر خط کیوں لکھتا ہے؟ میں نے کہا بابا جی ایک ایسا مسئلہ سامنے آ گیا تھا جو مجھے باہر کے لوگوں سے حل کروانا تھا کیونکہ ہمارے ہاں

ساری دانش ختم ہو گئی ہے۔ وہ کہنے لگے ایسی کونسی بات ہے میں نے انہیں بتایا کہ میں ایک مسئلے میں الجھا ہوا ہوں۔ وہ یہ ایک کہ آخر صاحب علم کون ہوتا ہے؟

وہ کہنے لگے۔ بھئی تم نے اتنا خرچا کیوں کیا۔ آپ میرے پاس ڈیرے پر آتے اور یہ سوال ہم سے پوچھ لیتے۔ ہمارے باباجی باوصف اس کے کہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے انہیں ایک لفظ "Note" آتا تھا۔ جانے انہوں نے کہاں سے یہ لفظ سیکھا تھا۔

مجھے کہنے لگے۔ ! "Note"

"صاحب علم وہ ہوتا ہے جو خطرے کے مقام پر اپنی جماعت میں سب سے آگے ہو اور جب انعام تقسیم ہونے لگے تو جماعت میں سب سے پیچھے ہو۔"

یہ سننے کے بعد میں بڑا خوش ہوا کیونکہ جب انسان کو علم عطا ہو جاتا ہے تو اس کو بڑی خوشی ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اور ممکن ہے میرا یہ خیال غلط ہو لیکن میرا خیال ہے کہ ہمارے ہاں کسی نہ کسی طرح سے علم کی کمی ہو رہی ہے اور احتیاط کی زیادتی ہو رہی ہے۔ میں خود بڑا محتاط ہوں۔ میرے پوتے 'نواسے نواسیوں کی

تعداد بڑھی تو میں ایک خوفزدہ انسان میں تبدیل ہو گیا کہ ان کا کیا بنے گا۔ یہ کدھر جائیں گے؟ ایسے کیوں ہو گا؟ دھوبی کا خرچ کم کیسے ہو گا؟

میں ہر وقت یہی سوچنے میں لگا رہتا تھا۔ اس سے خرابی یہ پیدا ہوتی ہے جو میں اپنے میں، اپنے دوستوں اور عزیزواقارب میں دیکھتا ہوں کہ خدا کی ذات پر سے اعتماد کم ہونے لگا ہے۔ جب آدمی بہت محتاط ہو جاتا ہے تو پھر ذرا وہ گھبرانے لگتا ہے اور ہم سب اس قسم کی گھبراہٹ میں شریک ہو گئے ہیں۔ اگر اس گھبراہٹ کو ذرا آگے بڑھایا جائے تو اس کے نقصانات بھی بہت زیادہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہم عموماً ایک جملہ بولتے ہیں کہ "جی بڑا دو نمبر کام کر رہا ہے۔" اس کی وجہ گھبراہٹ ہی ہے۔ جب ہم خوف اور گھبراہٹ کے پیش نظر یہ یہ سوچنا شروع کر دیتے ہیں کہ کہیں مجھ میں مالی کمزوری پیدا نہ ہو جائے دو نمبر کام کرتے ہیں۔ مجھے یاد آتا ہے کہ 1866ء میں ہندوستان کا ایک وائسرائے تھا۔ (میرا خیال ہے کہ لارڈ کرزن ہی ہو گا) اس کو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں جا کر Cultural Pattern تلاش کرنے کا بڑا شوق تھا اور بھارت میں میوزیم وغیرہ اس نے Settle کیے تھے۔ وہ ایک دفعہ ایک گاؤں گیا۔ اس نے وہاں اپنا کیمپ لگایا۔ اس کے ساتھ دو اڑھائی آدمیوں کا اس کا عملہ بھی تھا۔ اس وقت وائسرائے بڑی زبردست اور Powerful چیز ہوا کرتی تھی۔ لارڈ کرزن لکھتا ہے کہ جب وہ

اپنے کیمپ میں سویا ہوا تھا تو آدھی رات کے قریب مجھے اپنے سینے پر بہت بوجھ محسوس ہوا۔ وہ بوجھ اس قدر زیادہ تھا کہ مجھے سانس لینا مشکل ہو گیا۔ جب میں نے لیٹے لیٹے آنکھ کھولی تو کوئی پچیس تیس سیر کا کوبرا میرے سینے پر بیٹھا ہوا تھا اور اس نے پھن اٹھایا ہوا تھا اور اس کوبرے کا منہ میرے چہرے کی طرف تھا اور ہر لمحہ زندگی اور موت کے درمیان فاصلہ کم ہوتا چلا جا رہا تھا لیکن میں ہلا نہیں بلکہ اسی طرح خاموش لیٹا رہا اور کوئی چیخ و پکار نہیں کی اور میں اس انتظار میں تھا کہ چونکہ خدا کی طرف سے بھی کبھی نہ کبھی تائید غیبی انسان کو پہنچی ہے اور میں اس کا انتظار کرنے لگا۔

خواتین و حضرات اس طرح کے لمحات میں اس طرح کی سوچ ایک بڑے حوصلے اور اعتماد کی بات کی بات ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا کہ میرے کیمپ کا پردہ اٹھا کر ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ اس آدمی نے جب صورتِ حال دیکھی تو وہ الٹے پاؤں واپس چلا گیا اور اس نے دودھ کا ایک بڑا سا مرتبان لیا اور اس میں گرم دودھ ڈالا اور اس آدمی نے وہ دودھ بڑی ہمت کے ساتھ سانپ کے آگے رکھ دیا۔ جب سانپ نے دودھ کا مرتبان یا جگ دیکھا اور اس نے دودھ کی خوشبو محسوس کی تو سانپ مرتبان کے اندر داخل ہونے لگا اور مزے سے دودھ پینے لگا۔ جب سانپ اس کے مکمل اندر جا چکا تو اس شخص نے

مرتبان کو بند کر دیا۔ لوگوں کو جب واقعہ کا پتہ چلا تو ہر طرف حال دوہائی مچ گئی اور سارا عملہ کیمپوں سے باہر آ گیا۔ وائسرائے صاحب اس شخص سے بڑے خوش ہوئے اور کہا کہ اس شخص کو انعام ملنا چاہیے۔ اس شخص نے کہا جی میں نے آپ کی جان بچائی ہے۔ میرے لیے یہ بھی ایک بہت بڑا انعام ہے۔

میں اور کچھ لے کر بھی کیا کروں گا۔ لوگوں نے دیکھا کہ یہ تو ہمارے عملے کا آدمی ہے ہی نہیں۔ یہ تو کوئی باہر کا آدمی ہے۔ پھر اس سے استفسار کیا کہ تم کون ہو؟ وہ کہنے لگا کہ جی میں بند ھیڑ کھنڈ کا نامی گرامی چور ہوں۔ میں یہاں چوری کی نیت سے آیا تھا اور میں نے سوچا کہ وائسرائے جو کہ بادشاہ وقت کی طرح ہے اس کے کیمپ سے قیمتی چیزیں ملیں گی اور جب میں کیمپ کے اندر داخل ہوا تو میں نے یہ سین دیکھا اور یہ اب آدمیت کا تقاضا تھا کہ میں اپنا پیشہ ایک طرف رکھوں اور جان بچانے کا کام پہلے کروں۔

خواتین و حضرات! اللہ کی مدد ایسے بھی آ جاتی ہے اور اتنے محتاط ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ کبھی تھوڑا آرام بھی کر لینا چاہیے۔ کبھی کبھار سیٹی بھی بجا لینی چاہیے۔ میں جب اپنے اسٹوڈنٹ بچے بچیوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا سیٹی بجانی آتی ہے تو وہ نفی میں جواب دیتے ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ان کے پاس

سیٹی بجانے کا وقت ہی نہیں ہے۔ مجھے اپنے ساتھیوں اور ہم وطنوں کو تنی ہوئی زندگی گزارتے دیکھ کر دکھ جاتے ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کو رسیوں میں جکڑ رکھا ہے۔ کوئی دن یا کوئی تہوار بھی انجوائے نہیں کیا جاتا۔ بلکہ وہ ایک عذاب میں پڑے ہوئے ہیں۔

ایک مراکو کا بادشاہ تھا۔ اس کی عمر کوئی اسّی، سو برس کے قریب تھی۔ وہ ایک شخص سے ناراض ہو گیا اور اس بارے حکم دیا کہ اس کو زنداں میں ڈال دیا جائے اور کل صبح چھ بجے جلاد بلا کر اس کا سر قلم کر دیا جائے۔ اب وہ شخص صبح چھ بجے کا انتظار کرنے لگا اور وہ خوفزدہ نہیں تھا۔ اس نے جیل کے داروغہ کو دیکھا جسے شطرنج کھیلنے کا بڑا چسکا تھا اور اس سے کہا کہ سر آ جائیں بیٹھیں ایک بازی تو لگ جائے۔ اس نے بھی کہا کہ آ جاؤ۔ وہ شطرنج کھیلنے لگے اور اس بندے نے جس نے حکم شاہی کے مطابق قتل ہونا چاہیے تھا نے داروغہ کو شکست دے دی اور داروغہ سے کہا کہ اب آپ آرام کریں صبح ملیں گے۔ جب اس کے قتل کیے جانے کا وقت ہوا تو داروغہ پھر آ گیا اور کہنے لگا کہ آؤ جناب ایک بازی ہو جائے۔ یہ قتل و تل تو روز کا کام ہے ہوتا ہی رہے گا۔ وہ قیدی اس سے کہنے لگا کہ تیرا ستیاناس بادشاہ نے صرف تیری نوکری ختم کر دینی ہے۔ بلکہ میرے ساتھ تجھے بھی قتل کروا دینا ہے۔ لیکن وہ پھر بھی کھیلنے لگا۔ وہ صبح سے شام تک کھیلتے رہے۔

بازی پھنس جاتی تو اگلے دن پھر چلتی۔ اسی طرح چار راتیں ہو گئیں۔) یہ میں آپ سے ایک (Historical Fact) بیان کر رہا ہوں۔ (اور اس کے قتل کیے جانے کا وقت بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ ایک شام کو بیٹھا شطرنج کھیل رہے تھے کہ ایک شخص دھول سے اٹا ہوا اور سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا ان کی طرف آیا۔ وہاں پہنچ کر وہ اس قیدی میں گر گیا اور پکار پکار کر کہنے لگا "باادب باملاحظہ ہوشیار' شہنشاہ جہاں فلاں فلاں 'شہنشاہ مراکو۔" اب جیل کا داروغہ اور وہ قیدی حیران و پریشان کھڑے دیکھ رہے ہیں اور اس سے پوچھا کہ کیا ہو۔ اس نے بتایا کہ بلوائیوں نے مراکو کے بادشاہ کو قتل کر دیا ہے اور آپ چونکہ اس کے چھوٹے بھائی ہیں۔ اب آپ ہی تخت و تاج کے وارث میں لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ایک اکیلے مجھے علم تھا کہ آپ زندہ و سلامت ہیں۔ چنانچہ اس کو بڑی عزت و احترام کے ساتھ گھوڑے پر بٹھا کر لایا گیا اور جس بادشاہ نے اس کے قتل کا حکم نامہ جاری کیا تھا اسی کے تخت پر بٹھا دیا گیا اور وہ بادشاہ بن گیا۔ یہ ٹینشن اور ڈیپریشن کا مرض اس قدر ظالم، مہلک اور خطرناک ہے کہ کوئی منتر، کوئی گولی اور کوئی جادو ٹونا آپ کی مدد نہیں کر سکتا اور جوں جوں خدا کی ذات پر سے اعتماد اٹھتا جا رہا ہے یہ مرض بڑھتا چلا جا رہا ہے اور اس کو دور کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ چلئے اپنی زندگی کے 365 دنوں میں چار دن تو ایسے نکال لیں کہ واقعی ان

دنوں میں اللہ پر اعتماد کر کے بیٹھ جائیں۔ میری پیارے ملک کے پیارے لوگ
اس قدر کھچاؤ میں ہیں کہ ہر وقت خوف کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مجھے ایک
واقعہ یاد آ رہا ہے غالباً یہ واں رادھارام یا راجہ جنگ کی بات ہے کہ وہاں ایک
بینک کھلا۔ وہ چلتا رہا۔ ان علاقوں میں بینکوں کی ڈکیتیاں عام ہیں۔ اب کسی ڈکیت
نے سوچا کہ یہ قصبے کا بینک ہے اس میں آسانی سے واردات ہو سکتی ہے لہٰذا اس
نے اپنی کلاشنکوف لی۔ جیپ باہر کھڑی کی اور اس نے اس بینک میں ایک گولی
فائر کی اور سب کو ڈرا کر ہینڈز اپ کرا دیئے اور کیشیئر کے آگے جتنی رقم تھی وہ
اس نے اپنے تھیلے میں ڈال لی۔ اس رقم میں سارے ملے جلے نوٹ تھے۔ جب وہ
بینک سے باہر نکلا تو عجیب سماں تھا۔ اس کے فائر کرنے کی وجہ سے باہر لوگوں کو
صورتحال کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اور ان گاؤں والوں نے اس بینک ڈکیتی کو اپنی
عزت بے عزتی کا معاملہ بنا لیا تھا اور وہ اپنے گھروں سے اپنی پرانی بندوقیں نکال
کر باہر لے آئے۔ کسی کے پاس رائفل بھی تھی اور وہ سارے اکٹھے ہو کر آئے
اور آتے ہی اس ڈاکو کی جیپ کے ٹائر پنکچر کر دیئے۔ پھر شور مچانا شروع کر دیا۔
اس ڈکیت نے بھاگنے کی کوشش کی اور فائرنگ کرتا رہا لیکن وہ لوگ بھی
ارادے کے پکے تھے اور انہوں نے گھیراؤ کر لیا۔ جب ڈاکو کے ہاتھ سے روپوں

والا تھیلا چھوٹا تو نوٹ بکھر گئے۔ اب لوگوں نے ڈاکو کو تو جانے دیا لیکن روپوں کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا اور سارے نوٹ سنبھال کر بینک مینجر کو دے آئے۔

خواتین و حضرات یہ دنیا کی واحد بینک ڈکیتی ہے جس میں بینک کو 32 روپے کا فائدہ ہوا کیونکہ کئی لوگوں کی جیبوں سے گر کر پیسے اس رقم میں شامل ہو گئے

تھے اور اس طرح بینک نے لوٹے ہوئے 28 ہزار کی جگہ 28 ہزار 32 روپے حاصل کیے۔

برداشت کرنے اور حوصلہ کرنے سے کچھ ایسے فائدے کی راہیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ پریشان ہونے کی اس لیے بھی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ تو ہو کر رہے گا جو ہو کر رہنے والا ہے۔

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل

لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اب میں آپ لوگوں کو پھنسے ہوئے نہیں دیکھ سکتا اور میری آرزو اور بڑی تمنا ہے کہ آپ ایک سہل زندگی بسر کرنے کی کوشش کریں تاکہ بہت سے بڑے بڑے کام جو انتظار کر رہے ہیں اور بہت سی فتوحات جو آپ نے کرنی ہیں وہ آپ

کر سکیں اور یہ اسی صورت ممکن ہو گا کہ آپ خداوند تعالیٰ پر مکمل یقین رکھیں اور قلب کو بھی مانیں۔ آپ ۹۹ فیصد مادہ پرست کو تھامے رکھیں اور صرف ایک فیصد تو اپنی ذات کو آزاری کی اجازت دے دیں اور کہہ دیں کہ اگر آج سو روپے کا نقصان ہونا ہے تو ہو لے کوئی بات نہیں۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

آمین۔ اللہ حافظ۔

بانسری

ہمارے زمانے میں بڑی گھنگھور گھٹائیں گھِر کر آیا کرتی تھیں اور چھما چھم بارشیں ہوا کرتی تھیں۔ اب بڑی دیر سے ہم ویسی بارشوں کے انتظار میں ہیں اور آرزوئیں لے کر بیٹھے رہتے ہیں لیکن ویسی بارشیں آتی نہیں ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں اور ضروری نہیں کہ میرا محسوس کرنا درست ہو۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ گھنگھور گھٹائیں بہت گھمبیر خیالات کے صورت میں اب ہمارے وجود سے باہر کی بجائے ہمارے وجود کے اندر سمانے لگی ہیں اور دماغوں پر اثر انداز ہونے لگی ہیں۔ میں یہ بات اس لئے کر رہا تھا کہ ابھی پروگرام شروع ہونے سے پہلے ہم نیگیٹو اور پازیٹو کی بات کر رہے تھے۔ آج کی جو نئی نسل ہے وہ بہت زیادہ پریشانی کے عالم میں مبتلا ہے۔ ایک تو یہ بات ان کے چہروں سے عیاں ہوتی ہے اور دوسرا ان کی پریشانی سنہری اور درخشاں مستقبل کی نوید اور امید نہ ہونے کی بدولت ہے۔ جب بچے پریشان ہوں تو ظاہر ہے کہ بڑے پریشان ضرور ہوتے ہیں۔ باوصف اس کے کہ بڑے اپنی بڑائی کی وجہ سے اور

اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنا پر کچھ ایسے رویے اختیار کر چکے ہیں جن رویوں نے انہیں سکون عطا کر رکھا ہے لیکن وہ ان بچوں کی مدد نہیں کر سکتے جنہوں نے بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کر رکھی ہیں۔ میں ان کے لئے ڈیپریشن کا لفظ استعمال تو نہیں کرنا چاہتا لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان کے اندر Negativity کے بادل ایسے چھا گئے ہیں کہ ان سے نکلنا ان کے لئے بہت مشکل ہو گیا ہے۔ جو بچے بچیاں مجھ سے ملتے ہیں تو ان کے خیالات ایسے تکلیف دہ ہوتے ہیں کہ میں انہیں آپ کے سامنے پوری تفصیل کے ساتھ بیان کرنے لگوں تو شاید آپ پر بھی ویسا ہی بوجھ پڑ جائے جیسا ان کے والدین یا میرے جیسے آدمی پر ہے۔

Negativity کی عام مثالیں بالکل سیدھی سادھی یہ ہیں کہ ایک بچہ جس نے بی کام کیا ہے اور وہ تازہ ترین کمپیوٹر کے علم سے بھی آشنا ہے لیکن گھمبیر خیالات نے انہیں ایسے گھیر رکھا ہے کہ وہ خیال کرتے ہیں کہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ میں کامیاب ہونے کے لیے پیدا ہی نہیں ہوا۔ یہ سارے مسائل ہمارے گھرانے کے لئے ہی ہیں۔ ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ وہ اسی گھبراہٹ میں مبتلا رہتا ہے۔ جو معیشت کے ماہر ہیں وہ پروگرام بناتے رہتے ہیں کہ نوجوانوں کو زیادہ نوکریوں کی ضرورت ہے لیکن میں عاجزی کے ساتھ یہ سمجھتا ہوں کہ معیشت کے ساتھ ہی ان کا حل وابستہ نہیں ہے۔ انہیں کسی اور چیز کی

بھی ضرورت ہے جو ہم بڑے انہیں نہیں دے رہے اور ان بچوں کے ذہنوں
میں تکلیف دہ خیالات جنم لے رہے ہیں۔ نوجوان اس مایوسی میں ہیں کہ میں نے
امتحان تو دے دیا ہے لیکن کامیاب نہیں ہو سکوں گا۔ جو بال بچے والے ہیں وہ
کہتے ہیں کہ میں بیٹی کی شادی تو کر دی ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ بسے گی نہیں اور
لوٹ کے گھر آ جائے گی اور اس طرح کے خیالات ہر وقت ان کے ذہن میں
گھومتے رہتے ہیں۔ ایسے خیالات کو زندگی سے نکالا نہیں جا سکتا اور ان کا کوئی
علاج بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ یہ غیر اختیاری رجحانات یا خیالات ہوتے ہیں
اس لئے آتے ہی رہیں گے اور ان پر ہمارا کوئی زور نہیں چلتا ہے لیکن انہی منفی
تصورات کا ایک علاج ضرور نکالا جا سکتا ہے اے بچو، بھلے آپ اپنے ذہنوں کے
اندر ایسے منفی خیالات کو تو رہنے دیں لیکن اپنے اندر ایک ایسا رویہ ضرور اختیار
کریں جو ان منفی خیالات کے ہونے کے باوصف آپ کو مثبت انداز اختیار کرنے
پر راغب کرے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ آپ جب بھی بے شمار منفی خیالات
میں گھریں اور آپ کو مستقبل تاریک نظر آئے تو آپ جس مقام پر بھی ہوں
وہاں سے باہر نکل کر کھلی جگہ پر آ جائیں اور کھلی جگہ پر آ کر دونوں پاؤں کے
درمیان ڈیڑھ فٹ کا فاصلہ رکھیں۔ کندھے پیچھے رکھتے ہوئے سینہ آگے نکال کر
اور ٹھوڑی اوپر اٹھا کر آنکھیں آسمان کے ساتھ ملا کر ایک بہت ہی گہرا سانس

لیں (یہ ضروری ڈرل ہے جو خاص کر اس مقصد کے لئے ہے) اور پھر اس گہرے سانس کو روک کر یہ کہیں کہ "میرا اللہ مجھے طاقت عطا کرتا ہے اور میں طاقتور ہوں"

بچو! یہ وہ مشق یا ڈرل ہے جو کی جانی چاہئے جس سے فائدہ پہنچتا ہے۔ جب آپ اس ڈرل میں داخل ہوں گے تو آپ کو طاقت آتی محسوس ہو گی۔ چینی لوگ اس بارے میں کہتے ہیں کہ یہ طاقت اللہ کی طرف سے انسان کو عطا کی گئی ہے یہ کائنات کے اندر ہر جگہ موجود ہے جسے آپ ہاتھ پھیلا کر سمیٹ سکتے ہیں اور اپنے اندر داخل کر سکتے ہیں۔ ہمارا ہاتھ پھیلا کر دعا مانگنے کا طریقہ دیگر مذاہب سے یوں مختلف ہے کہ چینی ایک مخصوص خدا کی طاقت کو جسے وہ "چی" یا "کی" بولتے ہیں معلوم نہیں کہ اس کا اصل تلفظ کیا ہے۔ اس طاقت کو سمیٹ کر چہرے پر مل کر حاصل کرتے ہیں اور دعا مانگ کر ہم بھی محسوس کرتے ہیں کہ ہم نے اس قسم کی طاقت کو حاصل کر لیا ہے جو خدا نے ہمیں دی ہے اور آپ دعا مانگ کر ہاتھ چہرے پر پھیر کر اس طاقت کو Seal کر دیتے ہیں اور جو پانچ وقت کی نماز ادا کرتے ہیں وہ اس طاقت کو Seal کر کے اپنے وجود میں ڈال کر مضبوطی اور کامیابی کے ساتھ سیل کر دیتے ہیں۔ میں رویوں کی بات کر رہا تھا کہ اگر منفی خیالات اور تھکا دینے والے اور تکلیف دہ خیالات آپ کی جان نہیں

چھوڑتے تو آپ اپنے رویے میں تبدیلی ضرور پیدا کریں۔ معلوم نہیں آپ نے گزشتہ دنوں ایک ڈچ جرنلسٹ کی شائع ہونے والی رپورٹ پڑھی ہے کہ نہیں۔ ہو کہتا ہے کہ میں افغانستان میں تھا اور کہیں دور نکل گیا اور میں نے چھوٹی پہاڑیوں کے سلسلے میں بانسری کی بہت ہی خوبصورت آواز سنی اور میں مسحور ہو گیا۔ وہ آواز سن کر میرے قدم خود بخود اس جانب اٹھنے لگے۔ آگے جا کر میں نے دیکھا کہ پہاڑی کے اوپر ایک نوجوان چرواہا جو چھوٹی عمر کا تھا بیٹھا بانسری بجا رہا تھا۔ میں نے قریب جا کر دیکھا کہ اس کے پاس سیاہ رنگ کی ایک ذرا سی لمبی بانسری تھی۔ میں اس کی زبان تو نہیں جانتا تھا۔ اشارے سے اسے بانسری دکھانے کو کہا تو اس نے وہ بانسری مجھے دکھائی اور یہ دیکھ کر میری حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ وہ بانسری جس کو وہ بجا رہا تھا اور میرے قدم خود بخود اس کی طرف اُٹھ رہے تھے وہ رائفل کی ایک نال تھی جس کو اس نے کاٹ کر ایک طرف سے بند کر رکھا تھا اور اس میں سے چھ سوراخ بنائے ہوئے تھے اور اس میں ایک ہوا دینے کا سوراخ تھا اور میں اسے دیکھ کر حیران و پریشان تھا کہ اگر اتنی بڑی منفی چیز جس نے کتنے ہی انسانوں کو مار ڈالا ہو گا اور اگر اس کا رویہ تبدیل کر کے اسے مثبت مقاصد کے لئے استعمال کر دیا جائے تو وہ مدھر ساز والی بانسری بن جاتی ہے جو لوگوں کو موت یا خوف کے برعکس سکون اور اطمینان عطا کرتی ہے۔ اگر اسی

طرح آپ منفی رویوں کو تبدیل کرنے کے لئے پازیٹو اقدامات کرتے رہیں تو مایوسی کی فضا ختم ہو جائے گی۔ اگر ہم ایک نیا اور اچھا اندازِ فکر اپنائیں تو ضرور بہتر اثرات مرتب ہوں گے۔ Negativity کو Positivity میں بدلنا اندر کی آواز کی وجہ سے ممکن ہے۔ خیالات تو غیر اختیاری طور پر آتے ہیں لیکن رویہ اختیاری طور پر تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ بہت ہی زیادہ مایوس ہو جانے سے شیطان بہت ہی خوش ہوتا ہے اور جب بھی آپ منفی رویوں میں داخل ہوتے ہیں (خدا نہ کرے آپ اس بیماری میں داخل ہوں) تو پھر شیطان اس لئے خوش ہوتا ہے کہ میں نے بندے کو اللہ کی رحمت سے نکال لیا ہے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرما دیا ہے کہ ترجمہ: (اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہو۔)

لیکن آپ پر مایوسی آجانے سے شیطان انسان کو اللہ کے اس فرمان کے یقین سے باہر نکال لاتا ہے۔ شیطان انسان کو چوری چکاری، بے ایمانی اور گندی باتیں نہیں سکھاتا بلکہ وہ صرف اس بات پر مائل کرتا ہے اور ترغیب دیتا ہے کہ جس اللہ کو تو آج تک مانتا رہا ہے دیکھ اس نے تیرے ساتھ کیا کیا ہے۔ تو نے نوکری کے لئے Apply کیا تھا لیکن تیرا کام نہیں بنا۔ تو نے اتنے اچھے پرچے دیے

تھے لیکن تمہارے نمبر ہی کم آئے ہیں۔ شیطان کے پاس بس یہ ایک ہی Trick ہوتا ہے۔ وہ جیسے جیسے یہ بات پکی کرتا جاتا ہے آپ اللہ کے دائرے سے نکلتے جاتے ہیں اور شیطان کی ڈی میں آجاتے ہیں تو پھر اسے گول کرنے بڑے آسان ہو جاتے ہیں۔ آپ مایوس ہونے کی بات Neutral ہو کے اس قسم کا کام کریں جیسا کہ اس چرواہے نے بانسری بجا کر کیا تھا۔ رویے کو تبدیل کرنے اور اس پر حاوی ہونے کے لئے اتنی کوشش نہیں کرنی پڑتی جتنی کہ آپ سمجھ رہے ہیں۔ صرف تہیہ کرنے کی بات ہے۔ جب آپ تہیّے کے کنڈے میں ہاتھ ڈال کر ایک دفعہ لٹک جاتے ہیں تو وہ کنڈا پھر آپ کو خود بخود اُٹھا لیتا ہے۔ آپ نے سرکس میں کرتب دکھانے والے دیکھے ہوں گے۔ ان کی بھی ہاتھ ڈالنے ہی کی مشق ہوتی ہے پھر ان کا بدن خود بخود ان کو گھماتا پھراتا رہتا ہے۔ ہمیں رویے تبدیل کرنے کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ میں پہلے بھی آپ سے ایک علاقے کا بہت ذکر کرتا ہوں جو مجھے بہت پیارا ہے اور تھرپارکر ریگستان کا علاقہ ہے۔ یہ عجیب و غریب علاقہ ہے۔ اس جگہ کئی مذاہب اور قوموں کے لوگ رہتے ہیں۔ راجپوت بھی ہیں، خانہ بدوش بھی۔ کئی سال پہلے کی بات ہے۔ وہاں ہم نے ایک شخص کو دیکھا وہ لڑکا تو خیر نہیں تھا اس کے سر پر پگڑی تھی راجپوتوں جیسی لیکن کپڑے اس کے زیادہ اچھے نہیں تھے۔ اس کے ہاتھ میں

ایک لمبی ”سوٹی“ (چھڑی) تھی اور وہ کوبرا سانپ کو قابو کرتا تھا اور اس شخص میں بلا کا اعتماد تھا۔ وہ ایک ہاتھ لہرا کر سانپ کو فن اور اعتماد کے جادو سے مست بھی کرتا تھا اور کبھی کبھی کوبرا خوفناک ہو کر اس پر حملہ بھی کرتا تھا۔ جب سانپ اس پر حملہ کرتا تو وہ اپنی سوٹی جس کے آگے اس نے بیکر (بیکر وہ چیز ہے جس سے ہم سائنس کی لیبارٹریوں میں تجربات کرتے ہیں اور میں جس علاقے کی بات کر رہا ہوں وہاں کوبرا سانپ بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں) باندھا ہوا تھا۔ سانپ کے قریب کر دیتا تھا اور جونہی وہ سانپ کے قریب کرتا سانپ اس پر حملہ کر دیتا وہ شخص فوراً سانپ کی گردن دبوچ لیتا اور سانپ کے دانت اس شیشے کے برتن پر لگائے رکھتا اور سانپ کے منہ سے بالکل سفید رنگ کا زہر نکال لیتا اور ایک دم پھر وہ اس موذی جانور سے پیچھے ہٹ جاتا۔ میں اور ممتاز مفتی یہ کھیل دیکھتے رہے۔ ہم نے اس سے پوچھا کہ تو اس زہر کا کیا کرتا ہے تو اس نے جواب دیا کہ لیبارٹریوں والے اس سے وہ زہر خریدتے ہیں اور وہ ناگ کے اس زہر سے ادویات بناتے ہیں۔ وہ کہنے لگا کہ ”سائیں بابا میں ناگ چوتا (دوہتا) ہوں۔ یہ میرا پیشہ ہے۔“ اس نے بتایا کہ تین گھنٹے کے بعد ناگ میں پھر زہر پیدا ہو جاتا ہے اور اس نے بتایا کہ ایک وقت کے سانپ کے زہر سے گھوڑے کو مارا جا سکتا ہے اور اس نے بتایا کہ وہ شام تک تو تین ”چلیاں“ (2 تولے کے برابر) پھر

لیتا ہوں۔ دن بھر ناگ دوہتا ہوں اور شام کو اپنی بکری دوہتا ہوں اور میں پھر اس بکری کے دودھ میں گڑ اور پتی ڈال کے پیتا ہوں۔

خواتین و حضرات! میں رویے میں تبدیلی کی بات کر رہا تھا کہ اس نے ایک خوفناک چیز کو کس خوبی کے ساتھ ایک مثبت کام یا رویے میں تبدیل کر لیا تھا اور وہ اس سے گھبراتا نہیں تھا اور اس پر قائم تھا۔ جب میں فرسٹ ائیر میں تھا تو میں امریکہ کی اس اندھی، گونگی اور بہری بچی ہیلن کے بارے میں پڑھ کر حیران رہ گیا۔ اس کو قدرت نے کوئی صلاحیت نہیں دی۔ صرف ایک تودے کی مانند تھی۔ اس کے پاس صرف خوشبو اور لمس کو محسوس کرنے کی طاقت تھی۔ وہ اپنی خودنوشت میں لکھتی ہے کہ میں نے خود کو زندوں میں شامل کرنے کا ارادہ بنایا اور جو منفی چیزیں مجھ پر وارد کر دی گئی ہیں میں انہیں مثبت میں تبدیل کروں گی لیکن خواتین و حضرات وہ اس طرح نہیں گھبرائی پھرتی تھی جس طرح ہمارے بچے ایم-بی-اے کرنے کے بعد گھبرائے پھرتے ہیں اور چادر تان کے لیٹ جاتے ہیں۔ اس لڑکی نے اپنی ایک سہیلی کو بتایا کہ جب میں تمہارا ہاتھ اس طرح دباؤں تو اس کا مطلب مثال کے طور پر ''اے'' ہو گا۔ دوسری طرح دباؤں تو اس کا مطلب ''بی'' ہو گا۔ اس نے اپنی بات کو سمجھانے کے لئے اپنی دوست کو خود اشارے بتائے اور اس طرح اس نے ایک نئی زبان کو جنم دیا۔ وہ اپنی سہیلی

کا ہاتھ دباتی جاتی تھی اور اس کی سہیلی اس کی باتوں کو سمجھتی جاتی تھی اور لکھ لیتی تھی۔ وہ اپنی خود نوشت میں کہتی ہے کہ میں اللہ کی بڑی شکر گزار ہوں اور میں ہر وقت اس کا شکر ادا کرتی رہتی ہوں کہ اس نے مجھے دنیا کی ان نعمتوں سے محروم رکھا جو ساری کائنات کے لوگوں کو ملتی ہیں۔ اگر مجھ میں یہ خامیاں نہ ہوتیں تو میں اتنی نامور رائٹر نہ ہوتی اور میں ایک عام امریکی عورت کی طرح چولہے چونٹھے پر کام کرتی فوت ہو گئی ہوتی لیکن میں ساری خامیاں میرا بہت بڑا سہارا بن گئی ہیں۔ وہ پاکستان بننے کے دوسرے تیسرے سال لاہور آئیں۔ میری بھی ان سے ملنے کی بڑی خواہش تھی۔ خدا کا شکر کہ میری اس سے ملاقات ہوئی اور وہ اپنی اس دوست کے ذریعے سے ہم سے سوال جواب کرتی رہی اور میرے Funny قسم کے سوالات پر وہ بے قاعدہ ہنستی بھی تھی اور ہمارے سوالوں کا کھٹا کھٹ جواب دیتی۔ وہ اپنی خامیوں پر فخر کرتی۔ میں بھی اپنے پیارے بچوں کو مایوس نہیں دیکھنا چاہتا۔ اگر میرے بچے اپنے خیالات کو مثبت انداز میں ڈھالیں اور خودکُشی کرنے اور قتل کرنے والی رائفل کو بانسری میں تبدیل کر دیں تو وہ بہت سی مشکلات سے نکل سکتے ہیں۔ ان کی یہ گھبراہٹ بہت زیادہ انفارمیشن ملنے کی وجہ سے ہے اور وہ اپنے بارے میں بہت کم جانتے ہیں

جس طرح کہا گیا ہے کہ جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے اللہ کو پہچان لیا۔ اس لئے خود کی پہچان کرنا بہت ضروری ہے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ

تحائف

پھولوں اور تحفوں کی دنیا بھی بڑی عجیب و غریب ہے۔ اس کو اگر Microscopically دیکھیں تو اس کے نہایت عجیب و غریب معانی نکلتے ہیں۔ میرے ہی ہم عمر میرے ایک دوست بیمار تھے اور ہماری عمر کے لوگوں کو بیماری لگنا تو عام سی بات ہے۔ ہم اپنے اس دوست کی عیادت کرنے ہسپتال میں گئے تو وہاں ہمارے ایک اور دوست ان کے لئے پھولوں کا تحفہ لے کر آئے ہوئے تھے۔ ہمارے ہاں پھول دینے اور لینے کا بڑا رواج ہو گیا ہے۔ جب وہ پھول دینے والے دوست وہاں سے چلے گئے تو میرے زیرِ علاج دوست یوسف کہنے لگے کہ یار یہ پھول بہت اچھی چیز ہیں۔ بڑے خوبصورت لگتے ہیں لیکن اشفاق تو ہمارے اس دوست کو تو کچھ نہ کہنا لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ بجائے پھول میرے سرہانے رکھنے کے کچھ دیر میرے پاس بیٹھتا۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں میرا ہاتھ لیتا۔ مجھے اس بات کی بڑی آرزو اور طلب ہے کہ میرے دوست عزیز میرے قریب آکر مجھے وہ لمس عطا کریں جس کی مجھے بڑی ضرورت ہے۔

وہ کہنے لگا کہ میں پھولوں کا تحفہ برا نہیں سمجھتا لیکن پھول کے مقابلے میں قریب آنا زیادہ اچھا تھا۔

میں نے اسے بتایا کہ ولایت میں بھی پھول دینے کا بڑا رواج ہے۔ روم کی یونیورسٹی میں ہمارے پروفیسر اونگاریتی کہا کرتے تھے کہ میں کسی ایسے ملک میں نہیں رہنا چاہتا جہاں پھول بکتے ہوں۔ پھولوں کو بکنا نہیں چاہئے۔ خواتین و حضرات بات تو یہ بھی سوچنے والی ہے کہ پھول اور انسان کے درمیان ایک محبت کا رشتہ ہے۔ وہ رشتہ اُجاگر ہونا چاہئے تاکہ ہم پھولوں کو جنسِ خرید ار بنا کر پیش کریں۔ میں نے یوسف سے کہا کہ یہ تو تحفے کی بات ہے اور تحفے کو ہر حال میں قبول کیا جانا چاہیے۔

ہمارے نبی محمد صلی اللہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب آپ کسی کے پاس جائیں تو کوئی تحفہ چاہے چھوٹا ہو یا بڑا ضرور لے کر جائیں۔ اس سے محبت بڑھتی ہے۔ تحفے اور تحفے دینے کی بھی کئی اقسام ہیں اور بعض اوقات تحفہ عطا کرنے والا اسے ایسے عطا کرتا ہے کہ آپ کو یا وصول کرنے والے کو احساس تک نہیں ہوتا کہ مجھے کچھ عطا کیا جا رہا ہے یہ دے رہا ہے اور تحفے کے بڑے روپ ہوتے ہیں۔ بعض روپ ایسے ہوتے ہیں جو سمجھ نہیں آتے لیکن تحفہ ان تک پہنچ جاتا ہے

جسے عطا کیا جارہا ہو لیکن شعوری محور پر اس کا علم نہیں ہوتا۔ جسم اس تحفے سے واقف نہیں ہوتا لیکن روح بہت حد تک واقف ہوتی ہے اور اس سے بہت حد تک فائدہ بھی اٹھاتی ہے۔ روح کو توانائی اور تقویت بخشنے کے لئے ضروری ہے کہ تحفوں کے بارے میں ضرور سوچا جائے اور وہ تحفے ایسے ہوں جن کو روح بھی قبول کرے اور جسم بھی۔ ایسے تحفے جاری رہنے چاہئیں۔ مجھے وہ وقت یاد آرہا ہے جب میں سمن آباد میں رہتا تھا اور میرا پہلا بیٹا پیدا ہوا تھا۔ اس کی عمر کوئی چھ ماہ ہو گی جب کا یہ واقعہ ہے۔ چیکوسلواکیہ کی ایک فلم "Previous Summer" تھی۔ میں نے اس کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا اور وہ فلم دیکھنے کی مجھے بڑی آرزو تھی۔ میں اور بانو قدسیہ دونوں ہی وہ فلم دیکھنا چاہتے تھے۔ اس وقت وہ اس علاقے میں کوئی بس بھی نہیں چلتی تھی۔ گھر کے قریب میرے ایک خالو جو ایک کوآپریٹو بینک میں تھے وہ رہتے تھے۔ میں ان کے پاس گیا اور کہا کہ ہمیں فلم دیکھنے جانا ہے اور اگر آپ ہمارے ہاں Baby Sitting کر لیں۔۔۔۔ تو انہوں نے کہا کہ کیوں نہیں، بسم اللہ۔ میں نے کہا کہ جی وہ ہمارا بچہ خیر زیادہ روتا تو نہیں ہے اور اس کی ماں اس کے لئے فیڈر وغیرہ بنا کر دے جائے گی۔ وہ میرے رشتے کے خالو اپنی بیوی سے اس وقت کہنے لگے کہ "چل بھئی حمیدہ ادھر چلیں" جب وہ گھر آئے تو میں نے انہیں گھر کی چیزوں کی

بابت بتایا۔ لیکن وہ کہنے لگے کہ آپ لوگ بے فکر اور پر سکون ہو کر آسانی کے ساتھ جاؤ اور مزے اڑاؤ۔ وہ فلم ہماری توقع کے مطابق بڑی عجیب و غریب فلم تھی۔ اس فلم میں تین بُڈھے تھے۔ ایک برکھا والی Summer تھی جس میں وہ بڑی محبت سے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ ان کی عمر زیادہ ہوتی ہے اور انہیں سمجھ نہیں آتی کہ عشق میں کیسے مبتلا ہوا جائے۔

ہم واپس آئے تو گھر میں ہمارے خالو اور خالہ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا لیکن وہ کہنے لگے نہیں نہیں ہم تو فارغ ہی تھے پھر بھی کبھی ضرورت پڑے تو کہ دینا۔ میں نے شرارتاً ان سے کہا کہ جی گو برا تو لگتا ہے لیکن Baby Sitting کی ایک فیس ہوتی ہے۔

وہ کہنے لگے ہاں ہوتی تو ہے۔

وہ کہنے لگے کہ آج کل وہ فیس کتنی ہے۔

میں نے کہا جی دس روپے ہے۔

ہم دونوں کی۔ خالو نے پوچھا۔

میں نے کہا کہ نہیں خالو آپ کے دس روپے الگ اور خالہ کے دس روپے الگ۔

وہ کہنے لگے کہ ہمیں یہاں دو گھنٹے لگ گئے اور اس طرح چالیس روپے بن گئے۔ پھر انہوں نے بغلی جیب میں ہاتھ ڈالا اور چالیس روپے نکال کر ہم کو دے دیئے اور کہنے لگے کہ اتفاق سے میرے پاس پچاس ہیں دس میں رکھ لیتا ہوں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کو Baby Sitting کے معنی نہیں آتے۔

وہ کہنے لگے کہ آتے ہیں۔ لیکن ان کو واقعی اس کے معانی نہیں آتے تھے۔

وہ سمجھتے تھے کہ اگر بزرگ گھر میں Baby Sitting کریں تو انہیں اپنے پاس سے روپے دینا پڑیں گے۔ انہوں نے بجائے لینے کے چالیس روپے ہمیں دے دیے اور ہم نے وہ رکھ لئے۔ میری بیوی کہنے لگی کہ جلدی دیکھو کہ کیا کوئی اور اچھی فلم آرہی ہے کہ نہیں کیونکہ آئندہ خالو اور خالہ کو پھر بلائیں گے۔

خواتین وحضرات! اتنا وقت گزر گیاہے اور ہم Baby Sitting کے پیسے لے چکے ہیں تو مجھے اب خیال آتا ہے کہ ہم یہی سمجھتے رہے کہ ہمارے خالو پینڈو ہیں اور انہیں اس لفظ کے شاید معانی بھی نہیں آتے لیکن حقیقت میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ انہیں اس لفظ کے معانی بالکل ٹھیک آتے تھے اور اچھی طرح سے آتے تھے لیکن انہوں نے ہماری خوشنودی کے لئے، ہمارے ہاں آنے کے لئے اور ہمارے سر پر ہاتھ رکھنے کے لئے پیسوں کی صورت میں تحفہ عطا کیا تھا۔ ایسے

تحفے آپ کی زندگی میں بھی آتے رہتے ہیں۔ اس کے لئے صرف الرٹ رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ آپ کی زندگی کی بڑھوتری میں روحانی، نفسیاتی اور جذباتی طور پر بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مجھے اور آپ کو بھی یہ سوچنا چاہئے کہ تحفہ کس شکل میں دیا جائے کہ وہ لینے اور دینے والے کی روحانی و نفسیاتی نشوونما میں فائدہ پہنچائے۔ اس کا فائدہ محض جسمانی نہیں ہونا چاہئے کہ ہم کسی کو لحاف تحفے میں دے دیں۔

پچھلے سال گرمیوں میں میری بھتیجی کی شادی تھی۔ میں ان کے گھر کے صحن میں کھڑا ایک شامیانہ لگوا رہا تھا کہ اس میں لڑکیاں وغیرہ مہندی کی رسم کر لیں۔ میرے ساتھ میرے کچھ عزیز بھی تھے۔ وہاں پر ایک عجیب سا آدمی آگیا جو ہمارے محلے کا نہیں تھا اور میں نے اسے پہلے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ اس نے خاکی رنگ کی شرٹ اور خاکی ہی پتلون پہنی ہوئی تھی۔ ہو آکر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ ”جی یہاں کوئی شادی ہو رہی ہے؟“

میں نے کہا کہ ”جی ہاں شادی ہو رہی ہے۔“

وہ کہنے لگا کہ ”کس کی؟“ میں نے کہا کہ ”میرے بھتیجی کی۔“

وہ کہنے لگا کہ ”جی کیا نام ہے اس کا؟“

میں نے کہا ”اس کا نام عظمیٰ ہے۔“

وہ پھر کہنے لگا کہ ”شادی کب ہے جی؟“

وہ مجھ سے بچوں کی طرح ایک ایک سوال پوچھ رہا تھا۔

میں نے کہا کہ ”پرسوں بارات آئے گی۔“

اتنی دیر میں ایک نوجوان آ گیا جس کو میں پہچانتا تھا۔ اس نے آتے ہی اس شخص سے کہا کہ آئیں آئیں چلیں۔ جلدی کریں۔ وہ نوجوان اس شخص کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اسے لے گیا۔ میں تھوڑا سا پریشان ہوا اور حیران بھی ہوا لیکن پھر میرے ذہن سے بات نکل گئی۔ اگلی صبح وہی نوجوان جو اس شخص کو لے کر گیا تھا وہ میرے پاس آیا اور کہا کہ جی انہوں نے آپ سے کچھ ایسا تو نہیں کہا جو آپ کو ناگوار گزرا ہو۔ میں نے کہا کہ نہیں وہ تو مجھ سے شادی کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔

وہ نوجوان کہنے لگا کہ یہ میرے ماموں ہیں۔ یہ دماغی طور پر ذرا ماؤف ہیں۔ میں اور میری والدہ اس لئے گھبرائے تھے کہ انہوں نے کچھ ایسی باتیں نہ کہ دی

ہوں جو آپ کو ناگوار گزری ہوں۔ خواتین و حضرات اس نوجوان کے ماموں کا دماغی توازن تو ضرور بگڑا تھا لیکن اس پر ایک طرح کا پہرہ بٹھا دیا گیا تھا۔ جب مہندی کی رسم ہو چکی اور لڑکیاں ناچ گانا کر کے فارغ ہو گئیں تو اس وقت وہ صاحب پھر آ گئے اور بڑے کھسیانے اور شرمندہ سے تھے۔ میں نے کہا کہ آیئے آیئے تشریف لایئے۔ میں تو آپ کا انتظار کر تا رہا ہوں۔ وہ اب دونوں ہاتھ پیچھے رکھ کر جھوم جھوم کر باتیں کر رہے تھے۔ میں نے انہیں بیٹھنے کا کہا لیکن انہوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے چائے کا پوچھا تو انہوں نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ پھر انہوں نے اپنا ایک ہاتھ فوراً آگے کر دیا۔ ان کے ہاتھ میں عام سے خاکی لفافے میں مروڑی دے کر رکھی ہوئی کوئی چیز تھی۔ وہ کہنے لگا کہ میں بچی کے لئے یہ تحفہ لایا ہوں۔ میں نے کہا کہ بہت مہربانی اور ان سے تحفہ لے لیا اور وہ جیسے آئے تھے ویسے ہی شرمندگی کے عالم میں چلے گئے۔ مجھے اس بات کا بڑا افسوس ہوا کہ میں انہیں بٹھا بھی نہیں سکا۔

خواتین و حضرات! اس لفافے میں ایک چینی کا جگ تھا۔ وہ جگ عام سائز سے ذرا بڑا تھا۔ میں نے اپنی بھتیجی سے کہا کہ تمھارے لئے یہ تحفہ ہے۔ تمہیں دوسرے ملنے والے تحفے واقعی بڑے قیمتی ہیں اور ان کی پیکنگ بھی بڑی خوبصورت ہے لیکن اس تحفے کو بڑی محبت اور اعتماد کے ساتھ رکھنا یہ ایک بہت بڑے آدمی کا

تحفہ ہے۔ وہ ہنس دی اور کہنے لگی چچا یہ تو فضول سا ایک جگ ہے۔ میں اسے تحفے کی آئٹم میں کہاں رکھوں گی۔

خواتین و حضرات! وہ شخص جو جگ لے کر آئے تھے وہ جگ تھا جس میں انہیں دودھ دیا جاتا تھا۔ اس کے پاس اس جگ کے سوا دینے کو اور کچھ نہ تھا۔ جب مجھے اس بات کا علم ہوا تو میں نے اپنی بھتیجی سے کہا کہ یہ سارے تحفوں میں سے قیمتی تحفہ ہے اور جس آدمی نے دیا ہے تم اور میں دونوں مل کر اس کے دل کی گہرائیوں کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ وہ جگ اس شخص کا سب سے قیمتی سرمایہ تھا۔ میں گزشتہ جب کینیڈا گیا (اب میری وہ بھتیجی وہاں ہے) تو اس نے لکڑی کی ایک خوبصورت الماری میں اپنے تحفے رکھے ہوئے ہیں۔ اس نے اپنے دوسرے قیمتی تحفوں کے درمیان لکڑی کا ایک چوکور پیڈسٹل بنا کر اس پر وہ جگ رکھا ہوا ہے اور اسے دوسرے تحفوں سے اونچا رکھا ہوا ہے۔ مجھے وہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ وہ کہنے لگی کہ چچا جوں جوں وقت گزرتا ہے میں اس کو دیکھتی ہوں تو میری اس سے ایک طرح کی Relatedness پیدا ہو گئی ہے۔ وہ کہنے لگی کہ جب بھی کوئی مشکل پڑے تو اس جگ کو دیکھنے سے مشکل دور ہو جاتی ہے۔

خواتین و حضرات! ایسی باتیں جنہیں ہم ضعیف الاعتقادی کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسی باتیں ماننے سے آپ کی پختگی پر اچھا اثر نہیں پڑتا۔ لیکن میں میں اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایسے جگ کے ذریعے اور ایسے تحفے کے ذریعے جس کو آپ دیگر پیک کئے ہوئے تحفوں کی طرح وصول نہیں کرتے۔ اس تحفے کی قیمت زیادہ یوں ہوتی ہے کہ جب آپ اس کے ذریعے کچھ Communicate کرنا چاہیں تو آپ کو وہ سب کچھ نصیب ہو جاتا ہے جس کی کمی محسوس کی جا رہی ہوتی ہے۔ یہ طاقت تحفوں کی ہے اور اس کو عطا کرنے والوں کی ہے جو ہمیں میسر آتی ہے۔ ان سب چیزوں سے مل کر انسان کا پیٹرن بنتا ہے اکیلا انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا چاہے وہ کتنا ہی زور کیوں نہ لگا لے۔ اس لئے اللہ ہمیشہ انسانوں کو جماعت کے رُخ سے پکارتا ہے اور جماعت کے رُخ سے ہی حوالہ دیتا ہے۔ جب آدمی اکائی میں ہو تو اس کے لئے زندگی بسر کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ زندگی گزارنے کے لئے تحفوں کی استقامت اور اس کی معنوی طاقت کا سہارا پکڑنے کی شدت سے ضرورت ہے۔ چاہے کوئی بھی چھوٹی سے چھوٹی چیز ہی کیوں نہ ہو دِکھاوے اور لالچ سے ہٹ کر تحفہ میں دی جانی چاہیئے۔ چاہے گڑ کی ایک ڈھیلی ہی سوغات کے طور پر ہی کیوں نہ دی جائے لیکن یہ رشتے تحفے اور باتیں ہماری

زندگی سے نکلتی جارہی ہیں اور ہم اس سے دور ہوتے چلے جارہے ہیں۔ ہمیں اس کے قریب ہونے کی ضرورت ہے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

اللہ حافظ

جیر ابلیڈ، ڈاکیا اور علم

اس پروگرام کے شروع ہونے سے ذرا پہلے میں ایک نیا کیلنڈر دیکھ رہا تھا جس کے اوپر ایک بڑے شیر کی تصویر تھی اور وہ شیر ایسا خوفناک تھا جو میں نے یا آپ نے کبھی چڑیا گھر میں اپنی نظر سے نہیں دیکھا۔ اس کے نوکیلے دانت خنجر کی طرح ہوتے ہیں اور اس کا چہرہ بہت ہی خوفناک ہوتا ہے۔ یہ شیر اب تو نایاب ہے۔ یہ ڈائنو سار کے زمانے میں ہوا کرتا تھا اور اپنے آس پاس، ارد گرد جانوروں کو اٹھا کر خوراک کے لیے لے جاتا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ جانور کس طرح سے انسانوں کے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں اور پھر کس طرح سے ہمارے اوپر حاوی بھی ہوتا رہا ہے اور کن کن خصوصیات کی بنا پر یہ انسان سے بہتر ہے۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ماضی، حال اور مستقبل کا جانور یہ انسانوں سے یوں بہتر ہے کہ اس میں دیکھنے کی صلاحیت ہم آپ سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی بصارت بڑی تیز ہوتی ہے۔ آپ ایک گوشت کا چھوٹا سا ٹکڑا یا بوٹی زمین پر رکھ دیں تو میل بھر اونچی اڑتی ہوئی چیل فوراً جھپٹا مار کر اس بوٹی کو اچک لے گی لیکن

وہ مجھے یا آپ کو نظر نہیں آسکتی ہے۔ کبھی آپ صبح اٹھ کر چڑیوں کو دانہ ڈالیں تو دور اڑتی ہوئی چڑیاں بڑی جلدی ان دانوں کو دیکھ لیتی ہیں اور جانوروں میں شکرا تو دیکھنے کی بہت زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ اس طرح سے سننے کی قوت چمگادڑ میں بہت زیادہ ہے۔ بہت ساری آوازیں ایسی ہوتی ہیں جو یہاں موجود ہیں لیکن ہمارے کان ان کو نہیں سن سکتے لیکن چمگادڑ انہیں سن سکنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اندھی چمگادڑ رات کے اندھیرے میں اڑتے ہوئے Sound کو سنتی ہے۔ اسی طرح سے سُونگھنے کی طاقت کتوں میں بہت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ بند ٹرنک کے اندر پلاسٹک کے لفافوں میں بڑی مہارت سے بند کی ہوئی ہیروئن کو بھی سونگھ لیتے ہیں۔ آپ نے چور پکڑنے والے سونگھے کتوں کے بارے میں بھی سنا ہو گا۔ وہ ایک پاؤں کا نشان سونگھ کر اصل آدمی کو پہچان لیتے ہیں۔ جانوروں کی ان غیر معمولی صلاحیتوں کے باوصف انسان کی برتری اپنی جگہ قائم ہے۔ خونخوار شیر اور بھاری بھر کم ہاتھی انسانی صلاحیتوں کو نہیں پا سکتا ہے۔ اللہ کی طرف سے جو ہمیں عقلِ سلیم عطا کی گئی ہے ہم اس پر اللہ کے شکر گزار ہیں۔ میں شیر کی تصویر دیکھ کر سوچنے لگا کہ ہڑپہ یا انڈس ویلی کے پاس یقیناً پرانے زمانے میں بڑے بڑے جھاڑ اور جنگل ہوتے ہوں گے جن میں بڑے بڑے شیر رہتے ہوں گے تو غار میں رہنے والے "گجو" نے اپنے کسی دوست "بینڈی" سے ضرور کہا ہو گا کہ یار یہ

شیر بہت تنگ کرتا ہے اس اس علاقے کے جتنے بھی ہرن ہیں اس نے ختم کر دیئے ہیں۔ ہم اس کا کیا سدِباب کریں۔ پھر بینڈی نے کہا ہو گا کہ تم مجھ سے یہ اپنا کیا دکھ بیان کر رہے ہو میں خود پریشان ہوں کیونکہ میری بیوی نے مجھے پکڑ کے دو چماٹے مارے ہیں اور غار سے یہ کہہ کر نکال دیا ہے کہ بچے بھوکے مر رہے ہیں تم ہر روز ایک چھوٹا سے خرگوش مار کر لے آتے ہو اور میرے اٹھارہ بچے ہیں تم کوئی بڑا شکار کر کے لاؤ(اس زمانے میں یقیناً فیملی پلاننگ کا کوئی تصور نہیں ہوتا ہو گانا) اور اس نے کہا کہ میں تو رات بھر گھر سے باہر ہی سویا ہوں۔ اس وقت گجو نے بینڈی سے کہا ہو گا کہ دریا کنارے جہاں یہ شیر پانی پینے آتا ہے وہاں ایک بہت بڑا گڑھا ہے اور اگر ہم شیر کو پھانسنے کے لیے اس گڑھے کے اندر گوشت کا کوئی ٹکڑا یا ران وغیرہ رکھ دیں تو شیر یقیناً اسے پانے کے لیے چھلانگ لگائے گا تو بینڈی نے کہا کہ وہ بڑا جانور ہے۔ چھلانگ مار کر گوشت لے لے گا اور طاقت سے باہر نکل آئے گا۔ اس کا کوئی اور حل ڈھونڈنا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ ہم بانس کا ایک مضبوط اور نوکیلا سرکنڈا لیتے ہیں اور اسے گڑھے کے درمیان میں کھڑا کرتے ہیں جب یہ شیر چھلانگ لگائے گا تو یہ بانس اس کے پیٹ میں دھنس جائے گا۔ اس منصوبے پر اتفاق ہوا اور دونوں نے ایک بانس گاڑ دیا اور گوشت رکھ دیا۔ شیر کو گوشت کی خوشبو آئی اور اس نے

چھلانگ ماری تو وہ بانس اس کے پیٹ کے آر پار ہو گیا اور شیر کے مرنے کی خوشی میں انہوں نے وہاں لوک گیت بھی گائے ہوں گے کہ شکر ہے یہ بلا ٹلی۔ اب ان دونوں کے درمیان ایک اور بات طے ہوئی کہ یہ جو فعل ہم نے کیا ہے اور یہ ہمارے ذہن کا کمال ہے اور اب اس ذہنی اختراع کو آگے پھیلنا چاہیے اور لوگوں کو پتہ لگنا چاہیے کہ یوں بھی ہو سکتا ہے چنانچہ انہوں نے کسی پرانے چیتھڑے پر مٹکے یا گھڑے پر بجھے ہوئے کوئلے کے ساتھ ایک ڈیزائن سا تیار کیا جس میں دکھایا گیا تھا کہ اگر ایسا دائرہ بنے جس کے درمیان ایک بانس یا کوئی نوکیلی چیز گاڑ دی جائے تو اس طرح سے دشمن کو زیر کیا جا سکتا ہے۔ اس سے ان کا مقصد اپنے دیگر ساتھیوں کو ایسے ظالم اور خونخوار جانوروں سے چھٹکارا مل سکتا ہے۔ جب انہوں نے اس طرح ڈیزائن بنایا تو انہیں خدا کی طرف سے کچھ لکھنے کا احساس ہوا۔ جب انہیں لکھنا آ گیا تو انہوں نے پتھر کی ٹھیکریاں استعمال کیں۔ اس طرح انسان کو جو سب سے بڑی نعمت میسر آئی وہ لکھنے کی تھی اور تیسری سب سے بڑی خوبی جو ہم میں اس دونوں صلاحیتوں کے امتزاج سے ملی وہ یہ تھی کہ ہم اپنے ذہن کے اندر ایک مشکل پیدا بھی کر سکیں اور اس پیچیدہ خیال کو مزید گانٹھیں بھی دے سکتے ہیں اور یہ خیال کہ شیر یا ہاتھی کے ذہن میں پیدا کبھی نہیں ہوا۔ ہم میں چوتھی صلاحیت یہ پیدا ہوئی کہ ہمارے ذہن کا پیچیدہ خیال

جب کسی دوسرے تک منتقل ہوتا ہے تو وہ بھی اسے سمجھ لیتا ہے۔ جب غالب کہتا ہے کہ:

گر تیرے دل میں ہو خیال

وصل میں شوق کا زوال

یا وہ کہتا ہے کہ:

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب

شرم تم کو مگر نہیں آتی

جب میں سوچتا ہوں کہ یہ باتیں غالب کے ذہن میں کیسے آئیں اور جب اس سے ہو کر ہم تک پہنچیں تو ہم نے بھی فوراً یہ سمجھ لیا کہ غالب کیا کہنا چاہ رہا ہے۔

اقبال کا ایک شعر میری سمجھ میں آ جاتا ہے۔ شیکسپیئر کا کوئی قول ہوتا ہے تو وہ بھی سمجھ جاتا ہوں اور میں اس ڈرامہ "ہیملٹ (Hamlet) " میں To Be Or Not To Be کو بھی جاننے لگا ہوں جیسا کہ یہ بات مصنف کے ذہن میں پیدا ہوئی تھی۔ ہم نے ان نعمتوں پر کبھی غور نہیں کیا۔ آج کیلنڈر کی مہربانی سے

مجھے خیال آیا اور یہ باتیں میرے ذہن میں آئیں لیکن جب ہم پڑھنا لکھنا سیکھ گئے اور علم ہمارے تصرف میں آنے لگا تو پھر اس کے ساتھ ایک خدشہ بھی پیدا ہو گیا کہ یہی Tool اور ہتھیار منفی انداز میں بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جب بھی دعا مانگتے تھے یہی فرماتے کہ "اے اللہ مجھے علم نافع عطا فرما۔"

وہ انسانیت کو فائدہ پہنچانے کا علم مانگتے۔ وہ نقصان دینے والے علم سے پناہ مانگتے۔ ہم سائنس کی ترقی کی بڑی بات کرتے ہیں اور اس علم کے فوائد کا ذکر جا بجا کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے بہت نقصان بھی ہیں۔ سائنس کی بدولت ڈیزی کٹر اور ایٹم بم بنا کر انسانوں کی وسیع پیمانے پر ہلاکت کا سامان کیا گیا ہے۔ ہم سب کو بار بار سوچ کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم علم نافع کی طرف جائیں۔ اس کی ہی آرزو کریں۔ آپ دیکھیں کہ تالا توڑنے کا بھی تو ایک علم ہی ہے اور جیب کاٹنا بھی ایک علم ہے۔ میرا ایک دوست اوکاڑہ میں رہتا ہے۔ اس کے چھوٹے بھائی نے ایف-اے کیا تو میں نے اس سے کہا کہ اسے بی-اے میں داخل کروانے کے لیے یہاں بھیج دو لیکن اس نے اپنے بڑے بھائی سے کہا کہ میں بی-اے میں داخلہ نہیں لینا چاہتا۔ آپ کے دوست اشفاق صاحب ہیں ان کا بڑے لوگوں سے ملنا جلنا ہے۔ آپ مجھے بس

جیب کترے کا علم سکھا دیجیے میں آگے پڑھ کر کیا کروں گا۔ اب میں سمجھا کہ وہ مذاق کرتا ہے لیکن اس نے مجھے فون کر کے بھی یہی کہا۔ میں نے اپنے دوست سے کہا کہ اسے میرے پاس بھیجو۔ ان نے میرے پاس آکر کہا کہ بھائی جان بی۔ اے کا ایک علم ہے تو جیب کاٹنا بھی تو ایک علم ہی ہے نا۔ میرے ایک تھانیدار دوست لٹن روڈ تھانے میں تھے۔ میں نے اس سے کہا کہ یار اس لڑکے کا کچھ کرو۔ اس نے مجھ سے کہا کہ ایک پرانا بابا ہے اس سے پوچھتے ہیں۔ اس بابے نے کہا کہ میں پانچ سو روپیہ لوں گا اور باقاعدہ اسے شاگردی اختیار کرنی پڑے گی۔ ایک پگڑی اور سیر لڈو پہلے دن بطور شاگرد اسے لانا ہوں گے۔ پھر کام سکھانا شروع کریں گے۔ انشاءاللہ یہ نو ماہ، سال میں "جیر ابلیڈ" ہو جائے گا۔ مجھے یہ سن کر بڑی حیرت اور عبرت ہوئی کہ سکھانے والے بھی موجود ہیں اور سیکھنے والے بھی۔

یہ ایک چھوٹی سطح ہے، بڑے لیول پر بھی یہ کام ہو رہا ہے۔ جسے آپ مافیا کہتے ہیں۔ بڑے بڑے اور نیک نام ملکوں میں نقصان دہ علم کے فروغ کا اور اس کے استعمال کا کام ہو رہا ہے۔ ہمارے اوپر Terrorism کا الزام دھرا جاتا ہے لیکن انکے اپنے ہاں بھی عجیب طرح کی دہشت گردی کا چلن موجود ہے۔ اس سے ایک خوف ضرور پھیل رہا ہے۔ مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد ہے۔ میرے والد

صاحب ڈاکٹری پڑھنے کے لیے لاہور آئے۔ وہ 93-1890ء کی بات ہو گی۔ ابا جی بتاتے ہیں وہ اپنی والدہ کو کارڈز لکھتے تھے کہ میں یہاں بخیریت ہوں اور پڑھائی وغیرہ بھی ٹھیک جا رہی ہے۔ میری دادی ان پڑھ تھیں۔ خط یا کارڈ لانے والے ڈاکیا ہی اماں کو وہ خط وغیرہ پڑھ کر سنا دیا کرتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میرے والد کے خط میری دادی کو نہیں ملتے رہے تو وہ ابا جی بڑے پریشان ہوئے کہ خط کیوں نہیں مل رہے تو انھوں نے کارڈ میں لکھا کہ "اماں اس مرتبہ آپ ڈاکیے کو تنبیہہ کر دیجیے کہ اگر اس نے خط پہنچانے میں کوتاہی کی تو میں اس کے ساتھ سختی کے ساتھ پیش آؤں گا اور میں اس کی شکایت کروں گا۔" اب وہ ڈاکیا کارڈ یا خط لے کر آیا تو ظاہر ہے کہ اسے اس ڈاکیے نے ہی پڑھنا تھا اور وہ خط کو پڑھنے لگا لیکن جب وہ اس مقام پر پہنچا تو تو تھوڑا رکا اور پھر وہ پڑھنے لگ کہ امی جی ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ "اس ڈاکیے کو تنبی (چادر) دیجیے تا کہ یہ آپ کا شکر گزار ہو" میری دادی نے کہا کہ "میں اک دی بجائے دو تنبیاں لے دینی آں" اور انھوں نے مشہور قسم کا لٹھا لے کر دو اعلیٰ درجے کی شلواریں سلوا کر اس ڈاکیے کو دے دیں۔ اب آپ دیکھئے کہ اس ڈاکیے نے "تنبیہ" کو کس طرح 'تنبی' میں بدل ڈالا۔ دادی بتاتی تھیں کہ پھر اس کے بعد انہیں وقت پر خط ملتے رہے۔ اسی طرح لکھنے کے معاملے میں بھی تاریخ بھری پڑی ہے جس میں گروہ انسانی

سے کوتاہیاں ہوتی رہیں اور ان کی تحریروں سے لوگوں کو نقصان پہنچتا رہا ہے لیکن جہاں کوتاہیاں ہوئیں وہاں لکھنے سے فائدے بھی ہوئے ہیں اور علم نے ہی انسان کو ساری منازل طے کرا کے یہاں تک پہنچایا ہے لیکن میرے اندازے کے مطابق اب علم، تعلیم Learning کا قافلہ اس وقت تک آگے نہیں چل سکتا جب تک اس کے ساتھ تربیت نہ ہو۔ تربیت کے لیے روح کی بالیدگی کی بڑی ضرورت ہوتی ہے اور اس کی بابت بابوں سے پوچھنا چاہیے جو ان منازل سے گزرتے ہیں کہ یہ کیا چیز ہے اور ہم اپنی روح کو وہ سربلندی کس طرح سے عطا کر سکتے ہیں کہ ہم اپنی نظر میں ہی محترم ٹھہریں۔ ہماری سب سے بڑی خرابی یہی ہے کہ ہم اپنی نظر میں محترم نہیں ہیں۔ جو شخص اپنی نظر میں محترم ٹھہر گیا وہ باعزّت اور باوقار ہو گیا۔ اس کو توقیر ذات ملنے لگی لیکن یونیورسٹیوں، مکتبوں اور دانش کدوں میں یہ تعلیم نہیں ملتی۔ اس کے لیے کھوج کرنی پڑتی ہے اور اس کے لیے اپنے آپ کے ساتھ بیٹھنا پڑے گا اور اپنے آپ کو Face کرنا پڑے گا۔ پھر آپ میں وہ آسانیاں نکلنے لگیں گی جن کی ہم کو خواہش ہے۔ وگرنہ انسان تمباکو کی بل دی ہوئی گٹی یا "کھبڑ" کی طرح ہی رہے گا۔ جس سے اپنے ہی خم نہیں کھولے جاتے۔ میں جب اٹلی میں تھا تو میں اس وقت چھبیس برس کا نوجوان تھا۔ وہاں میرا ایک دوست اور ہم عصر ڈاکٹر بالدی بھی تھا۔ اس کے گھر میں اس

کی ماں اور والد کی شادی کو سالگرہ کی تقریب تھی۔ ہم نے وہاں کیک ویک اور چائے کافی سے لطف اٹھایا لیکن اس کھانے پینے سے پہلے ڈاکٹر بالدی کے باپ نے کہا کہ دیکھو بھئی آج ایک اچھا دن ہے میں اپنی بیوی سے درخواست کرتا ہوں کہ اگر زندگی میں کوئی ایسی کوتاہیاں کی ہیں جس کا مجھے علم نہ ہو اور یہ انہیں جانتی ہو تو مجھے یہ بتائے اور میں اس حوالے سے ڈائریکٹ کمیونیکیشن چاہوں گا۔ وہ کہنے لگا کہ میرے ساتھ جو زیادتیاں ہوئی ہیں وہ میں کہوں گا۔ ہم نے ان دونوں کو کاغذ دیا کہ وہ اگر کوئی ایسی بات ہوئی ہے تو لکھیں۔ دونوں نے جب لکھ لیا تو ہم نے ان سے کاغذ لے لیے۔ بالدی کی ماں نے لکھا کہ ایک بار ہم نے تھیٹر جانا تھا اور بالدی کے ابو نے کسی سرکاری کام کی وجہ سے تھیٹر جانے سے معذرت کی حالانکہ میرا اندازہ یہ ہے کہ اسے کوئی کام نہیں تھا۔ اس نے لکھا کہ یہ آج بتیس برس پہلے کی بات ہے۔ میں اس وقت نوجوان تھی لیکن میرے شوہر نے جانے سے انکار کر دیا جس کا آج تک میرے دل پر بوجھ ہے۔ پھر بالدی کی ماں آئی اس نے کہا کہ وہ ہمارے ہاں بارہ دن ٹھہرے گی لیکن وہ تیرہ دن رہی (خواتین و حضرات ساس تو ویسے ہی بری لگتی ہے اور دنیا میں آج تک کوئی خوبصورت ساس نہیں بنی ہے) اس کے بعد بالدی کے اباجی کی تحریر تھی۔ جس

میں سب سے پہلے انہوں نے لکھاہوا تھاI Love You ۔دوسرے کاغذ پر بھی I Love Youاور پھر تمام کاغذوں پر یہی فقرہ درج تھا۔

بچو لکھنے کا ایک انداز ہوتا ہے۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ڈاکیے کی طرح تقریر میں بالدی کے ابو کی طرح تحریر میں لکھت اور پڑھت میں ہم ایسا کریں کہ اس سے دوسرے کو سکون اور نفع عطا کرے۔ اگر علم جیر ابلیڈ بننے والا ہے تو ہمارے کسی علم یا پڑھنے لکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور ہم جانوروں سے بھی بدتر ہوتے چلے جائیں گے۔ چڑیا بلبل گاتے ہونے مر جاتے ہیں۔ ہم ایسے نہیں کر سکتے۔ ہمیں ہر وقت کوئی نہ کوئی دھڑکا ہی لگا رہتا ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ ہمیں بھی خوش رہنے کی صلاحیت عطا فرمائے اور ہم ایسے ہو جائیں کہ ہم خدا کے ہر حکم کو خوشی خوشی بجالائیں اور اپنے Creator کے حکم زندگی گزاریں۔

میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین۔

اللہ حافظ۔

فونگ شوئی

جب میں زندگی میں پہلی مرتبہ ہانگ کانگ گیا تو جیسے ہر نئے ملک اور شہر میں جانے کا ایک نیا تجربہ ہوتا ہے اس طرح میرا ہانگ کانگ جانے کا تجربہ بھی میری زندگی کے ساتھ ایسے چھوتے ہوئے گزرا کہ میرے اندر تو شاید وہ سب کچھ تھا جسے اجاگر ہونے کی ضرورت تھی لیکن وہ باہر برآمد نہیں ہو پاتا تھا۔ میں وہاں جس دفتر میں جانا تھا وہاں کے باس جس سے میں نے براڈکاسٹنگ کے سلسلے میں ملاقات کرنا تھی وہ بیمار ہو کر ہسپتال میں داخل ہو چکے تھے اور اس کے دفتر والے کچھ پریشان تھے۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی کے مہرے یا کمر کے مہرے ایک دوسرے پر چڑھ گئے تھے۔ میں نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی لیکن دفتر والوں نے کہا کہ وہ بات کرنے کے قابل ہی نہیں ہیں اور کافی تکلیف میں ہیں۔ ان صاحب کا دفتر جو بڑا اچھا اور خوبصورت دفتر تھا۔ اس میں کچھ تبدیلی ہو رہی تھی۔ اس کی سیکرٹری چیزوں کو ہٹانے، رکھنے یا جگہ بدلنے بارے ہدایت دے رہی تھی۔ وہاں ایک چھوٹے سے قد کا آدمی بھی آیا ہوا تھا جو Instructions

دے رہا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہم دفتر کی "فونگ شوئی" کر رہے ہیں اور یہ شخص "فونگ شوئی" کے Expert ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ہمارے دفتر کی فونگ شوئی بہت خراب تھی اور اس کی وجہ سے ہمارے باس پر بیماری کا حملہ ہوا۔ اب ڈاکٹر ان کے باس کا ڈاکٹری انداز میں علاج کر رہے تھے لیکن وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اگر دفتر کی فونگ شوئی بہتر ہوتی تو ایسے نہ ہوتا۔

میں نے ان سے پوچھا کہ یہ فونگ شوئی کیا ہوتی ہے۔ تو انہوں نے بتایا کہ اس کا لفظی مطلب پانی اور ہوا ہے۔ اس دفتر کی آب و ہوا نا مناسب تھی جس سے صاحب بیمار ہو گئے۔ ہمیں اس Expert نے کہا تھا اس دفتر کی کھڑکی کے سامنے جو عمارت ہے وہ اس انداز میں بنی ہے جو اس دفتر پر منفی انداز میں اثر انداز ہو سکتی ہے اور اگر اس کھڑکی پر ایک دبیز پردہ مسلسل لٹکتا رہے تو پھر اس کے اثرات سے بچا جا سکتا ہے۔ دوسری بات وہ یہ کہہ رہا تھا کہ اس کمرے میں ایک شیشے کا بڑا حوض رکھا جائے اور اس میں کالی مچھلیاں ہوں اور اس باس کی جو میز اور کرسی ہے وہ جہاں اب ہے وہاں نہ ہو بلکہ دروازے کے ساتھ ہو۔

خواتین و حضرات! گو یہ شگون کی سی بات کر رہا تھا لیکن زندگیوں میں شگون عجیب طرح سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان کو منطقی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ تعلق نہیں کہا جا سکتا۔ دفتر والوں کے مطابق ان کے باس کو سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہ بالکل دروازے کے ساتھ میز کرسی نہیں لگوا سکتے کیونکہ دنیا میں آج تک کسی باس کی میز کرسی بالکل دروازے کے ساتھ نہیں ہوتی ہے لیکن فونگ شوئی ماسٹر کا اصرار تھا کہ اس دفتر کا جغرافیہ اس امر کا تقاضہ کر رہا ہے۔ جب دفتر کی ساری تبدیلیاں ہو چکیں تو انہوں نے کہا کہ اب باس کی طبیعت پہلے سے کچھ بہتر ہو گئی ہے تو میں نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کام یہاں ہو رہا ہے لیکن طبیعت وہاں بہتر ہو رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ آب و ہوا اور رخ کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ہمیں بھی اللہ نے ایک رخ کا آرڈر دیا ہے کہ تم اپنا رخ ادھر کو رکھنا پھر عبادت کرنا یا کوئی قسم اٹھانا تو رخ ادھر کر کے اٹھانا۔ اگر آپ کی سوئی متعین رخ سے ادھر ادھر ہلتی یا ہٹتی ہے تو آپ کا عمل چاہے کتنا بھی اچھا ہو، علم کتنا بھی اچھا ہو تو مشکل پیدا ہو جائے گی۔ میں اس وقت یہی سوچتا رہا کہ ہمیں خدا نے کہا ہے کہ اپنا چہرہ قبلہ رخ کر کے نماز پڑھو تو ظاہر ہے اس میں کوئی حکمت ضرور ہو گی جس کا مجھے علم نہیں ہے۔ یہ بات سوچ کے مجھے اپنی جوانی کے اس وقت کا خیال یا جب ہم ہڑپہ دیکھنے گئے تھے۔ وہاں جو بستیاں بسائی گئی

تھیں ان کا ایک زمانے کے لوگوں نے ایک خاص رخ رکھا تھا۔ پانچ ہزار سال پہلے بھی ان بستیوں کا باقاعدہ رخ رکھا گیا۔ ہماری طرح سے ٹاؤن پلاننگ کیے گئے گھر تھے۔ اس فونگ شوئی کے تصور سے میرے ہاتھ ایک بہت اچھی بات آئی۔ وہ یہ تھی کہ میں ایک پڑھا لکھا آدمی ہونے کی حیثیت سے اعتراض کیا کرتا تھا کہ بھئی آپ کیوں کہتے ہیں کہ کندھے سے کندھا ملا کر لائن سیدھی کر لیں۔ جس طرح ہر نماز کے وقت امام صاحب کہتے ہیں میں کہتا تھا کہ اگر ایک انچ آگے یا پیچھے ہو بھی جائے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے تب احساس ہونے لگا کہ یقیناً فرق پڑتا ہے لیکن میں اس کو نہیں سمجھتا۔ میں اس بات پر بھی بہت چڑتا تھا اور میرے اور بھی بچے چڑتے ہوں گے کہ ٹخنوں سے اونچا پائنچہ کیوں رکھیں۔ اس کا ہمیں کیوں کہا جاتا ہے۔ ہم کہتے کہ اس سے کیا ہوتا ہے لیکن فونگ شوئی کا وہ سارا Process دیکھنے کے بعد میں نے سوچا کہ اس سے روح کی آب و ہوا میں ضرور فرق پڑتا ہو گا اور ہم کیوں نہ ایسا کر لیں جیسا کہ ہمارے بڑوں اور پرکھوں نے کیا ہے۔ ہم اپنے سرجنوں کی بات تو مانتے ہیں اور اتنا ہی کاٹ دیا جاتا ہے جیسے وہ کہتے ہیں۔ اس طرح روحانی آپریشن میں بھی بابوں کی یا بڑوں کی بات مان لی جائے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ برطانیہ کا جو ایک جیو گرافک میگزین ہے اس میں لکھنے والے ان دنوں ایک Research کر کے

حیران ہو رہے ہیں کہ وہ مسلمان جو عرب سے چل کر ایسی عجیب و غریب جگہوں پر پہنچے جن کے جغرافیے سے وہ آشنا نہیں تھے۔ ان لوگوں نے چودہ یا پندرہ سو برس پہلے جو مساجد بنائیں تھیں ان کا رخ کس طرح سے کعبے یا حرم شریف کی طرف رکھا گیا تھا۔ کیونکہ ان کے پاس اطراف کا تعین کرنے والا کوئی آلہ نہیں ہوتا تھا اور کوئی قطب نما نہیں تھا۔

اس حوالے سے میگزین میں ریسرچ سلسلہ وار چھپتی رہی۔ ایک مضمون میں انہوں نے لکھا کہ چونکہ وہ بحری سفر کرتے تھے اور وہ ستارہ شناس تھے اس لیے وہ اطراف کا تعین درست رکھتے تھے اور مساجد کا رخ درست رکھتے تھے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کشتیوں والے تاجر یا ملاں تو ان بابوں کو ان ویران علاقوں میں چھوڑ کر چلے جاتے تھے اور یہ مساجد وغیرہ یہ بابے ہی بناتے تھی۔ سنکیانگ ایک عجیب و غریب علاقہ ہے۔ اگر آپ کبھی شاہراہ ریشم پر گئے ہوں اور پھر آگے چین کے بارڈر تک جائیں تو وہ انتہائی غیر آباد علاقہ تھا۔ وہاں آنے والوں کو آخر کس نے بتایا تھا کہ اس مسجد کا رخ کعبے کی سمت کرنا ہے اور کعبہ کس طرف ہے؟

میگزین کے مطابق ایک اکیلا شخص انڈونیشیا گیا۔ اس نے بھی پھونس لکڑی، پتھر جوڑ جاڑ کے ایک مسجد بنائی اور اس کا رخ بھی Correct کعبے کی طرف رکھا۔ میں نے جب یہ مضمون پڑھا تو پھر مجھے حیرانی ہوئی اور فونگ شوئی کا مسئلہ بھی ذہن میں آیا اور میں نے سوچا کہ رخ کا درست رکھنا کس قدر ضروری ہے۔ میں نے آج سے پچیس تیس برس پہلے جب اپنا گھر بنایا تھا تو یہ رخ والی اور فونگ شوئی کی بات ذہن میں نہیں رکھی تھی البتہ اب یہ بات ذہن میں آتی ہے۔ اس وقت بانو قدسیہ نے کہا کہ ایک کمرہ ایسا ہونا چاہیے جس میں ایک بہت اچھا اور خوبصورت قالین بچھا ہوا ہو۔ میں نے کہا قالین تو بھئی بہت مہنگی چیز ہے ہم کہاں سے لیں گے۔ وہ کہنے لگے کہ میرے پاس پانچ سات ہزار روپے ہیں اس کا لے لیں گے۔ میں کہا اتنے پیسوں سے قالین تو نہیں آئے گا البتہ اس کا ایک دھاگہ ضرور آجائے گا۔ میرے ایک دوست حفیظ صاحب کا بہت بڑا قالینوں کا شوروم تھا جس کا نام "بخارا کارپٹس" تھا انہوں نے کہا کہ آپ زحمت نہ کریں ہم لوڈر میں ڈال کر کچھ قالین بھیج دیں گے آپ کو اور آپا کو جو پسند آجائے وہ رکھ لیں۔ اب وہ قالین لانے والے ایک ایک کر کے قالین دکھاتے جاتے اور ہم جو دیکھتے وہ ہی اچھا اور بھلا لگتا۔ جس طرح لڑکیاں کپڑا خریدنے جاتی ہیں تو انہیں بہت سارے کپڑوں میں سے کوئی پسند نہیں آتا ہے بالکل یہی کیفیت ہماری تھی اور

ہم سے کوئی فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ کون سے رنگ کا قالین رکھیں۔ ابھی ہم شش و پنج میں ہی تھے کی ہماری بلی میاؤں کرتی ہوئی کمرے میں آئی اور وہ بچھے ہوئے قالینوں پر بڑے نخرے کے ساتھ چلنے لگی اور ایک قالین پر آ کر بیٹھ گئی اور پھر نیم دراز ہو گئی۔ میں نے کہا کہ یہ ہی ٹھیک ہے۔ اگر اس نے چوائس کیا اور اللہ نے اس کو چوائس کی وہ صلاحیت دی ہے جو ہم میں نہیں ہے تو ہم اسی قالین کو رکھ لیں گے۔ وہ قالین اب تک ہمارے پاس ہے اور وہ زیادہ پرانا ہو کر زیادہ قیمتی ہو گیا ہے۔

بھارت کا ایک شہر کانپور ہے۔ اس کے پاس ایک قصبہ تھا۔ اس قصبے میں ایک بزرگ آ کر اپنے پیروکاروں یا مریدین سے ملے۔ لوگ اپنے پیر کی عزت افزائی کے لیے دن بھر ان کے ساتھ رہے اور نماز پڑھتے رہے۔ شام کے وقت وہ پیر صاحب نے جب وہاں ایک چھوٹی سی مسجد دیکھی تو وہاں مغرب کی نماز پڑھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ ان کے پیروکار کہنے لگے کہ جی ہم اس مسجد میں نہیں جائیں گے۔ وہ کہنے لگے کہ آپ کو مسجد میں جانے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ جی آپ ہمارے بڑے ہیں ہم آپ کو مسجد میں جانے سے نہیں روکتے لیکن ہم آپ سے درخواست کریں گے کہ آپ یہاں نماز نہ ہی پڑھیں تو اچھا ہے۔ وہ پیر صاحب فرمانے لگے کہ آپ لوگ کیسی بات کرتے ہیں کہ میں مسجد میں نماز نہ پڑھوں۔

بہر حال وہ بزرگ مسجد میں تشریف لے گئے۔ وضو کیا اور نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر انہوں نے پوچھا کہ آپ لوگوں نے اس مسجد میں نماز ادا کیوں نہیں کی تو لوگوں نے کہا کہ سر اس کا قبلہ غلط ہے اس کا رخ خانہ کعبہ کی طرف نہیں ہے بلکہ ٹیڑھا ہے۔ ہم اس لیے یہاں نماز نہیں پڑھتے۔ اس سے محترم بزرگ کو بڑی تکلیف ہوئی اور وہ کہنے لگے کہ یہ کوئی ایسا جواز نہیں ہے۔ وہ بزرگ محراب کے سامنے کھڑے ہو گئے اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنی شروع کر دی اور وہ بڑی دیر تک دعا مانگتے رہے۔ لوگ بتاتے ہیں کہ تھوڑی دیر بعد وہ محراب پھٹ گیا اور اس میں اتنا بڑا سوراخ ہو گیا جس میں سے ان لوگوں نے جو وہاں نماز ادا کرنے سے انکاری تھے دیکھا کہ سامنے حرم شریف ہے اور لوگ اس کا طواف کر رہے ہیں۔

خواتین و حضرات! جگہوں کی جغرافیائی صورتحال کا ایک عجیب اثر ہوتا ہے اور اس اثر سے یوں فائدہ اٹھانا چاہیے کہ ہمیں اپنے گھر کے اندر ایک مخصوص کونے میں تن تنہا بیٹھ کر اٹھایا جانا چاہیے۔ وہاں آپ کو مفتا مفت ایسی ارتعاش ملے گی جو آپ کے روحانی سفر میں معاون ثابت ہو گی۔ مجھے ہانگ کانگ میں فونگ شوئی کو دیکھ کر بہت فائدہ پہنچا کہ جن چیزوں پر میں اپنی حماقت کے ساتھ معترض ہوتا

تھا اور میں ان پر طنز بھی کیا کرتا تھا خدا مجھے معاف کرے۔ میرے پوتے وغیرہ اب بھی ایسی باتوں پر طنز کرتے ہیں۔

خواتین و حضرات! جب مسلمانوں نے یہ طے کیا کہ ہم اپنے لیے U.N.O کی عمارت بنائیں گے اور ایک ایسی عمارت بنائیں گے جہاں جا کر ہم درخواست یا عرض داشت پیش کر سکیں یہ عمارت کے بنانے کے لیے کوئی آرکیٹیکٹ نہیں منگوائے گئے تھے۔ سیانوں نے بلیو پرنٹس تیار نہیں کروائے تھے بلکہ فرمانے والوں نے فرمایا کہ ایک اونٹنی کو چھوڑ دو وہ جا کر جہاں بیٹھ جائے گی وہی مقام ہمارا مقام ہو گا اور مسلمانوں کے U.N.O کا صدر دفتر اور گھر ہو گا اور وہی ہماری آئندہ نسلوں اور پوری ملت کے لیے نگاہوں کا نور ہو گا۔

اس بات کو سوچنے کی بڑی ضرورت ہے۔ لوگ اب تک وہاں جا کر دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں اور کھڑے ہوتے رہیں گے اور وہی جگہ ہمارے دل اور نگاہوں کا محبوب مرکز اور ہمارا سب کچھ ہے۔ آپ سے بس یہی درخواست کرنا چاہ رہا تھا کہ بہت ساری ایسی باتیں جن کا میری جیسے پڑھے لکھے بندے تمسخر اڑاتے ہیں یا اپنی کسی کوتاہی کی وجہ سے کچھ کہہ دیتے ہیں۔ حقیقت کا علم تو خدا ہی جانتا ہے، جب اذان ہوتی ہے تو سروں پر اوڑھنیاں کیسے خود بخود آ جاتی ہیں

اور جو خاتون یا بچی اوڑھنی لے لیتی ہے وہ ہمارے ساتھ کی ہوتی ہے اور جو بد قسمتی سے نہیں بھی لیتی تو وہ ہے تو ہمارا ہی سرمایہ اور جانِ جگر لیکن اس کی فونگ شوئی میں ایسا فرق پڑ گیا ہے۔ جیسا کہ ہانگ کانگ والے باس کی ریڑھ کی ہڈی کے مہروں میں خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن آرزو یہ ہوتی ہے کہ ایسی خرابی نہ ہو جو ہم کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دے۔ کبھی کبھی کئی ایسی بات جو جوڑنے والی ہو اور آپ کو ناپسند ہو تو اسے فوراً اختیار کر لینا چاہیے۔ ہمارے بابے کہتے ہیں کہ مباحثے کے اندر، جھگڑے اور ڈائیلاگ میں کبھی کبھی آپ کو ایسی کمال کی بات سوجھ جائے جو آپ کے مدمقابل کو زیر کر دے اور سب کے سامنے رسوا کر دے تو وہ بات کبھی نہ کرو اور بندہ بچا لو۔ مت ایسی بات کرو جس وہ شرمندہ ہو جائے۔

ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں ایسی شرمندگی عطا نہ کرنا جو ہم کو ہماری ملت اور امہ سے توڑے یا ہمیں الگ الگ دانوں میں تقسیم کر دے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

دھرتی کے رشتے

میں بڑی درد مندی سے اور بڑے دکھ کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ ہم نے اپنے ساتھ کیا کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہم اپنے رشتوں کو پہچاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ بات ہمیں بڑی ہی خوفناک جہنم کی طرف لیے چلی جا رہی ہے۔ میرے گھر کے باہر لگا ہوا شہتوت کا درخت میرا دوست، میرا عزیز اور رشتہ دار ہے اور وہ فاختائیں جو ہماری منڈیر پر آتی ہیں، میں انہیں جانتا ہوں۔ وہ مجھے جانتی ہیں لیکن میں انسانوں کو نہیں پہچانتا۔ میں ان سے دور ہو گیا ہوں۔ میں ان کے ساتھ ایک عجیب طرح کی نفرت میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ بہار کے موسم میں جب بہار اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہوتی ہے اور گرمیوں کا شروع ہوتا ہے اس وقت ایک سہارا ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ وہ برکھارُت کا سہارا ہوتا ہے۔ ساون کا سہارا ہوتا ہے کہ بارشیں آئیں گی، مینہ برسیں گے اور پھر ہم جسمانی طور پر نہ سہی ذہنی طور پر پورے کے پورے برہنہ ہو کر برستی ہوئی بارشوں میں نہائیں گے اور پھر سے اپنے پیارے بچپن میں پہنچ جائیں گے۔ پچھلے دنوں تمام عالم میں "

Water Day" منایا گیا۔ سنا ہے کہ دنیا سے پانی کم ہو رہا ہے۔ یہ بڑی خوفناک سی بات ہے۔ باوصف اس کے کہ انسان کی خدمت کے لیے سارے پہاڑ، بڑی بڑی کروڑوں ٹن کی پگڑیاں باندھے ہر روز صبح اٹھ کر سورج کی خوشامد کرتے ہیں کہ خدا کے واسطے دو تین کرنیں ہماری طرف پھینکو ہم نے انسانوں کو پانی بھیجنا ہے۔ ہمارے بابا اور بزرگ بتاتے ہیں کہ جتنی بھی بے جان چیزیں ہیں یہ انسان کی خدمت کے لیے دیوانہ وار چل رہی ہیں۔ آدمی آدمی کی خدمت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے لیکن سورج بہت پریشان ہے وہ کہتا ہے کہ میری ساری کرنیں لے لو لیکن اے پہاڑو انسان کو کسی نہ کسی صورت پانی پہنچنا چاہیے۔ ایک ہمارا مزدور بابا ہے وہ مجھے کہتا ہے کہ اشفاق صاحب آپ کو پتہ نہیں ہے کہ صبح کے وقت سطح کے اوپر سوئی گیس ہوتی ہے۔ وہ نیچے کی سوئی گیس کو آواز دے کر کہتی ہے کہ "لڑکیو جلدی کرو اوپر کی طرف آؤ۔ لوگوں نے ناشتے بنانے ہیں۔ باہر نکلو اور انسانوں کی خدمت کرو۔" وہ گیس پھر فٹافٹ نکلتی چلی آتی ہے لیکن انسان بے چارہ اپنے ساتھیوں کی خدمت نہیں کرتا۔

جب ہم یہ پروگرام کر رہے ہیں اور آپ یہ پروگرام دیکھ رہے ہیں اس وقت بہاولپور سے بکریوں کا ایک ریوڑ چلتا ہوا ملتان کی طرف آ رہا ہے اور چھوٹے چھوٹے پٹھوروں (بکری کے کمسن بچے) کی مائیں اور لیلوں (بھیڑ کے ننھے بچے)

کی مائیں اونچی آواز میں کہہ رہی ہیں کہ بچو جلدی جلدی قدم اٹھاؤ صبح جا کر ذبح ہونا ہے اور ہمارا گوشت لاہور تک جانا ہے۔ پتو کی، ساہیوال اور کئی جگہوں پر جانا ہے اس لیے جلدی جلدی ملتان پہنچو۔ وہ کہتے ہیں کہ اماں چل تو رہے ہیں آپ ہمیں اور تیز چلنے پر کیوں مجبور کرتی ہیں۔ آگے سے وہ جواب دیتی ہیں کہ ہم انسان کی خدمت پر معمور ہیں۔ اس طرح جتنے بھی جمادات، حیوانات اور اللہ کی جتنی بھی مخلوق ہے وہ ساری کی ساری انسان پر قربان ہونے کے لیے تیار ہے اور روز قربان ہوتی چلی جا رہی ہے۔ جب میں نے ملتان کا ذکر کیا تو مجھے خیال آیا کہ پاکستان کے اندر جتنے بھی ثمر بہشت یا آموں کی دوسری قسمیں موجود ہیں آج تک کسی آم نے خود کو چوس کر نہیں دیکھا۔ کبھی اپنی مٹھاس خود محسوس نہیں کی۔ اپنا سارا کا سارا وجود انسان کو دے دیا ہے۔ بس یہ تو ہماری بد قسمتی ہے کہ انسان انسان کے ساتھ والی محبت اور پیار نہیں کرتا جیسی کہ بے جان چیزیں رکھتی ہیں۔ جب پانی کا دن منایا گیا اور اس خوف کا اظہار کیا گیا کہ پانی آئندہ اور کم ہو جائے گا تو مجھے اپنے بچپن کا وہ ساون یاد آ گیا جب ہم نیکریں پہن کر بے تحاشا بھاگا کرتے تھے اور اپنے گاؤں کی گلیوں کے چکر لگایا کرتے تھے اور اوپر سے پانی برسا کرتا تھا۔ ہم خوشی سے گاتے:

کالیاں اِٹاں، کالے روڑ

ہمیں ان باتوں کا مطلب نہیں آتا تھا لیکن ہم بس گایا کرتے تھے۔ ہماری جو چھوٹی بہنیں تھیں وہ اپنی گڑیا جو انہیں بہت پیاری ہوتی ہے اس لے کر روتی ہوئیں پانچ چھ کے تعداد میں آنسو بہاتی ہوئی چلتی تھیں اور موتی میں لپٹی ہوئی پیاری گڑیا کو ماتھے سے لگا کر جلا دیتی تھیں اور وہ قافلہ بارش کی دعا مانگتا ہوا اور روتا ہوا چلتا تھا اور یہ گاتا تھا:

تُو دَس وے بدلا کالیا

اساں گُڈی پٹولا ساڑیا

(یہ ایک طرح کا بچوں کا شگون تھا کہ اس طرح گڑیا اور کپڑے سے بنے کھلونے جلانے سے بارش آجاتی ہے)۔

وہ چھوٹی چھوٹی پیاری بچیاں انسانوں کے سکھ کے لیے اللہ میاں سے دعا کرتی تھیں حالانکہ انہیں بارش کے فائدے یا نقصان کا علم نہیں تھا۔ اب پانی کی کمی کا دکھ بہت زیادہ خوف پیدا کرتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اے اللہ میرے پوتے اور نواسے اس برکھا رُت سے واقف نہیں ہیں۔ انہیں پتہ ہی نہیں ساون کیا ہوتا

ہے۔ انہیں معلوم نہیں سڑک کے کنارے کس طرح مینڈک آ کر بیٹھتے ہیں۔ کیسے مینڈکوں کی آوازیں آتی ہیں اور وہ سخت بارش کے بعد کس طرح سے آوازیں نکالتے ہیں۔

میں جب پانچویں چھٹی میں ہوتا تھا مینڈک کی آواز کو بڑی اچھی طرح سمجھتا تھا اور مجھے پتہ ہوتا تھا کہ اب مینڈکیاں بولی ہیں اور اب یہ مینڈک بولے ہیں۔ اب بڑے سائز کے مینڈک بولے ہیں۔ اب درمیانے سائز کے مینڈک بولے ہیں اور وہ قطار در قطار بیٹھے بولنا شروع کر دیتے تھے۔ جب ہم سکول جاتے تھے تو میری پھوپھی کہا کرتی تھیں کہ ”اشفاق جاتے ہوئے ڈڈواں (مینڈکوں) نوں سلام کر کے جانا۔“

ہمارا ڈڈو کے ساتھ بڑا گہرا رشتہ تھا اور ہم سکول جاتے ہوئے پھوپھی کے حکم کے مطابق ”ڈڈو سلام، ڈڈو سلام“ کہہ کر جاتے تھے اور وہ سڑک کنارے بیٹھے ہوئے ایک آواز نکالتے تھے۔ اس زمانے میں ہم مینڈکوں کی بولی جاننے کی بھی کوشش کیا کرتے تھے اور ہم سے جو سینئر اسٹوڈنٹ ہوتے تھے وہ ہمیں بتاتے تھے کہ جب بڑا مینڈک بولتا ہے تو وہ کہتا ہے:

”ویاہ کریے، ویاہ کریے“

پھر مینڈکیاں بولتیں ”کدوں تک، کدوں تک“

پھر مینڈکیاں ایک دوسرے سے کہتیں:

” نیوندراپایئے، نیوندراپایئے“

اور ساتھ ہی چھوٹی مینڈکی کہتی:

”کناں کناں کناں “

اور ایک بوڑھاڈڈو بولتا اور کہتا:

” ٹکا، ٹکا، ٹکا، ٹکا “

اس طرح ایک پوری بولی ہوتی تھی جو ہم جانتے تھے اور مزید جاننے کو کوشش کرتے تھے۔ وہ خوبصورت زندگی ہوتی ہے جس سے ہم محروم ہو گئے ہیں۔ ہم نے تو اب قتل و غارت گری کو اپنا لیا ہے۔ ہم کیا چڑیوں اور مینڈکوں سے ملیں گے۔ میرے گھر کے باہر جو شہتوت کا درخت ہے وہ پاکستان کا باشندہ ہے۔ وہ میرا عزیز ترین ہے لیکن میری آنکھیں اتنی غیر ہو گئی ہیں اور میرے دیدے بے نور ہو گئے ہیں اور میں نے تو انسانیت سے محبت کرنی چھوڑ دی ہے۔ اس

پیارے شہتوت کے ساتھ اور فاختاؤں کے ساتھ کیسے محبت کروں گا۔ ہم ہر روز ایسی ایسی خبریں پڑھتے ہیں جن سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ آخر ہمیں ہو کیا گیا ہے۔ یہ کون ایسا ظالم ہے جس نے ہمارے اندر سے محبت اور شیرینی کی ساری خوشیاں اور انداز چھین لیے ہیں اور چاشنی چاٹ لی ہے۔

خواتین و حضرات یہ علاقے اور خطے جو ہوتے ہیں یہ انسان کی پہچان بنتے ہیں اور انسان ان خطوں کی پہچان بنتے ہیں۔ ہم علاقوں کو رسلے انسان، سنجیلے انسان اور غصیلے انسان کے طور پر دیکھتے ہیں اور جس طرح کے انسان ہوتے ہیں اس خطے کے بارے میں بھی ویسا یہ تاثر قائم کر لیا جاتا ہے۔ نباتات، جڑی بوٹیاں، اللہ کی طرف سے خود رو اگنے والے پودے اور جو ہم کوشش سے اگاتے ہیں انکا بھی ہمارے ساتھ ایک رشتہ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ گلاب چواسیدن شاہ کا ہے۔ اس سے اچھا گلاب دنیا میں کہیں نہیں اگتا۔ ترکی والے اپنے گلاب کے بہترین ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور وہاں کا گلاب ساری دنیا میں مشہور ہے۔ ان کی دنیا بھر میں گلاب کی بہت بڑی سپلائی ہے۔ میں نے ان کے گلابوں کے کھیتوں کو بھی دیکھا ہے۔ لیکن چواسیدن شاہ کا گلاب منفرد ہے۔ میں یہ اس لیے نہیں کہتا ہوں کہ میرا اور میرے پیارے وطن کا گلاب ہے بلکہ اس لیے کہ وہ بہت ہی اعلیٰ درجے کا ہے۔ آپ نے قصور کی میتھی سنی ہو گی۔ وہ بھی اللہ کی ایک نعمت ہے۔

میں چیخ چیخ کر کہتا ہوں کہ میرے پیارے سیالکوٹ کے رہنے والو، وہ گنا کہاں گیا جو اتنا نرم اور میٹھا ہوتا تھا کہ جی چاہتا کہ چوستے ہی رہیں۔ انسان کا علاقے اور جگہ کا رشتہ انسان کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اسے چھوڑا نہیں جا سکتا۔ میں صرف اپنے رشتہ داروں سے وابستہ ہوں۔ میرے اور کئی عزیز اور میرے بہت ہی قریبی عزیز ہیں۔ میرے صرف مسلمان، پارسی، شیعہ، سُنی، بابری، عیسائی، میگوار، گیری ہی عزیز و اقارب نہیں ہیں بلکہ وہ جانور بھی میرے عزیز رشتہ دار ہیں یہ مینا، اونٹ، فاختائیں، درخت، کیکر، شہتوت، طوطے بھی رشتہ دار ہیں۔ جب میں ایک پودا ذہن میں بوتا ہوں تو میں اس کے ساتھ اپنے آپ کو بھی بوتا ہوں۔ کبھی آپ غور کر کے دیکھ لیں کہ وہ پودا بونے کے بعد میرے اندر بھی اس کی نشوونما شروع ہو جاتی ہے۔ جب آپ کسی چڑی مار سے طوطا لے کر اڑاتے ہیں اور وہ ٹیں ٹیں کرتا ہوا گھر کو جاتا ہے تو آپ بھی گھر کو جاتے ہیں۔ جب طوطا گھر پہنچ جاتا ہے تو آپ کی روح اور وجود بھی سکون کے گھر میں پہنچ جاتا ہے۔ لیکن میں ایک نہایت دردناک انداز میں اور آنسو پی کر یہ بات کروں گا کہ ہم اس علاقے کے لوگ تو بڑی محبت کرنے والے لوگ تھے۔ سندھ اور پانچ دریاؤں کے علاقے کے لوگ تو محبتیں بانٹنے والے لوگ ہیں۔ ہمیں کیا ہو گیا ہے۔ آج سے بیس پچیس برس پہلے جب ہمارے لسانی جھگڑے ہوئے تو

یہاں کے جو پرانے اور ان پڑھ لوگ تھے وہ کہتے تھے کہ سندھ میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ تو سائیں لوگ ہیں، پیارے لوگ ہیں۔ وہ کیسے جھگڑ سکتے ہیں۔ ہم ان لوگوں کو بہت سمجھاتے تھے لیکن وہ کہتے تھے کہ نہیں لسانی جھگڑے نہیں ہیں۔ ہم سے کوئی اور غلطی ہو گئی ہے۔ یہ غلطی کسی اور بندے کی ہے۔ وہاں تو درگاہوں پر گانے والے لوگ ہیں جو سلام کرنا اور رکوع میں جانا جانتے ہیں وہ کبھی ظلم نہیں کر سکتے۔ مجھے اس بات کس دکھ ہوتا ہے۔ خدا کے واسطے اس بات کو شدت سے محسوس کریں۔ گھروں سے نکل کر ہم نے زندہ رہنا کیوں چھوڑ دیا ہے۔ ہم ایک خوفزدہ قوم بن کر رہ گئے ہیں۔ ہر وقت ڈر کے ساتھ وابستہ ہیں اور ٹوٹتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے روٹھتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ میری آپا زبیدہ جو جہلم میں رہتی تھیں وہ بچوں کو تعلیم دیتی تھیں۔ بہت معروف ہستی تھیں۔ ان کے ملنے والی ایک خاتون تھیں یہ کوئی دس بارہ برس پہلے کی بات ہے۔ میں وہاں جہلم گیا تو وہ دونوں سہیلیاں وہاں گھر پر تھیں۔ وہاں آپا زبیدہ کی ملازمہ بی بی صغریٰ تھیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ دونوں کے گھر پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔ اور یہ بی بی صغریٰ باوصف اس کے کہ کوئی علم نہیں رکھتی اور پڑھی لکھی نہیں ہے لیکن اس کا درجہ بہت بلند ہے۔ بڑی آپا کہنے لگیں کہ ہاں اللہ رحیم و کریم ہے۔ وہ فضل کرنے والا ہے۔ اللہ رحمٰن ہے وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ وہ

کہنے لگی کہ میں اپنے بارے میں تو کچھ کہہ سکتی ہوں صغریٰ کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی کہ یہ بہشت میں جائے گی یا نہیں۔

خواتین و حضرات یہ پہلا موقع تھا کہ جب میں نے ان میں ایک شگاف اور خلیج محسوس کی کہ انسان کے اندر اس قدر قریب رہتے ہوئے بھی اس قدر شگاف پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن کبھی اللہ ہم کو استطاعت دے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دے اور ہم اپنے بہت قریب دیکھ سکیں۔ آپ کو یہ بات سن کر بہت عجیب لگے گی کہ بہت سے ندی نالے اور پلیں بھی ہماری رشتہ دار ہیں۔ جب کبھی آپ ٹرین سے جاتے ہوئے خالی پل یا نالے پر سے گزرتے ہیں تو اس کو جو Sound آپ کو محسوس ہوتی ہے وہ بڑے معانی اور مطالب لے کر آتی ہے اور وہ آپ سے بات کرتی ہے۔ اس کی وہ آواز صرف آپ ہی کے لیے ہوتی ہے۔ کبھی آپ آدھی رات کو اونچی آواز دے کر دیکھیں کسی سنسان جگہ پر تو اس کی صدائے گشت آپ تک پھر لوٹ کر آئے تو پھر آپ کو پتہ چلتا ہے کہ اندھیری رات کی آواز کیا ہوتی ہے اور دن کے وقت وہ آواز کیا ہوتی ہے۔ یہ گانے والے، راگ کو سمجھنے والے جانتے ہیں کہ ٹکراتی ہوئی آواز اور ڈائریکٹ آواز میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ میرے منہ سے آنے والی اور لوٹ کر آنے والی آواز بھی میری ہے اور ہم ایک رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔ خدا کے واسطے سمجھنے کو کوشش

کریں کہ ہم نے اپنے ساتھ یہ کیا کرنا شروع کر دیا ہے؟ اور کیوں کرنا شروع کر دیا ہے؟ اس کے پیچھے کون آدمی ہے؟

آپ اپنے رشتوں کو پہچاننے کو کوشش کریں اور انسانوں کے ساتھ یہ ایک عجیب طرح کی نفرت کا رجحان ہے۔ ہم اس مرض میں مبتلا کیوں ہو گئے ہیں۔ پچھلے دنوں ملتان کے ایک بینک میں ایک اکاؤنٹ میں دردانہ عزیز احمد کے نام کا چیک آیا۔ بینک والوں نے اس چیک کو پاس کر دیا پھر اس کے ساتھ ہی اس پاس کرنے والے نے کہا کہ یہ دستخط تو دردانہ عزیز کے ہی ہیں لیکن اس پر جو اکاؤنٹ نمبر درج ہے یہ وہ نہیں ہے۔ پچھلے چیک انہوں نے نکال کر دیکھے ان میں سیاہی کا رنگ بھی وہی تھا اور دستخط بھی وہی تھے۔

اب تحقیق شروع ہو گئی یہ کیسے ممکن ہے۔ بعد ازاں پتہ یہ چلا کہ کہیں گڑبڑ نہیں ہوئی مسئلہ صرف یہ ہے کہ اس بینک میں دو دردانہ عزیز ہیں۔ اب جو چیک آیا ہے یہ اس کا نہیں ہے جس کا خیال کیا جا رہا تھ۔ بینک منیجر نے مزید تصدیق کے لیے اور آئندہ کوئی غلطی کا احتمال نہ رہ جانے کی وجہ سے دونوں کو بینک بلایا۔ وہ دونوں بینک آئیں۔ منیجر نے مجھے بتایا کہ جب وہ دونوں بینک میں داخل ہوئیں تو ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان دونوں کا قد ایک جیسا تھا اور دونوں نے تقریباً

ایک جیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ایک ذرا سی گوری تھی اور دوسری کا رنگ ذرا گندمی تھا۔ ان کے دستخط بالکل ایک دوسری کے ساتھ ملتے تھے اور جو نیلے رنگ کی سیاہی ایک استعمال کرتی تھی، دوسری بھی وہی رنگ استعمال کرتی تھی۔ ان کی کاریں تھی ایک ہی ماڈل، ایک ہی کمپنی اور ایک ڈیزائن کی تھیں۔ بس ان کی کاروں کے نمبر میں فرق تھا۔ ایک کا گاڑی کا نمبر MN 1715 تھا جبکہ دوسری کی کار کا نمبر MN 1571 تھا۔ دو دونوں بھی ایک دوسری سے مل کر بہت خوش ہوئیں اور وہ آپس میں سہیلیاں بن گئیں۔ دونوں کے خاوندوں کا نام بھی عزیز احمد تھا، دونوں چشتیہ سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔

اللہ فرماتا ہے کہ "اے لوگو ایک دوسرے کے قریب آجاؤ اور ایک دوسرے کو اپنے رشتہ دار جانو۔"

خواتین و حضرات! کسی نہ کسی حوالے سے اور کسی نہ کسی طریقے سے ہم ایک دوسرے کے رشتہ دار تو ہیں آخر۔

ہم جتنی بھی بھاگنے کی کوشش کریں ہم نے آخر کار تو بابا آدم تک ہی جانا ہے۔ ہمارا حساب "ڈارون" کے حساب کی طرح نہیں ہے بلکہ ہمیں لوٹ کر وہیں جانا پڑتا ہے جہاں سے چلے تھے۔ ہم اب اس برکھارُت کی دعا کرتے ہیں اور اللہ سے

فریاد کرتے ہیں کہ اے اللہ ہمارے لیے ویسی ہی بارشیں بھیج جیسی بارشوں میں ہم گلی محلوں اور کھیتوں میں بھاگا کرتے تھے۔ وہ ساون بھیج جس ساون میں ہم " پوڑے "(میٹھی روٹیاں) پکایا کرتے تھے۔ وہ موسم عطا فرما جس کی تلاش میں ہم انتظار کی آنکھیں پھاڑ کر بیٹھا کرتے تھے۔ یہ ساری چیزیں ہم سے ناراض ہو گئی ہیں۔ ان کو ہم سے پھر سے ملا دے اور ٹوٹے رشتے بحال کر دے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر دست بستہ رکوع میں جا کر یہ کہا جائے کہ " اے پروردگار تو ہمارے موسموں کو پھر ہمارے پاس لا دے۔ ہمیں وہی پانی دے جو ہم کو شیرینی اور ٹھنڈک عطا کرتے ہیں اور ہماری فصلیں پکاتے ہیں۔"

لیکن یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب انسان انسان کے اتنا ہی قریب آئے جس قدر آنے کی ضرورت ہے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور میری بڑی آرزو ہے کہ اللہ ان آسانیوں کو تقسیم کرنے کا بھی شرف عطا فرمائے تا کہ ہم لوٹ کر پھر اس انسانی مقام پر پہنچ سکیں جہاں سے ہم نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ آمین۔

اللہ حافظ۔